اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے بس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد دہم

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد دہم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپوزنگ	محمد جمشید ہاشمی
تاریخ اشاعت	باراول جولائی 2018ء،
	باردوم نومبر 2019ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ13

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37225085-37247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail: info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

تحدیثِ نعمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ، سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَعَلٰی صَحَابَتِہِ الصِّدِّیْقِیْنَ الْکَامِلِیْنَ، وَعَلٰی اَوْلِیَاءِ اُمَّتِہٖ وَعُلَمَاءِ مِلَّتِہٖ مِنَ الْفُقَھَاءِ الْمُجْتَھِدِیْنَ وَالْمُفَسِّرِیْنَ وَالْمُحَدِّثِیْنَ اَجْمَعِیْنَ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ! تفہیم المسائل کی دسویں جلد پیشِ خدمت ہے اور تا حال یہ سلسلہ ''تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ'' کا مصداق بن گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرصتِ حیات اور ہمت وتوفیق عطا فرمائی، تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، ان شاءاللہ العزیز!۔

اس کتاب کی تدوین وتبویب اور حوالہ جات نکالنے میں مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا تعاون شامل حال رہا ہے اور اس کی کمپوزنگ اور تسوید وتبییض کے تمام مراحل میں حافظ محمد جمشید ہاشمی نے کافی محنت کی ہے، کیونکہ یہ کتاب بار بار نظرِ ثانی کے مراحل سے گزرتی ہے۔

ابتدائی مسوّدے کی پروف ریڈنگ اور تصحیح مولانا بختیار علی نے کی۔ اسے ہمارے شیخ الحدیث علامہ احمد علی سعیدی نے لفظ بہ لفظ پڑھا اور مفید مشوروں سے نوازا، اسی طرح حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی نے، جبکہ وہ بیرونِ ملک سفر کے لیے پا بہ رکاب تھے، اسے عجلت میں پڑھا اور تصحیح واضافات کی بابت مفید رہنمائی کی۔ علامہ مفتی محمد وسیم اختر المدنی سے بھی بعض مسائل میں مشاورت رہی اور مفید نکات شامل کیے۔ آخر میں ہمارے قابلِ فخر جوان عالم شارحِ ترمذی واستاذِ حدیث علامہ حافظ قاری محمد عبداللہ نے نہایت توجہ سے پڑھا اور اُن کی نشاندہی پر بعض جگہ ہم نے مفید اضافات کیے۔

میں اپنے ان تمام ذی علم وذی وقار رُفقائے کرام کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ اپنے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل ان کی عمر، علم

اور فیوض میں برکات نصیب فرمائے۔ تفہیم المسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور بعض اہلِ علم کتابت کی اغلاط اور فروگزاشتوں کی جانب متوجہ بھی فرماتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ میری تحریروں کو نہایت توجہ سے پڑھتے ہیں، میں ان سب کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ! تفہیم المسائل کی تمام جلدیں اور اصلاحِ عقائد واعمال ہندوستان سے بھی طبع ہوچکی ہیں، یہ ہمارے لیے اعزاز اور سعادت کی بات ہے کہ وہاں کے اہلِ علم اور دینی ذوق رکھنے والی شخصیات سے ہمارا بالواسطہ علمی وروحانی رشتہ قائم ہورہا ہے، کئی جرائد ہمارے بعض کالموں اور فتاویٰ کو بھی شائع کرتے ہیں، میں اُن سب کا شکرگزار ہوں۔

بشری استطاعت کی حد تک یہ کتاب اغلاط سے پاک ہے، لیکن تسامحات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے، اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کسی بھی فروگزاشت پر مطّلع ہوں تو ضرور نشاندہی فرمائیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ سلسلۂ خیر جاری رکھے اور اس کی افادیت میں برکت عطا فرمائے۔ اس موقع پر میں قارئین کرام سے ملتمس ہوں کہ وہ میری اور میرے برادرِ عزیز ڈاکٹر محبوب الرحمٰن کی صحت کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معذوری اور محتاجی سے امان عطا فرمائے اور میرے والدین کریمین اور اساتذۂ کرام رحمہ اللہ علیہم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ وہ انہیں اپنی مغفرت سے نوازے اور اُن کو اور ہم سب کو آخرت میں شفاعتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نصیب فرمائے۔ نیز ہمارے ادارے کے اکابر حضرت علامہ مفتی محمد اطہر نعیمی اور علامہ مفتی جمیل احمد نعیمی دامت برکاتہم کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔

المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

فہرست

عقائد کے مسائل

مقامِ نبوت کے بارے میں باادب رہنا چاہیے

سوال:

مسجد قبا حمید پورہ میر پور خاص کے خطیب صاحب نے جمعہ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''سیدنا عمر فاروق شہید، سیدنا عثمان غنی شہید، سیدنا علی شہید (رضی اللہ عنہم) ہیں، تو ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے کیسے رہتے، وہ کربلا میں (گردن کٹی) شہید ہوئے۔ کیا شہادت کا رتبہ نبوت سے بڑا ہے، ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو نبیوں کے سردار ہیں''، کیا ایسی تقریر کرنے والے امام کے پیچھے نماز جائز ہے؟، (محمد جمال خان، حمید پورہ کالونی میر پور خاص)۔

جواب:

مذکورہ امام صاحب کا اندازِ بیان درست نہیں ہے اور ان کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ کربلا میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی شہادت واقع ہوئی، حالانکہ کربلا کا واقعہ آپ کے وصال مبارک سے تقریباً 50 سال بعد ہوا ہے، لہٰذا امام کا بیان غلط ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف قصداً جھوٹ منسوب کرنے والے کے لیے بڑی وعید فرمائی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ''۔

ترجمہ: ''جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح البخاری: 110)''۔

اگر امام متنبہ کیے جانے کے باوجود اپنے قول سے رجوع نہ کرے تو اُسے امامت سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا چاہیے:

ادب گاہیست زیرِ آسمان اَزعرشِ نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

امام کے بیان سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ گویا حضرات عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم شہادت کا مرتبہ پاکر حضور سے آگے نکل گئے۔کوئی امتی یا سارے امتی مل کر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آگے نہیں نکل سکتے ، نبی اور امتی میں تقابل محض جہالت یا خطیبوں کی لن ترانیاں اور جسارتیں ہیں، اللہ تعالیٰ ایسی جسارت سے اپنی پناہ میں رکھے۔

البتہ بعض علمائے کرام نے حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی شہادت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معنوی شہادت سے تعبیر کیا ہے، بہ ایں معنی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی صورت نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمِ انور کے اوپر والے حصے کے زیادہ مشابہ تھی اور حضرتِ امام حسین رضی اللہ عنہ کی صورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمِ انور کے نیچے والے حصے سے زیادہ مشابہ تھی ۔لیکن یہ علمی نکتہ آفرینی ہے،قرآن وحدیث میں کوئی منصوص مسئلہ نہیں ہے۔حضراتِ حسنین کریمین کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صورتاً مشابہت کے بارے میں حدیث پاک میں ہے:

’’عَنْ عَلِيٍّ قَالَ:اَلْحَسَنُ أَشْبَهُ بِرَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم مَا بَيْنَ الصَّدْرِ إِلَى الرَّأْسِ وَالْحُسَيْنُ أَشْبَهُ بِالنَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وسلم مَا كَانَ أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ‘‘۔

ترجمہ:’’حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں : حضرت حسن رضی اللہ عنہ سینے سے لے کر سر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیادہ مشابہ تھے اور حسین رضی اللہ عنہ سینے سے نیچے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صورتاً زیادہ مشابہ تھے،(سُنن ترمذی:3779)‘‘۔

شہادت جہری کا کمال امام حسین رضی اللہ عنہ کو ملا، کیونکہ آپ کو علانیہ طور پر میدانِ کربلا میں تلوار سے شہید کیا گیا۔شہادتِ جہری امام حسین کے حصے میں آئی اور سری امام حسن کے حصے میں آئی۔ان دونوں شہزادوں کی بالترتیب جہری اور سرّی شہادت کو مشابہت صوری کی بنا پر معنوی اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شہادت سے تعبیر کیا گیا تاکہ منصبِ شہادت آپ کی نسبت سے مقدس ومتبرک قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ نے جو مناصبِ جلیلہ اپنے محبوب بندوں کو عطا کیے ہیں، اُن میں نبوت ورسالت سے بڑا کوئی منصب نہیں ہے۔دیگر تمام کمالات کا منبع بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی

ہے، جس کو جو مرتبہ وکمال ملا، آپ کے فیضان سے ملا، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:
''وَاللّٰهُ الْمُعْطِيْ وَأَنَا الْقَاسِمُ''، ترجمہ:'' اللہ (نعمتیں) عطا فرمانے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں، (صحیح بخاری:3116)''۔

جہاں تک صوفیہ کرام کے اس قول کا تعلق ہے:''وِلَايَةُ النُّبُوَّةِ اَفْضَلُ مِنَ النُّبُوَّةِ''، ترجمہ:''ولایتِ نبوت، نبوت سے افضل ہے''۔اس کا مطلب بھی ہرگز یہ نہیں کہ مطلقاً ولایت نبوت سے افضل ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ولایتِ نبوت''، مطلق نبوت سے افضل ہے اور وہ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ نبوت کے فرائض انجام دیتے ہوئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم مخلوق سے رابطہ رکھتے ہیں، لیکن جب آپ اللہ کے ذکر وفکر میں مستغرق رہتے ہیں، تو یہ آپ کی جہتِ ولایت ہے، جو آپ کی نبوت کو لازم ہے اور یہ آپ کی نبوت سے جدا نہیں ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی اس جہت کو صوفیہ نے افضل قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے حق میں معنوی شہادت مُتحقق ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:
''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ،قَالَ:لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ أُهْدِيَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ شَاةٌ فِيهَا سُمٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: اِجْمَعُوا إِلَيَّ مَنْ كَانَ هَا هُنَا مِنْ يَهُودٍ فَجُمِعُوا لَهُ فَقَالَ إِنِّي سَائِلُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْهُ، فَقَالُوا: نَعَمْ، قَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: مَنْ أَبُوكُمْ، قَالُوا: فُلاَنٌ، فَقَالَ: كَذَبْتُمْ، بَلْ أَبُوكُمْ فُلاَنٌ ، قَالُوا: صَدَقْتَ قَالَ: فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُ عَنْهُ ، فَقَالُوا: نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ، وَإِنْ كَذَبْنَا عَرَفْتَ كَذِبَنَا كَمَا عَرَفْتَهُ فِي أَبِينَا، فَقَالَ لَهُمْ: مَنْ أَهْلُ النَّارِ، قَالُوا نَكُونُ فِيهَا يَسِيرًا ثُمَّ تَخْلُفُونَا فِيهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اخْسَئُوا فِيهَا، وَاللّٰهِ لاَ نَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا، ثُمَّ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ، فَقَالُوا نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ، قَالَ هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هٰذِهِ الشَّاةِ سُمًّا، قَالُوا: نَعَمْ، قَالَ مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ، قَالُوا: أَرَدْنَا إِنْ كُنْتَ كَاذِبًا نَسْتَرِيحُ، وَإِنْ كُنْتَ نَبِيًّا لَمْ يَضُرَّكَ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب خیبر فتح کیا گیا تو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک

زہر آلود بکری ہدیہ کی گئی، پس نبی ﷺ نے فرمایا: جتنے بھی یہاں یہودی ہیں، اُن سب کو میرے پاس جمع کرو، سو اُن کو جمع کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں تم سے ایک چیز کے متعلق سوال کروں گا، کیا تم مجھ کو سچ سچ بتاؤ گے، اُنہوں نے کہا: جی ہاں! تو نبی ﷺ نے اُن سے پوچھا: تمہارا باپ کون ہے؟، انہوں نے کہا کہ فلاں شخص ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے جھوٹ بولا بلکہ تمہارا باپ فلاں شخص ہے، اُنہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں تم سے کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! اے ابوالقاسم! اور اگر ہم نے جھوٹ بولا تو آپ ہمارے جھوٹ کو جان لیں گے، جیسے آپ نے ہمارے باپ کے متعلق جھوٹ کو جان لیا تھا، پس آپ نے اُن سے پوچھا: اہلِ دوزخ میں سے کون ہے؟، اُنہوں نے کہا: ہم تھوڑا عرصہ دوزخ میں رہیں گے، پھر آپ لوگ ہمارے خلیفہ ہو کر دوزخ میں جائیں گے، تب نبی ﷺ نے فرمایا: تم دوزخ میں ذلت کے ساتھ رہنا، اللہ کی قسم! ہم کبھی بھی تمہارے خلیفہ ہو کر دوزخ میں نہیں جائیں گے، آپ نے پھر فرمایا: اگر میں تم سے کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو تم اس کے متعلق سچ سچ بتاؤ گے؟، پس انہوں نے کہا: ہاں! اے ابوالقاسم! آپ نے پوچھا: کیا تم نے اس بکری میں زہر ڈالا تھا، اُنہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو اس چیز پر کس چیز نے برانگیختہ کیا، اُنہوں نے کہا: ہمارا ارادہ یہ تھا کہ اگر آپ جھوٹے (نبی) ہیں تو ہم کو راحت مل جائے گی اور اگر آپ درحقیقت نبی ہیں تو یہ گوشت آپ کو ضرر نہیں دے گا، (صحیح بخاری: 3169)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

''قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللهُ عَنهَا: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَقُولُ فِی مَرَضِهِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ، یَا عَائِشَةُ! مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِیْ أَکَلْتُ بِخَیْبَرَ، فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِی مِنْ ذٰلِكَ السَّمِّ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ جس مرض میں فوت ہوئے، اس میں آپ نے فرمایا: اے عائشہ! میں ہمیشہ اس کھانے کے درد کو محسوس کرتا رہا ہوں، جو میں

نے خیبر میں کھایا تھا اور اب وہ وقت ہے کہ اس زہر کے اثر سے میرے دل کی رگ کٹ گئی ہے"، (صحیح بخاری:4428)"۔

اس پر علماء نے بحث کی ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفاتِ مبارکہ طبعی طور پر ہوئی یا آپ نے شہادت پائی۔ احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بظاہر تو یہی کہنا مناسب ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے طبعی طور پر وصال فرمایا اور اس کے قرائن وشواہد بھی موجود ہیں، لیکن بعض علماء نے اسبابِ وفات میں اس زہر کے اثر کا بھی ذکر کیا ہے، جو ایک یہودیہ نے بکری کے گوشت میں ملائی تھی اور وہ آہستہ آہستہ آپ کے وجودِ مبارک میں اثر کرتی رہی، چنانچہ:

(1) علامہ زرقانی مالکی لکھتے ہیں:

''وَقَدْ كَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَغَيْرُهٗ يَرَوْنَ أَنَّهٗ مَاتَ شَهِيْدًا مِنَ السُّمِّ الَّذِیْ تَنَاوَلَهٗ بِخَيْبَرَ، وَمِنَ الْمُعْجِزَةِ أَنَّهٗ لَمْ يُؤَثِّرْ فِيْهِ فِیْ وَقْتِهٖ لِأَنَّهُمْ قَالُوْا: إِنْ كَانَ نَبِيًّا لَمْ يَضُرَّهٗ وَإِنْ كَانَ مَلَكًا اِسْتَرَحْنَا مِنْهُ، فَلَمَّا لَمْ يُؤَثِّرْ فِيْهِ تَيَقَّنُوْا نُبُوَّتَهٗ حَتّٰى قِيْلَ: إِنَّ الْيَهُوْدِيَّةَ أَسْلَمَتْ ثُمَّ نَقَضَ عَلَيْهِ بَعْدَ ثَلَاثِ سِنِيْنَ لِإِكْرَامِهٖ بِالشَّهَادَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم یہ رائے رکھتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اُس زہر کے اثر سے شہید ہوئے ہیں جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے خیبر میں کھایا تھا اور یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا معجزہ تھا کہ وہ زہر اُس وقت آپ پر اثر انداز نہیں ہوا، کیونکہ یہود نے کہا تھا: ''اگر یہ نبی ہیں تو انہیں یہ زہر نقصان نہیں پہنچائے گا اور اگر (العیاذ باللہ!) یہ بادشاہ ہیں (اور ان کی یہ تگ ودو حکومت حاصل کرنے کے لیے ہے) تو ہمیں ان سے نجات مل جائے گی''، پس جب اُس زہر نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمِ اطہر پر اثر نہ کیا، تو اُنہیں آپ کے نبی ہونے کا یقین ہوگیا، حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ وہ یہودیہ اسلام لے آئی (جس نے آپ کو زہر دیا تھا)، پھر اُس زہر کا اثر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم پر تین سال بعد ظاہر ہوا تاکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم شہادت کے اعزاز سے مشرف ہوجائیں، (شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، ج:12،ص:94)''۔

(2) علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

''وَلَمَّا احْتَجَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ فِي الْكَاهِلِ، وَهُوَ أَقْرَبُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي يُمْكِنُ فِيهَا الْحِجَامَةُ إِلَى الْقَلْبِ، فَخَرَجَتِ الْمَادَّةُ السُّمِّيَّةُ مَعَ الدَّمِ لَا خُرُوجًا كُلِّيًا، بَلْ بَقِيَ أَثَرُهَا مَعَ ضَعْفِهِ، لِمَا يُرِيدُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مِنْ تَكْمِيلِ مَرَاتِبِ الْفَضْلِ كُلِّهَا لَهُ، فَلَمَّا أَرَادَ اللّٰهُ إِكْرَامَهُ بِالشَّهَادَةِ، ظَهَرَ تَأْثِيرُ ذٰلِكَ الْأَثَرِ الْكَامِنِ مِنَ السُّمِّ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا، وَظَهَرَ سِرُّ قَوْلِهِ تَعَالٰى لِأَعْدَائِهِ مِنَ الْيَهُودِ: ''أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ''، فَجَاءَ بِلَفْظِ كَذَّبْتُمْ بِالْمَاضِي الَّذِي قَدْ وَقَعَ مِنْهُ وَتَحَقَّقَ، وَجَاءَ بِلَفْظِ تَقْتُلُونَ بِالْمُسْتَقْبَلِ الَّذِي يَتَوَقَّعُونَهُ وَيَنْتَظِرُونَهُ''۔

ترجمہ: ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فصد لگوانا چاہی تو دونوں مونڈھوں کے درمیان لگوائی، جو فصد لگانے کے لیے ممکنہ طور پر دل کے سب سے قریب جگہ ہے۔ سو اِس کے ذریعے وہ زہریلا مادہ خون کے ساتھ نکل تو آیا، مگر پورا نہ نکل سکا، بلکہ اس کا معمولی سا اثر باقی رہا، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے فضیلت کے تمام مراتب کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو شہادت کے اعزاز سے مکرّم فرمانا چاہا، تو اُس پوشیدہ زہر کا اثر ظاہر ہوگیا تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس امر کا ارادہ فرمایا تھا، وہ ہوکر رہے۔ اور آپ کے دشمن یہود کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک کا راز بھی ظاہر ہوگیا: (ترجمہ): ''تو کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول وہ (پیغامِ حق) لے کر آئے جو تمہارے مَن پسند نہیں تھا، تو تم تکبر کرتے رہے، پس ایک گروہِ انبیاء کی تم نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو تم نے قتل کیا، (البقرۃ:87)''۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں لفظِ ''کَذَّبْتُمْ'' ماضی کے صیغے کے ساتھ ارشاد فرمایا، کیونکہ نبیوں کے جھٹلانے کا ارتکاب اُن سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور یہ ثابت تھا اور لفظِ ''تَقْتُلُوْنَ'' کو مستقبل کے صیغے کے ساتھ اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ اس بات کے وقوع پذیر ہونے کے منتظر تھے، (زاد المعاد، ج:، ص:113)''۔

علامہ ابن قیم ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''قَالَ الزُّهْرِيُّ: فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ شَهِيدًا''۔

ترجمہ: ''امام زُہری نے فرمایا: پس رسول اللہ ﷺ کو شہادت کے طور پر وفات دی گئی، (زادالمعاد، ج:3،ص:299)''۔

لیکن یہ سب ظنّی روایات ہیں، ان کا فضائل کے طور پر بیان کرنا درست اور بجا ہے، لیکن عقیدے کے طور پر بایں معنی بیان کرنا کہ ان کے منکر کو ملامت کی جائے اور اس پر طعن کیا جائے، اصولِ شرع کی روشنی میں درست نہیں ہے، پس ہم نے جو لکھا ہے کہ شہادتِ معنوی متحقق ہے، وہ اسی معنی میں ہے۔

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ''، ترجمہ: ''اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا، (المائدۃ:67)''۔ سو جب اس یہودی عورت کے زہر آلود گوشت کھلانے کی وجہ سے آپ فوت ہوگئے تو اللہ نے آپ کو نہ بچایا اور اس آیت کے خلاف ہوگیا، میں کہتا ہوں: اس آیت کے خلاف تب ہوتا جب آپ اس طعام کے کھانے کی وجہ سے فوت ہوجاتے یا حضرتِ بشر بن المعرور کی طرح اس مرض میں مسلسل مبتلا رہ کر فوت ہوجاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ نے فی الفور اس زہر کے اثر سے آپ کو بچالیا اور اخیر عمر میں خلافِ عادت اس زہر کے اثر سے آپ پر وفات طاری کردی تاکہ آپ میں شہادت کی موت مُتحقق ہو اور شہید ہونا آپ کی اُمّت کے لیے سُنّت ہوجائے۔ آپ ﷺ نے بے توجہی میں ایک لقمہ کھایا، پھر اللہ تعالیٰ نے فوراً آپ کو اس طرف متوجہ کردیا کہ اس گوشت میں زہر ملا ہوا ہے اور اس بے توجہی میں یہ حکمت تھی کہ زہر آپ کے جسم میں پہنچے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کا فوری اثر روک دے اور وفات کے وقت اس کا اثر ظاہر ہو اور آپ میں معنوی شہادت پائی جائے اور شہادت کے لیے بھی آپ کی زندگی میں اُسوہ اور نمونہ ہو، (نعمۃ الباری شرح صحیح بخاری، جلد 7، ص:623)''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِینَ لَا تَطِیبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ یَتَخَلَّفُوا عَنِّی، وَلَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَیْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِیَّةٍ تَغْزُو فِی سَبِیلِ اللهِ، وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ أَنِّی أُقْتَلُ فِی سَبِیلِ اللهِ، ثُمَّ أُحْیَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْیَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْیَا، ثُمَّ أُقْتَلُ''۔

ترجمہ:''اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، اگر ایسا نہ ہوتا کہ مسلمان مردوں کے دل اس سے آزردہ ہوتے کہ میں ان کو چھوڑ کر جہاد کے لیے چلا جاؤں اور مجھے اتنی سواریاں میسر نہیں کہ میں اُن (سب) کو (اپنے ساتھ جہاد پر لے جانے کے لیے) سوار کروں، تو میں کسی جہاد پر جانے والے لشکر کے ساتھ جانے سے پیچھے نہ رہتا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، میری ضرور یہ تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، (صحیح البخاری:2797)''۔

حضور کا شہادت کی تمنا کرنے کا سبب شہادت کو فضیلت عطا کرنا اور مسلمانوں کو شہادت پر آمادہ کرنا ہے اور خود بھی آپ کے اندر جذبۂ شہادت موجود تھا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شہادت کا منصب نبوت کے منصب سے بڑا ہے، اس میں یہ ترغیب ہے کہ کوئی بڑے منصب والا اپنے منصب سے کم تر درجے کی تمنا بھی کرسکتا ہے، البتہ جو شہادت آپ کی ذات سے متصف ہوجائے، وہ یقیناً بہت بڑی ہے۔ بعض اوقات نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کو شوق دلانے اور خیر کی ترغیب دینے کے لیے اس طرح کے کلمات ارشاد فرماتے تھے:

امام محمد بن یوسف صالحی شامی مسجد نبوی کی تعمیر کا منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا عَنْ أَبِیهِ، قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَمَعَهُ حَجَرٌ، فَلَقِیَهُ أُسَیْدُ بْنُ حُضَیْرٍ، فَقَالَ: یَا رَسُولَ اللهِ! أَعْطِنِیهِ، فَقَالَ: اِذْهَبْ فَاحْتَمِلْ غَیْرَهُ فَإِنَّكَ لَسْتَ بِأَفْقَرَ إِلَى اللهِ مِنِّی''۔

''حضرت اسامہ بن زید اپنے والد حضرت زید بن حارثہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

نبی کریم ﷺ نکلے اور آپ ایک پتھر اٹھائے ہوئے تھے، حضرت اُسید بن حُضیر آپ سے ملے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ پتھر مجھے دے دیجیے (یعنی اسے میں اٹھاتا ہوں)، آپ ﷺ نے فرمایا: تم جاؤ اور دوسرا پتھر اٹھالاؤ، تم مجھ سے زیادہ اللہ (کی رضا) کے محتاج نہیں ہو، (سبل الھدیٰ والرشاد، ج:3،ص:337)''۔کوئی یہ نہ کہے کہ مسجد کی تعمیر کے لیے پتھر اٹھانا نبوت کے منصب سے بڑا ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس پر اصرار کیا۔ البتہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو خیر کے کاموں میں رغبت دلانے کے لیے اور جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے ارشادات فرماتے تھے اور قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے:

''اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ﴿۲۴﴾ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾''۔

ترجمہ:'' بے شک نیکوکار ضرور (جنت کی) نعمتوں میں ہوں گے، (عزت والی) مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے، آپ ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی پہچان لیں گے، ان کو مُہر بند شرابِ (طہور) پلائی جائے گی، اس کی مُہر مشک ہے اور باہم مقابلہ کرنے والوں کو ایسے (مقامات کے حصول کے لیے) مقابلہ کرنا چاہیے، (المطففین:26۔22)''۔

دعا اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے

سوال:

کیا اللہ کے علاوہ کسی سے دعا مانگی جا سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ سے یا کسی نبی سے یا ولی سے، کیا یہ شرک نہیں ہے، کیونکہ دعا عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے، (ڈاکٹر شفیق احمد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(1) ''وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ''۔

ترجمہ: ''اور (اے رسول!) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو (آپ فرمادیں کہ) بے شک میں ان کے قریب ہوں، دعا کرنے والا جب دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، پس انہیں چاہیے کہ وہ مجھ سے دعا کریں، (البقرۃ:186)''۔

(2) ''اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ''۔

ترجمہ: ''بھلا کون ہے جو پریشان حال کی دعا کو قبول کرتا ہے اور اس سے تکلیف کو دور فرمادیتا ہے، (النمل:62)''۔

دعا عبادت کی روح ہے اور حدیثِ پاک میں دعا کو عینِ عبادت قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۱) ''اَلدُّعَاءُ هُوَالْعِبَادَةُ''، ترجمہ: ''دعا (عین) عبادت ہے، (سنن ترمذی:2969)''۔ ایک اور حدیث میں دعا کو عبادت کا مغز یعنی جوہر قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(2) ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ''۔ ترجمہ: ''دعا عبادت کا مغز ہے، (سُنن ترمذی:3371)''۔

ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کے حضور بندوں کے اعمال میں سے دعا کو سب سے زیادہ تکریم کا حق دار قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

(3) ''لَیْسَ شَیْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللهِ تَعَالٰى مِنَ الدُّعَاءِ''، ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ مکرم کوئی شے نہیں ہے، (سُنن ترمذی:3370)''۔

مندرجہ ذیل حدیث مبارک سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا مانگنے والوں کی قبولیت کو اپنے ذمۂ کرم پر لیا ہے:

''عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ إِلَى الصَّلَاةِ، فَقَالَ: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِينَ عَلَيْكَ، وَأَسْأَلُكَ بِحَقِّ مَمْشَايَ

هٰذَا، فَإِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشَرًا، وَلَا بَطَرًا، وَلَا رِيَاءً، وَلَا سُمْعَةً، وَخَرَجْتُ اتِّقَاءَ سُخْطِكَ، وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ، فَأَسْأَلُكَ أَنْ تُعِيذَنِي مِنَ النَّارِ، وَأَنْ تَغْفِرَ لِي ذُنُوبِي، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، أَقْبَلَ اللهُ عَلَيْهِ بِوَجْهِهِ، وَاسْتَغْفَرَ لَهُ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو اپنے گھر سے یہ دعا مانگتے ہوئے نماز کے لیے نکلا: اے اللہ! تیرے سائلین کا تیرے ذمۂ کرم پر جو حق ہے، میں اس کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، میں (تیری عبادت کے لیے) اپنے چلنے کے حق کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، میں اِتراتے ہوئے، اکڑتے ہوئے اور نمود وشہرت کے لیے نہیں نکلا۔ میں تیری ناراضی سے بچتے ہوئے اور تیری رضا کو چاہتے ہوئے نکلا ہوں، سو میں تیری ذاتِ کریمی سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے جہنم سے پناہ عطا فرما، میرے گناہوں کو معاف فرما، کیونکہ تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو بخش دے، تو اللہ تعالیٰ اس کی جانب اپنے کرم کے ساتھ توجہ فرمائے گا اور اس کے لیے ستّر ہزار فرشتے دعائے مغفرت کریں گے، (سنن ابن ماجہ:778)''۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ''۔

ترجمہ: ''اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا کو قبول فرماؤں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے، (المؤمن:60)''۔

اس آیت کی تفسیر میں صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی لکھتے ہیں:

'' آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ دعا سے مراد عبادت ہے اور قرآنِ کریم میں دعا بہ معنی عبادت بہت جگہ وارد ہے اور حدیث شریف میں ہے: دعا ہی عبادت ہے، (خزائن العرفان)''۔

بندوں کا دعا مانگنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور دعا سے بے نیاز ہونا غضبِ الٰہی کا باعث

أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ، إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هَذِهِ لِتُقْضَى لِي، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ''۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک نابینا شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: (یارسول اللہ!) آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کردے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں دعا کردیتا ہوں اور اگر تم چاہو تو اس (مصیبت) پر صبر کرو، تو یہ (آخرت میں) تمہارے لیے بہتر ہوگا، اس نے عرض کیا: آپ دعا فرمادیجیے!، راوی بیان کرتے ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں فرمایا: تم اچھی طرح سے وضو کرکے دو رکعت نفل پڑھو اور (پھر) یہ دعا مانگو: (اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:) ''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور نبیِ رحمت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وسیلہ سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، (یارسول اللہ!) میں آپ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو، اے اللہ! تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو میرے لیے شفاعت کرنے والا بنادے، (سنن ترمذی: 3578)''۔

(2) ''عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: خَرَجَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ يَمْشُونَ فَأَصَابَهُمُ الْمَطَرُ، فَدَخَلُوا فِي غَارٍ فِي جَبَلٍ، فَانْحَطَّتْ عَلَيْهِمْ صَخْرَةٌ، قَالَ: فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: اُدْعُوا اللهَ بِأَفْضَلِ عَمَلٍ عَمِلْتُمُوهُ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي كَانَ لِي أَبَوَانِ شَيْخَانِ كَبِيرَانِ، فَكُنْتُ أَخْرُجُ فَأَرْعَى، ثُمَّ أَجِيءُ، فَأَحْلُبُ، فَأَجِيءُ بِالْحِلَابِ، فَآتِي بِهِ أَبَوَيَّ فَيَشْرَبَانِ، ثُمَّ أَسْقِي الصِّبْيَةَ وَأَهْلِي وَامْرَأَتِي، فَاحْتَبَسْتُ لَيْلَةً، فَجِئْتُ فَإِذَا هُمَا نَائِمَانِ، قَالَ: فَكَرِهْتُ أَنْ أُوقِظَهُمَا وَالصِّبْيَةُ يَتَضَاغَوْنَ عِنْدَ رِجْلَيَّ، فَلَمْ يَزَلْ ذٰلِكَ دَأْبِي وَدَأْبَهُمَا حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ، فَافْرُجْ عَنَّا فُرْجَةً نَرَى مِنْهَا السَّمَاءَ، قَالَ: فَفُرِجَ عَنْهُمْ، وَقَالَ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي كُنْتُ أُحِبُّ امْرَأَةً مِنْ بَنَاتِ عَمِّي كَأَشَدِّ مَا يُحِبُّ الرَّجُلُ النِّسَاءَ، فَقَالَتْ: لَا تَنَالُ ذٰلِكَ مِنْهَا حَتَّى تُعْطِيَهَا مِائَةَ دِينَارٍ، فَسَعَيْتُ فِيهَا حَتَّى

جَمَعْتُهَا، فَلَمَّا قَعَدْتُ بَيْنَ رِجْلَيْهَا قَالَتْ: اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَفُضَّ الْخَاتَمَ إِلَّا بِحَقِّهٖ، فَقُمْتُ وَتَرَكْتُهَا، فَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ عَنَّا فُرْجَةً، قَالَ: فَفَرَجَ عَنْهُمُ الثُّلُثَيْنِ، وَقَالَ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي اسْتَأْجَرْتُ أَجِيْرًا بِفَرَقٍ مِنْ ذُرَةٍ فَأَعْطَيْتُهٗ، وَأَبٰى ذَاكَ أَنْ يَأْخُذَ، فَعَمَدْتُ إِلٰى ذٰلِكَ الْفَرَقِ فَزَرَعْتُهٗ حَتّٰى اشْتَرَيْتُ مِنْهُ بَقَرًا وَرَاعِيْهَا، ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ: يَا عَبْدَ اللّٰهِ أَعْطِنِي حَقِّي، فَقُلْتُ: انْطَلِقْ إِلٰى تِلْكَ الْبَقَرِ وَرَاعِيْهَا، فَإِنَّهَا لَكَ، فَقَالَ: أَتَسْتَهْزِئُ بِي؟، قَالَ: فَقُلْتُ مَا أَسْتَهْزِئُ بِكَ وَلٰكِنَّهَا لَكَ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ، فَافْرُجْ عَنَّا، فَكُشِفَ عَنْهُمْ"۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ نے فرمایا: تین شخص سفر پر نکلے، (اس دوران) ان پر بارش ہونے لگی، وہ (بارش سے بچنے کے لیے) ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوگئے، اچانک ایک چٹان اُن کے اوپر آگری (جس نے غار کا منہ بند کردیا)، راوی بیان کرتے ہیں: انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: تم نے جو بہترین نیک عمل کیا ہو، اس کے وسیلے سے اللہ سے دعا مانگو، پس اُن میں سے ایک نے کہا: اے اللہ! میرے بوڑھے ماں باپ تھے، میں بکریاں چرانے کے لیے باہر جاتا تھا، پھر میں (بکریوں کا) دودھ دوہتا اور برتن میں ڈال کر ماں باپ کے پاس لاتا تو وہ پیتے، پھر میں بچوں، اپنے گھر والوں اور بیوی کو پلاتا، پس ایک رات میں (کہیں) رک گیا، سو جب میں (دودھ لے کر) آیا تو وہ دونوں سوچکے تھے، وہ کہتا ہے: میں نے انہیں (نیند سے) جگانا پسند نہ کیا اور بچے میرے پیروں کے پاس (دودھ کے لیے) چلّا رہے تھے، پس میں اور میرے ماں باپ اسی حال میں رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی، (اس نے کہا:) اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام (صرف) تیری رضا کے لیے کیا تھا، تو اس غار کے دھانے کو ہم پر کھول دے کہ ہم آسمان دیکھ سکیں، راوی بیان کرتے ہیں: پس اُن کے لیے غار کا منہ کشادہ کردیا گیا۔ اور دوسرے نے کہا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں اپنی ایک چچازاد بیٹی سے شدید ترین محبت کرتا تھا، جو کوئی مرد کسی عورت سے کرتا ہے،

اُس نے کہا: جب تک تم مجھے سو دینار نہ دو، تم اپنی مراد کو نہیں پا سکتے، سو میں کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے وہ دینار جمع کر لیے، پس جب میں اُس کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو اس نے کہا: اللہ سے ڈرو اور جائز طریقے کے بغیر میری بکارت کو زائل نہ کرو، پس میں اُسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا، (اے اللہ!) تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام (صرف) تیری رضا کے لیے کیا تھا، تو اس غار کے دھانے کو ہم پر کھول دے، راوی بیان کرتے ہیں: پس غار کا دو تہائی منہ کھل گیا۔ اور دوسرے نے کہا: اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے ایک فَرَق (۱۲ کلو گرام کے مساوی پیمانہ) جوار کے عوض ایک مزدور اجرت پر رکھا، پس جب میں نے اس کو اجرت دی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا، پھر میں نے اس غلّے کو زمین میں کاشت کیا اور اس کی (پیداوار) سے میں نے ایک گائے اور چرواہا خریدا، پھر (کافی عرصے بعد) وہ مزدور (اپنی مزدوری لینے) آیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! میرا حق مجھے دے دو، میں نے کہا: ان گایوں اور ان کے چرواہے کو جا کر لے لو، یہ تمہارے ہیں، اس نے کہا: آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟، میں نے کہا: میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا، بلکہ یہ سب مال تمہارا ہے، (تو اس نے کہا:) اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام (صرف) تیری رضا کے لیے کیا تھا، تو اس غار کے دھانے کو ہمارے لیے کھول دے، چنانچہ غار کا دھانا (اللہ کی قدرت سے) کھول دیا گیا (اور وہ صحیح سلامت باہر نکل آئے)، (صحیح البخاری: 2215)"۔

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ہمارے زمانے میں بعض جہلاء اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی بجائے اپنی حاجتوں کا سوال پیروں، فقیروں سے کرتے ہیں اور قبروں اور آستانوں پر جا کر اپنی حاجات صاحبِ مزار پر پیش کرتے ہیں اور اولیاء اللہ کی نذر مانتے ہیں، حالانکہ ہر چیز کی دعا اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے اور اسی کی نذر ماننی چاہیے، کیونکہ دعا اور نذر دونوں عبادات ہیں اور غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں ہے، البتہ اس حدیث مبارک کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمہم اللہ علیہم کا

وسیلہ پیش کرنا چاہیے، (تبیان القرآن، جلد 1، ص: 725، بتصرف)''۔

جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے مدد مانگی جائے، تو عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت سے مدد کے اہل ہیں، بشرطیکہ ان کو اذنِ الٰہی کے تابع سمجھ کر مدد مانگی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى''۔

ترجمہ: ''اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، (المائدۃ: 2)''۔

(2) ''هُوَ الَّذِىْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ''۔

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں کی جماعت سے آپ کی تائید فرمائی، (الانفال: 62)''۔

(3) ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ''۔

ترجمہ: ''اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور آپ کے پیروکار مومنین، (الانفال: 64)''۔

(4) ''وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا''۔

ترجمہ: ''اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی کارساز بنادے اور کسی کو اپنے پاس سے ہمارا مددگار بنادے، (النساء: 75)''۔

(5) ''فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ''۔

ترجمہ: ''تو بے شک اللہ نبی کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد سب فرشتے بھی (ان کے) مددگار ہیں، (التحریم: 4)''۔

(6) ''قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ''۔

ترجمہ: ''(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا: اللہ کی طرف میرے کون مددگار ہیں، حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے (راستے میں) مددگار ہیں، (آل عمران: 52)''۔

(7) ''وَاجْعَلْ لِّىْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِىْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِى ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِىْ''۔

ترجمہ: ''اور میرے لیے میرے اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو ایک وزیر بنادے،

اس سے میری کمر مضبوط کردے، (طٰہٰ: 31-29)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے ذریعے بھی نصرت فرماتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ نصرت سے محروم رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(1) ''وَالظّٰلِمُوْنَ مَالَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ''۔

ترجمہ: اور ظالموں کا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار، (الشوریٰ: 8)''۔

(2) ''وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا''۔

ترجمہ: ''اور جس کو وہ گمراہ کردے، تو اس کے لیے کوئی مددگار ہدایت دینے والا نہیں پائے گا، (الکہف: 17)''۔

(3) ''فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ اس کو ہدایت نہیں دیتا، جس کو وہ گمراہ کردے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے، (النحل: 37)''۔

(4) ''وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا''۔

ترجمہ: ''اور جس پر اللہ لعنت کرے (تو اے مخاطب!) تو ہرگز اس کا کوئی مددگار نہ پائے گا، (النساء: 52)''۔

دخولِ جنت کے لیے اسلام شرط ہے

سوال:

جمعۃ المبارک کے دن دورانِ تقریر امام صاحب نے کہا: ''یہودی تو ویسے ہی جہنمی ہیں''، سوال یہ ہے کہ کیا کسی غیر مسلم یہودی یا عیسائی کو جہنمی کہنا درست ہے اور جو غیر مسلم اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، مگر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے، کیا وہ جنت میں جا سکتے ہیں؟، (عثمان حیدر صدیقی)۔

جواب:

نفسِ مسئلہ سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ عنداللہ اسلام ہی اصل دین ہے اور

اتباعِ رسول ﷺ ہی ہدایت کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک (پسندیدہ) دین (صرف) اسلام ہے اور اہلِ کتاب نے جاننے کے باوجود صرف آپس کے عناد کے سبب (دین میں) اختلاف کیا، اور جو اللہ کی آیات کا انکار کرے، تو یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے، پھر (اے رسول!) اگر وہ آپ سے جھگڑیں تو کہہ دیجیے! میں نے اور میرے پیروکاروں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور آپ اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے کہیے: کیا تم اسلام لے آئے؟، پھر اگر وہ اسلام لے آئے ہیں تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے، (آل عمران: 20-19)''۔ قرآن مجید میں 45 مقامات پر ایمان اور اعمالِ صالحہ کو یک جا بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت صراحت کے ساتھ وحدتِ ادیان کے نظریے کو بھی رد کرتے ہوئے فرمایا:

(الف): ''قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝''۔

ترجمہ: ''آپ کہیے: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس (کلام) پر جو ہم پر اتارا گیا اور اُس پر (بھی) جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد (میں انبیاء) پر نازل کیا گیا اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دیگر) نبیوں پر اُن کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا، (آپ کہیے:) ہم (ایمان لانے میں) اُن رسولوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی امتیاز نہیں برتتے اور ہم اُسی کے اطاعت گزار ہیں اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے

گا،تو (یہ) اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا، (آل عمران:85)''۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کے بنیادی عقائد بیان کرتے ہوئے ایمان بالرُسُل کے لیے لازم قرار دیا کہ رسولوں پر ایمان لانے میں کوئی تفریق نہ کی جائے، فرمایا:

(ب): ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ''۔

ترجمہ: ''رسولِ (اکرم) ایمان لائے اُس کلام پر جو اُن کے رب کی جانب سے اُن پہ نازل کیا گیا اور مومن بھی ایمان لائے، سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی (نازل کردہ) کتابوں پر اور اُس کے (تمام) رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں (ایمان لانے میں) کوئی امتیاز نہیں برتتے، (البقرۃ:285)''۔

(ج): قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک رسول کی تکذیب کو سب رسولوں کی تکذیب قرار دیا ہے، فرمایا:

(1) ''کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِیْنَ'' ترجمہ: ''نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، (الشعراء:105)''۔

(2) ''کَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِیْنَ'' ترجمہ: ''قومِ عاد نے رسولوں کو جھٹلایا، (الشعراء:123)''۔

(3) ''کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ'' ترجمہ: ''قومِ ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا، (الشعراء:143)''۔

(4) ''کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِیْنَ'' ترجمہ: ''قومِ لوط نے رسولوں کو جھٹلایا''۔ (الشعراء:160)

سب کو معلوم ہے کہ قومِ نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کو، قومِ عاد نے حضرت ہود علیہ السلام کو، قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کو اور قومِ لوط نے حضرت لوط علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، مگر ان چاروں آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ ایک رسول کی تکذیب سب رسولوں کی تکذیب کو لازم ہے، حالانکہ اِن اقوام کے ادوار میں ابھی سارے رسول نہیں آئے تھے، یہ اس لیے کہ رسالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک موہوبہ منصب ہے اور تمام انبیائے کرام ورُسُلِ عظام علیہم السلام پر وحی کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ،

یہ ایسا ہی ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کا انکار پورے قرآن کے انکار کو مستلزم ہے۔

آپ نے سوال میں لکھا ہے: ''جو غیر مسلم اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، مگر نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے، کیا وہ جنت میں جا سکتے ہیں؟''۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ دخولِ جنت کے لیے اسلام شرط ہے اور اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کو اللہ تعالیٰ نے کفار کی صف میں شامل فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(الف): ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ''۔

ترجمہ: ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، جو کہ اہلِ کتاب اور مشرکین ہیں، (وہ) جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ بدترین مخلوق ہیں، (البینۃ: 6)''۔

اس سے اُن لوگوں کے نظریے کا بھی رد ہو گیا، جنہوں نے کہا: ''عالمی سطح پر لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک مومن (ان میں مسلمان اور اہلِ کتاب شامل ہیں) اور دوسرے کفار ومشرکین''، قرآنِ کریم نے ایک سے زائد مقامات پر اہلِ کتاب کو کفار کے زُمرے میں شامل کیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی اہلِ ایمان کے زمرے میں شامل نہیں کیا، یہاں اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں، جنہوں نے خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا اور آپ پر ایمان نہ لائے، یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ دونوں کی نبوت کا انکار کیا اور نصاریٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا''۔

ترجمہ: ''بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور (ایمان لانے میں) اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ ایمان و کفر کے درمیان ایک راستہ نکالنا چاہتے ہیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کُن عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ایمان لانے میں اُن رسولوں کے درمیان کسی ایک کے بارے میں کوئی امتیاز نہیں برتا، (یہ) وہ لوگ ہیں کہ عنقریب انہیں ان کا اجر عطا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، (النساء:152_150)''۔

اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنے والوں اور حق سے رُوگردانی کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(1) ''اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ۫ وَمَا لَھُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ''۔

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں، جن کے اَعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور اُن کا کوئی مددگار نہیں ہے، (آل عمران:22)''۔

نیک اعمال کا ضائع ہو جانا اور کفار کا جہنمی ہونا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہے:

(2) ''وَلَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ حَتّٰی یَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِکُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ وَمَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ۚ وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ''۔

ترجمہ: ''اور وہ (کافر) تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر اُن کے بس میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر گیا اور وہ حالتِ کفر ہی میں مر گیا تو ان لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور وہ لوگ جہنمی ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، (البقرۃ:217)''۔

(3) ''قُلۡ ھَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا ؕ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُھُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَھُمۡ

يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝''۔

ترجمہ: ''آپ کہیے! کیا ہم تم کو یہ خبر دیں کہ سب سے زیادہ ناقص عمل کن لوگوں کے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی دنیا کی زندگی میں اکارت گئی اور وہ اس خوش فہمی میں رہے کہ وہ نیک کام کررہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا، سوان کے اعمال ضائع ہوگئے اور ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، (الکہف:105-103)''۔ یعنی جب اُن کا انجام پہلے سے طے شدہ ہے تو ان کے لیے میزان قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''ثُمَّ قَالَ تَعَالٰى: فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا، وَفِيْهِ وُجُوْهٌ: الْاَوَّلُ: اَنَّا نَزْدَرِیْ بِهِمْ وَلَيْسَ لَهُمْ عِنْدَنَا وَزْنٌ وَمِقْدَارٌ، الثَّانِیْ: لَانُقِيْمُ لَهُمْ مِيْزَانًا لِاَنَّ الْمِيْزَانَ اِنَّمَا يُوْضَعُ لِاَهْلِ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ مِنَ الْمُوَحِّدِيْنَ لِتَمْيِيْزِ مِقْدَارِ الطَّاعَاتِ وَمِقْدَارِ السَّيِّئَاتِ، الثَّالِثُ: قَالَ الْقَاضِیْ: اِنَّ مَنْ غَلَبَتْ مَعَاصِيْهِ صَارَ مَا فِیْ فِعْلِهٖ مِنَ الطَّاعَةِ كَاَنْ لَمْ يَكُنْ، فَلَا يَدْخُلُ فِی الْوَزْنِ شَیْءٌ مِنْ طَاعَتِهٖ۔

ترجمہ: ''اس آیت کی تفسیر کئی طریقوں سے کی گئی ہے:

(1) یہ کہ ہم انہیں حقیر جانیں گے اور اُن کے اعمال کی ہمارے ہاں کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

(2) ہم اُن کے لیے میزان نہیں قائم کریں گے، کیونکہ میزان تو اہلِ توحید میں سے حاملینِ حسنات وسیئات کے لیے قائم ہوگی تاکہ اُن کی نیکیوں اور برائیوں کی مقدار ظاہر ہو۔

(3) قاضی بیضاوی نے کہا: جن کے گناہ غالب آجائیں، تو اُن کے معمولی نیک اعمال کالعدم ہوجاتے ہیں تو اُن کی طاعات نتیجے کے اعتبار سے بے وزن ہوجاتی ہیں، (تفسیر کبیر، سورۃ الکہف، آیت:105)''۔

ابوحیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''اُن کے نیک اعمال سرے سے ہیں ہی نہیں کہ اُن کا وزن کیا جائے، وہ تو سیدھے جہنم میں جائیں گے''، (البحر المحیط، سورۃ الکہف، آیت:105)''۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے اور ان کے اعمال عذاب کے مقابل ہوں گے، ان کی کوئی نیکی ہی نہیں ہوگی کہ جس کا قیامت کے دن میزانِ اعمال میں وزن کیا جائے اور جس کی کوئی نیکی نہ ہو تو وہ جہنمی ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: تہامہ پہاڑ کی طرح اعمال لائے جائیں گے لیکن اُن کا کوئی وزن نہیں ہوگا اور ایک قول یہ ہے کہ ''فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا''، اس سے مجاز اور استعارہ مراد ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ''آج کے دن ہمارے نزدیک ان کی کوئی قدر نہیں ہوگی، (تفسیر قرطبی، سورۃ الکہف، آیت:105)''۔

(4) ''مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝''۔

ترجمہ: ''جو (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہتے ہوں تو ہم اُن کے کل اعمال کا صلہ یہیں دے دیں گے اور یہاں ان کے صلے میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور انہوں نے دنیا میں جو کام کیے، وہ ضائع ہوگئے اور جو کچھ وہ کرتے تھے، وہ برباد ہے، (ھود:16-14)''۔

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ، وَلَا نَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ، إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اُس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، اس اُمت میں سے جو کوئی

بھی میری نبوت کی خبر سنے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، پھر وہ شخص اس حال میں مرے کہ وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان نہ لایا ہو، تو وہ شخص جہنمی ہی ہوگا، (صحیح مسلم:384)''۔

ان آیات واحادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ آخرت میں نجات اور دخولِ جنت کے لیے سابق انبیائے کرام پر ایمان لانے اور اُن کے اَدوار میں اُن کی شریعت کو حق جاننے کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید اور نبی آخرالزمان سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا لازمی شرط ہے۔ اگر یہود ونصاریٰ تورات وانجیل کی تعلیمات پر کامل ایمان لے آئیں اور کسی تحریف اور باطل تاویل کے بغیر مِن وعَن اِن کتابوں کو مانیں، تو ان میں نبیِ آخرالزمان ﷺ کی آمد کے بارے میں بشارتوں اور نشانیوں کو جاننے کے بعد یقیناً آپ ﷺ اور قرآنِ مجید پر بھی ایمان لے آئیں۔

اللہ تعالیٰ نے عالَمِ ارواح میں خاتم النّبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان اور آپ کی نصرت کا پیمان تمام انبیائے کرام سے لیا، حالانکہ دنیا میں آپ نے اُن سب کے بعد آنا تھا اور اسی کی بشارت یہ انبیائے کرام اپنے اپنے زمانے میں اپنی امتوں کو دیتے رہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

''وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ''۔

ترجمہ:''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، (میں) اپنے سے پہلی (نازل کردہ کتاب) تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اُس (عظیم) رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اُس کا نام احمد ہوگا، (الصف:6)''۔

امام نووی شافعی لکھتے ہیں:

''وَأَنَّ مَنْ لَمْ یُكَفِّرْ مَنْ دَانَ بِغَیْرِ الْإِسْلَامِ كَالنَّصَارٰی، أَوْ شَكَّ فِی تَكْفِیرِهِمْ، أَوْ صَحَّحَ مَذْهَبَهُمْ، فَهُوَ كَافِرٌ، وَإِنْ أَظْهَرَ مَعَ ذٰلِكَ الْإِسْلَامَ وَاعْتَقَدَهٗ''۔

ترجمہ: ''اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کے ماننے والے کو کافر قرار نہ دے، جیسا کہ نصاریٰ ہیں یا اُن کی تکفیر میں شک کرے یا اُن کے مذہب کو صحیح قرار دے، وہ کافر ہے، خواہ وہ اسلام کا اظہار بھی کرے اور اس کا اعتقاد بھی رکھے (حکم یہی رہے گا)، (روضۃ الطالبین، ج:10، ص:70)''۔

بعض اُمور حکمتِ دین کے تحت ترک کرنے اَولیٰ ہیں

سوال:

ہمارے علاقے کی ایک مسجد کے خطیب صاحب نے اپنے وعظ میں فرمایا: عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے موقع پر ہمیں کیک نہیں کاٹنا چاہیے، اس وجہ سے کہ اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہوتی ہے اور ہمیں ''اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلیٰ'' کے تحت تشبہ بالغیر سے بچتے ہوئے اس سے اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر موقع پر چاہے عاشورہ کا روزہ ہو، سر کی مانگ نکالنے کا مسئلہ ہو یا ٹوپی پر عمامہ پہننے کا، اہل کتاب کی مخالفت کا حکم دیا ہے، جبکہ دیگر بعض احباب نے اس پر شدید مخالفت کی اور اعتراض اٹھایا یہ خوشی کا طریقہ ہے اور خوشی کا ہر طریقہ جائز ہے، قرآن وحدیث میں کہیں کیک کاٹنے کا ناجائز نہیں لکھا، لہٰذا ہم کیک کاٹیں گے۔ آپ اس بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (انتظامیہ جامع مسجد فرزند علی، ملک پورہ فیصل آباد)۔

جواب:

ہم نے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے بدعات وخرافات کے رَد میں ایک فتویٰ جاری کیا تھا، جس کے آخر میں ہم نے کیک کاٹنے کی بابت لکھا ہے: ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پنجاب میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے موقع پر منوں کے حساب سے کیک کاٹے جاتے ہیں، اس طرح کی حرکات میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تقدیس کے منافی ہیں اور یہ اس لیے ہورہا ہے کہ مذہبی معاملات کو جاہل واعظین اور پیروں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور کچھ اہلِ ثروت اپنی تشہیر اور نام ونمود کے لیے یہ کام کرتے ہیں، اخبارات، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا پر

اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔علماء کی ذمہ داری ہے کہ دینی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں ،قوم کی رہنمائی کریں اور مذہبی عنوان سے اس طرح کی اضافات کا راستہ روکیں ۔ ہاں ! اگر کوئی ایصالِ ثواب کی نیت سے لوگوں کو کیک کھلانا یا تقسیم کرنا چاہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔دلیل کا یہ انداز قطعاً درست نہیں ہے کہ ہر سوال کے جواب میں کہا جائے : ''قرآن وحدیث میں کہیں کیک کاٹنے کو ناجائز نہیں لکھا ،لہٰذا ہم کیک کاٹیں گے''، کیا ہر پیش آنے والی بات کی تمام جزئیات کی تفصیل قرآن وحدیث میں لکھی ہوتی ہے اور جو بات قرآن میں ہو تو اُس کا انکار تو کفر ہوگا۔جس مسئلے کی جو فقہی حیثیت ہے، اُس کے مطابق اُس کے قبول یا رَد کرنے کے لیے اُس سطح کی دلیل دی جاتی ہے یا طلب کی جاتی ہے۔

کیک کاٹنے کی ممانعت کا حکم تَشَبُّہ بالغیر کے سبب نہیں بلکہ حُرمت وتقدیس کے سبب لگایا گیا ہے کہ میلاد النبی ﷺ کی مُقدّس محافل خرافات ولغویات کا شکار نہ ہوں۔یہ محافل ومجالس بابرکت ، روحانی اور نورانی رہیں،شور وشغب ،دھینگا مشتی اور لغویات سے آلودہ نہ ہوں۔کیک کاٹنا کسی قوم کا مذہبی شِعار نہیں ہے،جس سے مشابہت کا حکم لگے، ذیل میں تَشَبُّہ بالغیر کے بارے میں اَحکام بیان کیے جارہے ہیں،احادیث مبارکہ میں ہے:

(1)''خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ ''۔ترجمہ:''مشرکین کی مخالفت کرو،(صحیح بخاری:5892)''۔

(2)''خَالِفُوا الْمَجُوْسَ ''۔ترجمہ:''مجوسیوں کی مخالفت کرو،(صحیح مسلم:260)''۔

(3)''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ''ترجمہ:''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے،وہ ان ہی میں سے ہے،(سنن ابوداؤد:4028)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

''اِعْلَمْ اَنَّ التَّشْبِيْهَ بِاَهْلِ الْكِتَابِ لَايُكْرَهُ فِي كُلِّ شَيْءٍ فَاِنَّا نَاكُلُ وَنَشْرَبُ كَمَا يَفْعَلُوْنَ، اِنَّمَا الْحَرَامُ هُوَ التَّشْبِيْهُ فِيْمَا كَانَ مَذْمُوْمًا وَفِيْمَا يُقْصَدُ بِهِ التَّشْبِيْهُ كَذَا ذَكَرَهُ ''قَاضِيْخَان'' فِي ''شَرْحِ الْجَامِعِ الصَّغِيْر''فَعَلٰى هٰذَا لَوْلَمْ يَقْصُدِ التَّشَبُّهَ لَايُكْرَهُ

عِندَهُمَا''۔

ترجمہ:''جان لو کہ اہلِ کتاب کے ساتھ ہر چیز میں تَشَبُّہ مکروہ نہیں ہے، کیونکہ اُن کی طرح ہم بھی کھاتے پیتے ہیں، البتہ مذموم باتوں میں اور جن باتوں میں ان کی تشبیہ کا قصد کیا جائے، یہ حرام ہے۔امام قاضی خان نے''الجامع الصغیر'' میں اسی طرح ذکر کیا ہے، پس اگر مشابہت کا ارادہ نہ ہو تو صاحبین کے نزدیک کراہت نہیں ہے،(البحرالرائق،جلد 2،ص:18)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّهُ الْعَزِیْز نے فتاویٰ رضویہ جلد 24،ص:532-530 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے،ہم اس کا خلاصہ درج کررہے ہیں:

''تَشَبُّہ کی دو صورتیں ہیں: **ایک لزومی:** یہ کہ اس کا ارادہ تو ان کی مشابہت کا نہیں ہے،مگر جو وضع اختیار کی ہے، وہ کسی باطل مذہب کے حامل لوگوں کا شِعارِ خاص ہے،لہٰذا مشابہت کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

دوسری التزامی: یہ کہ کسی قوم کی وضع خاص کو قصداً اختیار کرے۔پھر اس کی تین صورتیں ہیں:

(الف): یہ کہ اس قوم کو محبوب جان کر اس کی خاص وضع اختیار کرنے کا قصد کرے،ایسی مشابہت اگر مبتدع کے ساتھ ہے،تو بدعت ہے۔اور معاذ اللہ کفار کے ساتھ ہو تو کفر ہے اور ایسی ہی مشابہت''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ''،''غمز عیون البصائر'' میں ہے: ''اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا اَنَّ مَنْ رَأى اَمرَالْكُفَّارِ حَسَنًا فَقَدْ كَفَرَ''، ترجمہ:''ہمارے مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس نے کافروں کے مذہبی شِعار کو اچھا سمجھا،اُس نے کفر کیا''۔

(ب): یہ کہ کسی پسندیدہ مقصد کے لیے مذہبِ غیر کے شِعار کو اختیار کرے،جیسے زمانۂ جنگ میں دشمنوں کی جاسوسی کے لیے ایسا کرے۔ایسی صورت میں اُس وضع خاص کی قباحت اور مطلوبہ مقصد کی ضرورت کا تقابلی جائزہ لیا جائے گا۔اگر مطلوبہ مقصد کی ضرورت اس وضع خاص کی قباحت پر غالب اور راجح ہے تو اجازت دی جائے گی،ورنہ نہیں۔جیسے جنگ کے دوران بعض مجاہدین نے دشمنوں کے بھیس میں کارروائی کی۔

''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے: ''لوشدّ الزنّار علیٰ وسطہٖ و دخل دار الحرب لتخلیص الاسارٰی لایکفر ولودخل لاجل التجارۃ یکفر ذکرہٗ القاضی الامام ابو جعفر الاستروشی''۔

ترجمہ: ''اگر زنار باندھ کر مسلمان قیدیوں کو رہا کرانے کے لیے دارالحرب میں گیا تو کفر نہیں ہوگا اور یہی وضع تجارتی مقاصد کے لیے اختیار کی تو کفر ہے، قاضی امام ابو جعفر الاستروشی نے اس کا ذکر کیا''۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے: ''جنگ دھوکا ہے''۔

(ج): جس شخص نے مذہب غیر کی جو وضع اختیار کی ہے، نہ تو اسے اچھا جانتا ہے، نہ کوئی شرعی ضرورت اس کی داعی ہے اور نہ کوئی دنیاوی نفع حاصل کرنا مقصود ہے، بلکہ محض مذاق کے طور پر ایسا کیا ہے، تو یہ حرام ہے، ممنوع ہے''۔ مزید لکھتے ہیں:

''مذہب غیر کی جس وضع خاص کو اختیار کیا گیا ہے، اُس زمان و مکان میں اس کا شِعار خاص ہونا مُتحقق ہو اور وہ مختلف مذاہب یا اقوام میں مشترک بھی نہ ہو ورنہ اس پر لزوم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ البتہ فی نفسہٖ وہ وضع یا شِعار اگر شرعاً مذموم ہے، تو ممنوع یا مکروہ ہوگا، لیکن تشبُّہ کے باعث نہیں، چنانچہ یہودیوں کے خاص لباس ''طیلسان'' کے بارے میں ابن قیم کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے کہا: طیلسان ایک زمانے میں یہودیوں کا مذہبی شِعار تھا، اب نہیں رہا، لہٰذا اب یہ مباح ہوگا، علامہ ابن عبدالسلام نے اسے ''بدعت مباحہ'' میں شمار کیا ہے''۔

علامہ علی القاری نے امام اعظم کی ''الفقہ الاکبر'' کی شرح میں لکھا ہے:

''اِنَّا مَمْنُوْعُوْنَ عَنِ التَّشْبِیْہِ بِالْکَفَرَۃِ وَاَھْلِ الْبِدْعَۃِ الْمُنْکَرَۃِ فِی شِعَارِھِمْ لَا مَنْھِیُّوْنَ عَنْ کُلِّ بِدْعَۃٍ وَلَاکَانَتْ مُبَاحَۃً سَوَاءٌ کَانَتْ مِنْ اَفْعَالِ اَھْلِ السُّنَّۃِ اَوْمِنْ اَفْعَالِ الْکَفَرَۃِ وَاَھْلِ الْبِدْعَۃِ فَالْمَدَارُ عَلَی الشِّعَارِ''۔

ترجمہ: ''ہمیں کفار اور منکر بدعات والوں کے ساتھ مذہبی شِعارِ خاص کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے، ہر بدعت (نئی چیز) سے (مطلقاً) منع نہیں کیا گیا اور نہ ہی مباح بدعت سے منع کیا گیا ہے، خواہ اس کا تعلق اہلسنت سے ہو یا کافروں اور اہلِ بدعت کے اَفعال سے ہو،

پس (حکمِ تشبُّہ) کا مدار (اُن کے) شِعار پر ہے''۔

نوٹ: یہاں لزوم کے معنی یہ ہیں کہ کسی قول یا فعل کو دوسری قوم کی مُشابہت کے قصد کے بغیر اختیار کرنا اور التزام کے معنیٰ ہیں کہ خاص اُس قوم کی مشابہت کے قصد سے اُن کے شِعار کو اختیار کرنا۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر ہم موجودہ شِعار پر میلاد النبی ﷺ کو مستحب عمل سمجھ کر منا رہے ہیں، تو اس کی تقدیس وحُرمت کے لیے کوئی حدود ہونی چاہئیں، نہ کہ اس میں من پسند اضافات کر کے اسے میلا ٹھیلا بنا دیا جائے۔ ہمیں بتایا گیا کہ برطانیہ میں میلاد النبی کی ایک تقریب میں پانچ ہزار پاؤنڈ یعنی سات آٹھ لاکھ روپے کی آتش بازی کی گئی، ایک عالم نے کہا: آگ کے کھیل کو ہمارے دینی شعار کا حصہ نہ بنایا جائے، تو اس کے حامی چند علماء نے جھٹ فتح مکہ کا حوالہ دیا: رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین سے فرمایا کہ مکہ کے پہاڑوں پر پھیل جاؤ اور آگ جلاؤ تا کہ کفار مکہ پر دہشت طاری ہو، کیونکہ مسلمانوں کے لشکر کی کثرت جتلانی مقصود تھی، وہ جہاد کا موقع تھا، کیا دونوں میں کوئی وجہ مناسبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو دین کی عظیم تر حکمت کے تحت مالی وسائل کی دستیابی کے باوجود بیت اللہ کو شہید کر کے دوبارہ بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرنے کی اپنی خواہش کو قربان کر دیا، کیونکہ خدشہ تھا کہ تازہ تازہ اسلام قبول کرنے والے صحابۂ کرام کا ایمان متزلزل نہ ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے باطل معبودوں کو برا کہنے سے اس لیے منع فرمایا کہ مبادا اس کے رَدِّعمل میں کہیں وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ نہ کہہ دیں۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا ہوگا کہ دین کے کسی شِعار میں ہم جو اضافات کر رہے ہیں، ان سے عہد حاضر میں دین کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان، اگر نقصان کے احتمالات زیادہ ہیں، تو پھر اس سے اجتناب کریں۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے ساتھ عبد کی اضافت

سوال:

مجھے یہ پوچھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں جیسے علیم، حکیم، رؤف وغیرہ کا رکھنا جائز

ہے یا نہیں، نیز ایک عالم دین کا کہنا ہے کہ عبد کا اضافہ کیے بغیر ایسے نام رکھنا جائز نہیں، اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟، (محمد احمد، لودھراں)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: ''اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَی اللہِ تَعَالٰی عَبْدُاللہِ وَعَبْدُ الرَّحْمَانِ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام بہت پسند ہیں، (سنن ابوداؤد:4910)''۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے کوئی نام رکھا جائے تو افضل یہ ہے کہ ''عبد'' کی اضافت کے ساتھ رکھا جائے، جیسے عبدالرحمن، عبدالرحیم، عبدالستار، عبدالسبحان، عبدالغفور اور عبدالجبار وغیرہ، تو انہیں جب بھی پکارا جائے، پورا نام لیا جائے۔ اگر نام عبدالرحمٰن یا عبدالخالق یا عبدالمعبود یا عبدالغفور یا عبدالقدوس ہوں تو اس صورت میں عبد کی اضافت کو ساقط کر کے ''رحمٰن، خالق، معبود، غفور، قدوس، سبحان'' کہہ کر پکارنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسے اسمائے صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، دیگر اسمائے صفات جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص نہیں، ایسے ناموں سے بندوں کو بھی پکارا جاسکتا ہے، جیسے رحیم، کریم، علیم، حکیم، لطیف، رؤف، وَدُوْد وغیرہ اور جب پکارا جاسکتا ہے تو نام رکھنا بھی جائز ہے۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بعض اسمائے الٰہیہ جن کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے، ان کے ساتھ نام رکھنا جائز ہے جیسے علی، رشید، کبیر، بدیع، کیونکہ بندوں کے ناموں میں وہ معنی مراد نہیں ہیں، جن کا ارادہ اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنے میں ہوتا ہے اور ان ناموں کو معرّف باللّام کر کے بھی رکھ سکتے ہیں، جیسے اَلْعَلِیُّ، اَلرَّشِیْدُ، وغیرہ (بہارِ شریعت، حصہ:١٦، ص:٢٠٦)''۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''عبداللہ وعبدالرحمٰن بہت اچھے نام ہیں، مگر اس زمانہ میں یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بجائے عبدالرحمٰن اس شخص کو بہت سے لوگ رحمٰن کہتے ہیں اور غیر خدا کو رحمٰن کہنا حرام ہے، اسی

طرح عبدالخالق کو خالق اور عبدالمعبود کو معبود کہتے ہیں، اس قسم کے ناموں میں ایسی ناجائز ترمیم ہرگز نہ کی جائے، اسی طرح بہت کثرت سے ناموں میں تصغیر کا رواج ہے یعنی نام کو اس طرح بگاڑتے ہیں جس سے حقارت نکلتی ہے اور ایسے ناموں میں تصغیر ہرگز نہ کی جائے، لٰہذا جہاں یہ گمان ہو کہ ان ناموں کی تصغیر کی جائے گی، وہاں یہ نام نہ رکھے جائیں، دوسرے نام رکھے جائیں، (بہارِ شریعت، حصہ:15، ص:356)''۔

تنویرالابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَجَازَ التَّسْمِیَةُ بِعَلِیٍّ وَرَشِیْدٍ وَغَیْرِهِمَا مِنَ الْأَسْمَاءِ الْمُشْتَرَکَةِ وَیُرَادُ فِیْ حَقِّنَا غَیْرُ مَا یُرَادُ فِیْ حَقِّ اللهِ تَعَالٰی، لٰکِنِ التَّسْمِیَةُ بِغَیْرِ ذٰلِکَ فِیْ زَمَانِنَا أَوْلٰی، لِأَنَّ الْعَوَامَّ یُصَغِّرُوْنَهَا عِنْدَ النِّدَاءِ، کَذَا فِی ''السِّرَاجِیَةِ''۔

ترجمہ: اور علی، رشید وغیرہ مشترک اسماء (یعنی ایسے اسماء جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور بندوں کے لیے بھی) رکھنا جائز ہے اور جب یہ اسمائے مبارکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال ہوں گے، تو اِن کے وہ معنی مراد ہوں گے جو اُس کی ذاتِ جلالت کے شایانِ شان ہیں (یعنی صفاتِ ذاتیہ مراد ہوں گی) اور جب بندوں کے لیے استعمال ہوں گے تو وہ معنی مراد ہوں گے جو بندگی سے مناسبت رکھتے ہیں، لیکن ہمارے زمانے میں ان کے علاوہ دوسرے نام رکھنا اولیٰ ہیں، کیونکہ عوام پکارتے وقت ان ناموں کی تصغیر کردیتے ہیں (جیسے شیدا، علیا، کبیرا وغیرہ)، ''سِرَاجِیَةِ'' میں اسی طرح ہے۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''اَلَّذِیْ فِیْ'' التَّتَارْخَانِیَةِ ''عَنِ ''السِّرَاجِیَةِ'': اَلتَّسْمِیَةُ بِاسْمٍ یُوْجَدُ فِیْ کِتَابِ اللهِ تَعَالٰی کَالْعَلِیِّ وَالْکَبِیْرِ وَالرَّشِیْدِ وَالْبَدِیْعِ جَائِزَةٌ إلَخْ، وَمِثْلُهٗ فِیْ ''الْمِنَحِ ''عَنْهَا وَظَاهِرُهُ الْجَوَازُ وَلَوْ مُعَرَّفًا بِأَلْ، (قَوْلُهٗ: لٰکِنَّ التَّسْمِیَةَ إلَخْ) قَالَ أَبُو اللَّیْثِ: لَا أُحِبُّ لِلْعَجَمِ أَنْ یُسَمُّوْا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ وَعَبْدَ الرَّحِیْمِ، لِأَنَّهُمْ لَا یَعْرِفُوْنَ تَفْسِیْرَهٗ، وَیُسَمُّوْنَهٗ بِالتَّصْغِیْرِ تَتَارْخَانِیَّةٌ وَهٰذَا مُشْتَهِرٌ فِیْ زَمَانِنَا، حَیْثُ یُنَادُوْنَ مَنِ اسْمُهٗ عَبْدُ الرَّحِیْمِ وَعَبْدُ الْکَرِیْمِ أَوْ

عَبْدُ الْعَزِیْزِ مَثَلًا، فَیَقُولُونَ: رُحَیْمٌ وَکُرَیْمٌ وَعُزَیْزٌ بِتَشْدِیْدِ یَاءِ التَّصْغِیْرِ وَمَنِ اسْمُہٗ عَبْدُ الْقَادِرِ قُوَیْدِرٌ وَھٰذَا مَعَ قَصْدِہٖ کُفْرٌ"۔

ترجمہ: "تاتارخانیہ میں سراجیہ کے حوالے سے ہے: ایسے نام رکھنا جو کتاب اللہ میں پائے جاتے ہیں، جیسے علی، کبیر، رشید اور بدیع (وغیرہ) جائز ہیں، الخ۔ اور اسی کی مثل "مِنَح" میں ہے اور ظاہر اس کا جواز ہے، خواہ مُعرّف باللّام (جیسے الرشید) ہی کیوں نہ ہو، علامہ علاؤالدین حصکفی کا قول "لٰکِنَّ التَّسْمِیَۃَ الخ"، اس کی بابت ابواللیث نے کہا: میں عجمیوں کے لیے عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم نام پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ ان کے معنی نہیں جانتے اور ان کی تصغیر بنا دیتے ہیں (جیسے رحمو وغیرہ)، بحوالہ تاتارخانیہ۔ اور یہ ہمارے زمانے میں مشہور ہے، کیونکہ وہ عبدالرحیم، عبدالکریم اور عبدالعزیز کو مثلاً: رُحَیْمٌ: کُرَیْمٌ اور عُزَیْزٌ اور جس کا نام عبدالقادر ہے، اُسے "قُوَیْدِرٌ" (تصغیر کے ساتھ) بولتے ہیں اور ارادتاً ایسا کرنا کفر ہے، (ردّالمحتار علی الدرالمختار، ج:9،ص:12-511، بیروت)"۔

نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ علامہ شامی نے ابواللیث کے حوالے سے عجمیوں کے بارے میں جو مثالیں دی ہیں، ہم نے اپنے اس خطے میں ایسا کبھی نہیں سنا، ہوسکتا ہے انہیں کسی اور خطے کے عجمیوں سے واسطہ پڑا ہو، علامہ ابواللیث کا تعلق سمرقند سے تھا، اس پورے خطے کو ہماری فقہ وفتاویٰ کی قدیم کتب میں "ماوراء النہر" کہتے ہیں، یعنی دریائے جیحون کے اُس پار کے سارے علاقے، ممکن ہے وہاں ایسا ہوتا ہوگا، جیسا کہ سوویت یونین کے اُن ممالک پر قبضے کے بعد وہاں کے مسلمانوں نے اپنے روسی زبان میں ڈھالے اور رحیموف، کریموف، جوہر دودایوف اور رمضان قدیروف وغیرہ نام رکھے جانے لگے۔ لہٰذا ہمارے خطے میں عبدالرحیم، عبدالکریم، عبدالعزیز اور عبدالقادر ایسے پسندیدہ نام رکھنے چاہئیں، عربی تصغیر سے ہمارے عام لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں، البتہ اردو اور پنجابی وغیرہ کی تصغیر کے اوزان یا طرز اپنی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی تاکید کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات میں سے کسی ایک کی طرف "عبدیّت" کی نسبت کے

ساتھ نام رکھا جائے تو پورا نام لینا چاہیے، کیونکہ وہاں اُن اسمائے اوصاف سے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مراد ہوتی ہے، علامہ مفتی محمد وقار الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا:

''بعض لوگوں کے نام عبدالغفور، عبدالستار، عبدالغفار، عبدالجبار اور عبدالرؤف وغیرہ ہوتے ہیں، ایسے اشخاص کے ناموں کو بغیر ''عبد'' لگائے مثلاً ستار، غفور، جبار وغیرہ بولنا کیسا ہے؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''ایسا کہنا سخت گناہ ہے، پورا نام لینا چاہیے، (وقار الفتاویٰ، ج:1، ص:354)''۔

مفتی جلال الدین احمد امجدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جس کا نام عبدالرحمٰن، عبدالخالق، عبدالمعبود، عبدالقدوس یا عبدالقیوم ہوا سے رحمٰن، خالق، معبود، قدوس، قیوم کہنا حرام ہے، اس لیے کہ ان اسماء کا اطلاق غیر اللہ پر ناجائز ہے، ہاں اگر عبدالرحیم، عبدالکریم، عبدالعزیز کی طرح نام ہوں تو رحیم، کریم اور عزیز کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ ان کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے، (انوار الحدیث، ص:348، مکتبۃ المدینہ، کراچی)''۔

یہاں علامہ مفتی جلال الدین امجدی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن صفاتی ناموں کے بندوں پر اطلاق کو ناجائز اور حرام کہا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، جیسے رحمٰن، خالق، معبود، قدوس، قیوم۔ البتہ بعض صفاتی نام ایسے ہیں جن کا بندوں پر اطلاق ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ کریم میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر رَءُوف، رحیم، عزیز، شاھد وغیرھا کا اطلاق فرمایا ہے، یہ صفاتی نام جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولے جائیں تو اِن کے وہ معنی مراد ہوتے ہیں جو اُس کے شایانِ شان ہیں اور ذاتی وصف مراد ہوتا ہے اور جب یہ بندوں کے لیے بولے جائیں گے تو وہ معنی مراد لیے جائیں گے جو بندوں کے حسب حال ہیں اور عطائے باری تعالیٰ سے ہیں۔ تاہم جب اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام کی طرف عبد کی نسبت کرکے نام رکھا جائے تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پورا نام لے کر پکارا جائے تاکہ کوئی اشتباہ پیدا نہ ہو۔ البتہ اگر کسی کا نام صرف عزیز یا کریم ہو تو اُسے اس نام سے پکار سکتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر 90 سال بتانا

سوال:

ہمارے پڑوس میں خواتین کی محفل میلاد منعقد ہوئی ،اُس تقریب میں میلاد پڑھنے والی خاتون نے کہا: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر 90 سال تھی''، دلیل یہ بیان کی کہ وصال کے وقت حضرت عزرائیل تشریف لائے ،سلام کیا اور عرض کی: یارسول اللہ آپ کو لینے آیا ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے سے تشریف فرما حضرت جبرائیل سے فرمایا: میری عمر تو 90 برس تھی ، پھر کیوں بلایا جارہا ہے؟، حضرت جبرائیل نے فرمایا: آپ کی عمر واقعۂ معراج کی 27 سال ہے،اس طرح 90=27+63 ہوئی۔آپ رہنمائی فرمائیں ،(مدثر اختر، PECHS کراچی)۔

جواب:

اِس طرح کی کوئی روایت موجود نہیں ہے اور نہ ہی کہیں سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر مبارک 90 سال تھی ، بلکہ حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا:أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُوُفِّیَ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَسِتِّيْنَ''۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تریسٹھ سال کی عمر میں وفات ہوئی،(صحیح بخاری:4466)''۔

مذکورہ مُقررہ نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے وقت کا منظر بیان کیا، وہ بھی من گھڑت اور جھوٹا ہے،حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری کلمات کو یوں بیان فرمایا:

''أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ:كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ وَهُوَ صَحِيحٌ إِنَّهُ لَمْ يُقْبَضْ نَبِیٌّ حَتّٰی يَرٰی مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ،ثُمَّ يُخَيَّرُ فَلَمَّانَزَلَ بِهٖ وَرَأْسُهُ عَلٰی فَخِذِی،غُشِیَ عَلَيْهِ، ثُمَّ أَفَاقَ فَأَشْخَصَ بَصَرَهُ إِلٰی سَقْفِ الْبَيْتِ،ثُمَّ قَالَ:اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلٰی،

فَقُلْتُ: إِذًا لَا يَخْتَارُنَا، وَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَدِيثُ الَّذِي كَانَ يُحَدِّثُنَا وَهُوَ صَحِيحٌ، قَالَتْ فَكَانَتْ آخِرَ كَلِمَةٍ تَكَلَّمَ بِهَا: اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَىٰ"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی ﷺ صحت مند تھے، تو آپ فرماتے تھے کہ کسی نبی کی روح اس وقت تک قبض نہیں کی جاتی، یہاں تک کہ وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے۔ پھر اس کو (موت) کا اختیار دیا جاتا ہے، پس جب آپ کو مرضِ وفات لاحق ہوئی، اس وقت آپ کا سرِ مبارک میرے زانو پر تھا کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہوئی، پھر آپ ہوش میں آئے اور آپ نے گھر کی چھت پر نظر ڈالی اور دعا کی: اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَىٰ (میں رفیقِ اعلیٰ یعنی آپ کی بارگاہ میں حضوری کو اختیار کرتا ہوں)، (عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں) میں نے دل ہی دل میں کہا: اب یہ ہمیں اختیار نہیں فرمائیں گے (یعنی اس دنیا سے آپ کی رخصتی کا وقت آگیا ہے) اور میں نے جان لیا، یہ وہی حدیث ہے جو آپ ہمیں تندرستی کی حالت میں بیان فرماتے تھے اور جو آپ نے آخری کلام کیا، وہ یہ تھا: اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَىٰ !، (صحیح بخاری:4463)''۔

آپ کے سوال میں کسی میلاد خواں خاتون کی زبانی جو بیان ہے، اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی عمر مبارک نوے سال بتائی، جو کہ درست نہیں ہے۔ آپ کی عمرِ مبارک کے معروف تریسٹھ سال سب کو معلوم ہیں، محترمہ نے خود ہی آپ کی عمر مبارک نوے سال فرض کر لی اور پھر تریسٹھ اور نوے میں جو ستائیس سال کا فرق ہے، وہ واقعۂ معراج میں پورا کر دیا، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج ستائیس سال پر محیط ہے، حالانکہ قرآن وحدیث سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہے، بلکہ قرآنِ کریم میں تو اس کے برعکس بیان ہوا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا''۔

ترجمہ: ''بے عیب ہے وہ ذات جو اپنے محبوب بندے کو رات کے تھوڑے سے حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، (بنی اسرائیل:1)''۔

گھروں میں میلاد پڑھنے والی خواتین عموماً عالمہ یا کسی مستند ادارے سے فارغ التحصیل نہیں ہوتیں، ان میں بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو نعت خوانی کرتے کرتے مقرر بھی بن جاتے ہیں۔ ایسے مُقررین کا بائیکاٹ کرنا چاہیے، جو لوگوں کی نگاہِ عقیدت کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے موضوع روایات اور خیالی واقعات بیان کرتے ہیں، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف من گھڑت اور بے سروپا باتیں منسوب کرنے سے اللہ کا خوف کرنا چاہیے، اس پر حدیثِ پاک میں بڑی وعید آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''مَنۡ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلۡیَتَبَوَّأۡ مَقۡعَدَہٗ مِنَ النَّارِ''۔

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 110، 6197)''۔

اسلام میں کسی تاریخ یا دن کے نحس ہونے کا کوئی تصور نہیں

سوال:

میری بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہوچکی ہے، ایڈوانس دے کر ہال بک کرلیا ہے۔ سسرال والے 3 تاریخ کو نحس کہہ کر ہال منسوخ کرنے کا کہہ رہے ہیں، بکنگ کینسل ہونے پر رقم واپس نہیں ملے گی۔ آپ رہنمائی فرمائیں کہ 3 تاریخ نحس ہے یا نہیں؟، (عبداللہ، اسلام آباد)۔

جواب:

اسلام میں اس معنی میں بدشگونی کا کوئی تصور نہیں ہے کہ کوئی دن یا تاریخ تعیین کے ساتھ ہر ایک کے لیے بدفال ہو، البتہ نیک فال لے سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ کفار بدشگونی کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) ''فَاِذَا جَآءَتۡہُمُ الۡحَسَنَۃُ قَالُوۡا لَنَا ہٰذِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوۡا بِمُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَہٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُہُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ''۔

ترجمہ: ''تو جب اُنہیں بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ''یہ ہماری وجہ سے ہے'' اور اگر اُنہیں

کوئی برائی پہنچتی ہے تو (اسے) موسیٰ اور اُن کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے ہیں، سنو! ان (کافروں) کی نحوست، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقدر ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے، (الاعراف:131)''۔

سورۂ یٰسین میں اہلِ انطا کیہ کا واقعہ بیان فرمایا کہ جب اہلِ انطا کیہ کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول آئے، تو اس بستی والوں نے کہا:

(۲)''قَالُوْۤا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ قَالُوْا طَآىٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ''۔

ترجمہ:''ہم تو تمہیں نحس سمجھتے ہیں، پس اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کردیں گے اور ہماری طرف سے تم کو ضرور دردناک عذاب پہنچے گا، رسولوں نے کہا: تمہاری بدفالی تمہارے ساتھ ہے، کیا تم نصیحت کرنے کو برا سمجھتے ہو، بلکہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو، (یٰسین:19-18)''۔ اِسی طرح قومِ ثمود کی طرف جب صالح علیہ السلام گئے، تو اُنہوں نے کہا:

(۳)''قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓىٕرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ''۔

ترجمہ:''وہ بولے: ہم آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بدشگون (منحوس) خیال کرتے ہیں، (صالح علیہ السلام نے) کہا: تمہاری بدشگونی (نحوست) اللہ کے ہاں ہے بلکہ تم فتنہ میں مبتلا ہو، (النمل:47)''۔

نوٹ: بعض مفسرین نے ان رسولوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بتایا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ رسول تھے۔

حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی مرض (بذاتہٖ) مُتعدّی نہیں ہوتا اور نہ بدشگونی ہے اور نہ اُلّو کی نحوست ہے اور نہ ماہِ صفر کی نحوست

ہے، (صحیح بخاری: 5707)''۔

شیخ عبدالحق مُحدّث دہلوی لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے فرمایا: ''لَا طِیَرَۃَ'' یعنی حصولِ نفع اور دفعِ ضرر میں بدشگونی کے لیے کوئی تاثیر اور دخل نہیں اور بدشگونی نہیں کرنی چاہیے اور نہ اس کا اعتبار کرنا چاہیے جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہو کر رہے گا، شریعت نے اس کو سبب نہیں بنایا''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے فرمایا: ''لَا صَفَرَ'' بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ماہِ صفر ہے جو محرم کے بعد آتا ہے۔ عام لوگ اس ماہ کو مصیبتوں، بلاؤں، آفات اور حادثات کا مہینہ قرار دیتے تھے، یہ اعتقاد بھی باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، (اَشِعَۃُ اللَّمعَات، جلد 3، ص: 620)''۔

تین تاریخ کو نحس قرار دینے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ سب باطل اور بے اصل وہم ہیں۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''ماہِ صفر کو لوگ منحوس جانتے ہیں، اس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، لڑکیوں کو رخصت نہیں کرتے اور بھی اس قسم کے کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں، خصوصاً ماہِ صفر کی ابتدائی تیرہ تاریخیں بہت زیادہ نحس مانی جاتی ہیں اور ان کو تیرہ تیزی کہتے ہیں، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں، حدیث میں فرمایا: صفر کوئی چیز نہیں یعنی لوگوں کا اسے منحوس سمجھنا غلط ہے، اسی طرح ذوالقعدہ کے مہینہ کو بھی بہت لوگ برا جانتے ہیں اور اس کو خالی مہینہ کہتے ہیں یہ بھی غلط ہے اور ہر ماہ میں 3-13-23 / 8-18-28 کو منحوس جانتے ہیں، یہ بھی لغویات ہے، (بہارِ شریعت، حصہ 16، ص: 242)''۔

آپ بیٹی کے سسرال والوں کو سمجھائیں کہ کسی تاریخ کو منحوس جاننا یا تیرہ تیزی کا عقیدہ رکھنا باطل ہے اور محض جہالت ہے، اسلام میں ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں اور انسان کو وہی پہنچتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے مقدر فرما دیا، یہ سارے توہمات غیر اسلامی اور ہندوانہ ہیں، لہٰذا کسی تَرَدّد کے بغیر کسی بھی تاریخ کو نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان

ہے:

"لَنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا"۔

ترجمہ: "ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، ماسوا اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر فرمادی ہے، (التوبۃ:51)"۔

حدیث پاک میں ہے:

"وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی أَنْ یَّنْفَعُوْكَ بِشَیْئٍ لَمْ یَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْكَ بِشَیْئٍ لَمْ یَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ"۔

ترجمہ: "جان لو! اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے، تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں، (جامع الترمذی: 2516)"۔ یعنی تقدیر کے معاملات اللہ کے علم میں طے شدہ ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن کریم میں تو قومِ عاد کے بارے میں نحوست کا حوالہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ ۙ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ ۚ"۔

ترجمہ: "اور رہے عاد تو اُن کو گرجتی ہوئی تیز آندھی سے ہلاک کر دیا گیا، (اللہ نے) اس آندھی کو ان پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن مسلط رکھا، پس (اے مخاطب!) تم دیکھتے کہ یہ لوگ زمین پر کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح گر گئے، (الحاقۃ:7-6)"۔

(۲) "فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی وَ هُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ"۔

ترجمہ: ''سو ہم نے (ان کے) منحوس دنوں میں اُن پر خوفناک آواز والی آندھی بھیجی تاکہ ہم انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزا چکھائیں اور آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور ان کی بالکل مدد نہیں کی جائے گی، (حم السجدۃ:16)''۔

(۳) ''اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ''۔

ترجمہ: ''بے شک ہم نے اُن پر تیز و تند مسلسل چلنے والی آندھی منحوس دن میں بھیجی، (القمر:19)''۔

اِن آیات میں قومِ عاد پر عذاب کے دنوں کو منحوس قرار دیا گیا اور حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ قومِ عاد پر عذاب بدھ کے دِن آیا تھا اور وہ اِس دن کو منحوس کہتے تھے، اس کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں کہ تمام ایام برابر ہیں اور بدھ کا دن نحوست کے لیے خاص نہیں ہے (یعنی اُن پر عذاب اُن کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے آیا نہ کہ بدھ کے دن کی وجہ سے)۔اور ہر گزرنے والی ساعت کسی شخص کے لیے اچھی اور مبارک ہوتی ہے اور وہی ساعت دوسرے شخص کے لیے بری اور منحوس ہوتی ہے اور ہر دن کسی شخص کے لیے خیر اور دوسرے شخص کے لیے شَر ہوتا ہے (یعنی کوئی سچ بول کر دن گزارتا ہے تو کوئی جھوٹ بول کر دن گزارتا ہے) یعنی نحوست یا ناسازگاری کا تعلق زمانے سے نہیں ہوتا، بلکہ افراد کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اگر کسی شخص پر عذاب یا کوئی مصیبت نازل ہونے کی وجہ سے بدھ کا دن منحوس ہے تو ہر دن بلکہ ہر ساعت میں کسی نہ کسی شخص پر کوئی نہ کوئی مصیبت اور بلا نازل ہوتی ہے، تو اِس طرح تو تمام ساعتیں منحوس قرار پائیں گی، (روح المعانی، جلد 27، ص:86)''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لَا طِيَرَةَ، وَخَيْرُهَا الْفَالُ، قَالَ: وَمَا الْفَالُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟، قَالَ: اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ''۔

ترجمہ: ''اسلام میں بدشگونی تو نہیں ہے، (البتہ) نیک فال لینا بہتر ہے۔صحابہ نے پوچھا: ''نیک فال کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ اچھی بات جو تم میں سے کوئی سنے، (صحیح

بخاری:5754)''۔

''عَنْ عُرْوَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ أَحْمَدُ الْقُرَشِيُّ: قَالَ: ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَحْسَنُهَا الْفَالُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا، فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلِ: اَللّٰهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ، وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ''۔

ترجمہ:''حضرت عروہ بن عامر بیان کرتے ہیں: احمد قرشی نے کہا: نبی ﷺ کے سامنے بدفالی کا ذکر کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: سب سے اچھی چیز نیک فال ہے اور فال مسلمان کو کسی مہم سے نہیں روکتی، پس جب تم میں سے کوئی شخص کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھے تو کہے: اے اللہ! تمام اچھائیاں صرف تیری عطا سے ہیں اور برائیوں کو دور کرنے والی صرف تیری ذات ہے اور برائیوں سے رُخ موڑ دینے والی اور نیکیوں کی توفیق عطا کرنے والی صرف تیری ذات ہے، (سُنن ابوداؤد:3919)''۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی لکھتے ہیں:

''تَشَائَمْنَا بِكُمْ وَذٰلِكَ أَنَّهُمْ كَرِهُوْا دِيْنَهُمْ وَنَفَرَتْ مِنْهُ نُفُوْسُهُمْ وَعَادَةُ الْجُهَّالِ أَنْ يَتَيَمَّنُوْا بِكُلِّ شَيْءٍ مَالُوْا إِلَيْهِ وَقَبِلَتْهُ طِبَاعُهُمْ وَيَتَشَاءَمُوْا بِمَا نَفَرُوْا عَنْهُ وَكَرِهُوْهُ فَإِنْ أَصَابَهُمْ بَلَاءٌ أَوْ نِعْمَةٌ قَالُوْا بِشُؤْمِ هٰذَا وَبَرَكَةِ ذٰلِكَ''۔

ترجمہ:''ہمارا تم سے بدشگونی لینا، یہ اس سبب سے ہے کہ وہ اُن کے دین کو ناپسند کرتے تھے اور اُن کے دل اُن سے متنفر تھے۔ اور جاہلوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو متبرک سمجھتے ہیں، جس کی طرف اُن کے دل مائل ہوں اور جسے اُن کی طبیعتیں قبول کریں اور ہر اُس چیز سے بدشگونی لیتے ہیں جس سے وہ متنفر ہوں اور جسے وہ ناپسند کریں، سو جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ فلاں چیز کی نحوست ہے اور جب انہیں کوئی نعمت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ فلاں چیز کی برکت ہے، (مدارک التنزیل، سورۂ یٰس، آیت:18)''۔

علامہ برہان الدین المرغینانی متوفّٰی 593ھ، لکھتے ہیں:

''لِأَنَّهُمَا لِإِحْكَامِ الْبِنَاءِ وَالْقَبْرُ مَوْضِعُ الْبِلَاءِ وَلِأَنَّ بِالْآجُرِّ أَثَرَ النَّارِ فَيُكْرَهُ تَفَاؤُلًا''۔
ترجمہ: ''پختہ اینٹوں اور لکڑی کی قبر بنانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں عمارت کو مضبوط بنانے کے لیے ہوتی ہیں اور قبر بوسیدگی کی جگہ ہے، پس بدفالی کی وجہ سے یہ مکروہ ہے''۔
اس کے تحت محشی نے لکھا ہے:
''قَالَ الْجَزَلِيُّ: هٰذَا لَيْسَ بِشَيْءٍ، لِأَنَّهُ يُكَفَّنُ فِيْ ثَوْبٍ قَصَرَهُ الْقُصَّارُ وَإِنْ كَانَ بِهٖ أَثَرُ النَّارِ، وَكَذَا يُغْلَى الْمَاءُ۔
ترجمہ: ''امام جزلی نے کہا: بدفالی کی یہ بات بے معنی ہے، کیونکہ میت کو کپڑے میں دفن کیا جاتا ہے اور اُسے دھوبی (گرم پانی میں ڈال کر اور) کوٹ کوٹ کر سفید کرتے ہیں (یعنی اس میں بھی آگ سے واسطہ پڑتا ہے) اور میت کو غسل دینے کے لیے بھی پانی کو آگ پر گرم کیا جاتا ہے، (البدایہ، ج:1، ص:427، مکتبۃ البشریٰ، کراچی)''۔
اسی طرح علامہ زین الدین ابن نجیم اس کی شرح میں لکھتے ہیں:
''اس میں دو علتیں بیان کی گئی ہیں: ایک قبر کو پختہ کرنا (جو شرعاً مطلوب نہیں ہے)، اس حوالے سے قبر میں پتھر کا استعمال بھی مکروہ قرار پائے گا اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اینٹ میں آگ کا اثر ہوتا ہے، تو دونوں میں فرق ہوگا۔ امام حمید الدین الضریر نے دوسری علت کا جواب دیتے ہوئے لکھا: ''پانی بھی آگ میں گرم کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا استعمال جائز ہے، پس معلوم ہوا کہ آگ کا اثر نقصان دہ نہیں ہے''۔ ''غایۃ البیان'' میں اس کا جواب دیا: ''دونوں میں فرق ہے، پختہ اینٹ میں آگ کا اثر نظر آتا ہے اور پانی میں ایسا نہیں ہے، مصنف نے دونوں کی ممانعت کو مطلق رکھا اور امام سرخسی نے اسے مقیّد کیا، کیونکہ اکثر صورتوں میں زمین نرم ہوتی ہے، پس اینٹوں کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے لوہے کا تابوت بنانا اور ''شَرْحُ الْمُجْمَعْ'' میں یہ قید لگائی کہ اوپر اینٹیں لگانا مکروہ نہیں ہے، ارد گرد لگانا مکروہ ہے، کیونکہ قبر کو درندوں سے بچانا مقصود ہوتا ہے، (البحر الرائق، ج:2، ص: 339-340)''۔ الغرض بدشگونی کی نفی قرآن وحدیث کی نصوص سے ثابت ہے اور یہ

فقہائے کرام کے اقوال ہیں، نیز یہ کہ قبر کی حفاظت کے لیے پختہ اینٹوں کے بلا کراہت جواز کے اقوال بھی موجود ہیں۔

سورج اور چاند گرہن کا اسلامی تصور

سوال:

اسلام میں چاند اور سورج گرہن کی کیا حیثیت ہے، اگر شادی یا نکاح کے دن چاند یا سورج گرہن لگ جائے تو کیا نکاح نہیں کرنا چاہیے؟، (سید محمد اکمل حسین)۔

جواب:

سورج یا چاند گرہن ہونے کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو توہّمات پائے جاتے ہیں، اُن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ کسی کی موت و حیات اور نفع ونقصان سے سورج یا چاند گرہن کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کسی وقت کے سَعد یا نَحس ہونے سے کوئی تعلق ہے۔ یہ خیال بھی شرعاً باطل ہے کہ سورج گرہن کے موقع پر حاملہ خواتین پر کوئی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان تمام توہمات کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اِسی طرح شادی یا نکاح پر بھی اس کے کوئی اثرات نہیں مرتب ہوتے۔ البتہ ان مواقع پر ذکرِ الٰہی کرنے، نماز پڑھنے اور توبہ واستغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حدیث مبارک میں ہے:

''عَنْ قَيْسٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا مَسْعُودٍ، يَقُولُ: قَالَ النَّبِيُّ: إِنَّ الشَّمْسَ وَالقَمَرَ لاَ يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ، وَلَكِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا، فَقُومُوا، فَصَلُّوا''۔

ترجمہ: ''حضرت قیس بیان کرتے ہیں: میں نے ابو مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: سورج اور چاند کو لوگوں میں سے کسی کی موت کی وجہ سے گہن نہیں لگتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی (منجملہ) نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، پس جب تم ان نشانیوں کو دیکھو تو کھڑے ہو کر نمازِ (خسوف/کسوف) پڑھو، (صحیح بخاری: 1041)''۔

زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بڑے آدمی کی موت سے سورج یا چاند کو گہن

لگتا ہے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا وصال ہوا اور اتفاقاً اس موقع پر سورج کو گہن بھی لگ گیا، تو بعض نومسلم صحابہ نے کہا: آپ کے صاحبزادے کی وفات کی وجہ سے سورج کو گہن لگ گیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ''سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، انہیں کسی کی موت اور حیات کے سبب گہن نہیں لگتا''۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے سورج یا چاند گہن کے سلسلے میں عقائد کی اصلاح کے لیے بیان فرمائی۔ البتہ سورج یا چاند گرہن میں جس چیز کا مسلمانوں کے عمل کے ساتھ تعلق ہے، وہ توبہ واستغفار، ذکرِ الٰہی، خشوع وخضوع اور تضرّع کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی دو رکعت نماز کسوف پڑھنا ہے۔

اسی طرح تکوینی امور میں ستاروں کے کسی خاص زمانے یا کسی خاص مطلع سے نمودار ہونے کو مؤثر بالذات ماننا بھی جائز نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدٍ الجُهَنِيِّ، أَنَّهُ قَالَ: صَلّٰى لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ بِالحُدَيْبِيَةِ عَلٰى إِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلَةِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ: هَلْ تَدْرُونَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوا: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِي وَكَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ، فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِي كَافِرٌ بِالكَوْكَبِ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِي مُؤْمِنٌ بِالكَوْكَبِ''۔

ترجمہ: ''حضرت زید بن خالد جہنی بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی، اس وقت آسمان پر رات کی بارش کا اثر تھا، جب نبی ﷺ سلام پھیر نے کے بعد پیچھے مڑ کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جاننے والے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندوں نے اس حال میں صبح کی کہ بعض مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور بعض میرا کفر کرنے والے تھے، پس جنہوں نے کہا: اللہ کے

فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی، وہ مجھ پر ایمان لانے والے اور ستاروں (کی ذاتی تاثیر) کا کفر کرنے والے تھے اور جنہوں نے کہا: فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی تو وہ میرا کفر کرنے والے اور ستاروں (کی ذاتی تاثیر) پر ایمان لانے والے تھے، (صحیح بخاری:1038)''۔

اسلام کی تعلیمات کے مطابق کائنات میں جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور حکمت تکوین کے تحت آتا ہے، مؤثر بالذات صرف مَشِیّتِ الٰہی ہے، تقدیرِ الٰہی ستاروں کی چالوں اور برجوں کے تابع نہیں ہے۔ اس حدیث پاک میں سورج اور چاند کو اللہ کی قدرت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ سائنس دان اور ماہرین فلکیات (Astronomer) اس کے تکوینی اسباب کی بابت بتاتے ہیں کہ گردش کے دوران جب زمین اور سورج کے درمیان جزوی یا مکمل طور پر چاند حائل ہوجاتا ہے، تو جزوی یا پورا سورج گرہن ہوتا ہے اور جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہوجائے تو چاند گرہن ہوتا ہے۔

لیکن مومن کو تکوینی اسباب پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ اس جہت سے بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ سیاروں کی حرکت اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے بنائے ہوئے تکوینی نظام کے تابع ہے۔ زمین، سورج، چاند اور دیگر سیاروں میں سے کسی کی بھی مجال نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے نظام سے سرموانحراف کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1): ''وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾''۔

ترجمہ: ''اور سورج اپنی قرارگاہ (محور و مدار) پر رواں دواں ہے، یہ بہت غالب، بے حد علم والے (خالق) کا بنایا ہوا (نظام) ہے اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کی ہیں، یہاں تک کہ وہ لوٹ پھر کر کھجور کی پرانی ٹہنی کی مانند ہوجاتا ہے، نہ سورج کی مجال کہ وہ (چلتے چلتے) چاند

کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ہر ایک (یارہ اپنے) مدار میں تیر رہا ہے، (یٰسٓ:40-38)''۔

(2) ''وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ''۔

ترجمہ: ''اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا اور وہ مسلسل رواں دواں ہیں، (ابراہیم:33)''۔

(3): ''اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ''۔

ترجمہ: ''سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں، (الرحمٰن:5)''۔

جب اللہ قادر و قیوم ان مظاہر کائنات کو اپنی حکمت اور تکوینی نظام کے تحت کچھ وقت کے لیے بے نور کر سکتا ہے، تو وہ جب چاہے ان کی بساط نور کو مستقل طور پر لپیٹ بھی سکتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں بیان کی گئی علاماتِ قیامت میں آسمان کا پھٹ جانا، سورج کا لپیٹا جانا، ستاروں کا جھڑ جانا اور زمین میں زلزلہ برپا ہونا بھی بتایا گیا ہے۔ اسی طرح موسمی تغیرات، مختلف سَمت سے ہواؤں کے چلنے یا ستاروں کے طلوع ہونے سے لوگ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر بارش کے برسنے یا نہ برسنے کی پیش گوئیاں کرتے ہیں، یہ سب ظن و تخمین اور قیاسات ہوتے ہیں، قطعی اُمور نہیں ہوتے۔ ان اُمور کو قطعی ماننا یا مؤثر بالذات ماننا شریعت میں منع ہے، اِسی درجے کے یقین کو حدیث میں ''ستاروں پر ایمان لانے'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

جنات میں رسولوں کا ہونا

سوال:

کیا جنات میں بھی رسول ہوئے ہیں، (ابوحذیفہ ہاشمی، احسان پور)۔

جواب:

انسانوں میں انبیاءِ کرام ورُسلِ عظام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کی بعثت قرآن کریم کی قطعی نصوص سے ثابت ہے، لیکن جنات میں ان کی جنس سے رسولوں کی بعثت اور ان میں

سلسلہ رسالت جاری ہونے کے بارے میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جنات میں سے اُن کی جنس میں کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ بعض نے اس قول سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح انسانوں کے لیے ان کی جنس سے رسول بھیجے گئے ہیں، اسی طرح جنات میں بھی ان کی جنس سے رسول بھیجے گئے ہیں۔

علامہ محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، لکھتے ہیں:

''سُئِلَ الضَّحَّاكَ عَنِ الْجِنِّ، هَلْ كَانَ فِيهِمْ نَبِيٌّ قَبْلَ أَنْ يُبْعَثَ النَّبِيُّ ﷺ؟، فَقَالَ: أَلَمْ تَسْمَعْ إِلَى قَوْلِ اللهِ (يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ)، يَعْنِيْ بِذٰلِكَ رُسُلًا مِّنَ الْإِنْسِ وَرُسُلًا مِّنَ الْجِنِّ؟ فَقَالُوْا: بَلٰى!''۔

ترجمہ: ''ضحاک سے جنات کے متعلق پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ سے پہلے ان میں کوئی نبی گزرا ہے؟، تو انہوں نے کہا: کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: ''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر میری آیات بیان کرتے تھے''۔ اس کا معنی ہے: ''انسانوں میں سے رسول اور جنات میں سے رسول''، تو انہوں نے کہا: ہاں!، (تفسیر الطبری: 13896)''۔

لیکن امام ضحاک اس قول میں منفرد ہیں، جمہور علماء نے جنات میں ان کی نوع سے رسولوں کی بعثت سے انکار کیا ہے۔

''شرح عقائد نسفی'' میں رسول کی تعریف میں علامہ نسفی لکھتے ہیں:

''وَقَدْ أَرْسَلَ اللهُ تَعَالٰى رُسُلًا مِّنَ الْبَشَرِ إِلَى الْبَشَرِ''۔

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے انسانوں کی طرف رسولوں کو بھیجا ہے، (شرح عقائد نسفی، ص: 297، مکتبۃ المدینۃ العلمیہ کراچی)''۔

چنانچہ امام محمد بن جریر طبری آگے لکھتے ہیں:

''وَقَالَ آخَرُوْنَ: لَمْ يُرْسَلْ مِنْهُمْ إِلَيْهِمْ رَسُوْلٌ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مِنَ الْجِنِّ قَطُّ رَسُوْلٌ مُرْسَلٌ، وَإِنَّمَا الرُّسُلُ مِنَ الْإِنْسِ خَاصَّةً، فَأَمَّا مِنَ الْجِنِّ فَالنُّذُرُ قَالُوْا: وَإِنَّمَا قَالَ

یعنی: "الم یاتکم رسل منکم" - والرسل من احد الفریقین"

ترجمہ: "اور وہ کہتے ہیں کہ جنات میں ان کے لیے رسول نہیں بھیجے گئے اور ان کے لیے جنات میں سے اللہ کا مبعوث کیا ہوا کوئی رسول نہیں تھا اور رسل کرام صرف انسانوں ہی میں سے ہیں۔ البتہ جنات میں نذر (ڈرانے والے) ہوا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ" سے مراد یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک فریق میں سے رسول"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں مبعوث کیے گئے انبیائے کرام و رُسل عظام کے مخاطبین جنات بھی ہیں۔

مزید لکھتے ہیں:

"فَعَلٰی قَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ هٰذَا، أَنَّ مِنَ الْجِنِّ رُسُلًا لِلْاِنْسِ إِلٰی قَوْمِهِمْ، فَتَاْوِیْلُ الْاٰیَةِ عَلٰی هٰذَا التَّاْوِیْلِ الَّذِیْ تَأَوَّلَهٗ اِبْنُ عَبَّاسٍ أَلَمْ یَاْتِکُمْ أَیُّهَا الْجِنُّ وَالْاِنْسُ، رُسُلٌ مِّنْکُمْ، فَأَمَّا رُسُلُ الْاِنْسِ فَرُسُلٌ مِّنَ اللهِ إِلَیْهِمْ، وَأَمَّا رُسُلُ الْجِنِّ فَرُسُلُ رُسُلِ اللهِ مِنْ بَنِیْ آدَمَ، وَهُمُ الَّذِیْنَ إِذَا سَمِعُوا الْقُرْآنَ وَلَّوْا إِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ"۔

ترجمہ: "پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس تفسیری قول کے مطابق جنات کے لیے بھی وہی رسول ہیں جو انسانوں میں سے اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تاویل کے مطابق سورۃ الانعام آیت: 130 کی تفسیر یہ ہے: اے جن و انس! کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول نہیں آئے؟ تو جو انسانوں کے رسول ہیں، وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنات کے لیے بھی رسول ہیں اور جو جنات کے لیے رسول ہیں تو یہ انسانوں کی طرف مبعوث کیے گئے اللہ کے رسولوں کے نمائندے ہیں۔ اور یہ وہی ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجن آیت نمبر: 1 میں فرمایا: "آپ کہہ دیجیے! میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور کہا: ہم نے عجیب قرآن سنا جو سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پس ہم اس پر ایمان لے آئے، (تفسیر الطبری، ج:5، ص:46-345)"۔

جمہور مفسرین نے یہی معنی بیان فرمایا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تبیان القرآن'' میں لکھا ہے:

''اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنات سے بھی رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں، حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ رسول صرف انسانوں سے مبعوث کیے گئے ہیں، اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(1) جنات کے رسول سے رسول کا اصطلاحی اور معروف معنی مراد نہیں ہے اور وہ یہ ہے: وہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے احکام کی تبلیغ کے لیے لوگوں کے پاس بھیجا ہو اور اس پر وحی اور کتاب کا نزول ہو، بلکہ یہاں رسول سے لغوی معنی مراد ہے، یعنی فرستادہ اور پیامبر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جنات کے رسول وہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی سن کر اپنی قوم کو پہنچائی، یعنی مبلغ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''اور یاد کیجیے! جب ہم نے آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو متوجہ کیا، جو آپ کے پاس سے توجہ کے ساتھ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ ان (نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے پاس حاضر ہوئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے: چپ ہو جاؤ، پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ عذاب سے ڈرانے والے بن کر اپنی قوم کی طرف واپس پلٹے، (الاحقاف:29)''۔

(2)'' آپ کہیے: میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے (قرآن) کو سنا اور (آپس میں) کہا: بے شک ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف ہدایت دیتا ہے، سو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اپنے رب کے ساتھ ہرگز کسی کو شریک نہیں کریں گے، (الجن:2-1)''۔

(3) مجاہد نے کہا: انسانوں کی طرف رسولوں کو مبعوث کیا گیا ہے اور جنات کی طرف مُنذِرین کو اور اس آیت میں جنات کے رسول سے مراد منذرین ہیں، یعنی اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے۔

مزید لکھتے ہیں:

''اس آیت میں تغلیباً جنات کے مبلغین پر رسولوں کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے قرآن میں مذکر کے صیغے کے ساتھ خطاب ہوتا ہے، جبکہ ان احکام کا خطاب عورتوں کے لیے بھی ہوتا، تو یہ صیغہ مذکر تغلیباً بولا جاتا ہے۔اسی طرح جنات کے مُبلِّغین پر بھی رسول کا اطلاق کیا گیا ہے، حالانکہ جنات میں معروف اور اصطلاحی معنی میں رسول نہیں ہوتے، (تبیان القرآن، ج:3،ص:54-653)''۔آج کل سفارتی زبان میں ایسے افراد کو Diplomatic Attache کہا جاتا ہے۔

چنانچہ جنات نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن سننے کے بعد واپس اپنی قوم کے پاس گئے اور کہا: ''(جنات نے کہا:) اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق کی طرف ہدایت دیتی ہے اور سیدھے راستہ کی طرف (بھی)، (الاحقاف:30)''۔اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے تابع تھے اور انسانوں کے رسول یعنی موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات ہی کی پیروی کرتے تھے اور اُن میں ان کی جنس سے کوئی نبی نہیں آیا، ہاں اُن کے ہاں نُذُر (ڈرسنانے والوں) کا ثبوت قرآنِ مجید سے ہے، جیسا کہ ''وَلَّوا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُنْذِرِيْن'' سے ظاہر ہے۔مستند احادیث میں بھی جہاں انبیاء ورُسل علیہم السلام کا ذکر ہے، وہاں پر صرف انسانوں کے رسولوں کا ذکر ہے اور کسی جنّ رسول کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ سفرِ معراج میں بھی رُسُلِ اِنس کا ذکر ہے۔اس لیے جمہور کی بات زیادہ درست ہے کہ جنّات میں کوئی رسول نہیں آیا، ہاں ان میں رُسُلِ انس کے ہدایت یافتہ مُبلِّغ اور (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والے ضرور آئے ہیں۔

انسان کے جسم میں جنات کا تصرّف

سوال:

کیا جنات انسان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں؟، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جنات انسان کے جسم میں حلول کر کے تصرف کرتے ہیں، اس بارے میں رہنمائی فرمادیں، (محمد مزمل، کوٹ ادو)

جواب:

شیطان کے ضرر پہنچانے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

(1) ''وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ''

ترجمہ: ''اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجیے جب انہوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ شیطان نے مجھے بڑی اذیت اور سخت تکلیف پہنچائی ہے، (ص: 41)''۔

(2) ''اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ''۔

ترجمہ: ''سود خور لوگ قیامت کے دن صرف اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو، (البقرۃ: 275)''۔

شیطان کے ضرر پہنچانے سے متعلق احادیث

(۱) ''قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ مَا مِنْ بَنِي آدَمَ مَوْلُودٌ إِلَّا يَمَسُّهُ الشَّيْطَانُ حِيْنَ يُولَدُ، فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ، غَيْرَ مَرْيَمَ وَابْنِهَا ثُمَّ يَقُولُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: ''وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، (آل عمران: 36)''، (صحیح البخاری: 3431)''۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بنو آدم کا جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے اس کی پیدائش کے وقت شیطان اس کو مَس کرتا ہے اور شیطان کے مَس کرنے سے وہ بچہ چیخ مار کر روتا ہے ماسوا حضرت مریم اور ان کے بیٹے کے، پھر حضرت ابوہریرہ یہ آیت پڑھتے تھے: ''(عمران کی بیوی نے دعا کی:) میں مریم اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں''۔

(۲) ''عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَالَ: إِذَا اسْتَجْنَحَ اللَّيْلُ، أَوْ قَالَ جُنْحُ اللَّيْلِ، فَكُفُّوا صِبْيَانَكُمْ، فَإِنَّ الشَّيَاطِيْنَ تَنْتَشِرُ حِينَئِذٍ، (صحیح البخاری: 3280)''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رات داخل ہو تو اپنے بچوں کو باہر نہ جانے دو، کیونکہ اس وقت شیطان پھیل جاتے ہیں''۔

شیطان کے جسم میں داخل ہو کر ضرر پہنچانے کے متعلق احادیث

(۱)''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ اِمْرَأَةً جَاءَتْ بِابْنٍ لَهَا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّ ابْنِي بِهٖ جُنُونٌ، وَإِنَّهُ يَأْخُذُهُ عِنْدَ غَدَائِنَا وَعَشَائِنَا فَيُخَبِّثُ عَلَيْنَا، فَمَسَحَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدْرَهُ وَدَعَا، فَثَعَّ ثَعَّةً، وَخَرَجَ مِنْ جَوْفِهِ مِثْلُ الْجِرْوِ الْأَسْوَدِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بیٹے کو لے کر آئی اور کہنے لگی: یارسول اللہ! میرے بیٹے کو جنون ہے، صبح اور شام کے وقت اس کو جنون عارض ہوتا ہے اور یہ ہم کو تنگ کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی اس نے قے کی اور اس کے پیٹ سے سیاہ کتّے کے پلّے کی طرح کوئی چیز نکلی، (سنن دارمی: 21)''۔

(۲)''عَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ أَتَتْهُ اِمْرَأَةٌ بِابْنٍ لَهَا قَدْ أَصَابَهُ لَمَمٌ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: اُخْرُجْ عَدُوَّ اللهِ، أَنَا رَسُوْلُ اللهِ قَالَ: فَبَرَأَ''۔

ترجمہ: ''حضرت یعلیٰ بن مرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بیٹے کو لے کر آئی اور کہا: اس کو کچھ جنون ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے دشمن خدا نکل جا، میں اللہ کا رسول ہوں، پھر وہ بچہ ٹھیک ہو گیا، (مسند احمد: 17563)''۔

(۳)''عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ قَالَ: لَمَّا اسْتَعْمَلَنِيْ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَى الطَّائِفِ جَعَلَ يَعْرِضُ لِيْ شَيْءٌ فِيْ صَلَاتِيْ حَتّٰى مَا أَدْرِيْ مَا أُصَلِّيْ، فَلَمَّا رَأَيْتُ ذٰلِكَ رَحَلْتُ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ابْنُ أَبِي الْعَاصِ؟، قُلْتُ: نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ، قَالَ مَا جَاءَ بِكَ؟، قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، عَرَضَ لِيْ شَيْءٌ فِيْ صَلَاتِيْ حَتّٰى مَا أَدْرِيْ مَا أُصَلِّيْ قَالَ: ذَاكَ الشَّيْطَانُ اُدْنُهْ فَدَنَوْتُ مِنْهُ، فَجَلَسْتُ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيَّ،

قَالَ:فَضَرَبَ صَدْرِیْ بِيَدِهٖ، وَتَفَلَ فِیْ فَمِیْ وَقَالَ: اُخْرُجْ عَدُوَّ اللهِ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ قَالَ:الْحَقْ بِعَمَلِكَ قَالَ:فَقَالَ عُثْمَانُ: فَلَعَمْرِیْ مَا اَحْسِبُهٗ خَالَطَنِیْ بَعْدُ"۔

ترجمہ:"حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے طائف کا عامل بنایا تو کوئی چیز آکر مجھے نماز میں ستاتی تھی، حتیٰ کہ مجھے پتا نہیں چلتا تھا کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں، جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا، آپ نے فرمایا: ابن ابی العاص!، میں نے کہا: جی یارسول اللہ!، آپ نے فرمایا: تم کس لیے آئے ہو؟، میں نے عرض کی: یارسول اللہ! نماز میں مجھے کوئی چیز آکر ستاتی ہے حتیٰ کہ مجھے پتا نہیں چلتا کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں، آپ نے فرمایا: یہ شیطان ہے، قریب آؤ، میں آپ کے قریب گیا اور اپنے قدموں کے بل بیٹھ گیا، آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور میرے منہ میں اپنا لعاب ڈالا اور فرمایا: اے اللہ کے دشمن! نکل جا، آپ نے تین بار یہ عمل کیا، آپ نے فرمایا: اب تم اپنے کام پر جاؤ، حضرت عثمان نے کہا: مجھے اپنی زندگی کی قسم! اس کے بعد وہ مجھ میں نہیں آیا، (سنن ابن ماجہ:3548)"۔

علامہ آلوسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَقَدْ يَدْخُلُ فِیْ بَعْضِ الْاَجْسَادِ عَلٰى بَعْضِ الْكَيْفِيَّاتِ رِيْحٌ مُتَعَفِّنٌ تَعَلَّقَتْ بِهٖ رُوْحٌ خَبِيْثَةٌ تُنَاسِبُهٗ فَيُحْدِثُ الْجُنُوْنَ اَيْضًا عَلٰى اَتَمِّ وَجْهٍ وَرُبَمَا اِسْتَوْلٰى ذٰلِكَ الْبُخَارُ عَلَى الْحَوَاسِّ وَعَطَّلَهَا، وَاسْتَقَلَّتْ تِلْكَ الرُّوْحُ الْخَبِيْثَةُ بِالتَّصَرُّفِ فَتَتَكَلَّمُ وَتَبْطِشُ وَتَسْعٰى بِاٰلَاتِ ذٰلِكَ الشَّخْصِ الَّذِیْ قَامَتْ بِهٖ مِنْ غَيْرِ شُعُوْرٍ لِلشَّخْصِ بِشَیْءٍ مِنْ ذٰلِكَ اَصْلًا، وَهٰذَا كَالْمُشَاهِدِ الْمَحْسُوْسِ الَّذِیْ يَكَادُ يَعُدُّ مُنْكِرُهٗ مُكَابِرًا مُنْكِرًا لِلْمُشَاهَدَاتِ"۔

ترجمہ:"کبھی کسی جسم میں ایک متعفن روح داخل ہوجاتی ہے جس کی اس جسم کی روح کے ساتھ مناسبت ہو، پھر اس شخص پر مکمل جنون طاری ہوجاتا ہے اور بعض اوقات یہ بخار

(متعفن روح) انسان کے حواس پر غالب ہوکر اس کو معطل کردیتا ہے، پھر یہ خبیث روح اس کے جسم پر مستقل تصرف کرتی ہے، اس کی زبان سے کلام کرتی ہے اور اس کے اعضاء میں تصرف کرتی ہے اور جس شخص کے جسم میں یہ روح تصرف کرتی ہے اسے اس کا بالکل شعور نہیں ہوتا اور یہ چیز محسوس اور مشاہدہ میں ہے، اس کا صرف وہی شخص انکار کرے گا جو مشاہدات کا منکر ہوگا، (روح المعانی، ج:3، ص:49)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''علامہ آلوسی بڑے پائے کے محقق ہیں، ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے اس کے باوجود وہ انسان ہیں اور انسانی فروگزاشت سے خالی نہیں ہیں، یہ جو انہوں نے لکھا ہے تحقیق کے خلاف لکھا ہے، اللہ تعالیٰ کسی انسان کے جسم پر کسی اور روح کو تصرف کرنے کا اختیار نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو احکام شرعیہ کا مکلف کیا ہے، یہ چیز اس قاعدہ کے خلاف ہے، نیز اگر ایسا ہو تو ایک آدمی کسی کو قتل کردے اور بعد میں کہہ دے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا، مجھے اس کا پتا نہیں، مجھ پر اس وقت کسی جن کا اثر تھا، یہ قتل اسی نے کیا ہے۔اسی طرح ہر شخص کوئی بھی قانون شکنی کر کے عدالت سے یہ کہہ کر بری ہوسکتا ہے کہ اس قانون شکنی کے وقت میں کسی خبیث جن کے زیر اثر تھا، اور یوں دنیا فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن جائے گی اور امن اور سکون غارت ہوجائے گا، (تبیان القرآن، ج:1، ص:1040)''۔

انسان کے جسم میں جنّ کے حلول اور تصرُّف پر ایک حدیث سے استدلال

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَبَاحٍ، قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ عَبَّاسٍ: أَلاَ أُرِيكَ امْرَأَةً مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟ قُلْتُ: بَلَى، قَالَ: هٰذِهِ الْمَرْأَةُ السَّوْدَاءُ، أَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: إِنِّي أُصْرَعُ، وَإِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي، قَالَ: إِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ، وَإِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُعَافِيَكِ فَقَالَتْ: أَصْبِرُ، فَقَالَتْ: إِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي أَنْ لاَ أَتَكَشَّفَ، فَدَعَا لَهَا''۔

ترجمہ: "عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں: مجھ سے حضرت ابن عباس نے کہا: کیا میں تم کو ایک جنتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! انہوں نے کہا: یہ حبشی عورت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی، اس نے کہا: مجھ پر مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرے کپڑے کھل جاتے ہیں، آپ میرے لیے دعا فرمائیے!، آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو صبر کرلو اور تم کو جنت مل جائے گی اور اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ تم کو درست کردے گا، اس عورت نے کہا: میں صبر کرتی ہوں، اس عورت نے کہا: میرے کپڑے کھل جاتے ہیں، آپ دعا فرمائیں کہ میرے کپڑے نہ کھلیں، آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی، (صحیح البخاری:5652)"۔

انسان کے جسم میں جنّ کے تصرف اور تسلّط پر علامہ ابن قیم نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین عینی اور علامہ قسطلانی نے بھی اس حدیث کے تحت اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

شیخ انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں:

"مَنْ يَّصْرَعُ مِنَ الرِّيْحِ" وَفَسَّرَهٗ بَعْضُهُمْ بِاِصَابَةِ الْجِنِّ وَاٰخَرُوْنَ بِدَاءٍ يُسَمّٰى (مرگی) وَاَهْلُ الْعُرْفِ يُعَبِّرُوْنَ بِصَرْعِ الْجِنِّ عَنْ صَرِيْحِ الرِّيْحِ وَالظَّاهِرُ اَنَّ الْمُرَادَ هٰهُنَا هُوَ الدَّاءُ الْمَشْهُوْرُ لِاَنَّ اَلْمَامَ الْجِنِّ لَا يَكُوْنُ اِلَّا مِنْ عِشْقٍ اَوْ اِيْذَاءٍ وَحِيْنَئِذٍ لَا يَلِيْقُ تَحْرِيْضُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اِيَّاهَا عَلَى الصَّبْرِ"۔

ترجمہ: "دم گھٹنے سے بے ہوش ہونا" بعض لوگوں نے اس کی تفسیر جن کے تسلط سے کی ہے اور بعض دوسرے اس کی تعبیر مشہور بیماری سے کرتے ہیں جس کو مرگی کہتے ہیں اور اہل عرف اس کو سانس کی وجہ سے جنّ کا بے ہوش کرنا کہتے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث سے مراد مرگی کی بیماری ہے، کیونکہ انسان پر جنّ یا اس انسان سے عشق کی وجہ سے چڑھتا ہے یا اس کو ایذاء پہنچانے کے لیے اور اگر اس عورت کا بے ہوش ہونا جنّ کی وجہ سے ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس عورت کو صبر کی تلقین نہ فرماتے"۔

تحقیق یہی ہے کہ اس حدیث میں انسان کے جسم پر جنّ کے تصرّف کی کوئی دلیل نہیں ہے اور جو علماء اس نظریے کے قائل ہیں ان کی دلیل بھی صرف ان کا مشاہدہ ہے۔

صرع (مرگی) کے معنی کا بیان

اس حدیث میں ''صرع'' کا لفظ آیا ہے جس کا معنی مرگی ہے، علامہ زبیدی ''صرع'' کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''صرع ایک مشہور بیماری ہے، جیسا کہ صحاح میں ہے، رئیس (بوعلی سینا) نے کہا ہے کہ صرع نفسانی اعضاء کو اپنے افعال انجام دینے سے روکتی ہے، اس کا سبب ایک رکاوٹ ہے جو دماغ کے بعض اندرونی جھلیوں اور اعصاب محرکہ کے دوران خون میں خلط غلیظ یا چربی کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لیے روح اپنے کام کو طبعی طریقہ پر انجام نہیں دے سکتی اور اعضاء میں تشنج (تناؤ) پیدا ہوجاتا ہے، یعنی اعصاب میں زبردست تناؤ کی وجہ سے اینٹھن ہوجاتی ہے اور جسم اکڑ جاتا ہے، (تاج العروس، ج:5،ص:413)

انسان کے جسم پر جنّ کے تصرف اور تسلّط کے متعلق علمائے اسلام کے نظریات

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''قَدْ یَکُونُ سَبَبًا لِلصَّرْعِ وَهِیَ عِلَّةٌ تَمْنَعُ الْأَعْضَاءَ الرَّئِیسَةَ عَنِ انْفِعَالِهَا مَنْعًا غَیْرَ تَامٍّ وَسَبَبُهُ رِیحٌ غَلِیظَةٌ تَنْحَبِسُ فِی مَنَافِذِ الدِّمَاغِ أَوْ بُخَارٌ رَدِیءٌ یَرْتَفِعُ إِلَیْهِ مِنْ بَعْضِ الْأَعْضَاءِ وَقَدْ یَتْبَعُهُ تَشَنُّجٌ فِی الْأَعْضَاءِ فَلَا یَبْقَى الشَّخْصُ مَعَهُ مُنْتَصِبًا بَلْ یَسْقُطُ وَیَقْذِفُ بِالزَّبَدِ لِغِلَظِ الرُّطُوبَةِ وَقَدْ یَکُونُ الصَّرْعُ مِنَ الْجِنِّ وَلَا یَقَعُ إِلَّا مِنَ النُّفُوسِ الْخَبِیثَةِ مِنْهُمْ إِمَّا لِاسْتِحْسَانِ بَعْضِ الصُّوَرِ الْإِنْسِیَّةِ وَإِمَّا لِإِیقَاعِ الْأَذِیَّةِ بِهِ وَالْأَوَّلُ هُوَ الَّذِی یُثْبِتُهُ جَمِیعُ الْأَطِبَّاءِ وَیَذْکُرُونَ عِلَاجَهُ وَالثَّانِی یَجْحَدُهُ کَثِیرٌ مِنْهُمْ وَبَعْضُهُمْ یُثْبِتُهُ وَلَا یَعْرِفُ لَهُ عِلَاجًا إِلَّا بِمُقَاوَمَةِ الْأَرْوَاحِ الْخَیِّرَةِ الْعُلْوِیَّةِ لِتَنْدَفِعَ آثَارُ الْأَرْوَاحِ الشِّرِّیرَةِ السُّفْلِیَّةِ وَتَبْطُلُ أَفْعَالُهَا وَمِمَّنْ نَصَّ مِنْهُمْ عَلَى ذٰلِكَ أَبُقْرَاطُ فَقَالَ لَمَّا ذَکَرَ عِلَاجَ الْمَصْرُوعِ هٰذَا إِنَّمَا یَنْفَعُ فِی الَّذِی سَبَبُهُ أَخْلَاطٌ وَأَمَّا الَّذِی یَکُونُ مِنَ الْأَرْوَاحِ

فَلاً''۔

''صرع (مرگی) وہ بیماری ہے جو اعضائے رئیسہ کو اپنا پورا کام کرنے سے روک دیتی ہے، اس کا سبب وہ غلیظ ریح (ہائیڈروجن) ہے جس سے دماغ کے منافذ بند ہو جاتے ہیں، یا وہ زہریلے بخارات (گیسز) ہیں جو اعضاء سے دماغ کی طرف چڑھتے ہیں اور کبھی ان بخارات کی وجہ سے تشنج پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان کھڑا نہیں رہتا بلکہ کھڑے کھڑے گر جاتا ہے اور رطوبت کے گاڑھے ہونے کی وجہ سے اس کے منہ سے جھاگ گرنے لگتے ہیں (جدید طبی تحقیق یہ ہے کہ گیس صرف پیٹ میں ہوتی ہے، سعیدی غفرلہٗ)۔

کبھی صرع (مرگی) جنّ کے سبب سے ہوتی ہے اور اس کا سبب خبیث جنّ ہوتے ہیں، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان کو بعض انسانی صورتیں اچھی لگتی ہیں یا ان کو کسی انسان سے اذیّت پہنچتی ہے، صرع کا پہلا سبب وہ ہے جو تمام اطبّاء کے نزدیک ثابت ہے اور وہ اس کا علاج بیان کرتے ہیں اور صرع کے دوسرے سبب (جنّ) کا اکثر اطبّاء انکار کرتے ہیں اور بعض اطبّاء اس کے قائل ہیں اور اس کا اس کے سوا اور کوئی علاج معلوم نہیں ہے کہ نیک ارواح علویہ ارواح خبیثہ سفلیہ کا مقابلہ کر کے ان کے افعال کو باطل کر دیں، بقراط نے یہ کہا کہ اخلاط کے فساد کے سبب سے اگر مرگی ہو تو اس کا علاج ہے اور اگر مرگی جنات کے اثر سے ہو تو اس کا کوئی علاج معلوم نہیں ہے، (فتح الباری، ج:10، ص: 114، نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)''۔

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلرِّیْحُ الَّتِیْ تَحْتَبِسُ فِیْ مَنَاقِدِ الدِّمَاغِ وَتَمْنَعُ الْاَعْضَاءَ الرَّئِیْسَةَ عَنْ اِنْفِعَالِهَا مَنْعًا غَیْرَ تَامٍّ اَوْ بُخَارٍ یَرْتَفِعُ اِلَیْهِ مِنْ بَعْضِ الْاَعْضَاءِ، وَالرِّیْحُ هُوَ مَا یَکُوْنُ مَنْشَأً لِلصَّرْعِ وَسَبَبُهٗ: شِدَّةٌ تَعْرِضُ فِیْ بُطُوْنِ الدِّمَاغِ، وَفِیْ مَجَارِی الْاَعْصَابِ الْمُحَرِّکَةِ، وَسَبَبُ الزَّبَدِ غِلَظُ الرُّطُوْبَةِ وَالرِّیْحِ وَقَدْ یَکُوْنُ الصَّرْعُ مِنَ الْجِنِّ وَلَا یَقَعُ اِلَّا مِنَ النُّفُوْسِ الْخَبِیْثَةِ مِنْهُمْ، وَقَالَ الشَّیْخُ اَبُو الْعَبَّاسِ: صَرْعُ الْجِنِّ لِلْاِنْسِ قَدْ یَکُوْنُ عَنْ شَهْوَةٍ

وَهَوَى وَعِشْقٍ، كَمَا يَتَّفِقُ لِلْإِنْسِ مَعَ الْإِنْسِ، وَقَدْ يَتَنَاكَحُ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ وَيُوْلَدُ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ، وَقَدْ يَكُوْنُ عَنْ بُغْضٍ وَمُجَازَاةٍ مِثْلَ أَنْ يُؤْذِيَهِمْ بَعْضُ النَّاسِ أَوْ يَبُوْلَ عَلٰى بَعْضِهِمْ أَوْ يُصَبَّ مَاءً حَارًا وَيُقْتَلُ بَعْضُهُمْ، وَإِنْ كَانَ الْإِنْسُ لَا يَعْرِفُ ذٰلِكَ، وَأَنْكَرَ طَائِفَةٌ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ كَالْجُبَّائِي وَأَبِي بَكْرٍ الرَّازِيِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ زَكَرِيَّاءَ الطَّبِيْبِ وَآخَرُوْنَ دُخُوْلَ الْجِنِّ فِي بَدَنِ الْمَصْرُوْعِ، وَأَحَالُوْا وُجُوْدَ رُوْحَيْنِ فِي جَسَدٍ مَعَ إِقْرَارِهِمْ بِوُجُوْدِ الْجِنِّ، وَهٰذَا خَطَأٌ، وَذَكَرَ أَبُو الْحَسَنِ الْأَشْعَرِيُّ فِي (مَقَالَاتِ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ) أَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ: إِنَّ الْجِنَّ يَدْخُلُ فِي بَدَنِ الْمَصْرُوْعِ كَمَا قَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ''اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، (الْبَقَرَة: 275)''، وَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ: قُلْتُ لِأَبِيْ: إِنَّ قَوْمًا يَقُوْلُوْنَ: إِنَّ الْجِنَّ لَا تَدْخُلُ فِي بَدَنِ الْإِنْسِ، فَقَالَ: يَا بُنَيَّ! يَكْذِبُوْنَ، هُوَ ذَا يَتَكَلَّمُ عَلٰى لِسَانِهِ، وَفِي حَدِيْثِ أُمِّ أَبَانَ الَّذِي رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَغَيْرُهُ قَوْلُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ: أُخْرُجْ عَدُوَّ اللهِ، وَكَذَا فِي حَدِيْثِ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ: أُخْرُجْ يَا عَدُوَّ اللهِ فَإِنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، وَقَالَ الْقَاضِيْ عَبْدُ الْجَبَّارِ: أَجْسَامُهُمْ كَالْهَوَاءِ فَلَا يَمْتَنِعُ دُخُوْلُهُمْ فِي أَبْدَانِ الْإِنْسِ كَمَا يَدْخُلُ الرِّيْحُ وَالنَّفَسُ الْمُتَرَدِّدُ، وَاللهُ أَعْلَمُ''۔

ترجمہ: ''صرع کا سبب یہ ہے کہ دماغ کے منافذ میں ہوا (بخارات) رک جاتی ہے جو اعضاء رئیسہ کو پورا کام کرنے سے روک دیتی ہے یا وہ بخارات ہیں جو بعض اعضاء سے دماغ کی طرف چڑھتے ہیں، صرع (مرگی) کا سبب یہی زہریلے بخارات ہیں، ان کی وجہ سے دماغ کی جھلیوں اور اعصاب محرکہ کے دوران خون میں شدت پیدا ہوجاتی ہے اور رطوبت گاڑھی ہوجاتی ہے اور منہ سے جھاگ آنے لگتے ہیں۔

کبھی صرع کا سبب جنّ ہوتے ہیں اور یہ خبیث جنّوں کے اثر سے ہوتی ہے، شیخ ابوالعباس نے کہا ہے کہ جن کے اثرات سے جو انسان کو مرگی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنّ کو انسان پر شہوت آتی ہے یا وہ اس پر عاشق ہوجاتا ہے، جیسے انسان، انسان پر عاشق

ہوتا ہے، کبھی انسان اور جنّ میں مناکحت ہوجاتی ہے اور ان کی اولاد بھی ہوتی ہے اور کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جنّ کو کسی انسان سے بغض ہوتا ہے اور کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی انسان سے جنّ کو ایذاء پہنچتی ہے اور وہ اس کو سزا دینے کے لیے اس پر مرگی طاری کرتا ہے یا اس کو گرادیتا ہے، ایذاء کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کسی جنّ پر پیشاب کردیتا ہے یا اس پر گرم پانی گرادیتا ہے یا کسی جنّ کو قتل کردیتا ہے، ہر چند کہ انسان کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ یہ ایذاء جنّ کو پہنچارہا ہے۔

بعض معتزلہ مثلاً جبائی، ابوبکر رازی، محمد بن زکریا طبیب اور دوسرے علماء نے مرگی زدہ کے جسم میں جنّ کے دخول کا انکار کیا اور کہا کہ ایک انسان کے جسم میں دو روحوں کا وجود محال ہے جب کہ وہ جنّ کے وجود کے قائل ہیں اور یہ قول خطا ہے اور امام ابوالحسن اشعری نے مقالات اہل السنہ والجماعۃ میں یہ ذکر کیا ہے کہ جنّ مصروع (مرگی زدہ انسان) کے جسم میں داخل ہوتا ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے یہ فرمایا ہے: ''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) صرف اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح کہ جس کو شیطان (جنّ) نے چھوکر مخبوط الحواس کردیا ہو، (البقرۃ:275)''۔

امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ نے امام احمد سے کہا: ''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنّ انسان کے بدن میں داخل نہیں ہوتا، انہوں نے کہا: اے بیٹے! وہ خطا کرتے ہیں، جنّ انسان کی زبان پر کلام کرتا ہے، امام ابوداؤد نے حضرت ام ابان سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اے خدا کے دشمن! نکل جا، کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں اور قاضی عبدالجبار نے کہا: جنّات کے اجسام ہوا کی طرح ہیں، اس لیے ان کا انسان کے بدن میں داخل ہونا ممتنع نہیں ہے جیسا کہ ہوا اور سانس کا انسان کے جسم میں دخول ہوتا ہے، (عمدۃ القاری، ج:21، ص:214، ادارۃ الطباعۃ المصریہ)''۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں اپنی سند کے ساتھ طاؤس سے روایت کیا ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس مرگی زدہ لوگوں کو لایا جاتا تھا، آپ ان میں سے کسی ایک کے سینہ پر مارتے تو وہ ٹھیک ہوجاتا، پھر آپ کے پاس ایک مرگی زدہ عورت کو لایا گیا جس کا نام ام زفر تھا، آپ نے اس کے سینہ پر ضرب لگائی وہ ٹھیک نہیں ہوئی، (حافظ ابن حجر کہتے ہیں:) میری بیان کردہ سند سے یہ بھی مروی ہے کہ ام زفر کو جنّ کی وجہ سے مرگی ہوئی تھی کسی خلط کی وجہ سے مرگی نہیں ہوئی تھی، (فتح الباری، ج:10،ص:115،مطبوعہ لاہور)''۔

علامہ ابن قیم جوزیہ لکھتے ہیں:

''قُلْتُ: الصَّرْعُ صَرْعَانِ: صَرْعٌ مِنَ الْأَرْوَاحِ الْخَبِيثَةِ الْأَرْضِيَّةِ، وَصَرْعٌ مِنَ الْأَخْلَاطِ الرَّدِيئَةِ. وَالثَّانِي: هُوَ الَّذِي يَتَكَلَّمُ فِيهِ الْأَطِبَّاءُ فِي سَبَبِهِ وَعِلَاجِهِ وَأَمَّا صَرْعُ الْأَرْوَاحِ فَأَئِمَّتُهُمْ وَعُقَلَاؤُهُمْ يَعْتَرِفُونَ بِهِ وَلَا يَدْفَعُونَهُ، وَيَعْتَرِفُونَ بِأَنَّ عِلَاجَهُ بِمُقَابَلَةِ الْأَرْوَاحِ الشَّرِيفَةِ الْخَيِّرَةِ الْعُلْوِيَّةِ لِتِلْكَ الْأَرْوَاحِ الشِّرِّيرَةِ الْخَبِيثَةِ فَتُدَافِعُ آثَارَهَا، وَتُعَارِضُ أَفْعَالَهَا وَتُبْطِلُهَا، وَقَدْ نَصَّ عَلَى ذَلِكَ أبقراط فِي بَعْضِ كُتُبِهِ، فَذَكَرَ بَعْضَ عِلَاجِ الصَّرْعِ، وَقَالَ: هٰذَا إِنَّمَا يَنْفَعُ مِنَ الصَّرْعِ الَّذِي سَبَبُهُ الْأَخْلَاطُ وَالْمَادَّةُ. وَأَمَّا الصَّرْعُ الَّذِي يَكُونُ مِنَ الْأَرْوَاحِ، فَلَا يَنْفَعُ فِيهِ هٰذَا الْعِلَاجُ وَأَمَّا جَهَلَةُ الْأَطِبَّاءِ وَسَقَطُهُمْ وَسِفْلَتُهُمْ، وَمَنْ يَعْتَقِدُ بِالزَّنْدَقَةِ فَضِيلَةً فَأُولٰئِكَ يُنْكِرُونَ صَرْعَ الْأَرْوَاحِ وَلَا يُقِرُّونَ بِأَنَّهَا تُؤَثِّرُ فِي بَدَنِ الْمَصْرُوعِ، وَلَيْسَ مَعَهُمْ إِلَّا الْجَهْلُ، وَإِلَّا فَلَيْسَ فِي الصِّنَاعَةِ الطِّبِّيَّةِ مَا يَدْفَعُ ذٰلِكَ، وَالْحِسُّ وَالْوُجُودُ شَاهِدٌ بِهِ''۔

ترجمہ: ''صرع (مرگی) کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جو اخلاط ردیئہ کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا علاج اطباء سے ہوتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو ارواحِ خبیثہ (شریر جنّ) کی وجہ سے ہوتی ہے، ائمہ دین اور عقلاء اس کو مانتے ہیں اور اس کا رد نہیں کرتے اور اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ ارواح شریفہ، ارواحِ خبیثہ شریرہ کا مقابلہ کریں، ان کے اثر کو دور کریں اور ان کے افعال سے معارضہ کر کے ان کو باطل کردیں، بقراط نے اپنی بعض تصانیف میں اس کی تصریح بھی کی ہے، جو مرگی طبعی سبب سے ہوتی ہے، بقراط نے اس کے علاج کے بعض

طریقے ذکر کیے ہیں اور یہ کہا ہے کہ جو مرگی ارواح خبیثہ کے اثر کی وجہ سے ہو اس کا کوئی علاج نہیں ہے، البتہ جاہل طبیب اور بے دین لوگ ارواح خبیثہ کے اثر کی وجہ سے مرگی کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرگی زدہ کے بدن میں خبیث روح کا اثر نہیں ہوسکتا، یہ ان لوگوں کی محض جہالت ہے اور واقعہ اور مشاہدہ ان کی تکذیب کرتا ہے، (زاد المعاد، ج:3، ص:84)''۔

قاضی بدرالدین شبلی لکھتے ہیں:

''جس شخص پر جنون یا مرگی طاری ہوتی ہے، اس سے جو مضطرب حرکات صادر ہوتی ہیں اور اس وقت وہ جو باتیں کرتا ہے، ان کا فاعل کون ہے؟ جب جن اس شخص کے جسم میں داخل ہوتا ہے یا اس کو چھوتا ہے اس وقت اس سے مضطرب حرکات اور کلام کا صدور ہوتا ہے، عام لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ جن کا کلام ہے اور وہ جن کی طرف اس کلام کی اضافت کرتے ہیں، ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل قطعی نہیں ہے کہ جنون یا مرگی زدہ شخص سے جو کلام سنائی دے رہا ہے وہ جن کا کلام ہے یا اس شخص کا اپنا کلام ہے اور بغیر کسی سمعی اور قطعی دلیل کے ان میں سے کسی ایک کی طرف اضافت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ امام احمد کا یہ قول ہے کہ جنون یا مرگی زدہ شخص کی زبان پر جن کلام کرتا ہے، (آکام المرجان فی غرائب الاخبار واحکام الجن، ص:110-109، مکتبہ خیر کثیر کراچی)''۔

ڈاکٹر احمد شرباصی لکھتے ہیں:

''عام مسلمان بکثرت یہ بات کہتے ہیں کہ فلاں مرد کے جسم یا فلاں عورت کے جسم میں جن رہتا ہے اور یہ بیمار مرد یا بیمار عورت جو باتیں کرتی ہے وہ در اصل جن بولتا ہے، پھر وہ ایسے لوگوں کو لے کر آتے ہیں جن کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے جسموں سے جنوں کو نکالنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

مریض میں یہ حالت اعصابی تشنج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس کا علاج ماہر نفسیات اور ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق کرنا چاہیے اور مریض کو صاف ستھری غذا کھلانی چاہیے

اور کھلی فضا اور تازہ آب و ہوا میں رکھنا چاہیے۔

قدیم علماء یہ بیان کرتے چلے آئے ہیں کہ اس مرض کی نسبت جن یا شیطان کی طرف کرنا باطل ہے، کیونکہ قرآن مجید نے شیطان سے حکایت کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے: ''اور میرا تم پر کوئی تسلط نہ تھا مگر یہی کہ میں نے تم کو دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی، (ابراہیم:22)''، (یَسْئَلُوْنَکَ فِی الدِّیْنِ وَالْحَیَاۃ، ج:1 ص:609-610، دارالجیل، بیروت)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

عام طور پر جس شخص کو بھی اعصابی تشنج، کوئی نفسیاتی دورہ یا ہسٹریا کا مرض لاحق ہوتا ہے، لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں جن داخل ہو گیا اور اب وہ جن اس مریض کی زبان سے کلام کر رہا ہے اور اس کا علاج وہی شخص کر سکتا ہے جو جن نکالنے پر قادر ہو، یہ غلط خیال ہے، اس قسم کے مریضوں کا معروف طبی اور نفسیاتی طریقہ سے علاج کرانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے حصول شفا کی دعا کرنی چاہیے۔

سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، مسند احمد اور معجم طبرانی کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جن انسان کے جسم میں داخل ہو کر اس کو ایذا پہنچاتا ہے اور نبی ﷺ نے انسان کے جسم سے جن کو نکالا، اس لیے ہمیں معتزلہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ جن کا انسان کے جسم میں داخل ہونا محال ہے، البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ آیا جن انسان کے جسم میں داخل ہو کر اس کے اعضاء پر متصرف اور مسلّط ہوتا ہے یا نہیں؟ بایں طور کہ انسان کی زبان سے جن کلام کرے اور اس کے ہاتھ پیروں سے تصرف کرے اور انسان کے حواس اور مشاعر معطل ہو جائیں۔

امام احمد بن حنبل، علامہ ابن قیم حنبلی، حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی، علامہ قسطلانی شافعی، علامہ بدرالدین عینی حنفی اور علامہ آلوسی حنفی انسان کے جسم اور اعضاء پر جن کے تصرف کرنے کے قائل ہیں، لیکن ان کے نزدیک کتاب وسنت سے اس پر کوئی دلیل نہیں

ہے، ان کے نزدیک اس کی دلیل صرف اور صرف مشاہدہ ہے۔

جنّات کا یہ تصرف میرے مشاہدہ میں نہیں آیا، میں صرف اس وجہ سے اس کے خلاف نہیں ہوں کہ یہ میرے مشاہدہ میں نہیں آیا بلکہ میرے نزدیک یہ نظریہ انسان کی ذہنی اور جسمانی آزادی اور اس کے مکلف ہونے کے خلاف ہے، نیز اگر انسان کے جسم اور اعضاء پر خبیث جنّات کا تصرف اور تسلّط ممکن ہو تو اس سے دو اشکال لازم آئیں گے، اول یہ کہ پھر خبیث اور کافر جنوں کو یہ چاہیے کہ وہ تمام عام مسلمانوں کی زبانوں اور اعضاء پر مسلط ہو کر ان سے کفریہ افعال کا صدور کرالیں اور عام مسلمانوں کا نیک اعمال کرنا اور ایمان پر قائم رہنا نہ صرف مشکل اور دشوار بلکہ ختم ہو جائے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ جنّ انسانوں کے ہاتھوں اور زبان سے کوئی کام کراسکتا ہے تو پھر جو شخص قتل، چوری، راہزنی، ڈاکہ، لوٹ مار اور زنا کے کسی مقدمہ میں ماخوذ ہو، وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا، مجھے اس کا کوئی ہوش نہیں، کیونکہ جس وقت مجھ سے یہ جرم سرزد ہوا اس وقت میں جنّ کے زیر اثر تھا اور پھر اسلام کی حدود وتعزیرات اور ملکی قوانین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، ہم آئے دن اخبارات میں اس قسم کی خبریں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں عامل نے جنّ نکالنے کے بہانے فلاں عورت کی عصمت لوٹ لی اور فلاں عامل نے جنّ نکالنے کے لیے جن کے زیر اثر شخص کو اتنا زدوکوب کیا کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔

ہوسکتا ہے کہ میرا یہ نظریہ غلط ہو، لیکن انسانی جسم پر جنّوں کے تصرف کے متعلق میں نے جو اشکال قائم کیے ہیں، جب تک ان اشکالوں کو اٹھایا نہیں جائے گا، یہ مسئلہ منقح اور بے غبار نہیں ہوگا اور اگر عالم اسلام کے یہ اَجِلّہ علماء اس نظریے کے قائل نہ ہوتے تو میں اس نظریہ کو صراحۃً رد کردیتا، (شرح صحیح مسلم، ج:7،ص:650-641)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی بدن میں جنّ کے حلول اور تصرّف کے حوالے سے اپنا موقف پیش کیا ہے اور اس کی حکمت بھی بیان کردی ہے، لیکن انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کئی اکابر علماء اس نظریے کے قائل ہیں اور امام احمد رضا قادری نے

بھی ایک مقام پر مولانا روم کا حوالہ دیا ہے، اگرچہ انہوں نے اس پر اپنی عادتِ مبارکہ کے مطابق زوردار دلائل قائم نہیں فرمائے، تاہم اس کے امکان کو تسلیم کیا ہے، لہٰذا ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک راجح عدمِ حلول وتصرّف ہے اور دوسرے متعدد اکابر علماء کے نزدیک انسانی بدن میں جنّات کا حلول وتصرف ثابت ہے اور بعض اوقات ایسے شواہد بھی ملتے ہیں، تاہم قائلین کے نزدیک بھی اس حلول یا دخول کی کیفیت کا تعیّن نہیں کیا جاسکتا، البتہ تصرف کے شواہد نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ''۔

ترجمہ: ''جو لوگ سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن وہ اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے، جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کردیا ہو، (البقرۃ:275)''۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے حواس پر اثر انداز ہونے کا ذکر فرمایا ہے، لیکن یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ بدن میں داخل ہوکر ایسا کرتا ہے یا خارج سے تصرف کرتا ہے۔

طہارت کے مسائل

وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال:

ایک صاحب کہتے ہیں کہ وضو سے پہلے صرف بِسۡمِ اللہ کہنا چاہیے "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم" مکمل نہیں پڑھنی چاہیے، اِسی طرح اُن کا کہنا ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے زبان سے نیت کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے، (محمد احمد رضا، سرجانی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

وضو سے پہلے بِسۡمِ اللہ پڑھنے کو بعض فقہائے کرام (داؤد ظاہری اور امام احمد بن حنبل) نے واجب قرار دیا ہے، جمہور فقہائے احناف کے نزدیک سنت ہے اور علامہ علاؤالدین کاسانی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ "بَدَائِعُ الصَّنَائِع" نے اس دلیل کی بنا پر اسے سنت کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس پر ہمیشگی فرمائی۔ بعض نے اِسے مستحب قرار دیا ہے۔ فقہائے کرام نے وضو سے پہلے "بِسۡمِ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی دِیۡنِ الۡاِسۡلَام" پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے، "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم" بھی پڑھ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اسمِ جلالت دیگر کلمات کے ذریعے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بِسۡمِ اللہ کی تفصیلی بحث درج ذیل ہے:

(1) علامہ محمد بن محمود رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"(وَتَسۡمِیَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی اِبۡتِدَاءِ الۡوُضُوۡءِ)، قَالَ الطَّحَاوِیُّ: ھُوَ أَنۡ یَّقُوۡلَ بِسۡمِ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی دِیۡنِ الۡإِسۡلَامِ، ھُوَ الۡمَنۡقُوۡلُ عَنِ السَّلَفِ، وَقِیۡلَ إِنَّہٗ مَرۡفُوۡعٌ إِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ، وَاسۡتَدَلَّ بِقَوۡلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ: (لَا وُضُوۡءَ لِمَنۡ لَّمۡ یُسَمِّ اللّٰہَ)، وَوَجۡہُ ذٰلِکَ أَنَّ لَا لِنَفۡیِ الۡجِنۡسِ فَبِحَقِیۡقَتِہٖ یَقۡتَضِیۡ أَلَّا یَکُوۡنَ وُضُوۡءٌ إِلَّا بِتَسۡمِیَۃٍ، وَإِلَیۡہِ ذَھَبَ أَصۡحَابُ الظَّوَاھِرِ وَأَحۡمَدُ، وَجَعَلُوا التَّسۡمِیَۃَ مِنۡ شُرُوۡطِ الۡوُضُوۡءِ. لٰکِنَّا قُلۡنَا: اَلۡمُرَادُ بِہٖ نَفۡیُ الۡفَضِیۡلَۃِ لِئَلَّا یَلۡزَمَ نَسۡخُ آیَۃِ الۡوُضُوۡءِ بِہٖ"۔

ترجمہ:''اور وضو کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا، امام طحاوی نے کہا: اُس کا طریقہ یہ ہے کہ کہے:''بِسْمِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَام''، سَلَف سے یہی منقول ہے اور ایک قول کے مطابق یہ حدیثِ مرفوع ہے۔ اس پر نبی ﷺ کے اِس قول سے استدلال کیا ہے:''اُس کا وضو نہیں جس نے اللہ کا نام نہ لیا ہو''اور اُس کا سبب یہ ہے کہ''لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ یُسَمِّ اللّٰہَ''میں''لَا''نفیِ جنس کا ہے اور اُس کے حقیقی معنی کا تقاضا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر وضو نہ ہو اور''ظاہریہ''(داؤد ظاہری کے ماننے والے) اور امام احمد نے یہی معنی لیا ہے اور انہوں نے اللہ کا نام لینے کو وضو کی شرائط میں شمار کیا ہے۔ لیکن ہم (احناف) کہتے ہیں: ''لَا''، نفیِ جنس کے لیے نہیں ہے، بلکہ نفیِ فضیلت کے لیے ہے (یعنی اگر وضو کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا تو وضو تو ادا ہوجائے گا لیکن فضیلت سے محروم رہے گا)، اور (لَا کو نفیِ فضیلت کے معنی میں ہم نے اس لیے لیا ہے) تاکہ اِس کے ذریعے آیتِ وضو کا منسوخ ہونا لازم نہ آئے، (العنایہ بشرح الہدایہ، ج:1،ص:24)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ آیت:6 میں وضو کے جو فرائض بتائے گئے ہیں، اُن میں وضو کرتے وقت اللہ کا نام لینے کا ذکر نہیں ہے، لہٰذا فرائضِ وضو چار ہی رہیں گے، جو آیتِ وضو میں بیان کیے گئے ہیں۔

(2) علامہ ابوبکر بن علی حدّاد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(قَوْلُہٗ وَتَسْمِیَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی ابْتِدَاءِ الْوُضُوْءِ)، اَلْکَلَامُ فِیْھَا فِیْ ثَلَاثَۃِ مَوَاضِعَ: کَیْفِیَّتِھَا وَصِفَتِھَا وَوَقْتِھَا، أَمَّا کَیْفِیَّتُھَا، فَبِسْمِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَامِ، وَاِنْ قَالَ: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، أَجْزَأَہٗ، لِأَنَّ الْمُرَادَ مِنَ التَّسْمِیَۃِ ھُنَا مُجَرَّدُ ذِکْرِ اسْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی، لَا التَّسْمِیَۃُ عَلَی التَّعْیِیْنِ، وَأَمَّا صِفَتُھَا فَذَکَرَ الشَّیْخُ أَنَّھَا سُنَّۃٌ، وَاخْتَارَ صَاحِبُ الْھِدَایَۃِ أَنَّھَا مُسْتَحَبَّۃٌ، قَالَ وَھُوَ الصَّحِیْحُ''۔

ترجمہ:''تَسْمِیَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی ابْتِدَاءِ الْوُضُوْءِ''، اس میں کلام کے تین عنوان ہیں: اس کی کیفیت، اس کی صفت اور اس کا وقت، اِس کی کیفیت (یعنی اللہ کا نام لینے کا طریقہ) یہ ہے:''بِسْمِ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَامِ''اور اگر''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ

الرَّحِیْم '' بھی کہا، تو یہ کافی ہے، کیونکہ '' تَسْمِیَۃُ اللہِ '' سے مراد بس اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہے، تعین کے ساتھ کوئی خاص نام لینا مرادنہیں ہے۔اس کی صفت (فقہی اعتبار سے تَسْمِیَۃُ اللہِ کا حکم) یہ ہے: شیخ نے ذکر کیا ہے کہ یہ سنت ہے اور صاحبِ ہدایہ کا مختار یہ ہے کہ یہ مستحب ہے اور یہی قول صحیح ہے، (الجَوْھَرَۃُ النَّیِّرَۃ، ج:1،ص:10)''۔

(3) علامہ کمال الدین ابن ہُمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(قَوْلُہٗ وَتَسْمِیَۃُ اللہِ تَعَالیٰ) لَفْظُھَا الْمَنْقُولُ عَنِ السَّلَفِ، وَقِیْلَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاسْمِ اللہِ الْعَظِیمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلیٰ دِینِ الْإِسْلَامِ،وَقِیلَ الْأَفْضَلُ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ بَعْدَ التَّعَوُّذِ،وَفِی الْمُجْتَبٰی یَجْمَعُ بَیْنَھُمَا،وَفِی'' الْمُحِیط '': لَوْ قَالَ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللہُ أَوْ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ أَوْ أَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللہُ یَصِیرُ مُقِیْمًا لِلسُّنَّۃِ، وَھُوَ بِنَاءٌ عَلیٰ أَنَّ لَفْظَ بِسْمِ أَعَمُّ مِمَّا ذَکَرْنَا''۔

ترجمہ:'' وضو کے شروع میں اللہ کا نام لینے کے جو کلمات سَلَف سے منقول ہیں اور ایک قول کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہیں، یہ ہیں:'' بِسْمِ اللہِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلیٰ دِیْنِ الْاِسْلَامِ ''اور ایک قول کے مطابق ''اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ '' کے بعد ''بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ '' کہنا افضل ہے اور ''مجتبیٰ'' میں ہے کہ دونوں کلمات کہے اور ''محیط'' میں ہے: اگر '' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ '' یا '' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ '' یا '' اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ '' کہا، تو بھی سنت ادا ہوجائے گی اور یہ اس بات پر مبنی ہے کہ لفظ ''بِسْمِ ''میں اوپر ہمارے بیان کردہ کلمات میں عموم ہے، (فتح القدیر، ج:1،ص:23، ملخصاً)''۔حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: یَا أَبَا ھُرَیْرَۃَ! إِذَا تَوَضَّأْتَ، فَقُلْ بِسْمِ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ، فَإِنَّ حَفَظَتَکَ لَا تَبْرَحُ تَکْتُبُ لَکَ الْحَسَنَاتِ حَتّٰی تُحْدِثَ مِنْ ذٰلِکَ الْوُضُوءِ ''۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اے ابوہریرہ! جب تم وضو کرو تو ''بِسْمِ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہ '' پڑھا کرو، (ان کلمات کی برکت

سے) تمہارے نگہبان فرشتے (تمہارے نامۂ اعمال میں) برابر نیکیاں لکھتے رہیں گے تاوقتیکہ تمہارا یہ وضوٹوٹ جائے ،(مجمع الزوائد:1112)''۔

اورسنن ابوداؤد:101 میں ہے:''لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّا وُضُوْ ءَلَہٗ''اور''لَا وُضُوْ ءَلِمَنْ لَمْ یَذْ کُرِاسْمَ اللّٰہِ''اورسنن ترمذی:25میں ہے:''لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ''۔یعنی امام ابن ہُمام نے اس موضوع پر احادیث ذکر کرتے ہوئے اُن پر نقد و جرح کی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''تَأْتِی الْأَحْکَامُ الشَّرْعِیَّۃُ فِی کُلٍّ مِنَ الْبَسْمَلَۃِ وَالْحَمْدَلَۃِ،أَمَّاالْبَسْمَلَۃُفَتَجِبُ فِی ابْتِدَاءِ الذَّبْحِ وَرَمْیِ الصَّیْدِ وَالْإِرْسَالِ إِلَیْہِ،لٰکِنْ یَقُومُ مَقَامَھَاکُلُّ ذِکْرٍ خَالِصٍ وَفِی بَعْضِ الْکُتُبِأَنَّہُ لَا یَأْتِیْ بِالرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ لِاَنَّ الذَّبْحَ لَیْسَ بِمُلَائِمٍ لِلرَّحْمَۃِ، لٰکِنْ فِی ''الْجَوْھَرَۃِ'':أَنَّہُ لَوْ قَالَ:بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ،فَھُوَحَسَنٌ ،وَفِی ابْتِدَاءِ الْفَاتِحَۃِ فِی کُلِّ رَکْعَۃٍ قِیلَ وَھُوَقَوْلُ الْأَکْثَرِ،لٰکِنَّ الْأَصَحَّ أَنَّھَا سُنَّۃٌ،وَتُسَنُّ أَیْضًافِی اِبْتِدَاءِ الْوُضُوءِ وَالْأَکْلِ،وَفِی اِبْتِدَاءِکُلِّ أَمْرٍ ذِی بَالٍ،وَتَجُوْزُ أَوْ تُسْتَحَبُّ فِیمَا بَیْنَ الْفَاتِحَۃِ وَالسُّوْرَۃِ عَلَی الْخِلَافِ الْاٰتِی فِی مَحَلِّہٖ إِنْ شَاءَاللّٰہُ تَعَالٰی ،وَتُبَاحُ أَیْضًا فِی ابْتِدَاءِ الْمَشْیِ وَالْقِیَامِ وَالْقُعُودِ،وَتُکْرَہُ عِنْدَ کَشْفِ الْعَوْرَۃِ أَوْ مَحَلِّ النَّجَاسَاتِ وَفِی أَوَّلِ سُورَۃِ بَرَاءَۃٍ إِذَا وَصَلَ قِرَاءَتَھَا بِالْأَنْفَالِ کَمَا قَیَّدَہُ بَعْضُ الْمَشَایِخِ، قِیلَ وَعِنْدَ شُرْبِ الدُّخَانِ أَیْ وَنَحْوِہٖ مِنْ کُلِّ ذِیْ رَائِحَۃٍ کَرِیْھَۃٍ کَأَکْلِ ثُومٍ وَبَصَلٍ ، وَتَحْرُمُ عِنْدَ اِسْتِعْمَالِ مُحَرَّمٍ، بَلْ فِی ''الْبَزَّازِیَۃِ''وَغَیْرِھَا یَکْفُرُ مَنْ بَسْمَلَ عِنْدَ مُبَاشَرَۃِ کُلِّ حَرَامٍ قَطْعِیِّ الْحُرْمَۃِ، وَکَذَاتَحْرُمُ عَلَی الْجُنُبِ إِنْ لَمْ یَقْصِدْ بِھَا الذِّکْرَ''۔

ترجمہ:''ذبح کے وقت ، شکار پر تیر پھینکتے وقت اور شکاری کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لینا واجب ہے،خاص بِسْمِ اللّٰہ پڑھنا ضروری نہیں ہے بلکہ کسی بھی طریقے سے اللہ کا نام لینے سے یہ واجب ادا ہوجائے گا اور بعض کتابوں میں ہے کہ ذبح کرتے وقت ''بِسْمِ اللّٰہ''پر اکتفا کرے اور''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم''نہ پڑھے ،کیونکہ صفتِ رحمت فعلِ ذبح سے مناسبت

نہیں رکھتی اور"اَلْجَوْهَرَةُ النَّيِّرَة"میں ہے:اگر ذبح کے وقت"بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم" کہا تو یہ بہتر ہے اور سورۂ فاتحہ سے پہلے اور ہر رکعت کے شروع میں بِسْمِ الله پڑھنا مستحب ہے،لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ سنّت ہے۔اِسی طرح وضو،کھانے اور ہر اہم کام سے پہلے بِسْمِ الله پڑھنا سُنّت ہے اور نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد اور سورت سے پہلے جائز ہے یا مستحب ہے اور چلتے اٹھتے اور بیٹھتے وقت بِسْمِ الله پڑھنا مباح ہے۔بے پردگی کے وقت، نجاست کی جگہ اور جب سورۂ انفال کے بعد متصلاً سورۂ توبہ کی تلاوت کرے(اس سے پتا چلا کہ اگر کوئی سورۂ توبہ سے تلاوت کی ابتداء کر رہا ہے تو وہ تعوذ پڑھ کر سورۂ توبہ سے پہلے تسمیہ پڑھے کہ یہ مکروہ نہیں ہے،البتہ تسمیہ کے بعد وقف کرے پھر سورۂ توبہ کی تلاوت کرے)،اسی طرح تمباکو،لہسن،پیاز،سگریٹ یا حقہ اور کوئی بدبودار چیز کھاتے یا پیتے وقت بِسْمِ الله پڑھنا مکروہ ہے،حرام چیز کے استعمال کے وقت بِسْمِ الله پڑھنا حرام ہے اور"بزازیہ"وغیرہ میں ہے:جو حرامِ قطعی کے ارتکاب کے وقت بِسْمِ الله پڑھے گا،تو(یہ اللہ تعالیٰ کے اسمِ مبارک کی اہانت کے سبب)کفر ہے،جُنبی ذکر کی نیت سے بِسْمِ الله پڑھ سکتا ہے،تلاوت کی نیت سے نہیں،(ردالمحتار،ج:1،ص:11،مقدمہ)"۔

نیت دل کے ارادے کا نام ہے،زبان سے نیت کے کلمات ادا کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہیں اور نہ ہی شرعاً ضروری ہیں،زبان سے نیت کے کلمات ادا کرنے کو فقہائے کرام نے مستحب قرار دیا ہے۔

حسی ناپاکی اور معنوی ناپاکی میں فرق ہے

سوال:

میں ایک معذور آدمی ہوں،بیساکھی کے سہارے چلتا ہوں اور باتھ روم میں جاتے وقت میرا پیشاب نکل جاتا ہے۔میں اکثر اوقات گھر سے باہر رہتا ہوں اور پیشاب کی حاجت ہوتی ہے تو باہر کھڑے ہو کر کرتا ہوں،جس کی وجہ سے اکثر ناپاک رہتا ہوں۔ کاروباری معاملات کے لیے جن دکانوں اور دفاتر میں جاتا ہوں،وہ لوگ بعد میں بات

کرتے ہیں کہ ہماری روزی کی جگہ پر ناپاک آدمی آجاتا ہے۔ آپ میری شرعی رہنمائی فرمائیں میں بہت پریشان ہوں، (سمیر سکندر، دستگیر کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے:

"عَنْ جَابِرِبنِ عَبدِاللهِ قَالَ: نَھٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ یَبُولَ قَائِمًا"۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا، (سُنن ابن ماجہ:309)"۔

بیٹھ کر پیشاب کرنے میں انسانی وقار بھی ہے اور شرمگاہ کی حفاظت بھی۔ انسان پیشاب کے چھینٹوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور اگر (کسی عذر و مجبوری کی وجہ سے) کھڑے ہوکر پیشاب کرلے تو جائز ہے، لیکن اس میں یہ لازم ہے کہ پیشاب کے لیے نرم (پانی جذب کرنے والی) زمین تلاش کرے تاکہ اس پر پیشاب کے چھینٹے نہ پڑیں اور اپنی شرمگاہ کی لوگوں سے حفاظت کرے۔ قضائے حاجت اور بیت الخلاء جانے کے آداب کا خیال رکھے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَیُکرَہُ أَنْ یَبُولَ قَائِمًا أَوْ مُضطَجِعًا أَوْ مُتَجَرِّدًا عَنْ ثَوبِہٖ مِن غَیرِعُذْرٍ فَاِنْ کَانَ بِعُذْرٍ فَلَا بَأسَ بِہٖ، فَاِذَا أَرَادَ أَنْ یَبُولَ وَکَانَتِ الأَرضُ صُلْبَۃً دَقَّھَا بِحَجَرٍ أَوْ حَفَرَ حَفِیرَۃً حَتّٰی لَا یَتَرَشَّشُ عَلَیہِ البَولُ"۔

ترجمہ: "کسی عذر کے بغیر کھڑے ہوکر یا لیٹ کر یا برہنہ ہوکر پیشاب کرنا مکروہ ہے، اگر کسی عذر کے سبب ہو تو کوئی حرج نہیں، ایسی سخت زمین پر جس پر پیشاب کرنا ہو تو ایسی جگہ کو کرید کر نرم کرلے یا گڑھا کھود کر پیشاب کرے، تاکہ اس پر پیشاب کی چھینٹیں نہ پڑیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد1، ص:50)"۔

آپ سے جس حد تک ممکن ہو، پیشاب کے چھینٹوں سے بچنے کی کوشش کریں اور

طہارت وپاکیزگی اختیار کرنے کی کوشش کریں۔مذکورہ بالا کاروباری متعلقین کا رویہ نامناسب ہے،اُنہیں اپنے اس حقارت آمیز رویے پرغور کرنا چاہیے،معذوری انسان کے اختیار میں نہیں ہے،حدیث پاک میں ہے:

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ لَقِيَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي طَرِيقٍ مِنْ طُرُقِ الْمَدِينَةِ وَهُوَ جُنُبٌ فَانْسَلَّ فَذَهَبَ فَاغْتَسَلَ، فَتَفَقَّدَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا جَاءَهُ قَالَ:أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟، قَالَ:يَا رَسُولَ اللهِ! لَقِيتَنِي وَأَنَا جُنُبٌ فَكَرِهْتُ أَنْ أُجَالِسَكَ حَتَّى أَغْتَسِلَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:سُبْحَانَ اللهِ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ“۔

ترجمہ:”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: مدینے کے ایک راستے میں ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس حال میں آمنا سامنا ہوا کہ وہ جنبی تھے،پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ چپکے سے نکل کر چلے گئے اور غسل کیا۔اس دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو تلاش کیا،پس جب وہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا: ابوہریرہ!تم کہاں تھے؟،انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جب میرا آپ سے سامنا ہوا تو اس وقت میں جُنبی تھا،تو میں نے غسلِ جنابت سے پہلے آپ کی مجلس میں بیٹھنا پسند نہ کیا(یعنی خلافِ ادب سمجھا)،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (اے ابوہریرہ!) سبحان اللہ! مومن نجس نہیں ہوتا،(صحیح مسلم:371)“۔یعنی اگر جسم پر کوئی حسّی نجاست نہ لگی ہو تو جنبی انسان دوسرے انسان سے مصافحہ کرسکتا ہے،مل سکتا ہے یا کسی مجلس میں بیٹھ سکتا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ یحیٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”هٰذَا الْحَدِيثُ أَصْلٌ عَظِيمٌ فِي طَهَارَةِ الْمُسْلِمِ حَيًّا وَمَيْتاً“۔

ترجمہ:”یہ حدیث مسلمانوں کی طہارت کے بارے میں اصلِ عظیم ہے،خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ،(شرح النووی،جلد4،ص:57)“۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جنابت یا نفاس یا حدث (بے وضو ہونے) کی ناپاکی معنوی ہے،صوری نہیں ہے۔اگر کسی کے جسم یا لباس پر

معذوری کے سبب پیشاب کے قطرے پڑ گئے ہوں اور اب اس کا لباس یا جسم خشک ہے، تو کسی جگہ یا انسان کے لباس یا جسم کے ساتھ مَس ہونے سے وہ جگہ یا لباس یا جسم ناپاک نہیں ہوتا، کیونکہ حسی ناپاکی اور معنوی ناپاکی میں فرق ہے۔ البتہ اگر پیشاب کے قطرے کپڑے یا جسم کے حصے پر لگے ہوں، وہ ابھی گیلا ہے اور کسی دوسرے شخص کے لباس سے گیلا حصہ مَس ہوا اور پیشاب کا اثر پہنچا تو اتنی جگہ ناپاک ہو جائے گی اور دھونے سے پاک ہو جائے گی، اس بنا پر کسی سے نفرت جائز نہیں ہے، البتہ احتیاط سب پر لازم ہے۔ مغربی ممالک میں معذوروں کے لیے رفع حاجت اور صفائی کے خصوصی انتظامات ہوتے ہیں، ہمارے ہاں بھی اس کا انتظام ہونا چاہیے۔

شریعت نے معذور کو بہت رعایت دی ہے۔ ایسا شخص جس کا کسی مرض کے سبب وضو قائم نہ رہتا ہو اور وہ عذر نماز کے پورے وقت کو اس طرح گھیر لے کہ اس عذر کے بغیر وہ فرض نماز بھی ادا نہ کر سکے، یعنی اتنی دیر تک اپنا وضو قائم رکھنے پر قادر نہ ہو کہ ایک وقت کی فرض نماز پوری پڑھ لے، فقہی اصطلاح میں ایسے شخص کو ''شرعی معذور'' کہا جاتا ہے۔

بار بار عذر لاحق ہونے کی وجہ سے شرعاً اُسے یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ایک وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرے اور اُس وقت میں اس عذر کے سبب وضو ٹوٹنے کے باوجود فرض، سنّت، نوافل، قضا، تلاوت الغرض جو عبادات کرنا چاہے، کر لے۔ تاہم اگلی نماز کا وقت داخل ہونے پر تازہ وضو کرے اور پھر اُس نماز کا وقت ختم ہونے تک عذری حدث لاحق ہونے کے باوجود یہ تمام عبادات ادا کر سکتا ہے اور عذر کی بنا پر مقبول ہیں، البتہ اگر اس مرض معذوری کے علاوہ وضو کے فاسد ہونے کا کوئی اور سبب پایا جائے، تو وقت کے اندر بھی وضو ٹوٹ جائے گا، مثلاً بدن سے خون نکل آیا یا ریح خارج ہوگئی یا منہ بھر کر قے آ گئی وغیرہ، مگر ہر نئی نماز کا وقت داخل ہونے پر اسے تازہ وضو کرنا ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَاضَةُ وَمَنْ بِهٖ سَلَسُ الْبَوْلِ أَوِاسْتِطْلَاقُ الْبَطْنِ أَوِانْفِلَاتُ الرِّيْحِ أَوْ رُعَافٌ

دَائِمٍ أَوْ جُرْحٍ لَا يَرْقَأُ يَتَوَضَّئُونَ لِوَقْتِ كُلِّ صَلَاةٍ وَيُصَلُّونَ بِذٰلِكَ الْوُضُوْءِ فِي الْوَقْتِ مَاشَآءُوْا مِنَ الْفَرَائِضِ وَالنَّوَافِلِ هٰكَذَا فِي "الْبَحْرِ الرَّائِقِ"۔

ترجمہ: "مستحاضہ (وہ خاتون جسے سیلان الرحم کی بیماری لاحق ہے)، جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا مسلسل دست کی بیماری (DIARRHOEA) ہو یا ریح (یعنی ہوا) خارج ہوتی ہو یا دائمی نکسیر جاری ہو یا زخم جو مسلسل رستا رہتا ہو، تو ایسے معذور ہر نماز کے وقت کے لیے تازہ وضو کریں اور اُس وقت کے اندر فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کریں، جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے"۔ مزید لکھتے ہیں:

"وَيَبْطُلُ الْوُضُوْءُ عِنْدَ خُرُوْجِ وَقْتِ الْمَفْرُوْضَةِ بِالْحَدَثِ السَّابِقِ هٰكَذَا فِي "الْهِدَايَةِ"۔

ترجمہ: "دائمی معذور کا وضو سابق حدث کی وجہ سے فرض نماز کا وقت نکل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ "ھدایہ" میں ہے"۔ یعنی اگلے وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 41)"۔

علامہ شیخ احمد طحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ معذور کے شرعی احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وَمَنْ بِهٖ عُذْرٌ كَسَلَسِ بَوْلٍ أَوِ اسْتِطْلَاقِ بَطْنٍ) وَانْفِلَاتِ رِيْحٍ وَرُعَافٍ دَائِمٍ وَجُرْحٍ لَا يَرْقَأُ وَلَا يُمْكِنُ حَبْسُهٗ بِحَشْوٍ مِنْ غَيْرِ مَشَقَّةٍ وَلَا بِجُلُوْسٍ فَبِهٰذَا يَتَوَضَّئُوْنَ (لِوَقْتِ كُلِّ فَرْضٍ) لَا لِكُلِّ فَرْضٍ وَلَا نَفْلٍ، لِقَوْلِهٖ ﷺ: "الْمُسْتَحَاضَةُ تَتَوَضَّأُ لِوَقْتِ صَلَاةٍ" رَوَاهُ سِبْطُ ابْنِ الْجَوْزِيِّ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى، فَسَائِرُ ذَوِي الْأَعْذَارِ فِيْ حُكْمِ الْمُسْتَحَاضَةِ، فَالدَّلِيْلُ يَشْمَلُهُمْ (وَيُصَلُّوْنَ بِهٖ) أَيْ بِوُضُوْئِهِمْ فِي الْوَقْتِ (مَاشَآءُوْا مِنَ الْفَرَائِضِ) أَدَاءً لِلْوَقْتِيَّةِ وَقَضَاءً لِغَيْرِهَا وَلَوْلَزِمَ الذِّمَّةُ زَمَانَ الصِّحَّةِ (وَ) مَا شَآءُوْا مِنَ (النَّوَافِلِ) وَالْوَاجِبَاتِ كَالْوِتْرِ وَالْعِيْدِ وَصَلَاةِ جَنَازَةٍ وَطَوَافٍ وَمَسِّ مُصْحَفٍ"۔

ترجمہ: "جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا دست کی بیماری ہو یا ریح خارج ہوتی ہو یا نکسیر جاری ہو یا زخم مسلسل رستا رہتا ہو اور مشقت کے بغیر اسے روکنا ممکن نہ ہو اور نہ بیٹھ کر

روک سکتا ہو، تو ایسے عذر والے ہر نماز کے وقت میں ایک بار تازہ وضو کریں اور جب تک اُس نماز کا وقت باقی ہے، فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ''مستحاضہ ہر نماز کے وقت میں تازہ وضو کرے''۔ اس حدیث کو سبط بن جوزی نے حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا، پس تمام عذر والے مستحاضہ کے حکم میں ہیں، اور یہ دلیل اُن سب کو شامل ہے اور وہ اُس وضو سے جس قدر چاہیں (فرض) نماز پڑھیں، وقت کی ادا یا قضا نماز اور اگر زمانۂ صحت کی کوئی نماز اُس کی قضا ہوگئی تھی تو وہ بھی ادا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جس قدر چاہے نوافل اور واجبات اسی وضو سے ادا کر سکتے ہیں، مثلاً وتر، عید کی نماز، نمازِ جنازہ اور طواف اور مُصحف (قرآن مجید) کو چھونا، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد اوّل، ص: 212، 213)''۔

خواتین کی سیلان الرحم کی بیماری میں طہارت کا طریقہ

سوال:

بعض خواتین میں لیکوریا یعنی رحم سے پانی خارج ہونے کی شکایت پائی جاتی ہے، نماز پڑھنے والی خواتین کے لیے اس کی طہارت کا طریقہ کیا ہے؟، (نامعلوم)۔

جواب:

عورت کے فرج سے سفید یا پیلے رنگ کی جو رطوبت خارج ہوتی ہے، اُسے سیلان الرحم کہتے ہیں اور طبی اصطلاح میں اسے لیکوریا (Leucorrhoea) کہا جاتا ہے۔ رحم سے یہ رطوبت نکلنے کی صورت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور طہارت کے لیے وضو کرنا ہوتا ہے، غسل واجب نہیں ہوتا۔ اِس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ رطوبت کبھی کبھار خارج ہوتی ہے، تو ایسی خاتون نماز کے لیے ہر بار استنجا و وضو کرے اور دورانِ نماز اگر پھر رطوبت خارج ہو تو اَز سرِ نو پاک ہو کر نماز پڑھے۔ اگر کپڑے کے کسی حصے پر یہ رطوبت لگی ہو، تو اُس حصے کو دھو لے۔

(۲) یہ کہ رطوبت مسلسل خارج ہوتی ہے اور اتنا وقفہ نہیں ہوتا کہ ایک وقت کی پوری نماز

طہارت کی حالت میں پڑھ لے، تو اس صورت میں یہ بیماری ہے اور ایسی خاتون معذور قرار پائے گی، جیسے زخم سے مسلسل پیپ یا خون رِسنے یا پیشاب کے قطرات ٹپکنے یا ریح خارج ہونے والا معذور قرار پاتا ہے۔

سو ایسی خاتون ہر نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد تازہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اگلی نماز کا وقت داخل ہونے تک رطوبت کا خروج جاری رہنے کے باوجود وہ فرض، سنت، نوافل اور قضا نمازیں پڑھ سکتی ہے۔ اسی طرح تلاوت بھی کر سکتی ہے اور درود و اذکار و تسبیحات بھی پڑھ سکتی ہے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْمَعَانِی النَّاقِضَةُ لِلْوُضُوْءِ کُلُّ مَایَخْرُجُ مِنَ السَّبِیْلَیْنِ، لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی: ''أَوْجَاءَ أَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَائِطِ الآیة، وَقِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: مَاالْحَدَثُ؟، قَالَ: مَایَخْرُجُ مِنَ السَّبِیْلَیْنِ، وَکَلِمَةُ مَا عَامَّةٌ فَتَتَنَاوَلُ الْمُعْتَادَ وَغَیْرَہٗ''۔

ترجمہ: ''ناقضِ وضو اسباب میں: ہر وہ چیز شامل ہے، جو انسان کی دو شرمگاہوں سے خارج ہوتی ہے، المائدہ، آیت: 6 میں تیمم کے احکام بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے وضو ٹوٹنے کے اسباب میں ایک یہ بیان فرمایا: ''یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کر کے آیا ہو''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا گیا: ''(یا رسول اللہ!) ناپاکی کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو دونوں شرمگاہوں سے خارج ہو، اور کلمہ ''ما'' عام ہے، یہ اُس ناپاکی کو بھی شامل ہے جو عادۃً خارج ہوتی ہے، اِسے صاحبِ ہدایہ نے مُعتاد (عادۃً یا معمول کے مطابق) سے تعبیر کیا ہے اور اُس کو بھی شامل ہے جو رطوبت کسی اور سبب سے خارج ہو، اِسے صاحبِ ہدایہ نے غیر مُعتاد (جو عادت یا معمول کے خلاف ہو) سے تعبیر کیا ہے، (ہدایہ، جلد 1، ص: 34-33)''۔

فتح القدیر، بدائع الصنائع، ردالمحتار، فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں نواقض وضو کے باب میں یہ مسئلہ اِسی طرح موجود ہے۔

تیمم کا طریقہ

سوال:
تیمم کیسے کرتے ہیں، کیونکہ آجکل تو گھروں میں مٹی بھی نہیں ملتی اور پتھر بھی نہیں، تو اس کا طریقہ کیا ہے؟، (محمد حذیفہ جمشید، کراچی)۔

جواب:
تیمم کے تین فرائض ہیں: (۱) نیت (۲) سارے چہرے پر ہاتھ پھیرنا (۳) دونوں ہاتھ کا کہنیوں سمیت مسح کرنا۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں کشادہ کر کے کسی ایسی چیز پر جو زمین کی جنس سے ہو ماریں اور زیادہ گرد لگ جائے تو دونوں ہاتھوں کو آپس میں ٹکرا کر جھاڑ لیں اور پھر سارے چہرے کا مسح کریں (یعنی چہرے کی ان حدود کا احاطہ کریں جن کا وضو میں دھونا فرض ہے)، پھر دوسری مرتبہ یونہیں کریں اور دونوں ہاتھوں کا ناخن سے کہنیوں سمیت مسح کریں۔ وضو اور غسلِ واجب دونوں کا تیمم ایک ہی طرح ہے۔ ہر وہ شے جو جنسِ زمین سے ہو، اُس سے تیمم کیا جاسکتا ہے۔ گھروں میں دیوار پر ہاتھ مار کر بھی تیمم کیا جاسکتا ہے۔ اشیاء پر غبار لگ جاتا ہے، اُس سے بھی تیمم جائز ہے کہ یہ چیزیں مٹی کے قائم مقام ہیں۔

نجاست کھانے والے جانوروں کا حکم

سوال:
گلی کوچوں اور کھیتوں میں کھلی پھرنے والی مرغیاں جو ہر چیز کھا لیتی ہیں، کیا ان کا کھانا انسان کے لیے حلال ہے؟، (صفیہ سمیرا)۔

جواب:
ایسی مرغی جو گلی کوچوں میں پھرتی ہو، اُس کو ''دَجَاجَةُ الْمُخَلَّاة'' کہتے ہیں، ایسی مرغی کو کچھ عرصہ باندھ کر یا بند کر کے پاک غذا دی جائے تا کہ اس کے پیٹ سے کھائی ہوئی

نجاست کا اثر زائل ہو جائے، چونکہ مرغی کی غذا مخلوط ہوتی ہے، اس لیے ایسی مرغی کا کھانا مکروہ نہیں ہے، اُسے کھانا بلا کراہت جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

"عَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی فِی النَّاقَةِ الْجَلَّالَةِ وَالشَّاةِ الْجَلَّالَةِ وَالْبَقَرَةِ الْجَلَّالَةِ إِنَّمَا تَكُونُ جَلَّالَةً إِذَا أَنْتَنَ وَتَغَيَّرَ لَحْمُهَا وَوُجِدَتْ مِنْهُ رِيحٌ مُنْتِنَةٌ فَهِيَ الْجَلَّالَةُ حِينَئِذٍ، لَا يُشْرَبُ لَبَنُهَا وَلَا يُؤْكَلُ لَحْمُهَا، وَبَيْعُهَا، وَهِبَتُهَا جَائِزٌ هٰذَا إِذَا كَانَتْ لَا تَخْلُطُ وَلَا تَأْكُلُ إِلَّا الْعَذِرَةَ غَالِبًا، فَإِنْ خَلَطَتْ فَلَيْسَتْ بِجَلَّالَةٍ فَلَا تُكْرَهُ، لِأَنَّهَا لَا تَنْتُنُ، وَلَا يُكْرَهُ أَكْلُ الدَّجَاجِ الْمُخَلّٰى، وَإِنْ كَانَ يَتَنَاوَلُ النَّجَاسَةَ، لِأَنَّهُ لَا يَغْلِبُ عَلَيْهِ أَكْلُ النَّجَاسَةِ بَلْ يَخْلُطُهَا بِغَيْرِهَا وَهُوَ الْحَبُّ، وَالْأَفْضَلُ أَنْ يَحْبِسَ الدَّجَاجَ حَتّٰى يَذْهَبَ مَا فِي بَطْنِهَا مِنَ النَّجَاسَةِ، كَذَا فِي الْبَدَائِعِ"۔

ترجمہ: "امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: جلّالہ اونٹنی، جلّالہ بکری اور جلّالہ گائے، اُس صورت میں جلّالہ شمار ہوں گی، جب اُن کا گوشت بدبودار اور متغیر ہو جائے اور اُس میں بدبو پائی جائے، پس وہ جلّالہ ہے، نہ اُس کا دودھ پیا جائے اور نہ ہی اُس کا گوشت کھایا جائے، البتہ اُس کی خرید و فروخت اور ہبہ جائز ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ جب گندگی ان کی غالب غذا ہو اور اگر وہ مخلوط غذا کھائیں تو پھر جلّالہ نہیں ہے، اس لیے مکروہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا گوشت اور دودھ بدبودار نہیں ہوتا اور گلی کوچوں میں پھر کر خوراک تلاش کرنے والی مرغی کا (کھانا) مکروہ نہیں ہے اگرچہ وہ نجاست کھاتی ہو، کیونکہ اس کی خوراک پر نجاست غالب نہیں آتی بلکہ وہ اسے صاف خوراک (یعنی دانے) کے ساتھ ملا کر کھاتی ہے اور افضل یہ ہے کہ مرغی کو اتنا وقت روکے رکھیں کہ اس کے پیٹ میں جو نجاست ہے، وہ جاتی رہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 289)"۔ خرید و فروخت اس لیے جائز ہے کہ وہ جانور اپنی اصل کے اعتبار سے حلال ہے۔

"وَفِي مُخْتَصَرِ الْمُحِيطِ: وَلَا تُكْرَهُ الدَّجَاجَةُ الْمُخَلَّاةُ وَإِنْ أَكَلَتِ النَّجَاسَةَ يَعْنِي إِذَا لَمْ

تَنْتَنَ بِهَا لِمَا تَقَدَّمَ ، لِاَنَّهَا تَخْلُطُ وَلَا يَتَغَيَّرُ لَحْمُهَا وَحَبْسُهَا اَيَّامًا تَنْزِيهٌ''۔

ترجمہ:''اور مختصر المحیط میں ہے: گلی کوچوں میں پھر کر (خوراک تلاش کرنے والی) مرغی مکروہ نہیں ہے، خواہ وہ ناپاک چیزیں ہی کھائے، یعنی جب تک (اس کا گوشت) بدبودار نہیں ہوتا، جیسا کہ گزرا، کیونکہ وہ خوراک مخلوط ہوجاتی ہے اور گوشت کو بدبودار نہیں کرتی اور چند دن روکے رکھنے سے پاک ہوجاتی ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''وَفِي التَّجْنِيسِ إِذَا كَانَ عَلَفُهَا نَجَاسَةً تُحْبَسُ الدَّجَاجَةُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَالشَّاةُ أَرْبَعَةً وَالْإِبِلُ وَالْبَقَرُ عَشَرَةً وَهُوَ الْمُخْتَارُ عَلَى الظَّاهِرِ وَقَالَ السَّرَخْسِيُّ الْأَصَحُّ عَدَمُ التَّقْدِيرِ وَتُحْبَسُ حَتَّى تَزُولَ الرَّائِحَةُ الْمُنْتِنَةُ''۔

ترجمہ:''اور ''تجنیس'' میں ہے: جب (کسی جانور نے) نجس چارہ کھایا ہو تو مرغی کو تین دن روکے رکھیں گے اور بکری کو چار دن باندھیں گے، اونٹ اور گائے کو دس دن باندھیں گے اور یہی ظاہر الروایۃ ہے۔ امام سرخسی نے فرمایا: صحیح یہ ہے کہ (اس مقصد کے لیے) دنوں کی تعداد نہ مقرر کی جائے، بلکہ اُنہیں (ان کی منہ، پسینے اور لعاب سے) بدبو کے زائل ہونے تک باندھ کر رکھا جائے، (جلد 9،ص:371، بیروت)''۔

اس سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ حلال جانور کی غذا کا ہر صورت میں حلال اور پاکیزہ ہونا ضروری نہیں ہے،، بہت سے حضرات اکثر برائلر مرغیوں کی خوراک کے بارے میں اس وجہ سے تردُّد کرتے ہیں کہ وہ ذبح کے وقت بہنے والے خون (دمِ مسفوح) اور دیگر ناپاک یا حرام چیزوں سے تیار ہوتی ہے، پس یہ مصنوعی خوراک کھلانا جائز ہے اور چونکہ یہ مصنوعی خوراک کیمیکل طریقے سے تیار ہوتی ہے، اس لیے نہ بدبودار ہوتی ہے اور نہ ہی بدبو کا اثر مرغیوں کے گوشت میں ہوتا ہے اور ماہیت بدلنے سے ویسے بھی حکم بدل جاتا ہے۔

طہارت کا مسئلہ

سوال:

میں سعودیہ میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں۔ کام کی جگہ پر رفع حاجت کیلئے کیبن ٹائپ کے ریڈی میڈ ٹوائلٹ ہوتے ہیں، ان کا طول وعرض تین تا ساڑھے تین فٹ ہوتا ہے۔ وہاں صفائی کا انتظام ناقص ہے، اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ وہاں پیشاب پاخانہ کی چھینٹوں سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے اور غیر مسلم لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، جن کی دیکھا دیکھی ہمارے لوگ بھی بڑی تعداد میں ایسا کرتے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے استنجا کر لیتے ہیں اور آگے کا حصہ بہت ہی معمولی مقدار پانی کے ساتھ دھو لیتے ہیں۔ ممکن ہے دوران صفائی استعمال شدہ پانی کے چھینٹے پینٹ یا جوتے کے اوپر گرتے ہوں، وہ پھر جا کر وہ وضو کر کے نماز پڑھتے ہیں اور انہی میں سے کوئی شخص امامت کے لیے آگے کھڑا ہو جاتا ہے، جن میں سنت کے مطابق ڈاڑھی والے لوگ بھی ہوتے ہیں، ایسے ماحول کے لیے آپ رہنمائی فرمائیں، (محمد منیر، سعودی عرب)۔

جواب:

نماز اور بعض دیگر عبادات کے لیے طہارت لازم ہے، طہارت کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں بلکہ جان بوجھ کر طہارت کے بغیر نماز ادا کرنے کو علماء نے کفر لکھا ہے، کیونکہ اس میں نماز کی اہانت ہے۔ احادیث مبارکہ میں طہارت کی بابت انتہائی تاکید فرمائی ہے:

(۱) ''مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ''۔

ترجمہ: ''طہارت نماز کی کنجی ہے، (سنن ترمذی: 3، مسند امام احمد بن حنبل: 1006)''۔

(۲) ''عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نماز جنّت کی کنجی ہے اور طہارت نماز کی کنجی ہے، (مسند امام احمد بن حنبل: 14662)''۔

(۳) ''مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الْوُضُوءُ''۔

ترجمہ: ''نماز جنت کی کنجی ہے اور طہارت نماز کی کنجی ہے، (سُنن ترمذی:4)''۔

(۴) ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ''۔

ترجمہ: ''طہارت کے بغیر نماز درجۂ قبولیت کو نہیں پاسکتی، (سُنن ترمذی:1)''۔

حدیث پاک میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے:

''عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يَبُولَ قَائِمًا''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا، (سُنن ابن ماجہ:309)''۔

''عَنْ حُذَيْفَةَ، قَالَ أَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا، ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَجِئْتُهُ بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ''۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ قوم کے کچرا گھر پر آئے، عذر کی صورت میں یہاں کوڑے کے ڈھیر کا ہونا رسول اللہ ﷺ کے لیے عذر تھا، کیونکہ وہاں بیٹھنا آپ کے شایانِ شان نہ تھا، پھر آپ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا، پھر آپ نے پانی منگایا، سو میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا، پھر آپ نے وضو کیا، (صحیح بخاری:224)''۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے اور جب کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے تو بیٹھ کر پیشاب کرنا بہ طریقِ اَولیٰ جائز ہے، امام مالک نے کہا: اگر وہ ایسی جگہ ہے، جہاں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے چھینٹیں نہیں اُڑتیں تو کوئی حرج نہیں ہے ورنہ مکروہ ہے اور عام علماء نے یہ کہا ہے کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اگر کوئی عذر ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔ حضرت انس، حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے، حضرت ابن مسعود اور ابراہیم بن سعد نے اس کو مکروہ کہا ہے، ابراہیم کھڑے ہوکر پیشاب کرنے والے کی شہادت کو جائز نہیں کہتے تھے اور ابن المنذر نے کہا:

بیٹھ کر پیشاب کرنا مستحب ہے اور کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مباح ہے اور ان میں سے ہر طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، (نعمۃ الباری، جلد 1،ص:672)''۔

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں چار حرج ہیں:

اول: بدن اور کپڑوں پر چھینٹیں پڑنا اور جسم ولباس بلاضرورت شرعیہ ناپاک کرنا اور یہ حرام ہے، البحر الرائق میں بدائع الصنائع سے منقول ہے:

أَمَّا تَنْجِيْسُ الطَّاهِرِ فَحَرَامٌ۔ ترجمہ: پاک چیز کو (بلاضرورت شرعیہ) ناپاک کرنا حرام ہے۔

دوم: ان چھینٹوں کے باعث عذاب قبر اپنے سر پر لینا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِسْتَنْزِهُوْا مِنَ الْبَوْلِ فَاِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ۔ ترجمہ: پیشاب (کے چھینٹوں) سے بچو، کیونکہ اکثر عذاب قبر پیشاب سے نہ بچنے کی بناء پر ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں پر عذاب قبر ہوتا دیکھا تو فرمایا: ان میں سے ایک تو پیشاب (کے چھینٹوں) سے نہ بچتا تھا اور دوسرا چغلخوری کرتا تھا، (رواہ اصحاب الکتب الستہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)۔

سوم: راہ گزر پر ہو یا جہاں لوگ موجود ہوں تو بے پردگی کا باعث ہوگا، بیٹھنے میں رانوں اور زانوؤں کی آڑ ہوجاتی ہے اور کھڑے ہونے میں بالکل بے ستری ہے اور یہ باعثِ لعنتِ الٰہی ہے، حدیث میں ہے: لَعَنَ اللهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَيْهِ، ترجمہ: جو (بے حیائی کے مناظر کو) دیکھے اس پر اور جو دکھائے اس پر بھی اللہ نے لعنت فرمائی ہے، (السنن الکبریٰ للبیہقی:13566)۔

چہارم: یہ نصاریٰ سے مشابہت اور ان کے مذموم طریقے میں ان کی اتباع ہے، آج کل جن کو یہاں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا جوشوق سوار ہے، اس کی علت یہی ہے اور یہ موجبِ عذاب وعقاب ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، ترجمہ: شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، (البقرۃ:168)''۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ، ترجمہ: جو کسی قوم سے مشابہت رکھے تو وہ انہی میں سے ہے، (سنن ابوداؤد: 4031، مسند البزار: 2966)۔ اس حرکت کے ممنوع، بے ادبی، جفا اور خلافِ سنت مصطفیٰ ﷺ ہونے میں صحیح اور معتمد احادیث وارد ہیں۔

پہلی حدیث: اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے (جو اس باب میں مذکور ہے) کہ نبی ﷺ بیٹھ کر ہی پیشاب فرمایا کرتے تھے۔

یہی حدیث صحیح ابوعوانہ و مستدرک حاکم میں ان لفظوں سے مروی ہے:

مَا بَالَ قَائِمًا مُنْذُ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ، ترجمہ: جب سے نبی ﷺ پر قرآن مجید اترا ہے آپ نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں فرمایا، (مسند احمد: 25045، شرح معانی الآثار: 6806، مستدرک للحاکم: 644، السنن الکبریٰ للبیہقی: 492)۔

یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اس حدیث سے علامہ ابن حجر اور علامہ عینی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا جو جواب دیا ہے وہ بھی دفع ہو گیا۔

علامہ ابن حجر اور حافظ عینی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے متعلق کہا ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو فرمایا کہ نبی ﷺ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے اور جو کہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا تم اس کی تصدیق مت کرو، تو یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے علم کے مطابق کہا ہے، وہ نبی ﷺ کے گھر کا حال بتا رہی ہیں کہ گھر میں نبی ﷺ بیٹھ کر ہی پیشاب فرماتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گھر کے باہر کا علم نہیں تھا اور گھر کے باہر نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، جو کہ کبار صحابہ میں سے ہیں، اس کو بیان کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نزولِ قرآن کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی ہیں اور فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے

نزولِ قرآن کے بعد کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں فرمایا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو اس بات پر محمول کرنا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گھر میں پیشاب کرنے کا طریقہ بتارہی ہیں اور گھر کے باہر کے احوال کا ان کو علم نہیں تھا (کما قال الحافظ والعینی) کس طرح درست ہوگا؟۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو فرمایا ہے: مَا بَالَ قَائِماً الخ یہ ضرور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو بتایا ہے کہ میں نے نزولِ قرآن کے بعد کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، وہ عذر کی بنا پر تھا اور عذر (کی بنا پر افعال) عقلاً وشرعاً مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گھر میں بیٹھ کر پیشاب کرنا ثابت ہو گیا تو باہر بطریقۂ اولیٰ بیٹھ کر پیشاب فرماتے ہوں گے، کیونکہ گھر کے باہر تو آدمی ستر کا زیادہ التزام کرتا ہے اور ادب کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری حدیث: بزار اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''ثَلَاثٌ مِنَ الْجَفَاءِ: اَن يَّبُوْلَ الرَّجُلُ قَائِمًا اَوْ يَمْسَحَ جَبْهَتَهٗ قَبْلَ اَن يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاتِهٖ اَوْيَنْفُخَ فِي سُجُوْدِهٖ''۔

ترجمہ: ''تین باتیں جفاء اور بے ادبی میں سے ہیں: (1) آدمی کھڑے ہو کر پیشاب کرے، (2) نماز میں اپنی پیشانی سے (مٹی یا پسینہ) پونچھے، (3) سجدہ کرتے وقت (زمین پر غبار صاف کرنے کے لیے) پھونک مارے، (مسند البزار: 4424، المعجم الاوسط: 5998)''۔

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ، معتمد اور صحیح ہیں۔ عمدۃ القاری میں ہے: رَوَاہُ الْبَزَّارُ بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ، اور امام ترمذی کا حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو غیر محفوظ کہنا مردود ہے۔

تیسری حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اے عمر! کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو، (وہ کہتے ہیں:) اس دن سے میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

چوتھی حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم أَن يَّبُوْلَ الرَّجُلُ

قَائِمًا،ترجمہ:نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔
امام خاتم الحفاظ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن (لغیرہٖ) ہے،(فتاویٰ رضویہ،ج:4،ص: 585_589،رضافاؤنڈیشن،لاہور)۔
اعلیٰ حضرت کے جملہ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھڑے ہوکر(کسی عذر اور ضرورت کے بغیر) پیشاب کرنا ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے۔

ایک مرتبہ ہمارے سامنے غزالیِ زماں علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ اور علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کے جواز پر بحث ہورہی تھی،تو علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری:224 کی بابت فرمایا: وہاں سید المرسلین ﷺ کے لیے عذر تھا،کیونکہ وہ کوڑے کا ڈھیر تھا اور اس پر بیٹھنا آپ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا،اس پر میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ کوڑے کا ڈھیر بالعموم نرم اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے اور اس سے چھینٹے نہیں اڑتے،یہی بات امام مالک نے فرمائی ہے،الغرض عذر اور ضرورت کی بنا پر کھڑے ہوکر پیشاب کرنا بلا کراہت جائز ہے اور عذر کے بغیر پیشاب کرنے میں دو اقوال ہیں:(1) کراہتِ تحریمی،(2) کراہتِ تنزیہی، امامِ اہلسنت نے اپنے دلائل کی روشنی میں کراہتِ تحریمی کو ترجیح دی ہے،دونوں کا فرق فقط اتنا ہے کہ کراہتِ تحریمی کی صورت میں گناہ ہوگا اور کراہتِ تنزیہی کی صورت میں گناہ نہیں ہوگا،بشرطیکہ اسے عادت نہ بنائے۔البتہ نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا آج کل مذہب بیزار،سہل پسند اور اباحتِ کُلّی کے نظریات کے حامل لوگوں کا طریقہ ہے،جو عالمی سطح پر رائج ہے اور ہمارے لوگوں کی ایک معتد بہ تعداد بھی اس میں مبتلا ہے،لیکن یہ کسی کا مذہبی شعار نہیں ہے کہ اسے ''تشبّہ بالقوم'' سے تعبیر کیا جائے،خاص طور پر پینٹ پہنے ہوئے لوگ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں،اللہ ہم سب کو اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرمائے۔

سوال میں آپ نے جن خدشات کا اظہار فرمایا،وہ درست ہیں اور کھڑے ہوکر

پیشاب کرنے میں بدن یا کپڑوں کا نجس ہونا ممکن ہے، پیشاب نجاستِ غلیظہ میں شمار ہوتا ہے اور اگر بدن یا کپڑے پر لگ جائے اور درہم سے زیادہ ہے، تو بدن اور کپڑے کا پاک کرنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی اور اگر قصداً پڑھی تو گنہگار ہوا اور اگر بہ نیتِ استخفاف (یعنی ہلکا جان کر) پڑھی تو کفر ہوا۔ اگر درہم کے برابر ہے تو پاک کرنا واجب ہے، اگر پاک کیے بغیر نماز پڑھی تو مکروہ تحریمی ہے، یعنی نماز کا دہرانا واجب ہے اور قصداً پڑھی تو گنہگار بھی ہوا اور اگر درہم سے کم ہے تو پاک کرنا سنّت ہے، بغیر پاک کیے نماز پڑھی تو نماز ہوگئی مگر خلافِ سنّت ہوئی اور اُس نماز کا دہرانا بہتر ہے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''درہم کا وزن شریعت میں اس جگہ ساڑھے چار ماشے اور زکوٰۃ میں تین ماشہ اور ایک اعشاریہ دو رتی ہے اور اگر (نجاست) پتلی ہو، جیسے آدمی کا پیشاب اور شراب تو درہم سے مراد اس کی لمبائی چوڑائی ہے اور شریعت میں اس کی مقدار ہتھیلی کی گہرائی کے برابر بتائی، یعنی ہتھیلی خوب پھیلا کر ہموار رکھیں اور اس پر آہستہ سے اتنا پانی ڈالیں کہ اس سے زیادہ پانی نہ رک سکے، اب پانی کا جتنا پھیلاؤ ہے، اتنا بڑا درہم سمجھا جائے اور اس کی مقدار تقریباً یہاں کے روپے کے برابر ہے، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:389)''۔

نوٹ: صدر الشریعہ نے زکوٰۃ کے حوالے سے درہم کا جو وزن تین ماشہ ایک اعشاریہ دو رتی بتایا ہے، اُس کی مقدار یہ بنتی ہے: 25.2 رتی یا 3049.2 ملی گرام یا 3.049 گرام۔

کپڑوں کی طہارت کا مسئلہ

سوال:

اب سے تقریباً 60 سال قبل تک گھر کے میلے کپڑے خاتون خانہ اپنے ہاتھوں سے دھویا کرتی تھیں۔ واشنگ مشین کی پاکستان میں آمد کے بعد کپڑے مشین پر دھلنے لگے۔ سہل پسندی بڑھنے لگی اور خواتین خانہ (کی اکثریت) میلے کپڑے مشین پر خود دھونے کے بجائے گھر گھر کام کرنے والی ملازمہ سے مختلف مشاہرہ پر ان کے سپرد کیے جانے لگے، جن

کی طہارت مشکوک ہوتی ہے۔ مختلف گھروں پر کپڑے دھونے کی بنا پر اُن (ملازمہ) کے پائینچے کا نصف حصہ تقریباً گیلا ہوتا ہے اور انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اُن کے ناپاک گیلے کپڑوں سے دوسرے دھلے ہوئے کپڑے مس ہورہے ہیں، اکثر ملازمہ حائضہ ہوتی ہیں۔ دھوپ میں بہرحال کپڑوں کو خشک کردیا جاتا ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ متذکرہ بالا طریقے سے دھوئے ہوئے کپڑے خشک ہونے پر پاک ہوجاتے ہیں اوران کپڑوں کو پہن کر نماز ادا کی جاسکتی ہے؟، (عدنان الحق)۔

جواب:

کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے پہلے سے استعمال شدہ ناپاک پانی واشنگ مشین سے نکال کر دوبارہ وسہ بارہ تازہ پانی ڈال کر ان کپڑوں کو مشین میں معمول کے عمل سے گزار کر نچوڑا جائے تو وہ پاک ہوجاتے ہیں، اُن کپڑوں کی طہارت مشکوک نہیں رہتی، بشرطیکہ اُن پر کوئی حسی نجاست نہ لگی ہو۔ ملازمہ کے حائض ہونے سے کپڑوں کی طہارت مشکوک نہیں ہوگی، حیض وجنب کی ناپاکی معنوی ہے، حسّی نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) ''عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أُرَجِّلُ رَأْسَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا حَائِضٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں اپنے مخصوص ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بالوں کو کنگھی کرتی تھی، (صحیح بخاری:295)''۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی لکھتے ہیں:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى مَيْمُوْنَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا، فَقَالَتْ: أَيْ بُنَيَّ مَالِي أَرَاكَ شَعِثَ الرَّأْسِ، فَقَالَ: إِنَّ أُمَّ عَمَّارٍ تُرَجِّلُنِيْ وَهِيَ الْآنَ حَائِضٌ، فَقَالَتْ: أَيْ بُنَيَّ لَيْسَتِ الْحَيْضَةُ بِالْيَدِ، كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ رَأْسَهُ فِي حُجْرِ إِحْدَانَا وَهِيَ حَائِضٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں اُمُّ المومنین حضرت

میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، انہوں نے کہا: اے بیٹے! میں کیا دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے بال پراگندہ ہیں، میں نے کہا: (میری بیوی) اُمِّ عمّار مجھے کنگھی کیا کرتی تھیں اور وہ ابھی حیض سے ہیں۔ انہوں نے کہا: اے بیٹے! حیض ہاتھوں میں نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (ہمارے) حیض کے دنوں میں (بھی) اُمّہات المؤمنین میں سے کسی کی گود میں سرمبارک رکھ دیتے تھے، (عمدۃ القاری، جلد 3، ص:383)''۔

(۲) ''عَنْ عُرْوَةَ، أَنَّهُ سُئِلَ أَتَخْدُمُنِي الحَائِضُ أَوْ تَدْنُو مِنِّي المَرْأَةُ وَهِيَ جُنُبٌ؟ فَقَالَ عُرْوَةُ: كُلُّ ذَلِكَ عَلَيَّ هَيِّنٌ، وَكُلُّ ذَلِكَ تَخْدُمُنِي وَلَيْسَ عَلَى أَحَدٍ فِي ذَلِكَ بَأْسٌ أَخْبَرَتْنِي عَائِشَةُ: أَنَّهَا كَانَتْ تُرَجِّلُ، تَعْنِي رَأْسَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهِيَ حَائِضٌ، وَرَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَئِذٍ مُجَاوِرٌ فِي المَسْجِدِ، يُدْنِي لَهَا رَأْسَهُ، وَهِيَ فِي حُجْرَتِهَا، فَتُرَجِّلُهُ وَهِيَ حَائِضٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عروہ سے سوال کیا گیا: آیا حائض (بیوی) میری خدمت کرسکتی ہے یا عورت اگر جنبی ہوتو میرے قریب ہوسکتی ہے؟ (یعنی اُس کا بدن میرے بدن سے مَس ہوسکتا ہے)، عروہ نے کہا: یہ سب چیزیں میرے اوپر آسان ہیں اوران سب حالات میں میری بیوی اس طرح میری خدمت کرتی ہے اوراس میں کسی کے لیے بھی کوئی حرج نہیں ہے، مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبردی کہ وہ اپنے ایامِ مخصوص میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سرمیں کنگھی کرتی تھیں اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد میں معتکف ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنا سرِ مبارک حضرت عائشہ کے قریب کرتے اوروہ اپنے حجرہ میں ہوتے ہوئے ایامِ مخصوص میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سرمیں کنگھی کرتیں تھیں، (صحیح بخاری:296)''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن حجر عسقلانی مُتوفّٰی 852ھ لکھتے ہیں:

''وَفِي الْحَدِيثِ دَلَالَةٌ عَلَى طَهَارَةِ بَدَنِ الْحَائِضِ وَعَرَقِهَا''۔

ترجمہ: ''یہ حدیث حائضہ کے بدن اوراُس کے پسینے کے پاک ہونے پر دلالت کرتی ہے، (فتح الباری، جلد 1، ص:401)''۔

"عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَاوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ، فَقُلْتُ: إِنِّي حَائِضٌ، قَالَ: إِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِي يَدِكِ"۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر سے مجھ سے فرمایا: مجھے چٹائی دیدو، میں نے عرض کی: میں حیض سے ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، (مُصنف ابن ابی شیبہ: 7412)"۔ یعنی حیض وجنابت کی ناپاکی معنوی ہے، حسی نہیں ہے۔

علامہ ابن رجب حنبلی مُتوفّٰی 736ھ لکھتے ہیں:

"فَبَدَنُ الْحَائِضِ طَاهِرٌ، وَعَرَقُهَا وَسُؤْرُهَا كَالْجُنُبِ، وَحَكَى الْإِجْمَاعَ عَلٰى ذٰلِكَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ، وَسُئِلَ حَمَّادٌ هَلْ تَغْسِلُ الْحَائِضُ ثَوْبَهَا مِنْ عِرْقِهَا؟، فَقَالَ: إِنَّمَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ الْمَجُوسُ۔۔۔۔۔۔أَبُو حَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ يَقُولُونَ عَلٰى بَدَنِ الْجُنُبِ، وَأَعْضَاءِ الْمُحْدِثِ نَجَاسَةٌ حُكْمِيَّةٌ"۔

ترجمہ: "جُنُبی شخص کی طرح حائض کا بدن، جوٹھا اور پسینہ پاک ہے، اس پر مُتعدد علماء کا اجماع ہے، حماد سے سوال کیا گیا: آیا حائض اپنے پسینہ سے آلودہ کپڑوں کو دھوئے گی؟، اُنہوں نے کہا: یہ کام صرف مجوس کرتے ہیں"۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: "امام ابوحنیفہ اوران کے اصحاب یہ کہتے ہیں: جنبی اور حائض کے بدن پر نجاست حکمیہ ہوتی ہے"، (فتح الباری لابن رجب، جلد 1، ص: 402)"۔ ان اَحادیث کا سیاق وسباق یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں حائض عورت کے بدن کو ناپاک سمجھ کر اسے اپنے سے دور رکھتے تھے، اسی طرح ہمارے ملک کے شمالی علاقے چترال میں جو "کیلاش" قبیلہ رہتا ہے، وہ بھی حائض عورتوں کو حسی طور پر ناپاک سمجھتے ہیں۔

نماز کے مسائل

اِقامت کا مفصّل و مدلّل مسئلہ

سوال:

چند روز قبل ہماری مسجد کے امام صاحب نے مسئلہ بیان فرمایا کہ: ''اِقامت نماز سے قبل پڑھی جاتی ہے، بیٹھ کر سننا سنت ہے اور ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' پر کھڑا ہونا چاہیے، اس سے قبل نمازی کا کھڑا ہونا مکروہ عمل ہے''۔ میں اس دن سے عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہوں، اپنی 67 سالہ عمر میں اللہ اکبر کے ساتھ ہی کھڑا ہوا کرتا تھا، اگر میرا یہ عمل مکروہ ہے تو اس عرصہ میں ادا کی گئی نمازوں کا کیا ہوا۔ حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوئی، وہاں بھی اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ ہی صفیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کو اللہ اکبر کے ساتھ مساجد میں صف بندی کرتے ہوئے دیکھا ہے، ان کی نمازوں کا کیا ہوگا۔ مجھے امام صاحب کی علمی کمی یا ان پر بالا دستی مطلوب نہیں، اپنے اعمال کی درستگی اور گزشتہ نمازوں کی فکر ہے کیونکہ میرے نزدیک مکروہ عمل کے آغاز کے ساتھ کسی عبادت کی قبولیت ممکن نہیں ہوسکتی، (سرفراز احمد، قیوم آباد، کراچی)۔

جواب:

لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہے، اِقامت کہی جاتی ہے، یہ امرِ مشروع ہے اور سنّتِ مُتوارثہ ہے، اس کے کلمات حدیث سے ثابت ہیں، اسی کو ہمارے عرف میں ''تکبیر'' بھی کہا جاتا ہے اِقامت کی اصطلاح ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' کے کلمے سے اور ''تکبیر'' کی اصطلاح اس کے پہلے کلمے ''اللہ اکبر'' سے مستفاد ہے۔ جماعت کے لیے اقامت کے وقت مقتدی کب کھڑے ہوں، اس کے بارے میں احادیث مبارکہ میں کوئی صریح حکم مذکور نہیں ہے، ماسوا صحیح مسلم کی اس حدیث کے کہ ''لَاتَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ'' (جب تک تم مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو)۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ جماعت کھڑی ہونے کے وقت حجرۂ انور سے باہر

تشریف لاتے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نظریں حجرۂ انور کی طرف جمی رہتیں، جوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نکلتے، وہ اقامت شروع کردیتے اور صحابۂ کرام بھی فوراً کھڑے ہوجاتے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي قَتَادَةَ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُومُوا حَتّٰى تَرَوْنِي''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: جب نماز کے لیے اِقامت کہی جائے، تو جب تک تم مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو، (صحیح مسلم: 604)''۔

اس حدیث کے تحت امام یحییٰ بن شرف نووی رحمہ اللہ علیہ نے یہ روایات بیان کی ہیں:

''فِي رِوَايَةِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَقُمْنَا فَعَدَلْنَا الصُّفُوفَ قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَفِي رِوَايَةٍ: أَنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ تُقَامُ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ قَبْلَ أَنْ يَقُومَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامَهُ، وَفِي رِوَايَةِ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: كَانَ بِلَالٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يُؤَذِّنُ إِذَا دَحَضَتْ وَلَا يُقِيمُ حَتّٰى يَخْرُجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِذَا خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ''۔

ترجمہ: ''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے: ''نماز کے لیے اقامت کہی گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (کے اپنے حجرۂ انور سے) نکلنے سے پہلے ہم کھڑے ہوئے اور ہم نے صفیں درست کیں''۔ اور ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امامت کے لیے اقامت کہی جاتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے امامت کی جگہ کھڑے ہونے سے پہلے لوگ صفیں درست کرنے لگ جاتے''۔ جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں: جب (بارش کے سبب) زمین پھسلن والی ہوتی تو بلال اذان دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نکلنے سے پہلے اِقامت نہ کہتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نکلتے تو انہیں دیکھ کر اِقامت کہتے''۔

اس کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ الْقَاضِي عِيَاضٌ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ: يُجْمَعُ بَيْنَ مُخْتَلَفِ هٰذِهِ الْأَحَادِيثِ بِأَنَّ بِلَالًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَانَ يُرَاقِبُ خُرُوجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَيْثُ لَا يَرَاهُ غَيْرُهُ أَوْ إِلَّا الْقَلِيلُ، فَعِنْدَ أَوَّلِ خُرُوجِهِ يُقِيمُ وَلَا يَقُومُ النَّاسُ حَتّٰى يَرَوْهُ ثُمَّ لَا يَقُومُ مَقَامَهُ حَتّٰى يَعْدِلُوا الصُّفُوفَ وَقَوْلُهُ فِي رِوَايَةِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ قَبْلَ خُرُوجِهِ لَعَلَّهُ كَانَ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ وَنَحْوَهُمَا لِبَيَانِ الْجَوَازِ أَوْ لِعُذْرٍ وَلَعَلَّ قَوْلَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا تَقُومُوا حَتّٰى تَرَوْنِي كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ، قَالَ الْعُلَمَاءُ وَالنَّهْيُ عَنِ الْقِيَامِ قَبْلَ أَنْ يَرَوْهُ لِئَلَّا يَطُولَ عَلَيْهِمُ الْقِيَامُ، وَلِأَنَّهُ قَدْ يَعْرِضُ لَهُ عَارِضٌ فَيَتَأَخَّرُ بِسَبَبِهِ وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ مِنَ السَّلَفِ فَمَنْ بَعْدَهُمْ مَتٰى يَقُومُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ وَمَتٰى يُكَبِّرُ الْإِمَامُ، فَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ وَطَائِفَةٍ أَنَّهُ يُسْتَحَبُّ أَنْ لَّا يَقُومَ أَحَدٌ حَتّٰى يَفْرُغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْإِقَامَةِ وَنَقَلَ الْقَاضِي عِيَاضٌ عَنْ مَالِكٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ وَعَامَّةِ الْعُلَمَاءِ أَنَّهُ يُسْتَحَبُّ أَنْ يَقُومُوا إِذَا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ، وَكَانَ أَنَسٌ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ يَقُومُ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ وَبِهِ قَالَ أَحْمَدُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ، وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَالْكُوفِيُّونَ يَقُومُونَ فِي الصَّفِّ إِذَا قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ فَإِذَا قَالَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، كَبَّرَ الْإِمَامُ، وَقَالَ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ لَا يُكَبِّرُ الْإِمَامُ حَتّٰى يَفْرُغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْإِقَامَةِ، وَقَوْلُهُ قُمْنَا فَعَدَلْنَا الصُّفُوفَ إِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ هٰذِهِ سُنَّةٌ مَعْهُودَةٌ عِنْدَهُمْ وَقَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى اسْتِحْبَابِ تَعْدِيلِ الصُّفُوفِ وَالتَّرَاصِّ فِيهَا وَقَدْ سَبَقَ بَيَانُهُ فِي بَابِهِ قَوْلُهُ فَأَتٰى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى إِذَا قَامَ فِي مُصَلَّاهُ قَبْلَ أَنْ يُكَبِّرَ ذَكَرَ فَانْصَرَفَ وَقَالَ لَنَا مَكَانَكُمْ فَلَمْ نَزَلْ قِيَامًا نَنْتَظِرُهُ حَتّٰى خَرَجَ إِلَيْنَا وَقَدِ اغْتَسَلَ"۔

ترجمہ: "قاضی عیاض کہتے ہیں: ان احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ ایسی جگہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ رہے ہوتے، جہاں سے اور صحابہ نہ دیکھ پاتے یا بہت کم

لوگ دیکھ پاتے، پس حضرت بلال آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نکلتے ہوئے دیکھتے ہی اِقامت شروع کردیتے اور لوگ (عام نمازی) جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خود نہ دیکھتے کھڑے نہ ہوتے، پھر جب تک صحابہؓ صفیں برابر نہ کرلیتے، آپ مصلائے امامت پر نہ کھڑے ہوتے اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں جو یہ الفاظ ہیں: ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نکلنے سے پہلے لوگ صفیں بنانے لگ جاتے''، شاید یہ ایک دو یا چند بار بیانِ جواز کے لیے یا کسی عذر کے سبب ہوا ہوگا (کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تاخیر سے نکلے) اور شاید اسی کے بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہوگا: ''جب تک مجھے (خود) نہ دیکھ لو، مت کھڑے ہوا کرو''۔ علماء نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھنے سے پہلے کھڑے ہونے سے روکنے کا سبب یہ تھا کہ ان کا قیام طویل نہ ہوجائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کبھی کوئی حاجت درپیش ہونے کے سبب نکلنے میں تاخیر فرمادیتے۔ علمائے سَلَف اور ان کے بعد والوں میں اختلاف رائے ہوا کہ لوگ نماز کے لیے کب کھڑے ہوں اور امام تکبیر تحریمہ کب کہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ مؤذن کے اِقامت ختم ہونے سے پہلے لوگ کھڑے نہ ہوں۔ اور قاضی عیاض نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور عام علماء سے روایت کیا: جب مؤذن اقامت شروع کرے تو مستحب یہ ہے کہ لوگ کھڑے ہوجائیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ اس وقت کھڑے ہوا کرتے تھے: جب مؤذن: ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' کہتا اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور علمائے کوفہ نے کہا: اور جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ'' کہے، تو لوگ کھڑے ہوں اور جب وہ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' کہے، تو امام تکبیر تحریمہ کہے، اور سَلَف سے لے کر خَلَف تک جمہور علماء نے کہا ہے: مؤذن کے اقامت سے فارغ ہونے تک امام تکبیرِ تحریمہ نہ کہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''ہم کھڑے ہوئے اور صفیں برابر کیں''، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہاں یہ طریقہ رائج تھا۔ اور تمام علماء کے نزدیک صفیں برابر کرنا اور مل کر کھڑا ہونا مُستحب ہے اور اس کی تفصیل اس کے باب میں گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم :605 میں ہے: ابو ہریرہ کا یہ قول: ''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اِقامت کے بعد امامت کی جگہ تشریف لے آئے، پھر آپ کچھ

یاد آنے پر چلے گئے اور ہم سے فرمایا: ''اپنی جگہ کھڑے رہو''، پھر ہم قیام کی حالت میں انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ غسل فرما کر تشریف لے آئے، (صحیح مسلم بشرح النووی، جلد 5، ص:88-87)''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت اقامت کے بعد تکبیر تحریمہ کے لیے معمولی تاخیر کی جاسکتی ہے، پس اگر امام محسوس کرے کہ صفیں درست نہیں ہوئیں، تو وہ چند ثانیے یا ایک دو منٹ تاخیر بھی کرسکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَيُسْتَحَبُّ أَن يَّقُوْمَ إِلَى الصَّلَاةِ عِنْدَ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، وَبِهٰذَا قَالَ مَالِكٌ، قَالَ ابْنُ الْمُنْذِرِ: عَلٰى هٰذَا أَهْلُ الْحَرَمَيْنِ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ: يَقُوْمُ إِذَا فَرَغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْإِقَامَةِ''۔

ترجمہ: ''اور مستحب یہ ہے کہ مؤذن کے قول ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاة'' پر (مقتدی) نماز کے لیے کھڑے ہوجائیں اور امام مالک نے بھی یہی کہا، ابن المنذر نے کہا: اسی پر اہل حرمین کا تعامل ہے اور امام شافعی نے کہا: مؤذن کے اقامت سے فارغ ہونے کے بعد (مقتدی جماعت کے لیے) کھڑے ہوں''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَإِنَّمَا قُلْنَا إِنَّهُ يَقُوْمُ عِنْدَ قَوْلِهِ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، لِأَنَّ هٰذَا خَبَرٌ بِمَعْنَى الْأَمْرِ، وَمَقْصُوْدُهُ الْإِعْلَامُ، لِيَقُوْمُوْا، فَيُسْتَحَبُّ الْمُبَادَرَةُ إِلَى الْقِيَامِ امْتِثَالًا لِلْأَمْرِ، وَتَحْصِيلًا لِلْمَقْصُوْدِ، وَلَا يُكَبِّرُ حَتّٰى فَرَغَ الْمُؤَذِّنُ، لِأَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِنَّمَا كَانَ يُكَبِّرُ بَعْدَ فَرَاغِهٖ''۔

ترجمہ: ''یہ جو ہم نے کہا: وہ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاة'' کہتے وقت کھڑا ہوگا، تو یہ اس لیے کہ یہ خبر حکم کے معنیٰ میں ہے اور اس کا مقصد اِعلام (بتانا) ہے تاکہ لوگ کھڑے ہوں، تو اَمر کی تعمیل اور مقصد کے حصول کے لیے کھڑے ہونے میں جلدی کرنا مستحب ہے، اور امام اُس وقت تک تکبیر تحریمہ نہ کہے، جب تک مؤذن اقامت سے فارغ نہ ہوجائے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مؤذن کے فارغ ہونے کے بعد تکبیر کہا کرتے تھے، (المغنی، جلد 2، ص: 6، قاہرہ)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"لَایَقُوْمُ الْمُصَلُّوْنَ لِلصَّلَاةِ عِنْدَ الْاِقَامَةِ حَتّٰی یَقُوْمَ الْاِمَامُ أَوْ یُقْبِلَ لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: اِذَا أُقِیْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ، وَأَمَّا تَعْیِیْنُ وَقْتِ قِیَامِ الْمُؤْتَمِّیْنَ اِلَی الصَّلَاةِ فَقَالَ الْمَالِکِیَّةُ یَجُوْزُ لِلْمُصَلِّی الْقِیَامُ حَالَ الْاِقَامَةِ أَوْ أَوَّلَهَا أَوْ بَعْدَهَا، فَلَا یُطْلَبُ لَهٗ تَعْیِیْنُ حَالٍ، بَلْ بِقَدْرِ الطَّاقَةِ لِلنَّاسِ، فَمِنْهُمُ الثَّقِیْلُ وَالْخَفِیْفُ، وَقَالَ الْحَنَفِیَّةُ یَقُوْمُ عِنْدَ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ وَبَعْدَ قِیَامِ الْاِمَامِ، وَقَالَ الشَّافِعِیَّةُ یُسْتَحَبُّ أَنْ یَّقُوْمَ الْمُصَلِّیْ بَعْدَ اِنْتِهَاءِ الْاِقَامَةِ اِذَا کَانَ الْاِمَامُ مَعَ الْمُصَلِّیْنَ فِی الْمَسْجِدِ، وَکَانَ یَقْدِرُ عَلَی الْقِیَامِ بِسُرْعَةٍ، بِحَیْثُ یُدْرِكُ فَضِیْلَةَ تَکْبِیْرَةِ الْاِحْرَامِ، وَاِلَّا قَامَ قَبْلَ ذٰلِكَ بِحَیْثُ یُدْرِکُهَا"۔

ترجمہ: "لوگ اقامت کے وقت نماز کے لیے نہ کھڑے ہوں، یہاں تک کہ امام کھڑا ہوجائے یا آگے بڑھے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو"۔ جہاں تک مقتدیوں کا جماعت کے لیے کھڑے ہونے کے وقت کی تعیین کا معاملہ ہے، تو مالکیہ نے کہا: نمازی کے لیے اقامت کے دوران یا اس سے پہلے یا اس کے بعد تمام صورتوں میں کھڑا ہونا جائز ہے، کسی خاص مرحلے پر کھڑا ہونے کی تعیین کا مطالبہ نہ کیا جائے، بلکہ لوگ اپنے حسبِ حال کھڑے ہوسکتے ہیں، کیونکہ کوئی بھاری (جسامت والا) ہوتا ہے اور کوئی ہلکا۔ اور اَحناف نے کہا: "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" پر اور امام کے کھڑے ہونے کے بعد کھڑے ہوں۔ اور شافعیہ کا قول یہ ہے کہ جب امام نمازیوں کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو نمازی اقامت کے ختم ہونے پر کھڑے ہوں، نمازی فوری کھڑے ہونے پر قدرت رکھتا ہے، تو وہ تکبیرِ تحریمہ کی فضیلت کو پالے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ پہلے سے کھڑا ہوجائے تاکہ اس فضیلت کو پالے، (الفقہ الاسلامی وأدلتہ، جلد 1، ص: 719، دمشق)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ عِنْدَ الْاِقَامَةِ يُكْرَهُ لَهُ الْاِنْتِظَارُ قَائِماً، وَلٰكِنْ يَقْعُدُ، ثُمَّ يَقُوْمُ اِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَوْلَهُ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ كَذَا فِي الْمُضْمَرَاتِ''۔

ترجمہ: ''جب کوئی شخص اقامت کے وقت مسجد میں داخل ہو، تو اُسے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے، بلکہ بیٹھ جائے، جب مؤذن ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' پر پہنچے، تو کھڑا ہو، جیسا کہ ''مُضمرات'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 57)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''آج کل اکثر جگہ رواج پڑ گیا ہے کہ وقتِ اقامت سب لوگ کھڑے رہتے ہیں بلکہ اکثر جگہ تو یہاں تک ہے کہ جب تک امام مُصلّے پر کھڑا نہ ہو، اُس وقت تک تکبیر نہیں کہی جاتی، یہ خلافِ سنّت ہے، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 471)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ الْعَزِیْز سے سوال کیا گیا: ''زید دعویٰ کرتا ہے کہ جب تک سب مقتدی کھڑے نہ ہولیں اور صف سیدھی نہ ہو اور امام اپنی جانماز پر کھڑا نہ ہو، تب تک اقامت نہ کہی جائے۔ اور عَمرو دعویٰ کرتا ہے کہ مقتدی اور امام کو پہلے ہی سے کھڑا ہونا ضروری نہیں بلکہ جب اقامت کہتے ہوئے مؤذن ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' تک پہنچ جائے، اُس وقت امام و مقتدی کھڑے ہوجائیں اور جس وقت ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کہے، تب امام تکبیر کہے، اب ان دونوں میں کون حق پر ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''عَمرو حق پر ہے، کھڑے ہوکر تکبیر سننا مکروہ ہے، یہاں تک کہ علماء حکم فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں آیا اور تکبیر ہورہی ہے، وہ اس کے تمام تک کھڑا نہ رہے، بلکہ بیٹھ جائے، یہاں تک کہ مکبّر ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' تک پہنچے، اُس وقت کھڑا ہو، ''وِقایہ'' میں ہے:

''يَقُوْمُ الْاِمَامُ وَالْقَوْمُ عِنْدَ ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' وَيَشْرَعُ عِنْدَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ''۔

ترجمہ: ''امام اور نمازی ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' پر کھڑے ہوں اور ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ'' کے الفاظ پر امام نماز شروع کردے''۔

''محیط'' و ''ہندیہ'' میں ہے:

''يَقُومُ الْإِمَامُ وَالْقَومُ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، عِنْدَ عُلَمَائِنَا الثَّلٰثَةِ، هُوَ الصَّحِيْحُ''۔

ترجمہ: ''ہمارے تینوں ائمہ کے نزدیک جب اقامت کہنے والا ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہے، تو اُس وقت امام اور تمام نمازی کھڑے ہوں اور یہی صحیح ہے''۔

''جَامِعُ الْمُضْمَرَات'' و ''عالمگیریہ'' و ''ردالمحتار'' میں ہے:

''إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ عِنْدَ الْإِقَامَةِ يُكْرَهُ لَهُ الْإِنْتِظَارُ قَائِمًا وَلٰكِنْ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُومُ إِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَولَهُ ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ''۔

ترجمہ: ''جب کوئی نمازی تکبیر کے وقت آئے تو وہ بیٹھ جائے کیونکہ کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے پھر جب مؤذّن ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہے تو اس وقت کھڑا ہو''۔

اسی طرح بہت کتب میں ہے:

أَقُولُ: وَلَا تَعَارُضَ عِنْدِي بَيْنَ قَوْلِ الْوِقَايَةِ وَأَتْبَاعِهَا يَقُومُونَ عِنْدَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ وَالْمُحِيْطِ وَالْمُضْمَرَاتِ وَمَنْ مَّعَهُمَا عِنْدَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ فَإِنَّا إِذَا حَمَلْنَا الْأَوَّلَ عَلَى الْإِنْتِهَاءِ وَالْآخَرَ عَلَى الْإِبْتِدَاءِ اِتَّحَدَ الْقَوْلَانِ، أَيْ يَقُومُونَ حِيْنَ يَتِمُّ الْمُؤَذِّنُ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ وَيَأْتِي عَلَى الْفَلَاحِ وَهٰذَا مَا يُعْطِيْهِ قَولُ الْمُضْمَرَاتِ يَقُومُ إِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ وَلَعَلَّ هٰذَا أَوْلٰى مِمَّا فِي مَجْمَعِ الْأَنْهُرِ مِنْ قَوْلِهِ: وَفِي الْوِقَايَةِ: وَيَقُوْمُ الْإِمَامُ وَالْقَوْمُ عِنْدَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ أَيْ قُبَيْلَهُ۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں: صاحبِ ''وقایہ'' اور اُن کے متّبعین کے اس قول کہ مقتدی مؤذن کے ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' کہنے پر کھڑے ہوں اور صاحبِ ''محیط'' و ''مضمرات'' اور ان کی جماعت کے اس قول کہ مقتدی مؤذن کے ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہنے پر کھڑے ہوں، میں میرے نزدیک کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ جب ہم پہلے قول کو انتہا اور دوسرے کو ابتدا پر محمول کریں، تو دونوں قولوں میں اتحاد حاصل ہوجاتا ہے یعنی جب مؤذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' پورا کرکے ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کہے، تو کھڑے ہوں اور اس کی تائید ''مضمرات''

کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: اس وقت کھڑا ہو، جب مؤذن "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" پر پہنچے اور یہ اس سے بہتر ہے، جو "مَجْمَعُ الْاَنْھُر" میں ان کا قول ہے: "وقایہ" میں ہے: امام اور نمازی "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ" کے وقت یعنی اس سے تھوڑا سا پہلے کھڑے ہوں"۔

یہ اُس صورت میں ہے کہ امام بھی تکبیر کے وقت مسجد میں ہو، اور اگر وہ حاضر نہیں ہے، تو مؤذن جب تک اُسے آتا نہ دیکھے، تکبیر نہ کہے، نہ اُس وقت تک کوئی کھڑا ہو، لِقَولِہٖ ﷺ: لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِی (کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: تم نہ کھڑے ہوا کرو، یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو)، پھر جب امام آئے اور تکبیر شروع ہو، اس وقت دو صورتیں ہیں: (۱) اگر امام صفوں کی طرف سے داخلِ مسجد ہو تو جس صف سے گزرتا جائے، وہی صف کھڑی ہوتی جائے، (۲) اور اگر سامنے سے آئے تو اُسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں اور اگر خود امام ہی تکبیر کہے تو جب تک پوری تکبیر سے فارغ نہ ہو لے مقتدی اصلاً کھڑے نہ ہوں، بلکہ اگر اس نے تکبیر مسجد سے باہر کہی تو فراغ پر بھی کھڑے نہ ہوں جب وہ مسجد میں قدم رکھے، اُس وقت قیام کریں، "ہندیہ" میں بعد عبارت مذکور ہے:

فَاَمَّا اِذَا کَانَ الاِمَامُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، فَاِنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ مِنْ قِبَلِ الصُّفُوفِ فَکُلَّمَا جَاوَزَ صَفًّا، قَامَ ذٰلِکَ الصَّفُّ وَاِلَیْہِ مَالَ شَمْسُ الْاَئِمَّۃِ الحُلْوَانِیُّ وَالسَّرَخْسِیُّ وَشَیْخُ الْاِسْلَامِ خَوَاھَرزَادَہ، وَاِنْ کَانَ الاِمَامُ دَخَلَ الْمَسجِدَ مِنْ قُدَّامِھِم یَقُومُونَ کَمَا رَأَوُا الاِمَامَ وَاِنْ کَانَ الْمُؤَذِّنُ وَالاِمَامُ وَاحِدًا، فَاِن اَقَامَ فِی الْمَسْجِدِ فَالْقَوْمُ لَا یَقُوْمُوْنَ مَالَمْ یَفْرَغْ عَنِ الاِقَامَۃِ، وَاِنْ اَقَامَ خَارِجَ الْمَسْجِدِ فَمَشَایِخُنَا اِتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّھُمْ لَا یَقُومُونَ مَالَمْ یَدْخُلِ الاِمَامُ الْمَسجِدَ وَیُکَبِّرُ الاِمَامُ قُبَیلَ قَولِہٖ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ، قَالَ الشَّیْخُ الاِمَام شَمسُ الْاَئِمَّۃِ الْحُلْوَانِیُّ وَھُوَ الصَّحِیْحُ ھٰکَذَا فِی "الْمُحِیْط"۔

ترجمہ: "پس جب امام مسجد سے باہر ہو، سو اگر وہ صفوں کی جانب سے مسجد میں داخل ہو، تو جس صف سے وہ گزرے، وہ صف کھڑی ہو جائے، شمس الائمہ حلوانی، امام سرخسی اور شیخ

الاسلام خواہر زادہ اسی طرف گئے ہیں اور اگر امام اُن کے سامنے سے مسجد میں داخل ہو، تو اسے دیکھتے ہی تمام مقتدی کھڑے ہو جائیں، اگر مؤذن اور امام ایک ہی ہے، پس اگر اُس نے مسجد کے اندر ہی تکبیر کہی تو قوم اس وقت تک کھڑی نہ ہو، جب تک وہ تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے اور اگر اس نے خارج از مسجد تکبیر کہی، تو ہمارے تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ لوگ اس وقت تک کھڑے نہ ہوں، جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو اور امام "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کے تھوڑا پہلے تکبیر تحریمہ کہے، امام شمس الائمہ حلوانی کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے، محیط میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 379 تا 382)"۔

ایک اور سوال ہوا: "تکبیر کے شروع ہونے کے وقت امام ومقتدی کو کھڑا رہنا چاہیے یا بیٹھ جانا چاہیے اور بیٹھ جانے میں کیا فضیلت ہے اور کھڑا رہنے میں کیا نقصان ہے؟"۔

الجواب: "امام کے لیے اس میں کوئی خاص حکم نہیں، مقتدیوں کو حکم ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں، "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" پر کھڑے ہوں، کھڑے کھڑے تکبیر سننا مکروہ ہے، یہاں تک کہ عالمگیری میں فرمایا کہ: "اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آئے کہ تکبیر ہو رہی ہو، فوراً بیٹھ جائے اور "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" پر کھڑا ہو اور اس میں راز مکبر کے اس قول "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کی مطابقت ہے کہ ادھر اُس نے "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" کہا: "آؤ مراد پانے کو"، اُدھر جماعت کھڑی ہوئی، اُس نے کہا: "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" جماعت قائم ہوگئی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 421)"۔

الغرض جب جماعت کے لیے اقامت کہی جارہی ہو تو مقتدی اس وقت کھڑے ہوں، جب مؤذن "حَیَّ عَلَی الْفَلَاح" کہے، یہ مستحب ہے اور آداب اقامت میں سے ہے۔ شروع ہی سے کھڑے ہو کر اقامت سننے کو ہمارے اکابر فقہائے کرام نے مکروہ کہا ہے اور اس سے مراد مکروہ تنزیہی ہے اور مکروہ تنزیہی سے بچنا چاہیے، لیکن یہ گناہ نہیں ہے۔ فقہ حنفی میں یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے۔ نہ ہی یہ دیوبندی بریلوی خلافیات کا مسئلہ ہے، لہٰذا اسے مساجد میں فساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اگر اکثریت کھڑی ہوگئی ہے تو ایک یا چند آدمیوں

کے بیٹھے رہنے سے صفوں میں خلل واقع ہوگا اور جہاں اکثریت بیٹھی رہتی ہے، وہاں ایک یا چند آدمیوں کو اپنا تفرُّد اور پارسائی ظاہر کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہونا چاہیے، یہ خالص فقہی مسئلہ ہے اور اس میں انا پرستی کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ آپ پریشان نہ ہوں، آپ کی گزشتہ نمازیں صحیح ادا ہوگئیں اور امام کا موقف بھی درست ہے۔ مُستحبات اور اَولیٰ واَفضل کاموں پر عمل کرنا باعثِ اجر ہے، لیکن اُن کے ترک پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ جہاں تک اقامت کے وقت حرمینِ طیّبین کے معمولات کا تعلق ہے، اُن کا تعلق فقہِ حنبلی سے ہے اور فقہِ حنبلی میں جو کتاب ماخذ کا درجہ رکھتی ہے، وہ ''مغنی لابن قُدامہ'' ہے اور اس کا حوالہ آچکا ہے کہ جب مؤذن ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ'' کہے، تو مقتدی اس وقت کھڑے ہوں اور ائمۂ اَربعہ میں سے فقط امام مالک کا قول یہ ہے کہ مقتدیوں کا اِقامت کے شروع میں کھڑا ہونا مُستحب ہے، ممکن ہے وہ اس مسئلے میں امام مالک کے قول پر عمل کرتے ہوں۔ اَقوالِ ائمہ چار ہیں:

(۱) مالکیہ کے نزدیک اس میں توسُّع ہے، یعنی اقامت کے شروع میں بھی کھڑے ہوسکتے ہیں، دورانِ اقامت بھی کھڑے ہوسکتے ہیں اور اقامت مکمل ہونے کے بعد بھی کھڑے ہوسکتے ہیں، (ڈاکٹر وہبہ الزحیلی)، (۲) امام احمد بن حنبل کے نزدیک قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ کے کلمے پر کھڑے ہوں، (۳) امام شافعی کے نزدیک اِقامت کے ختم پر کھڑے ہوں، جبکہ امام اور مقتدی پہلے سے مسجد میں موجود ہوں، (۴) امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' پر کھڑے ہوں۔ ان میں سے کسی بھی قول پر عمل کرنے سے نماز کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اختلافات افضلیت میں ہے اور اَحناف کے نزدیک ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' پر کھڑا ہونا افضل ہے اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے۔ بعض فقہائے احناف نے ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' پر کھڑے ہونے کا قول کیا ہے اور دونوں اقوال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' پر قیام شروع کرے اور ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' پر کھڑا ہوجائے۔

اذان کے غلط تلفظ کا حکم

سوال:

ہماری ایک چھوٹی سی مسجد ہے ،ایک نمازی اذان دیتا ہے ،جو خود پڑھا لکھا نہیں ہے۔اذان کے الفاظ غلط طور پر ادا کرتا ہے،مثلاً: اللہ اکبر کے بجائے آلّا ھَکْبَرْ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے بجائے ھیّا علی الپھلاہ، (ڈاکٹر عباس)۔

جواب:

جیسا کہ آپ نے بتایا،اُس اذان دینے والے شخص کا تلفظ درست نہیں ہے،لہٰذا جب تک وہ شخص الفاظ کی تصحیح نہ کر لے،اُس کو اذان نہ کہنے دی جائے اوراس کی جگہ جو صحیح تلفظ پر قادر ہے،وہ اذان دے اور صحیح تلفظ کے ساتھ اذان سیکھنا کوئی مشکل کام نہیں،چند گھنٹوں کی محنت درکار ہے۔اس شخص کو پیار ومحبت سے سمجھانے کی کوشش کریں ،اس کے باوجود اگر وہ ضد پر اتر آئے تو جو صاحبِ اختیار وہاں ذمے دار ہے،اس سے رجوع کریں۔

نماز میں سورتوں کی ترتیب

سوال:

بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ نماز میں سورتوں کی ترتیب کیا ہے،اگر میں بتاؤں تو لوگ الجھ جاتے ہیں،میری رہنمائی فرمادیں۔سورۃ الزلزال سے سورۃ الناس تک دوسری اور پھر اسی طرح تیسری اور چوتھی رکعتوں تک دو سورتوں کو چھوڑنا چاہیے یا بالترتیب چاروں یا دو رکعتوں میں مسلسل بھی پڑھ سکتے ہیں،سورۃ الزلزال سے پہلے مسلسل ایک رکعت چھوڑ کر بھی پڑھ سکتے ہیں،لیکن الٹا پڑھنا یعنی امام سورۃ التین پڑھنے کے بعد دوسری رکعت میں سورۃ الم نشرح پڑھ لے،تو کیا نماز درست ہوگی ،(قاری محمد شمیم،کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید کو ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ

واجباتِ تلاوت میں سے ہے، واجباتِ نماز سے نہیں۔ اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے، لیکن نماز کا دُہرانا لازم نہیں ہوگا۔ اگر بھولے سے خلافِ ترتیب پڑھا، تو مکروہ بھی نہیں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے، اس کو چھوڑنا مکروہ ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''لَا بَأسَ أَنْ یَقْرَأَ سُورَۃً وَیُعِیدُھَا فِی الثَّانِیَۃِ، وَأَن یَّقْرَأَ فِی الأولیٰ مِنْ مَّحَلٍّ وَفِی الثَّانِیَۃِ مِن آخَرَ وَلَو مِنْ سُورَۃٍ اِنْ کَانَ بَیْنَھُمَا آیَتَانِ فَاَکْثَر، وَیُکْرَہُ الْفَصْلُ بِسُورَۃٍ قَصِیْرَۃٍ وَأَنْ یَّقْرَأَ مَنْکُوسًا اِلَّا اِذَا خَتَمَ فَیَقْرَأُ مِنَ الْبَقَرَۃِ وَفِی ''الْقُنْیَۃِ'': قَرَأَ فِی الْاُوْلیٰ اَلْکَافِرُون وَفِی الثَّانِیَۃِ اَلَمْ تَرَ، أَوْتَبَّتْ، ثُمَّ ذَکَرَ یُتِمُّ وَقِیْلَ یَقْطَعُ وَیَبْدَأُ''۔

ترجمہ: ''ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا یا پہلی رکعت میں کوئی سورت ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں وہی سورت دوسرے مقام سے تلاوت کی، بشرطیکہ اِن دونوں مقامات کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو، تو اِن دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نماز کی پہلی رکعت میں ایک سورت پڑھی اور دوسری میں دوسری سورت پڑھی تو اُن دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے۔ قرآن کو خلافِ ترتیب پڑھنا یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا جو ترتیب کے اعتبار سے پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو، مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن کے موقع پر پہلی رکعت میں ''سورۃ النّاس'' کے بعد دوسری رکعت میں ''سورۂ بقرہ'' پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ''قُنیہ'' میں ہے: پہلی رکعت میں ''سورۃ الکافرون'' پڑھی اور دوسری رکعت میں ''سورۃ الفیل'' یا ''سورۃ اللّہب'' پڑھی، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا، تو اسی سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے۔

علامہ ابن عابدین شامی (وَأَنْ یَّقْرَأَ مَنْکُوسًا) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"بِأَنْ يَّقْرَأَ فِي الثَّانِيَةِ سُوْرَةً أَعْلٰى مِمَّا قَرَأَ فِي الْأُوْلٰى، لِأَنَّ تَرْتِيْبَ السُّوَرِ فِي الْقِرَاءَةِ مِنْ وَاجِبَاتِ التِّلَاوَةِ"۔

ترجمہ: "یعنی دوسری رکعت کے اندر پہلی رکعت میں پڑھی جانے والی سورت کے مقابلے میں ایسی سورت پڑھی جو ترتیبِ مُصحف میں اُس سے مُقدّم ہے"، (اگرچہ اس طرح خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ ہے، لیکن نماز دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے)، کیونکہ قرآن کو ترتیب سے پڑھنا تلاوت کے واجبات میں سے ہے (نماز کے واجبات میں سے نہیں ہے)"۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

"أَفَادَ أَنَّ التَّنْكِيْسَ أَوِ الْفَصْلَ بِالْقَصِيْرَةِ إِنَّمَا يُكْرَهُ إِذَا كَانَ عَنْ قَصْدٍ، فَلَوْ سَهْوًا فَلَا كَمَا فِي "شَرْحِ الْمُنْيَةِ"، وَإِذَا انْتَفَتِ الْكَرَاهَةُ فَإِعْرَاضُهُ عَنِ الَّتِي شَرَعَ فِيْهَا لَا يَنْبَغِي، وَفِي "الْخُلَاصَةِ": إِفْتَتَحَ سُوْرَةً أُخْرٰى فَلَمَّا قَرَأَ آيَةً أَوْ آيَتَيْنِ أَرَادَ أَنْ يَّتْرُكَ تِلْكَ السُّوْرَةَ وَيَفْتَتِحُ الَّتِي أَرَادَهَا يُكْرَهُ، وَفِي "الْفَتْحِ": وَلَوْ كَانَ أَيِ الْمَقْرُوْءُ حَرْفًا وَاحِدًا"۔

ترجمہ: "اس عبارت سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنا یا درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنا صرف اس صورت میں مکروہ ہے، جب جان بوجھ کر ایسا کرے، لیکن اگر بھول کر اس طرح پڑھ لیا تو مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ "شرح منیہ" میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ نہیں ہے، تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) پڑھنا شروع کر دیا ہے، اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: ایک شخص نے ایک سورت پڑھنی شروع کی اور اُس کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا، پھر جب اُس نے ایک یا دو آیات پڑھ لیں تو اُس نے چاہا کہ اُسے چھوڑ کر وہی سورت پڑھے، جس کا اُس نے ارادہ کیا ہوا تھا، تو یہ مکروہ ہے اور "فتح القدیر" میں ہے: اگرچہ ایک ہی حرف پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 239، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال کیا گیا: "امام نے پہلی رکعت میں "قُلْ

أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھی اور دوسری میں "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیے"۔ آپ نے جواب میں لکھا: "اگر بھول کر ایسا کیا، نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہیے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گناہگار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہیے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر "سورۃ النّاس" پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی "سورۃ الناس" ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

نماز میں فاتحہ یا ختمِ سورت کے بعد بھول کر تشہّد پڑھنے کا حکم

سوال:

نماز کی کسی رکعت کے قیام میں اگر کوئی بھول کر التحیات پڑھ لے یا قعدۂ اخیرہ میں بھول کر سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟، (محمد اشرف، قصبہ کالونی کراچی)۔

جواب:

قیام کی حالت میں سورۂ فاتحہ سے پہلے التحیات پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو نہیں ہے، لیکن اگر سورۂ فاتحہ پڑھ لی اور اس کے بعد سورت پڑھنے سے پہلے درمیان میں تشہّد پڑھا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، (کیونکہ اس سے دوسرے واجب کی طرف منتقل ہونے میں تاخیر لازم آئے گی)۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَلَوْتَشَهَّدَ فِي قِيَامِهٖ قَبلَ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ فَلَاسَهْوَ عَلَيهِ، وَبَعْدَهَا يَلْزَمُهٗ سُجُودُ السَّهْوِ، وَهُوَالْأَصَحُّ، لِأَنَّ بَعْدَ الْفَاتِحَةِ مَحلُّ قِرَاءَةِ السُّورَةِ، فَإِذَا تَشَهَّدَ فِيهِ فَقَدْ أَخَّرَ الْوَاجِبَ وَقَبْلَهَا مَحلُّ الثَّنَاءِ كَذَا فِي "التَّبْيِين"، وَلَوتَشَهَّدَ فِي الْأُخْرَيَيْنِ لَايَلْزَمُهٗ السَّهْوُ كَذَا فِي "مُحِيط السَّرَخْسِي"۔

ترجمہ: "اگر (فرض کی پہلی دو رکعات کے) قیام میں (اور دیگر تمام نمازوں کی ہر رکعت کے

قیام میں) سورۂ فاتحہ سے پہلے تشہّد پڑھا، تو سجدۂ سہو نہیں اور اگر فاتحہ کے بعد پڑھا تو سجدۂ سہو لازم ہوگا اور یہ صحیح ترین قول ہے، اس لیے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا محل ہے، پس جب اس مقام پر تشہّد پڑھا تو اس نے واجب (یعنی سورت ملانے) کو مؤخّر کیا (کیونکہ نماز کے اندر فرض اور واجب کی اپنے مقام سے تین تسبیح کی مقدار تاخیر پر سجدۂ سہو لازم آتا ہے) اور سورۂ فاتحہ سے قبل ثناء پڑھنے کا مقام ہے (اور تشہّد بھی ثناء ہی ہے)، ''تبیین الحقائق'' میں اسی طرح ہے۔ اگر (فرض کی) آخری دو رکعات کے قیام میں تشہّد پڑھا تو سجدۂ سہو واجب نہیں، جیسا کہ ''مُحِیْطُ السَّرَخْسِیْ'' میں ہے (کیونکہ فرض کی آخری دو رکعات میں قراءت واجب نہیں ہے)''۔

قعدہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا (کیونکہ رکوع وسجود اور قعدہ محل قراءت نہیں ہیں)، اسی سبب علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا: ''وَاِذَا قَرَأَ الْفَاتِحَةَ مَکَانَ التَّشَھُّدِ فَعَلَیْهِ السَّھْوُ''، ترجمہ:''اور اگر تشہّد پڑھنے کی جگہ سورۂ فاتحہ پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:127)''۔

ضمِ سورت کے بعد قراءتِ واجبہ مکمل ہوگئی، اس کے بعد اگر تشہّد پڑھا تو سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَمَّا لَوْ قَرَأَھَا قَبْلَ السُّوْرَةِ مَرَّةً وَّبَعْدَھَا مَرَّةً فَلَا یَجِبُ کَمَا فِی ''الْخَانِیَةِ''، وَاخْتَارَ فِی ''الظَّھِیْرِیَّةِ'' وَ''الْخُلَاصَةِ''، وَصَحَّحَهُ الزَّاھِدِیُّ لِعَدَمِ لُزُوْمِ التَّاخِیْرِ، لِاَنَّ الرُّکُوْعَ لَیْسَ وَاجِباً بِاَثَرِ السُّوْرَةِ، فَاِنَّهُ لَوْجَمَعَ بَیْنَ سُوَرٍ بَعْدَ الْفَاتِحَةِ لَایَجِبُ عَلَیْهِ شَیْءٌ، کَذَا فِی ''الْبَحْرِ'' ھُنَا وَفِی السُّجُوْدِ السَّھْوِ''۔

ترجمہ:''اگر ایک بار سورت ملانے سے پہلے اور ایک بار سورت ملانے کے بعد فاتحہ پڑھی، تو سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا، جیسا کہ ''خانیہ'' میں ہے اور ''محیط''، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' اور ''ظہیریہ'' میں اسی کو مختار قرار دیا گیا ہے اور ''زاہدی'' نے بھی اس قول کو صحیح کہا ہے، کیونکہ

سورت کے بعد رکوع فی الفور لازم نہیں، جیسا کہ فاتحہ کے بعد کئی سورتیں جمع کر دیں، تو سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا، "البحر الرائق" میں اس مقام پر اور سجدۂ سہو کی بحث میں یہی قول کیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2،ص:135)"۔

کھلے میدان میں نمازِ عید ادا کرنا افضل اور سنت ہے

سوال:

ہمارے شہر ہارون آباد میں مرکزی عیدگاہ موجود ہے، کثرت ازدحام کے سبب ہم لوگ قریبی مسجد میلاد چوک والی میں نمازِ عید ادا کرنا چاہتے ہیں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عیدگاہ کو چھوڑ کر مسجد میں عید کی نماز جائز نہیں۔ کیا ہم عیدگاہ کے ہوتے ہوئے مسجد میں نمازِ عید ادا کر سکتے ہیں؟، (حاجی محمد اکرم، صدر مرکزی مسجد میلاد چوک، ہارون آباد)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحَى إِلَى الْمُصَلَّى"۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ (یعنی کھلے میدان) کی طرف نکل کر جاتے تھے، (بخاری:956)"۔

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: أَصَابَ النَّاسَ مَطَرٌ فِي يَوْمِ عِيدٍ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَصَلَّى بِهِمْ فِي الْمَسْجِدِ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عید کے دن بارش ہوئی، تو مسجد میں عید کی نماز پڑھی، (سُنن ابن ماجہ:1313)"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی عذر کی بنا پر مسجد میں نمازِ عید پڑھی جا سکتی ہے۔

نمازِ عید کے لیے کھلے میدان میں جانا سنّت ہے، اگرچہ مسجد میں گنجائش ہو۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''(وَالْخُرُوْجُ اِلَيْهَا) أي الجبانة لِصَلاةِ الْعِيْدِ (سُنَّةٌ وَاِنْ وَسِعَهُمُ الْمَسْجِدُ الْجَامِعُ) هُوَالصَّحِيْحُ''۔

ترجمہ: ''نمازِ عید کے لیے عیدگاہ جانا سُنّت ہے، اگر چہ جامع مسجد میں گنجائش ہو، یہی صحیح ہے، (باب صلاۃ العیدین، جلد 5، ص:108، دمشق)''۔

نمازِ عید کی مشروعیت کا سبب باری تعالیٰ کی نعمتوں کا تشکر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ''۔

ترجمہ: ''سوتم میں سے جو (عاقل، بالغ، صحت منداور مقیم مسلمان) ماہ رمضان کو پائے، تو اس پر اس کے روزے رکھنا فرض ہے اور جو بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہوتو دوسرے دنوں میں (چھوڑے ہوئے روزوں کی) گنتی پوری کرلے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا، اورتم پر لازم ہے کہ (روزوں کی) گنتی پورا کرو اور (اس نعمت پر) اللہ کی کبریائی بیان کروکہ اس نے تمہیں ہدایت فرمائی اور تا کہ تم شکرگزار بن جاؤ، (البقرۃ:185)''۔

اس کے ساتھ نمازِ عید مسلمانوں کی جمعیت، وحدت اور سَطوت وشوکت کا مظہر بھی ہے اور اس کا بہترین مظاہرہ کھلے میدان میں ہوتا ہے۔ پس اگر چہ مسجد میں نمازِ عید پڑھنا جائز ہے، لیکن افضل اور سنت کھلے میدان میں پڑھنا ہے۔ البتہ بڑے شہروں میں جہاں آبادیاں بہت تنگ اور گنجان (Conjusted) ہیں اور کھلے میدان دستیاب نہیں ہیں، وہاں بارش کی طرح کھلی جگہ کا دستیاب نہ ہونا بھی عذر ہے۔

عذر کی بنا پر غیر سَمتِ قبلہ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:

میرا ایک دوست اٹلی میں ایک اٹالین کے پاس کام کرتا ہے، کام کرنے کے لیے بھی

تین سوکلومیٹر یا اس سے زیادہ فاصلے کا سفر کرنا پڑتا ہے، جب گھر سے نکلتے ہیں تو فجر کا وقت شروع نہیں ہوا ہوتا اور جب کام کی جگہ پر پہنچتے ہیں، تو فجر کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔اس کا مالک غیر مسلم ہے وہ راستے میں رکتا بھی نہیں کہ دیر نہ ہو جائے اور جس سمت سفر کر رہے ہوتے ہیں وہ بھی قبلہ کی مخالف سمت ہوتی ہے، کیا وہ قبلہ کی مخالف سَمت میں منہ کر کے کار میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟، اگر جواب اثبات میں ہے تو فبہا اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر دورانِ سفر نماز کا کیا حکم ہے، ہماری رہنمائی فرمائیں، (ساجد منیر)۔

جواب:

آپ کے دوست کو چاہیے کہ وہ اپنے مالک سے نماز کی ادائیگی کے لیے وقت مانگے اور اختصار کے ساتھ کم از کم مقدارِ واجب تلاوت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوشش کرے اور اگر مالک اُسے نماز کا وقت دینے پر راضی نہ ہو تو وہ کسی دوسری جگہ ملازمت کے حصول کی کوشش کرے۔اس دوران اُس کے ساتھ رہتے ہوئے سفر میں جس طرح بن پڑے، کار میں بیٹھ کر نماز ادا کرے، قبلے کی طرف رُخ کرنا ممکن نہ ہو تو گاڑی جس سَمت میں جارہی ہو، اُسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرلیں، اگر چہ وہ سَمتِ قبلہ کے خلاف ہو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ''۔

ترجمہ: ''مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، پس تم جس طرف بھی رُخ کرو گے، وہیں اللہ (کی رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے، بے شک اللہ بڑی وسعت والا، بہت علم والا ہے، (البقرۃ:115)''۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(۱) ''عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّمَا نَزَلَتْ هٰذِهِ الآيَةُ: (فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ) أَنْ تُصَلِّيَ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ بِكَ رَاحِلَتُكَ فِي السَّفَرِ تَطَوُّعًا، كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا رَجَعَ مِنْ مَكَّةَ يُصَلِّي عَلٰى رَاحِلَتِهِ تَطَوُّعًا يُوْمِئُ بِرَأْسِهِ نَحْوَ الْمَدِيْنَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: اِس آیت: (فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ) ''تم جس طرف بھی رُخ کروگے، وہیں اللہ (کی رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس رُخ پر تمہاری سواری کا جانور جارہا ہے، اُسی رُخ پر منہ کرکے نفل نماز پڑھ لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف واپسی کا سفر فرماتے تو اپنی سواری پر بیٹھے ہوئے مدینہ منورہ کی طرف رُخ کرکے نفل نماز پڑھ لیتے اور اشارہ سے رکوع وسجود فرماتے تھے''۔

(۲) ''عَنِ ابۡنِ عُمَرَ: اَنَّہٗ یُصَلِّیۡ حَیۡثُ تَوَجَّھَتۡ بِہٖ رَاحِلَتُہٗ، وَیَذۡکُرُ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کَانَ یَفۡعَلُ ذٰلِکَ، وَیَتَاَوَّلُ ھٰذِہِ الۡاٰیَۃَ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ''۔

ترجمہ: (سواری پر سفر کرتے ہوئے) جس طرف سواری کا رخ ہوتا، عبداللہ بن عمر اسی طرف رخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی طرح کرتے تھے اور وہ سورۃ البقرۃ آیت: 115 کی یہی تاویل کرتے''۔

(3) ''عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بن عَامِرِ بن رَبِیۡعَۃَ، عَنۡ أَبِیہ، قَالَ: کُنَّا مَعَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فِیۡ لَیۡلَۃٍ سَوۡدَاءَ مُظۡلِمَۃٍ، فَنَزَلۡنَا مَنۡزِلًا فَجَعَلَ الرَّجُلُ یَأۡخُذُ الۡاَحۡجَارَ فَیَعۡمَلُ مَسۡجِدًا یُصَلِّیۡ فِیۡہِ، فَلَمَّا أَصۡبَحۡنَا، إِذَا نَحۡنُ قَدۡ صَلَّیۡنَا عَلٰی غَیۡرِ الۡقِبۡلَۃِ، فَقُلۡنَا: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! لَقَدۡ صَلَّیۡنَا لَیۡلَتَنَا ھٰذِہٖ لِغَیۡرِ الۡقِبۡلَۃِ فَأَنۡزَلَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ: ''وَلِلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ فَأَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم ایک سخت تاریک اندھیری رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ تھے، ہم ایک جگہ ٹھہرے اور ہر شخص نے اپنی اپنی سجدہ گاہ کی طرف پتھر رکھے اور نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ (رات کو) نماز پڑھتے وقت ہمارا رخ قبلے کی طرف نہیں تھا، ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! رات کو ہم نے نماز اس حال میں پڑھی کہ ہمارا رخ قبلے کی جانب نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، پس تم جس طرف بھی رُخ کروگے، وہیں اللہ (کی

رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے، بے شک اللہ بڑی وسعت والا، بہت علم والا ہے،
(البقرۃ:115)، (جامع البیان، جلد 1، ص:550، بیروت)''۔
چنانچہ فقہائے کرام نے فرمایا: جب بندہ سَمتِ قبلہ کے بارے میں تحرّی (یعنی جستجو) کرنے کے بعد نماز پڑھ لے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ سَمت درست نہیں تھی، تو نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، یعنی نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی۔ البتہ دورانِ نماز کوئی باخبر شخص متوجہ کرے، تو قبلے کی سَمت اپنا رُخ سیدھا کرلے۔ آج کل ہوائی جہاز یا ریل میں سفر کرتے ہوئے آپ قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔
قبلے کی سَمت معلوم کرنے کے لیے اپنی فکری اور علمی صلاحیت کے استعمال کے ساتھ ساتھ خارجی ذرائع سے بھی صحیح سَمت معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، اسے فقہی اصطلاح میں ''تحرّی'' کہتے ہیں۔ تحرّی کے بعد جس طرف ظنِ غالب ہوا، جب اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سَمت درست نہیں تھی، تو نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! اگر نماز کے دوران کسی نے متوجہ کردیا تو نماز کے اندر ہی قبلے کی جانب مُڑ جائے اور نماز مکمل کرے، نماز صحیح طور پر ادا ہوجائے گی۔
تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:
''وَیَتَحَرّٰی عَاجِزٌ عَنْ مَعْرِفَۃِ الْقِبْلَۃِ فَاِنْ ظَھَرَ خَطَؤُہٗ لَمْ یُعِدْ''۔
ترجمہ: ''ایسا شخص جو سَمتِ قبلہ معلوم کرنے سے عاجز ہو، تحرّی کر کے نماز پڑھے گا۔ پس اگر (نماز پڑھنے کے بعد اس پر) ظاہر ہوا کہ سَمتِ قبلہ جاننے میں اُس سے خطا ہوئی ہے، تو نماز نہ دُہرائے (نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی)، (جلد 3، ص:114، دمشق)''۔
علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:
''وَاِلَّا بِاَنْ کَانَ خَوْفُہٗ مِنْ عَدُوٍّ یُصَلِّی کَیْفَ قَدَرَ کَمَا فِی الْاِمْدَادِ وَغَیْرِہٖ، وَلَا اِعَادَۃَ عَلَیْہِ اِذَا قَدَرَ بِمَنْزِلَۃِ الْمَرِیْضِ خَانِیَّۃٌ''۔
ترجمہ: ''ورنہ اگر دشمن کا خوف ہو تو (جس طرف بھی) قدرت ہو، نماز پڑھ لے، جیسا کہ

امداد الفتاویٰ وغیرہ میں ہے اور اس صورت میں اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے، وہ مریض کی مانند (معذور) ہے، خانیہ "، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:2،ص:40)"۔

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کا تعلق تحرّی سے نہیں ہے، بلکہ یہ عذر کی صورت ہے، پس جیسے بھی ہو سکے، وہ وقت کے اندر نماز ضرور پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ اس تقصیر کو معاف فرمائے اور اس ابتلا سے نجات کی صورت مقدر فرمائے۔ عذر کے بغیر سواری پر نماز پڑھنا منع ہے، حدیث پاک میں ہے:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي عَلَى رَاحِلَتِهِ، حَيْثُ تَوَجَّهَتْ فَإِذَا أَرَادَ الفَرِيضَةَ نَزَلَ، فَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ"۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر جدھر بھی اس کا رُخ ہوتا (نفل) نماز پڑھ لیتے تھے، پس جب آپ فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو سواری سے اتر جاتے اور قبلہ کی جانب رُخ کر کے نماز ادا فرماتے، (صحیح البخاری:400، مسند ابوداؤد الطیالسی: 1907، مسند احمد:14533)"۔ جبکہ ضرورت اور عذر کے پیش نظر سواری پر فرض نماز بھی ادا کی جا سکتی ہے، حضرت یَعلیٰ بِنْ مُرَّۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"أَنَّهُمْ كَانُوا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ، فَانْتَهَوْا إِلَى مَضِيقٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَمُطِرُوا السَّمَاءُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَالبِلَّةُ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ، فَأَذَّنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، وَأَقَامَ، فَتَقَدَّمَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، فَصَلَّى بِهِمْ يُومِئُ إِيمَاءً يَجْعَلُ السُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ"۔

ترجمہ: "وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، پس وہ ایک تنگ جگہ پہنچے اور نماز کا وقت ہو گیا، اس وقت آسمان سے بارش برس رہی تھی اور نیچے زمین گیلی تھی، تو نبی ﷺ نے اپنی سواری پر اذان دی (یعنی اذان دینے کا حکم دیا جیسا کہ دیگر روایات میں ہے) اور اقامت کہی، پھر آپ اپنی سواری پر آگے بڑھے اور انہیں اشارہ سے نماز پڑھائی، آپ

صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کو رکوع سے پست رکھتے تھے، (ترمذی: 411، مسند احمد: 17573، سنن دار قطنی: 1429)"۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قُلْتُ: أَرَأَيْتَ رَجُلاً يَخَافُ الْعَدُوَّ فَلَا يَسْتَطِيعُ النُّزُولَ عَنْ دَابَّتِهِ أَيَسَعُهُ أَنْ يُّصَلِّيَ عَلىٰ دَابَّتِهِ وَهُوَ يَسِيرُ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ يُومِئُ إِيمَاءً وَيَجْعَلُ السُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ؟، قَالَ: نَعَمْ"۔

ترجمہ: "میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: مجھے بتائیے! کسی شخص کو دشمن کا خوف ہو، اس وجہ سے وہ اپنی سواری سے اترنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ چلتی سواری پر جدھر اُس کا منہ ہو، اشارے سے نماز پڑھے اور سجدے میں رکوع کی نسبت زیادہ جھکے؟، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ہاں، (المبسوط للامام محمد بن حسن الشیبانی، ج: 1، ص: 398)"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

قُلْتُ: أَرَأَيْتَ إِنْ صَلَّى الْمَكْتُوبَةَ عَلىٰ دَابَّتِهِ قَالَ لَا يُجْزِئُهُ وَعَلَيْهِ أَنْ يُّعِيدَ، قُلْتُ فَإِنْ كَانَ مَرِيضًا لَا يَسْتَطِيعُ النُّزُولَ أَوْ كَانَ يَتَخَوَّفُ عَلىٰ نَفْسِهِ مِنَ السِّبَاعِ وَغَيْرِهَا قَالَ يُجْزِئُهُ"۔

ترجمہ: "میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: مجھے بتلائیے کہ اگر کوئی شخص چوپائے پر نماز پڑھے (تو کیا اس کی نماز درست ہے؟)، تو امام اعظم نے فرمایا: نہیں! اور (اگر پڑھ لی) تو اس پر نماز کو دہرانا لازم ہے، میں نے عرض کیا: اگر وہ بیمار ہو اور سواری سے اتر نہ سکتا ہو یا (زمین پر اتر کر نماز پڑھنے کی صورت میں) اُسے درندوں یا کسی اور سے جان کا خطرہ ہو؟، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: (اس صورت میں) اس کے لیے (سواری پر) نماز پڑھنا جائز ہے، (المبسوط للامام محمد بن حسن الشیبانی، ج: 1، ص: 295)"۔

علامہ محمود بن احمد بن الصدر الشہید النجاری برہان الدین مازہ حنفی لکھتے ہیں:

''وَمِنَ الْأَعْذَارِ إِنْ خَافَ لَوْ نَزَلَ عَنِ الدَّابَّةِ عَلٰى نَفْسِهٖ أَوْ عَلٰى دَابَّتِهٖ لِصًّا أَوْ سَبُعًا أَوْ كَانَ فِيْ طِيْنٍ لَا يَجِدُ عَلَى الْأَرْضِ مَكَانًا يَابِسًا أَوْ كَانَتِ الدَّابَّةُ جَمُوْحًا، إِنْ نَزَلَ عَنْهَا، لَا يُمْكِنُهُ الرُّكُوْبُ إِلَّا بِمُعِيْنٍ أَوْ كَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا لَا يُمْكِنُهُ أَنْ يَّرْكَبَ وَلَا يَجِدُ مَنْ يَّرْكَبُهٗ فَفِيْ هٰذِهِ الْأَحْوَالِ كُلِّهَا تَجُوْزُ الْمَكْتُوْبَةُ عَلَى الدَّابَّةِ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ''فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَآ أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ''۔

ترجمہ: ''(جن اَعذار کی بنا پر سواری پر فرض نماز پڑھنا جائز ہے)، اُن میں سے چند یہ ہیں: (1) اگر اُسے سواری سے اترنے کی صورت میں اپنی جان یا اپنی سواری کی بابت چور یا درندے (سے ضرر) کا اندیشہ ہے، (2) یا وہ ایسی کیچڑ والی جگہ میں ہے، جہاں نماز پڑھنے کے لیے خشک زمین دستیاب نہیں ہے، (3) یا جانور سرکش ہے کہ اگر وہ اس اترتا ہے تو کسی مددگار کے بغیر اس کے لیے اس پر سوار ہونا ممکن نہیں ہے، (4) یا وہ بوڑھا شخص ہے کہ (سواری سے اتر کر) اس پر سوار نہیں ہوسکتا اور کوئی مددگار بھی نہیں ہے، تو اِن تمام صورتوں میں سواری پر فرض نماز ادا کرنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ترجمہ): ''پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر نماز پڑھو، پھر جب تم بے خوف ہو جاؤ تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے، جس کو تم (پہلے) نہیں جانتے تھے، (البقرۃ:239)''، (المحیط البرہانی، ج:2، ص:55)''۔ علامہ قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی حضرت یَعْلیٰ بِنْ مُرَّۃ کی گزشتہ حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''حَدِيْثُ يَعْلٰى ضَعِيْفُ السَّنَدِ صَحِيْحُ الْمَعْنٰى قَالَ الصَّلَاةُ بِالْإِيْمَاءِ عَلَى الدَّابَّةِ صَحِيْحَةٌ إِذَا خَافَ مِنْ خُرُوْجِ الْوَقْتِ وَلَمْ يَقْدِرْ عَلَى النُّزُوْلِ لِضَيْقِ الْمَوْضِعِ أَوْ لِأَنَّهٗ غَلَبَهُ الطِّيْنُ وَالْمَاءُ''۔

ترجمہ: ''حضرت یعلیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند ضعیف ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے یہ صحیح ہے، (قاضی ابوبکر) فرماتے ہیں: جب وقت کے نکل جانے کا اندیشہ ہو اور وہ جگہ کی تنگی کے سبب سواری سے اتر نہ سکتا ہو، کیونکہ وہ کیچڑ والی جگہ ہے، تو ایسی صورتِ حال میں سواری پر

اشارے کے ساتھ نماز پڑھنا صحیح ہے، (عَارِضَۃُ الْاَحْوَذِی، ج:2،ص:201)"۔

شرعی معذورہ کے نماز، فدیۂ صیام اور حج کے بارے میں چند سوالات

سوال:

میں Musclular Distrophy کی مریضہ ہوں، اس بیماری کے سبب میں زمین پر بیٹھ کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ کبھی کبھار کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتی ہوں تو ایک رکعت بھی مکمل نہیں ہوتی کہ بازوؤں کا اوپری حصہ، کندھے اور گھٹنے جواب دے دیتے ہیں کیونکہ کرسی پر بیٹھ کر رکوع وسجود کے لیے جھکتے وقت سارا وزن متاثرہ حصے پر پڑتا ہے، ایسے میں کیا کروں؟۔

اونچی چارپائی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں لوگ کہتے ہیں کہ پاؤں زمین پر لگنے چاہییں، اگر میں زمین پر پاؤں لگاؤں تو اٹھنا دشوار ہوگا کیونکہ اونچی جگہ سے تو میں کسی طرح اٹھ پاتی ہوں لیکن نیچی ہائٹ کی وجہ سے بالکل نہیں اٹھ پاتی۔ لیٹ کر نماز پڑھنے میں سمتِ قبلہ کا مسئلہ ہے کہ کمرے کی بناوٹ اور چارپائی اس طرح ہے کہ قبلہ کا رخ نہیں ہوتا۔

سردی اور گرمی کے موسم میں وضو اور غسل میں بہت دشواری ہوتی ہے اس کا کوئی حل بتائیں۔ میرا ارادہ حج کرنے کا ہے لیکن ایک مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر دورانِ حج بیماری مزید بڑھنے کا اندیشہ ہو تو حج فرض نہیں، کیا مجھ پر حج فرض نہیں ہے؟۔

روزوں کا فدیہ کتنا ہے، گزشتہ سال چھ ہزار روپے دیا تھا، اس سال سات ہزار روپے دیا ہے، کیا یہ ٹھیک ہے؟، (مریم، لالہ موسیٰ)۔

جواب:

آپ نے لکھا ہے: "کبھی کبھار کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتی ہوں تو ایک رکعت بھی مکمل نہیں ہوتی کہ بازوؤں کا اوپری حصہ کندھے اور گھٹنے جواب دے دیتے ہیں، کرسی پر بیٹھ کر رکوع وسجود کے لیے جھکتے وقت سارا وزن متاثرہ حصے پر پڑتا ہے، ایسے میں کیا کروں؟"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرسی پر بیٹھنا آپ کے لیے تکلیف کا باعث نہیں ہے، بلکہ رکوع وسجود

کے لیے جھکنا باعث تکلیف ہے، اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ آپ سر کو معمولی مقدار جھکا کر رکوع کریں اور سجدے کے لیے رکوع سے تھوڑا زیادہ سر جھکائیں، کیونکہ آپ کی نماز اشارے کی ہے اور اشارے کے لیے سر کو جھکایا جاتا ہے، کندھوں اور کمر کو جھکانا ضروری نہیں ہے۔

دوسرا سوال آپ نے یہ کیا ہے: ''اونچی چار پائی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں لوگ کہتے ہیں کہ پاؤں زمین پر لگنے چاہییں، اگر میں زمین پر پاؤں لگاؤں تو اٹھنا دشوار ہوگا، کیونکہ اونچی جگہ سے تو میں کسی طرح اٹھ پاتی ہوں، لیکن نیچی ہائٹ کی وجہ سے بالکل نہیں اٹھ پاتی''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چار پائی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے معذور کے پاؤں کا زمین کو مَس کرنا ضروری نہیں ہے، جس طرح آسانی ہو اس طرح بیٹھ کر سر کے اشارے سے رکوع وسجود ادا کریں۔

تیسرا سوال آپ نے یہ کیا ہے: ''لیٹ کر نماز پڑھنے میں سَمت قبلہ کا مسئلہ ہے کہ کمرے کی بناوٹ اور چار پائی اس طرح ہے کہ قبلہ رخ نہیں ہوتا''۔ آپ کمرے کی بناوٹ اور چار پائی کے قبلہ رخ نہ ہونے کو چھوڑیے، آپ بیڈ کے طول یا عرض میں یا جیسے بھی ممکن ہو قبلہ رخ لیٹ جائیں اور اشارے سے نماز پڑھیں، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا نا قابلِ برداشت تکلیف کا باعث ہو۔

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے: ''سردی اور گرمی کے موسم میں وضو اور غسل میں بہت دشواری ہوتی ہے، اس کا کوئی حل بتادیں''۔ آپ کے سوال میں دشواری کا سبب واضح نہیں ہے کہ آیا آپ کے لیے ٹھنڈے پانی کا استعمال تکلیف کا سبب ہے یا گرم پانی کا، اس کا حل تو یہ ہے کہ جس موسم میں آپ کے لیے جس کیفیت (گرم یا سرد) کے پانی کا استعمال قابلِ برداشت ہو، وہ استعمال کریں، جب تک آپ پانی استعمال کرسکتی ہیں، تیمم جائز نہیں ہے اور اگر آپ کے لیے پانی کا استعمال ہلاکت یا مرض کی شدت کا سبب ہو یا کوئی ایسی بیماری ہے جس میں ڈاکٹر نے آپ کو پانی کے مطلقاً استعمال سے منع کیا ہے، تو اس صورت میں آپ تیمم

کرسکتی ہیں۔

آپ نے پانچواں سوال یہ کیا ہے: "میرا ارادہ حج کرنے کا ہے لیکن ایک مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر حج کے دوران بیماری مزید بڑھنے کا اندیشہ ہو تو حج فرض نہیں، کیا مجھ پر حج فرض نہیں ہے"۔ اگر آپ صحت کی حالت میں حج کی مالی استطاعت رکھتی تھیں اور آپ کو شوہر یا محرم کی رفاقت بھی حاصل تھی اور آپ نے کوئی مانع نہ ہونے کے باوجود حج نہ کیا اور بعد میں آپ کو یہ مرض لاحق ہو گیا تو آپ پر اپنی طرف سے حجِ بدل کرانا لازم ہے اور اگر آپ کو اسی مرض کی حالت میں اتنی مالی استطاعت نصیب ہوئی ہے کہ جس سے آپ حج ادا کرسکتی ہیں، تو آپ پر اصلاً حج فرض نہیں ہے، کیونکہ حج کی فرضیت کے لیے صحت مند ہونا وجوبِ حج کی شرائط میں سے ہے، اس صورت میں آپ پر حج بدل کرنا بھی لازم نہیں ہے، لیکن اگر اسی حالت میں آپ حج پر جانا چاہتی ہیں تو آپ طواف اور سعی وِیل چیئر پر کرسکتی ہیں، خواہ یہ وِیل چیئر آپ کے شوہر یا محرم چلائیں یا کسی کو اجرت دے کر یہ خدمت لے لیں، اسی طرح رمی جمرات اور دمِ تمتّع و دمِ قِران کے لیے بھی کسی کو اپنا وکیل بنا سکتی ہیں اور اگر آپ نے حجِ افراد کیا ہے، تو آپ پر شکرانے کا دم واجب نہیں ہے۔ اگر آپ نے حج بدل کرالیا ہے، لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ صحت یاب ہو گئی ہیں، خود ارکانِ حج ادا کرنے کے قابل ہو گئی ہیں اور بدستور استطاعت رکھتی ہیں، تو تشکّرِ نعمت کے طور پر دوبارہ حج ادا کرلیں۔

آپ کا آخری سوال ماہِ رمضان کے فدیۂ صیام کے بارے میں ہے۔ اگر آپ اتنی عمر رسیدہ اور ضعیف ہیں یا دائمی مریضہ ہیں کہ بحالی کا بظاہر امکان نظر نہیں آتا، تو آپ پر اپنے روزوں کا فدیہ واجب ہے، اس کی مقدار ہر سال اشیاء کے نرخ کے حساب سے بتائی جاتی ہے اور گندم، جَو، کھجور، کشمش اور پنیر کی قیمتوں کے حساب سے رقم بتا دیتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی مالی استطاعت کے مطابق فدیہ ادا کرلیں، مالدار لوگ کشمش، پنیر یا کھجور کے نصاب کے مطابق اپنے روزوں کا فدیہ ادا کریں تو افضل ہے، آپ ہر سال اپنے قریب کے کسی عالم

یاامام وخطیب سے معلوم کروالیا کریں، بشرطیکہ وہ فقہی مسائل پر بصیرت رکھتے ہوں۔

وتر کے بعد نفل پڑھنا ممنوع نہیں ہے

سوال:

حدیث میں ہے کہ وتر کو رات کی آخری عبادت بناؤ،تو کیاوتر کے بعد نفل پڑھنے چاہییں؟،(نور، ملتان)۔

جواب:

وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا بہتر ہے،حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الوِتْرِ رَكْعَتَيْنِ''۔

ترجمہ:''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وتر کے بعد دو رکعت نماز (نفل) پڑھتے تھے،(سنن ترمذی:471)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا بہتر ہے،اس کی پہلی رکعت میں سورتِ ''زلزال'' اوردوسری میں ''الکافرون'' پڑھنا بہتر ہے۔حدیث میں ہے:''اگر رات میں نہ اٹھا تو یہ تہجد کے قائم مقام ہوجائیں گی''،(بہارِ شریعت،جلد1،ص:658)''۔حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ ثَوْبَانَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ هَذَا السَّهَرَ جَهْدٌ وَثِقَلٌ، فَإِذَا أَوْتَرَ أَحَدُكُمْ، فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ، فَإِنْ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ، وَإِلَّا كَانَتَا لَهُ''۔

ترجمہ:''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بے شک بیداری مشقت ہے اور دشوار ہے،پس تم میں سے کوئی شخص وتر ادا کرے،تو اس کو چاہیے کہ دو رکعت (نفل) پڑھے،پس اگر رات کو (تہجد کے لیے) اٹھ گیا تو ٹھیک ،ورنہ یہ دو رکعات (تہجد) کے قائم مقام ہوجائیں گی ،(سُنن دارمی:1601،شرح معانی الآثار:2011، صحیح ابن خزیمہ:1106،صحیح ابن حبان:2577)''۔سُنن دارمی میں ''سَهر'' یعنی بیداری کا کلمہ ہے، اس صورت یہ حدیث اس معنیٰ پر محمول ہوگی ،جو ہم نے بیان کیے ہیں، دیگر

روایات میں سفر کا لفظ آیا ہے ،اُس صورت میں یہ حدیث حالتِ سفر پر محمول ہوگی ۔
احادیثِ مبارکہ میں ہے:
(1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:
”مَنْ صَلّٰی مِنَ اللَّيْلِ فَلْيَجْعَلْ آخِرَ صَلٰوتِهٖ وِترًا فَاِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم كَانَ يَاْمُرُ بِذٰلِكَ“۔
ترجمہ:”جو شخص رات کو نماز (تہجد) پڑھے، وہ وتر کو نماز کے آخر میں پڑھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہی حکم دیتے تھے، (صحیح مسلم:751)“۔
(2)”عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مِنْ اَوَّلِ اللَّيْلِ وَأَوْسَطِهٖ وَآخِرِهٖ فَانْتَهٰى وِتْرُهٗ اِلَى السَّحَرِ“۔
ترجمہ:”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رات کے اول، اوسط، آخر ہر حصہ میں وتر پڑھے ہیں اور آپ کے وتر فجر تک پہنچ گئے، (صحیح مسلم:745)“۔
حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:”مَنْ خَشِيَ مِنْكُمْ أَنْ لَا يَسْتَيْقِظَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ مِنْ أَوَّلِهٖ، وَمَنْ طَمِعَ مِنْكُمْ أَنْ يَّقُوْمَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ، فَإِنَّ قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ فِي آخِرِ اللَّيْلِ مَحْضُوْرَةٌ، وَهِيَ أَفْضَلُ“۔
ترجمہ:”تم میں سے جس شخص کو یہ خطرہ ہو کہ رات کے آخر میں وہ بیدار نہیں ہو سکے گا، وہ اول رات میں وتر پڑھ لے، پھر سو جائے اور تم میں سے جس کو یہ امید ہو کہ وہ رات کے آخر میں بیدار ہوگا، وہ رات کے آخر میں وتر پڑھے کیونکہ رات کے آخر میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہ وقت افضل ہے، (سُنن ترمذی:455)“۔

رات کی آخری نماز بنانے سے مراد یہ ہے کہ اگر رات کے اخیر حصے میں بیدار ہونے کا یقین ہو تو اُس وقت وتر ادا کرے اور اگر چھوٹ جانے کا خدشہ ہو تو پہلے وقت میں ادا کرلے اور یہ اُس کے سونے سے پہلے آخری نماز شمار ہوگی، تاہم وتر کے بعد نفل پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے، باقی نماز مغرب کے بعد سے صبح صادق طلوع ہونے تک نفل کی ممانعت نہیں ہے

اور اس پورے دورانیے میں کسی بھی وقت نفل پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

حدیثِ پاک میں ہے: "عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِجْعَلُوا آخِرَ صَلٰوتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی رات کی نماز میں وتر کو آخر میں پڑھا کرو، (صحیح مسلم:752)"۔

اس حدیث مبارک میں وتر کو رات کی آخری نماز بنانے کا حکم ایجابی نہیں ہے، بلکہ استحبابی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے خود بھی وتر کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا ثابت ہیں:

"عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ، عَنْ صَلَاةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: كَانَ يُصَلِّي ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّي ثَمَانَ رَكَعَاتٍ، ثُمَّ يُوتِرُ، ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوسلمہ بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی (رات کی) نماز کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا: آپ ﷺ تیرہ رکعات (اس طرح) پڑھتے تھے کہ پہلے آٹھ رکعات پڑھتے، پھر وتر پڑھتے اور پھر اس کے بعد بیٹھ کر دو رکعت (نفل) پڑھتے، (صحیح مسلم:738)"۔

رسول اللہ ﷺ کا بعض اوقات بیٹھ کر نوافل پڑھنا چونکہ اس امر کو مشروع کرنے اور بیانِ جواز کے لیے ہوتا تھا، اس لیے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھنے پر قیام کے برابر پورا ثواب ملتا تھا۔ عام لوگوں کے لیے عذر کے بغیر بیٹھ کر نوافل پڑھنا اس لیے جائز ہے کہ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے، لیکن ان کا ثواب قیام کے مقابلے میں کم ہے۔

ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی امامت کا مسئلہ

سوال:

کیا "ہومیو پیتھک" علاج حرام ہے اور کیا ایسا شخص جو ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہو، وہ امامت کرواسکتا ہے، (مزمل ضیاء، فیصل آباد)۔

جواب:

عام لوگوں میں یہی مشہور ہے کہ ہومیو پیتھک ادویہ میں الکحل کے استعمال کے سبب یہ ادویہ حرام ہیں۔اس بارے میں ہم ایک تفصیلی فتویٰ ''تفہیم المسائل'' جلد 7،ص: 379 تا386 جاری کر چکے ہیں۔جس کے آخر میں ہم نے لکھا:''فقہائے اُمّت کا اِس پر اِجماع ہے کہ انگور یا کھجور سے کشید کی ہوئی شراب ،خواہ اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، بہرصورت حرام اور نجس ہے۔لیکن اگر اُس کی ماہیت تبدیل کر دی جائے اور اُسے سِرکہ بنالیا جائے،تو اس صورت میں حلال اور پاک ہوجائے گا۔

الکحل اور اسپرٹ کی ایک خاص مقدار نشہ آور ہوتی ہے،قلیل مقدار جو نشہ کی حد کو نہ پہنچے،امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے۔مشروبات میں ایتھائل الکحل استعمال ہوتا ہے،جس کا فارمولا C2H5OH ہے،یہ ایک زہریلا مائع ہے،جس کا مسلسل استعمال انسانی صحت کے لیے مُضِر ہوسکتا ہے۔فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق قلیل ترین مقدار میں الکحل یا اسپرٹ کا استعمال صرف طِبّی ضروریات یعنی علاج کے لیے ٹانک کے طور پر جائز ہے۔لیکن اگر اِس کا استعمال لہو ولعب یا عیش وطرَب کے لیے ہوتو پھر یہ حرام اور ناجائز ہے۔فقہائے کرام نے ممکنہ مفاسد سے بچنے کے لیے سَدِّ ذرائع کے طور پر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دیا تھا،جو حکمتِ دین کا تقاضا تھا۔موجودہ دور میں دواؤں میں جو الکحل استعمال ہوتی ہے،اس کی مقدار ایک فیصد سے بھی کافی کم ہوتی ہے،اِس لیے ہم امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے قول پر عمل کرتے ہوئے اِس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آج کل مشروبات ، پرفیومز اور ادویہ میں جو الکحل ڈالا جاتا ہے،وہ انگور یا کھجور سے کشید کردہ نہیں ہوتی بلکہ اسے دیگر نشاستے والی چیزوں سے کشید کیا جاتا ہے، کیونکہ انگور اور کھجور سے کشید کی ہوئی شراب بہت قیمتی ہوتی ہے۔
پرفیومز اور ٹھوس یا مائع ادویہ میں الکحل اُن اشیاء کے خراب ہونے اور طویل عرصے تک

قابلِ استعمال رہنے یا اپنی حالت پر قائم رکھنے کے لیے ڈالا جاتا ہے، نہ نشہ مقصود ہوتا ہے نہ ہی لہو ولعب۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تمام فقہاء کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ انگور اور کھجور سے کشید کی گئی شراب کی مقدار خواہ قلیل ہو یا کثیر، حرام اور نجس ہے۔ اِن کے علاوہ دیگر نشا ستے دار اشیاء کو اُبالنے یا جوش دینے (Fermentation) کے بعد جو الکحل بنایا جاتا ہے، تو اس کی اتنی قلیل مقدار جو نشہ کی حد تک نہ پہنچے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک حلال ہے۔ لیکن اگر کوئی ضرورت پر مبنی اِس جواز میں غُلُوّ کرتا ہے اور اِسے نشے کی عادت کے طور پر یا عَیش وطَرَب کے لیے استعمال کرتا ہے، تو یہ حرام ہے۔ الغرض اگر کسی دوا، خواہ ٹھوس ہو یا سیرپ ٹانک میں الکحل کی انتہائی معمولی مقدار ملی ہو، تو اُس کا استعمال جائز ہے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر اگر باشرع ہے اور فقہی اعتبار سے امامت کے معیار پر پورا اترتا ہے، تو اُس کی امامت جائز ہے۔

نفلی عبادات کا ایصالِ ثواب

سوال:

میرا سوال یہ ہے کہ نفل روزے اور نماز کا ثواب کسی مرحوم کو دیا جاسکتا ہے مثلاً بارہ رکعات چاشت پڑھیں اور کہا کہ 6 رکعات کا اصل ثواب میری والدہ کو پہنچے۔ شوال کے چھ نفلی روزے رکھ کر اس کا ثواب بھی مرحوم کو بخش دینا جائز ہے؟، (زاہد حسین چنگ)۔

جواب:

بندۂ مومن کے کسی نیک عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو جزا دی جاتی ہے، اسے ثواب کہتے ہیں۔ ایصال کے معنیٰ ہیں: ''پہنچانا'' اور ایصالِ ثواب کے معنی ہیں: کسی مسلمان کا اپنے کسی نیک عمل خواہ بدنی ہو یا مالی یا دونوں کے مجموعے کا ثواب کسی دوسرے مسلمان کو بخشش دینا یا ہدیہ کرنا۔

دعا بھی ایک عملِ خیر ہے، یہ دعا کرنے والے کا قلبی اور قولی فعل ہے، اس کے

ذریعۂ ثواب یاسببِ مغفرت بننے پر غلام احمد پرویز اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے سوا سب کا اتفاق ہے۔قرآن مجید میں انبیائے کرام علیہم السلام کی دعائیں مذکور ہیں اور قرآن وحدیث میں دعا کی ترغیب بھی دی گئی ہے اور فضیلت، آداب اور احکام بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔مسلمان میت پر نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اور وہ بھی ثناء اور درود کے علاوہ دعا پر مشتمل ہے اور ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو عمومی حقوق ہیں، اُن میں سے ایک وفات پانے والے کی نماز جنازہ ہے، جو کہ میت کا نہیں، بلکہ مُصلّی کا فعل ہے، تو اگر اس فعل کا فائدہ میت کو نہیں پہنچتا تو اسے مشروع کرنے کی اور حکمت کیا ہے؟۔

سب سے پہلے ہم اہلِ ایمان کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام، حاملینِ عرش ملائکہ اور خود مومنوں کی اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور جمیع اہلِ ایمان کے لیے اُن دعاؤں کا ذکر کریں گے، جو قرآن مجید میں مذکور ہیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ ''اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ''۔

ترجمہ:''وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں، وہ سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مؤمنوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو محیط ہے، سو تو ان لوگوں کی مغفرت فرما، جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرے راستے کا اتباع کیا ہے اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے، (المؤمن:7)''۔

اہلِ ایمان کو اپنے حق میں دعا کی ترغیب دی گئی:

☆ ''رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ۗ وَ اغْفِرْ لَنَا ۗ وَ ارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ

مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ"۔
ترجمہ:"اے ہمارے رب! ہم پر اُن احکام کا بوجھ نہ ڈالنا، جن کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مالک ہے تو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما، (البقرۃ:286)"۔

☆"اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔
ترجمہ:"جو یہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لائے سو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا، (آل عمران:16)"۔

☆"رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ"۔
ترجمہ:"اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک منادی کو ایمان کی ندا کرتے ہوئے سنا کہ (اے لوگو!) تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ سو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو مٹا دے، اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر، (آل عمران:193)"۔

☆"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"۔
ترجمہ:"اے ایمان والو! اللہ کی طرف خالص توبہ کرو، یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تم سے تمہارے گناہوں کو مٹا دے اور تم کو ان جنتوں میں داخل کر دے، جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں جس دن اللہ نہ نبی کو شرمندہ ہونے دے گا اور نہ اُن لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرف دوڑ رہا ہوگا وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل فرما دے اور ہمیں بخش دے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے،

(التحریم:8)"۔

گزشتہ اُمتوں کے انبیاء اور علماء کی اپنے حق میں دعا:

☆"وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ"۔

ترجمہ:"اور ان کی دعا صرف یہی تھی کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہماری زیادتیوں کو بھی اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما،(آل عمران:147)"۔

☆"قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ"۔

ترجمہ:"انہوں نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کے لائق نہ ہو، بے شک تو ہی بہت دینے والا ہے،(ص:35)"۔

دوسرے مسلمانوں کے لیے ایصالِ ثواب نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں اس وصف کو مدح کے طور پر بیان فرمایا ہے۔عباداتِ مالیہ یا بدنیہ فرض و نفل سب کا ثواب دوسروں کو پہنچایا جاسکتا ہے، ایصال ثواب مردوں کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے اور زندوں کے لیے بھی، قرآن مجید سے ایصالِ ثواب کا ثبوت ملتا ہے:

☆"قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأَخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ"۔

ترجمہ:"حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کرا اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے،(الاعراف:151)"۔

☆"رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ"۔

ترجمہ:"(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا،(ابراہیم:41)"

☆"رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ"۔

ترجمہ:''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرمااور ہمارے اُن مومن بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما جو ہم سے پہلے وفات پا چکے،(الحشر:10)''۔اور اس کے ایک معنیٰ ہیں: ''جو ایمان لانے میں ہم سے سبقت لے گئے''۔

☆''رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ''۔

ترجمہ:''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما،(نوح:28)''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''أِنَّ اِلانسَانَ لَهُ أَنْ يَجْعلَ ثَوابَ عَمَلِهِ لِغَيرِهٖ صَلاَةً أوْصَوماً،أوْصَدَقةً أوْ غَيرَهَاعِندَ أَهلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ،لِمَارُوِی عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انَّهُ ضَحّٰى بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ، أَحَدُهُمَاعَنْ نَفسِهٖ،وَالآخَرُعَنْ أُمّتِهٖ''۔

ترجمہ:''اہلُ السنہ والجماعۃ کے نزدیک انسان کے عمل (خیر) کا ثواب کسی دوسرے شخص کو پہنچایا جاسکتا ہے، جیسے نماز، روزہ، صدقہ یا دوسرے نیک اعمال۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت ہے: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سینگوں والے دو مینڈھوں کی قربانی کی، اُن میں سے ایک اپنی جانب سے اور دوسری اپنی امّت کی طرف سے،(صحیح البخاری:5558)، (ہدایہ، جلد2،ص:345)''۔

شرح عقائد النسفی میں ہے:

''وَفِي دُعَاءِالاَحْيَاءِلِلاَمْوَاتِ وَصَدَقَتِهِمْ أَیْ صَدَقَةِ الْاَحْيَاءِعَنْهُمْ أَیْ عَنِ الْاَمْوَاتِ، نَفْعٌ لَهُمْ أَیْ لِلاَمْوَاتِ''۔

ترجمہ:''زندوں کا مردوں کے لیے دعا کرنا اور زندوں کا مردوں کی طرف سے صدقہ کرنے کا فائدہ مُردوں کو پہنچتا ہے،(ص:394)''۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) ''اَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ ضَحّٰی بِکَبْشٍ أَقْرَنَ وَقَالَ: هٰذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَّمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي''۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ نے ایک سینگوں والے مینڈھے کی قربانی کی اور فرمایا: یہ میری طرف سے اور میری امت میں سے ہر اس شخص کی طرف سے ہے، جس نے (مالی استطاعت نہ ہونے کی بنا پر) قربانی نہیں کی، (مسند احمد: 11066)''۔

(۲) ''عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! إِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟، قَالَ الْمَاءُ، قَالَ فَحَفَرَ بِئْرًا وَّقَالَ هٰذِهٖ لِأُمِّ سَعْدٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! اُمِّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں، تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لیے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا: ''پانی''، چنانچہ انہوں نے کنواں کھدوا کر (وقف کر دیا) اور کہا: یہ ''اُمِّ سعد'' کا کنواں ہے (یعنی ان کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے)، (سنن ابی داؤد: 1678)''۔

(۳) ''عَنْ حَنَشٍ قَالَ: رَأَيْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ لَهُ مَا هٰذَا؟، فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَوْصَانِي أَنْ أُضَحِّيَ عَنْهُ فَأَنَا أُضَحِّي عَنْهُ''۔

ترجمہ: ''حَنَش کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا، میں نے عرض کی: یہ کیا ہے؟، اُنہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں آپ کی طرف سے قربانی کیا کروں، پس میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں، (سُنن ابوداؤد: 2787)''۔

(۴) ''عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟، قَالَ: نَعَمْ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: ''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی: میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ (موت

سے پہلے) بات کر پاتیں تو صدقہ کرنے کا حکم دیتیں۔ سو اب اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا اِس کا انہیں اجر ملے گا؟، نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: ہاں! (اِس کا اجر) اُسے ملے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1388، الفاظ کے کچھ تغیّر کے ساتھ: 2760)"۔

(۵) "عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا نَتَصَدَّقُ عَنْ مَوْتَانَا وَنَحُجُّ عَنْهُمْ وَنَدْعُو لَهُمْ فَهَلْ يَصِلُ ذٰلِكَ إِلَيْهِمْ؟، قَالَ نَعَمْ، وَيَفْرَحُونَ بِهِ كَمَا يَفْرَحُ أَحَدُكُمْ بِالطَّبَقِ إِذَا أُهْدِيَ إِلَيْهِ"۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: جب ہم اپنے فوت شدہ لوگوں کی طرف سے صدقہ کرتے ہیں اور اُن کی طرف سے حج کرتے ہیں اور اُن کے لیے دعائیں کرتے ہیں، کیا یہ اُن تک پہنچتا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ان تک پہنچتا ہے اور وہ اس سے اس طرح خوش ہوتے ہیں، جس طرح تم میں سے کسی کو خوانِ طعام ہدیہ کیا جائے، تو وہ خوش ہوتا ہے، (عمدۃ القاری، جلد 3، ص: 177، بیروت)"۔

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"علامہ زین الدین ابن نجیم مصری حنفی لکھتے ہیں: "ہمارے نزدیک انسان کے لیے اپنے عملِ صالح کا ثواب دوسروں کو پہنچانا جائز ہے، خواہ وہ عمل نماز ہو یا روزہ یا تلاوتِ قرآن یا ذکر یا طواف یا حج یا عمرہ یا ان کے علاوہ کوئی اور عمل ہو، یہ چیز کتاب اور سنت سے ثابت ہے، رہا یہ کہ حدیث میں ہے: "لَا يَصُومُ أَحَدٌ عَنْ أَحَدٍ، وَلَا يُصَلِّي أَحَدٌ عَنْ أَحَدٍ (نہ کوئی کسی کی طرف سے روزہ رکھے اور نہ کوئی کسی کی طرف سے نماز پڑھے)، (موطا امام مالک: 1069)"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی طرف سے نماز پڑھنے یا روزے رکھنے سے اس کا فرض ساقط نہیں ہوگا، اس میں ایصالِ ثواب کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ اِسقاطِ فرض کی نفی ہے، کیونکہ جس شخص نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ کیا اور اس کا ثواب زندہ یا مردے کو پہنچا دیا تو یہ جائز ہے اور اہلسنّت وجماعت کے نزدیک اس کا ثواب پہنچتا ہے، اسی طرح "بدائع الصنائع" میں ہے: اور اس سے معلوم ہوا کہ زندہ اور مردہ دونوں کو ثواب پہنچ سکتا

ہے اور انسان فعل کے وقت اپنی نیت کرے یا اپنے غیر کی نیت کرے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ ہر حال میں دوسرے کو ثواب پہنچا سکتا ہے''۔

فقہائے شافعیہ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں: ''علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں: تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز اور مستحب ہے، اور اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور اس کو نفع دیتا ہے اور صدقہ کرنے والے کو بھی اس سے نفع ہوتا ہے، قرآن کریم میں ہے: ''وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى (یعنی انسان کو صرف اپنی سعی کا صلہ ملتا ہے)، (النجم:39)''۔ بظاہر اس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا اس کے لیے ایصالِ ثواب کرے تو اس کو اس کا اجر نہیں ملے گا، لیکن اس باب کی احادیث اس آیت کے عموم کے لیے مُخصِّص ہیں۔۔۔۔ مسلمانوں کا اس پر بھی اجماع ہے کہ وارث پر میت کی طرف سے صدقہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، البتہ اگر میت پر حقوق مالیہ ثابت ہوں اور اس نے مال چھوڑا ہو تو ان حقوق کو ادا کرنا واجب ہے، خواہ میت نے ان کو ادا کرنے کی وصیت کی ہو یا نہ، میت کے مال سے اللہ تعالیٰ کے قرض اور حقوق ادا کیے جائیں مثلاً زکوٰۃ، حج، نذر، کفارہ اور روزوں کا فدیہ، اسی طرح لوگوں کے قرض ادا کیے جائیں اور اگر میت کا ترکہ نہ ہو تو ورثاء پر واجب نہیں ہے، لیکن ورثاء اور دوسرے مسلمانوں کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنی طرف سے تبرُّعاً میت کے حقوق مالیہ ادا کردیں، (شرح صحیح مسلم، جلد رابع، ص:505-504)''۔

نوٹ: اس آیت کے لیے احادیث کو مُخصِّص قرار دینے کی بھی چنداں حاجت نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی نیک عمل کرنے والے کو اس کا ثواب ملتا ہے، تو وہ اُسے دوسروں کو بخش دے، اس میں کیا حرج ہے، جیسے مزدور کو جب مزدوری مل جائے اور وہ اُسے کسی اور کو ہدیہ کرے تو اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ نیز اگر کوئی النجم:39 کے مَن پسند معنیٰ لینے پر بضد ہو، جبکہ احادیث میں ایصالِ ثواب مشروع ہے اور وہ اسے ایک دوسرے کی ضد قرار دے، تو ہم اس میں تطبیق اس طرح کریں گے کہ کسی کے ایمان کا ثواب کافر کو نہیں پہنچتا، لیکن احادیثِ مبارکہ

کی روشنی میں ایک مومن کے نیک عمل کا ثواب دوسرے مومن کو پہنچتا ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مسلکِ اہلِ حدیث کے ممتاز عالم نواب صدیق حسن خان بھوپالی (السراج الوہاج، جلد 2، ص:55) لکھتے ہیں: ''زندہ انسان، نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن، حج اور دیگر عبادات کا جو ثواب میت کو ہدیہ کرتا ہے، وہ میت کو پہنچتا ہے اور زندہ انسان کا اپنے فوت شدہ بھائی کے لیے یہ عمل نیکی، احسان اور صلہ رُحمی کے قبیل سے ہے اور تمام مخلوقات میں جس کو نیکی اور احسان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ میت ہے جو ''تَحتَ الثَّریٰ'' میں رہین ہے اور اب نیک اعمال کرنے سے عاجز ہے، پھر اپنے فوت شدہ بھائی کے لیے عبادات کا ہدیہ پیش کرنا ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے، سو جو شخص میت کے لیے ایک دن کے روزے یا قرآن مجید کے ایک پارے کی تلاوت کا ہدیہ پیش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو دس روزوں اور دس پاروں کا اجر عطا فرمائے گا اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنی عبادات کو دوسروں کے لیے ہدیۃً پیش کرنا اس سے بہتر ہے کہ انسان ان عبادات کا اپنے لیے ذخیرہ کرے، یہی وجہ ہے کہ جس صحابی نے کہا تھا کہ میں اپنی دعا کا تمام وقت آپ پر صلوٰۃ پڑھنے میں صرف کروں گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے لیے کافی ہے، یہ وہ صحابی ہیں جو بعد کے تمام لوگوں سے افضل ہیں، پھر اس قول کا کیا جواز ہے کہ سَلَفِ صَالحین نے فوت شدہ لوگوں کے لیے ایصالِ ثواب نہیں کیا!، کیونکہ اس قسم کے ایصالِ ثواب کے لیے لوگوں کی شہادت کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ سَلَفِ صالحین نے ایصالِ ثواب نہیں کیا تھا تو اس سے ایصالِ ثواب میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ مستحب ہے، واجب نہیں ہے اور ہمارے لیے ایصالِ ثواب کے جواز کی دلیل موجود ہے، خواہ ہم سے پہلے کسی نے ایصالِ ثواب کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ شیخ ابن قیّم نے ایصالِ ثواب کے لیے دلائل میں دعا، استغفار اور نمازِ جنازہ کو پیش کیا ہے اور ان تمام کاموں کو سَلَفِ صالحین نے کیا ہے اور نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ آپ کے لیے اذان کے بعد فضیلہ اور وسیلۃ (بلند درجہ) کی دعا کی جائے

اور آپ پر صلوٰۃ پڑھی جائے اور یہ قیامت تک مشروع ہے اور ہم نے اپنے مشائخ اور قرابت داروں کو دعا، تلاوتِ قرآن اور صدقات کا ثواب پہنچایا اور ہم نے خواب میں دیکھا کہ انہوں نے اس پر ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ ان تک ہمارا نفع پہنچا ہے۔ عبدالحق نے روایت کیا کہ حضرت ابن عمر نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر سورۂ بقرہ پڑھی جائے، امام احمد پہلے ایصالِ ثواب کا انکار کرتے تھے، جب انہیں حضرت ابن عمر کے اس قول کا علم ہوا تو انہوں نے اس انکار سے رجوع کرلیا۔ امام ابن ابی شیبہ نے حَجّاج بن دینار سے مرفوعاً روایت کیا ہے تم اپنی نمازوں کے ساتھ ماں باپ کی طرف سے نماز پڑھو اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کی طرف سے روزے رکھو اور اپنے صدقہ کے ساتھ ان کی طرف سے صدقہ کرو، حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مُردوں پر یٰسین پڑھو''، اس کا ایک احتمال یہ ہے کہ انسان کی موت کے وقت پڑھو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کی قبر پر پڑھو، علامہ سیوطی نے کہا: جمہور نے پہلی صورت کا اختیار کیا ہے اور شیخ ابن قیم نے کئی دلائل سے دوسری صورت کو ترجیح دی ہے، عبدالواحد مقدسی نے کہا: یہ احادیث مرفوعہ اور صالحین کی خواب میں بشارتیں ایصالِ ثواب کے جواز پر اور میت کو اس سے نفع پہنچنے پر دلالت کرتی ہیں، شیخ نے کہا: ہر چند کہ صرف صالحین کی بشارات دلیل نہیں بن سکتیں، لیکن بکثرت بشارات اس کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا: تمہارے خوابوں سے اس کی موافقت ہوتی ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرہ میں ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد رابع، ص: 507-508)''۔

ان احادیثِ مبارکہ اور تمام مسالک کے اکابر فقہائے کرام کے مستند حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ مالی صدقات کی طرح قولی اور فعلی عبادات اور اعمال خیر کا ثواب دوسروں کو ہدیہ کرنا یا بخش دینا شریعت میں ثابت ہے اور مشروع ہے۔

خطیب کے سامنے مسجد میں اذانِ جمعہ

سوال:

اکثر مساجد میں جمعہ کے دن اذانِ ثانی منبر کے قریب اور خطیب کے سامنے ہوتی ہے۔کیا یہ عمل شریعت کے خلاف ہے؟،نماز جمعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، برآمدے میں سہولت کے باوجود یہ عمل جاری ہے، ایسا کرنا شرعاً کیسا ہے؟،(عبداللہ بن عبداللہ)۔

جواب:

عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما میں جمعۃ المبارک کے دن ایک ہی اذان دی جاتی تھی اور اُس کے بعد دو خطبے اور نمازِ جمعہ کی ادائیگی عمل میں آتی تھی۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱)''عَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیدَ، قَالَ:کَانَ یُؤَذَّنُ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ، وَأَبِی بَکْرٍ، وَعُمَرَ''۔

ترجمہ:''حضرت السائب بن یزید بیان کرتے ہیں :رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب منبر پر بیٹھ جاتے ،تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے مسجد کے دروازے پر اذان دی جاتی تھی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں بھی اسی طرح ہوتا،(سُنن ابوداؤد:1088)''۔

(۲)''عَنِ ابْنِ عُمَرَ،قَالَ:کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ خُطْبَتَیْنِ،کَانَ یَجْلِسُ إِذَا صَعِدَ الْمِنْبَرَ حَتّٰی یَفْرُغَ أُرَاہُ قَالَ الْمُؤَذِّنُ ثُمَّ یَقُومُ، فَیَخْطُبُ،ثُمَّ یَجْلِسُ فَلَا یَتَکَلَّمُ، ثُمَّ یَقُوْمُ فَیَخْطُبُ''۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو خطبے دیتے تھے، آپ منبر پر بیٹھ جاتے اور جب مؤذن اذان سے فارغ ہوتا تو آپ کھڑے ہوکر ایک خطبہ دیتے، پھر بیٹھ جاتے اور کوئی بات نہیں کرتے تھے، پھر کھڑے ہوکر دوسرا خطبہ دیتے تھے، (سُنن ابوداؤد:1092)''۔

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں نمازِ جمعہ میں لوگوں کی کثرت کے سبب

دوسری اذان دی جانے لگی، آج کل خطیب کی تقریر سے پہلے صورۃً جو پہلی اذان دی جاتی ہے، یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں اضافی دی جانے والی اذان ہے۔

(۳)"عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، قَالَ: كَانَ النِّدَاءُ يَوْمَ الجُمُعَةِ أَوَّلُهُ إِذَا جَلَسَ الإِمَامُ عَلَى المِنْبَرِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَلَمَّا كَانَ عُثْمٰنُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَاءِ، قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: الزَّوْرَاءُ مَوْضِعٌ بِالسُّوقِ بِالْمَدِينَةِ"۔

ترجمہ:"حضرت السائب بن یزید بیان کرتے ہیں: جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی، جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں یہی معمول تھا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد آیا اور لوگ زیادہ ہوگئے تو مقامِ زوراء پر تیسری اذان کا اضافہ کردیا (یہاں اقامت کے اعتبار سے تیسری اذان فرمایا ہے) (امام بخاری فرماتے ہیں کہ زوراء مدینے کے بازار میں ایک مقام کا نام ہے)، (صحیح بخاری:913)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَوَجَبَ سَعْيٌ إِلَيْهَا وَتَرْكُ الْبَيْعِ بِالْأَذَانِ الْأَوَّلِ) فِي الْأَصَحِّ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي زَمَنِ الرَّسُولِ بَلْ فِي زَمَنِ عُثْمَانَ۔ (وَيُؤَذِّنُ) ثَانِيًا (بَيْنَ يَدَيْهِ) أَيِ الْخَطِيبِ"۔

ترجمہ:"زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کے ساتھ جمعہ کی طرف سعی کرنا واجب ہے، اگرچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شروع ہوئی ہے، دوسری اذان خطیب کے سامنے کہی جائے"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ فِي "شَرْحِ الْمُنْيَةِ": وَاخْتَلَفُوا فِي الْمُرَادِ بِالْأَذَانِ الْأَوَّلِ فَقِيلَ الْأَوَّلُ بِاعْتِبَارِ الْمَشْرُوعِيَّةِ وَهُوَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيِ الْمِنْبَرِ لِأَنَّهُ الَّذِي كَانَ أَوَّلًا فِي زَمَنِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَزَمَنِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ حَتَّى أَحْدَثَ عُثْمَانُ الْأَذَانَ الثَّانِيَ عَلَى الزَّوْرَاءِ حِينَ كَثُرَ النَّاسُ۔ وَالْأَصَحُّ أَنَّهُ الْأَوَّلُ بِاعْتِبَارِ الْوَقْتِ، وَهُوَ الَّذِي يَكُونُ عَلَى الْمَنَارَةِ بَعْدَ

الزَّوَالِ‘‘۔

ترجمہ: ’’شرح المنیۃ‘‘ میں مذکور ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس اذان پر سعی واجب ہے جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں یہی اذان اول تھی، حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں اذانِ ثانی شروع کی، جب لوگ زیادہ ہوگئے تو مقامِ زوراء پر یہ اذان دی جاتی تھی اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ وقت کے اعتبار سے یہی اذان اوّل ہے جو کہ زوال کے بعد منارہ پر دی جاتی ہے، (جلد 5،ص:81، دمشق)‘‘۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ’’اذان ثانی جمعہ کے دن امام کے قریب اندر مسجد کے جو مروج ہے اس میں کراہت یعنی کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی؟۔ فصیل حوض خارج مسجد ہے یا داخل مسجد؟، ابوداؤد کی حدیث میں جو حضور اقدس ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے وقت میں باب مسجد پر اذان کا ذکر ہے اُس وقت تک اذان اول شروع تھی یا نہیں؟ اگر اس وقت میں صرف ایک اذان تھی تو جب سے دوسری اذان شروع ہوئی اُس وقت بھی بقیہ خلفائے راشدین کے وقت میں اذانِ ثانی باب مسجد پر ہوتی تھی یا امام کے متصل منبر کے پاس؟ بینوا توجروا‘‘۔

آپ نے جواب میں لکھا:

’’علمائے کرام نے کراہت لکھی اور اسے مطلق رکھا اور مطلق کراہت غالباً کراہت تحریم پر محمول ہوتی ہے، سید عالم ﷺ کے زمانہ اقدس میں اذان دروازہ مسجد پر ہُوا کرتی اور کبھی نہ حضور سے منقول نہ خلفائے راشدین سے کہ مسجد کے اندر اذان کہلوائی ہو اور عادتِ کریمہ تھی کہ مکروہ تنزیہی کو بیان جواز کے لیے کبھی اختیار فرماتے پھر اس میں ترک ادب بارگاہ الٰہی ہے، والعلم بالحق عند اللہ۔ حوض قدیم کی فصیل فنائے مسجد ہے نہ عین مسجد، ورنہ اس پر وضو ناجائز ہوتا اور فنائے مسجد میں اذان جائز ہے۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔ صدر خلافت امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک وہی ایک اذان خطبہ تھی، انھوں نے اذانِ اول زائد فرمائی مگر اذانِ

خطبہ میں کوئی تبدیلی نہ کی، نہ کسی خلیفہ رُاشد سے اس میں کوئی تغیر منقول، ہاں امام ابن الحاج مکی نے مدخل میں ہشام بن عبدالملک بادشاہ مروانی کی نسبت لکھا کہ اس نے سنت کو بدلا اس کا زمانہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے اسی برس بعد ہوا، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8،ص:402-401)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کا موقف ہی ہمارے نزدیک راجح اور درست ہے، اگر کسی فتنے کے بغیر باہمی اتفاقِ رائے سے اس پر عمل ممکن ہوتو اِسی پر عمل کرنا چاہیے، ورنہ جہاں جس طریق پر عمل ہورہا ہے، اس پر عمل جاری رکھیں کہ بعض علمائے اہلسنت نے اِسے مکروہِ تنزیہی لکھا ہے، جو جواز کے درجے میں ہے، کیونکہ امامِ اہلسنت کے دور سے ہی یہ مسئلہ علمائے اہلسنت میں مختلف فیہ رہا ہے۔اس لیے ہماری رائے میں اِس مسئلہ پر شدت نہیں برتنی چاہیے، اِس کو فتنہ وفساد اور اہلسنت میں تفریق کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔نمازِ جمعہ کے اجتماع میں مسجد سے باہر اذان دینے کی صورت میں کئی مشکلات درپیش آتی ہیں، مؤذن کو اذان کہنے کے لیے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر مسجد کے دروازے تک جانا اور اذان کے بعد واپس لوٹنا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں دشواری ہے، مسجد خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، یہ خرابی ہر دوصورتِ میں لازم آتی ہے۔مسجد کے باہر ساؤنڈ سسٹم کا انتظام کرنا دوسری دشواری ہے، اگر بغیر ساؤنڈ سسٹم کے اذان دی جائے تو لوگوں کی بڑی تعداد جو دوسری اذان کے وقت مسجد میں آتی ہے، وہ جمعہ سے محروم رہ سکتے ہیں۔نیز اس دور میں اہلسنّت کی بہت سی مساجد میں اذان مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینے کا ہی رواج ہے اور اس مسئلے پر اگر شدت برتی جائے تو اس سے فتنے کا دروازہ کھلے گا اور خود امامِ اہلسنت، مجددِ دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے کہا ہے کہ دین کی عظیم تر حکمت کے تحت بعض مستحبات و مستحسنات کو ترک کیا جاسکتا ہے، جو شِعارِ نبوت سے بھی ثابت ہے۔ یہ اگر ایک یا چند مساجد کا مسئلہ ہوتا تو ضرور ہم عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیتے، لیکن اب یہ ابتلائے عام ہے، اس لیے اسے اہلسنّت کی مساجد میں نزاع واختلاف اور فساد کا ذریعہ نہ

بنایا جائے، ہم پہلے ہی بہت سی ابتلاؤں سے دوچار ہیں۔

شرعی مسافتِ سفر

سوال:

میرا آبائی گاؤں اسلام آباد سے تقریباً 227 کلومیٹر دور ہے، جہاں پر میرا آبائی گھر اور زمین ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام آباد میں بھی گھر ہے۔ یہ بتائیں کہ جب میں گاؤں جاؤں (پندرہ دن سے کم قیام ہو) تو میری نماز قصر ہوگی یا پوری؟، میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ مسافر کے لیے تین دن کا سفر ہو تو پھر مسافر ہوگا، جس میں رات شمار نہیں کی جائیگی اور دن میں بھی سواری اور اپنے آرام، عبادات اور طعام وغیرہ کا وقت بھی شامل ہے۔ تاہم کچھ علماء سے یہ سنا ہے کہ چونکہ اب پیدل سفر کا تصور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا ایک خاص مسافت کے لیے سفر کرنے والا شرعاً مسافر شمار ہوگا، پس سوال یہ ہے کہ سفر شرعی کی مسافت کتنی ہے، (س، اسلام آباد)۔

جواب:

کم ازکم مسافتِ سفر ''جس کا سفر شروع کرنے سے نماز میں ''قصر'' واجب ہوجاتی ہے، وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض یعنی نمازوں کی اپنے اوقات پر ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سفر کے ذرائع بدل گئے ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی کے بیان کیے ہوئے فارمولے اور مختار قول کے مطابق سفر شرعی کی مسافت تقریبا 99 کلومیٹر ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثُمَّ اخْتَلَفُوْا، فَقِيْلَ: اَحَدٌ وَّعِشْرُوْنَ، وَقِيْلَ: ثَمَانِيَةَ عَشَرَ، وَقِيْلَ: خَمْسَةَ عَشَرَ، وَالْفَتْوٰى عَلَى الثَّانِيْ لِاَنَّهُ الْاَوْسَطُ''۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے (سفرِ شرعی کی مسافت) اکیس فرسخ اور بعض نے اٹھارہ فرسخ اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دی ہے اور فتویٰ اٹھارہ فرسخ کے قول پر ہے، یہ اوسط قول ہے، (ردّالمحتار علی الدّر المختار: جلد 2،ص:526، بیروت)''۔لہٰذا مفتیٰ بہٖ قول کے مطابق شرعی مسافتِ سفر، جس کے لیے عزمِ سفر کرنے سے نماز قصر واجب ہوتی ہے، 18 فرسخ ہے اور اس کے چوّن شرعی میل بنتے ہیں، واضح رہے کہ شرعی میل دو ہزار گز کا ہوتا ہے اور آج کل کے اعشاری پیمانے سے یہ مسافت تقریباً 99 کلومیٹر بنتی ہے۔

وطن کی دو قسمیں ہیں: وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''(اَلْوَطَنُ الْاَصلِیُّ) ھُوَ مَوْطِنُ وِلَادَتِہٖ أَوْ تَاھُّلِہٖ أَوْ تَوَطُّنِہٖ''۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کرلے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَوْلُہٗ: (اَلْوَطَنُ الْاَصلِیُّ) وَیُسَمّٰی بِالْاَھْلِیِّ وَ وَطَنُ الْفِطْرَۃِ عَنِ الْقُھُسْتَانِی، قَوْلُہٗ: (أَوْ تَاھُّلِہٖ) أَیْ تَزَوُّجِہٖ۔

ترجمہ: وطنِ اصلی کو ''وطنِ اہلی'' اور ''وطن الفطرۃ'' بھی کہا جاتا ہے اور قُہستانی سے منقول ہے کہ (درمختار کی عبارت میں) ''أَوْ تَاھُّلِہٖ'' سے مراد کسی مقام پر شادی کر کے (اہل وعیال کے ساتھ) رہنا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:2،ص:535,536، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''عِبَارَۃُ عَامَّۃِ الْمَشَایِخِ اَنَّ الْاَوْطَانَ ثَلٰثَۃٌ: وَطَنٌ اَصلِیٌّ وَھُوَ مَوْلِدُ الرَّجُلِ أَوِ الْبَلَدُ الَّذِیْ تَاَھَّلَ بِہٖ وَوَطَنُ سَفَرٍ وَقَدْ سُمِّیَ وَطَنُ اِقَامَۃٍ، وَھُوَ الْبَلَدُ الَّذِیْ یَنْوِی الْمُسَافِرُ الْاِقَامَۃَ فِیْہِ خَمْسَۃَ عَشَرَ یَوْمًا أَوْ اَکْثَرَ وَ وَطَنُ سُکْنٰی وَھُوَ الْبَلَدُ الَّذِیْ یَنْوِی الْاِقَامَۃَ فِیْہِ دُوْنَ خَمْسَۃَ عَشَرَ یَوْمًا، وَعِبَارَۃُ عَامَّۃِ الْمُحَقِّقِیْنَ مِنْ مَّشَائِخِنَا اَنَّ الْوَطَنَ

وَطَنَانِ، وَطَنٌ اَصْلِیٌّ وَوَطَنُ اِقَامَةٍ وَلَمْ یَعْتَبِرُوْا وَطَنَ السُّکْنٰی وَطَنًا وَھُوَالصَّحِیْحُ ھٰکَذَا فِی "الْکِفَایَةِ"۔

ترجمہ:"عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں: ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے۔ دوسرا وطنِ سفر ہے، اسے وطنِ اقامت بھی کہتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لیے رہنے کا ارادہ لے اور تیسرا وطن سکنیٰ ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لیے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ "وطنِ سُکنیٰ"، کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور "کفایہ" میں بھی اِسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج:1،ص:143)"۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ آپ کی نیت اور ارادے پر موقوف ہے کہ آپ نے اپنے آبائی مقام کے ساتھ مستقل وطنیت کی نسبت قائم رکھی ہوئی ہے، تو آپ وہاں کم مدت کے لیے جائیں یا زیادہ، ہرصورت میں پوری نماز پڑھیں گے اور اسلام آباد میں اگر بیک وقت 15 دن یا اس سے زیادہ قیام کا ارادہ ہے تو پوری نماز پڑھیں گے، ورنہ قصر پڑھیں گے اور اگر آپ نے اپنی نیت اور ارادے میں اسلام آباد کو مستقل وطن کے طور پر اختیار کرلیا ہے تو پھر مدت قیام سے قطع نظر پوری نماز پڑھیں گے۔

نمازِ فجر کے بعد سونے کا حکم

سوال:

اسلام پورا ضابطۂ حیات ہے، اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ فجر کے بعد سونا اچھا نہیں ہے، میرا سوال یہ ہے کہ بہت سارے ممالک میں فجر ایک بجے رات کو ہوتی ہے، اس صورت میں یہ اصول کس طرح درست ہوگا، کیونکہ معمولاتِ زندگی وہاں پر بھی صبح آٹھ یا نو بجے شروع ہوتے ہیں، (فیصل قاسم، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾''۔

ترجمہ: ''اور ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا ہے، اور ہم نے دن کو روزگار کے لیے بنایا ہے، (النبأ:10-11)''۔

(۲) ''وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا''۔

ترجمہ: ''اور وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور نیند کو راحت بنایا اور دن کو اٹھنے (اور کام) کے لیے بنایا، (الفرقان: 47)''۔

(۳) ''هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا''۔

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون پاؤ اور دن کو چشم کُشا بنایا، (یونس:67)''۔

سو اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ قدرت میں رات کو آرام کے لیے اور دن کو طلبِ معاش کے لیے بنایا، مگر ہم نے قدرت کے نظام کو بدل دیا، بہت سے لوگ رات جاگ کر گزارنا اپنا کمال سمجھتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں۔ ہمارے ہاں توانائی کا بحران ہے، لیکن ہمارا کاروباری طبقہ اپنا معمول بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے اور حکومتیں نظام کو بہتر بنانے میں ناکام ہیں، حالانکہ ترقی یافتہ ممالک میں سرِشام کاروبار بند ہو جاتا ہے اور لوگ گھروں کا رخ کرتے ہیں اور دن کو اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ اکثر کی تو نمازِ فجر قضا ہو جاتی ہے، کیونکہ رات کے آخری حصے میں وہ سوتے ہیں اور دن چڑھے اٹھتے ہیں۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ دعا فرماتے: ''اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ فِیْ بُكُوْرِھَا''۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میری اُمّت کی صبح کے وقت میں برکت دے، (ابن ماجہ:1832)''۔

(۲) ''نَوْمُ الصُّبْحَةِ تَمْنَعُ الرِّزْقَ'' ترجمہ: ''صبح کے وقت سونا رزق کو روکنا (یعنی بے برکتی

کا سبب بنا) ہے، (المعتصر، جلد 1، ص: 10)''۔

(۳) ''اِذَا صَلَّیْتُمْ صَلَاۃَ الْفَجْرِ فَلَا تَنَامُوْا عَنْ طَلَبِ أَرْزَاقِکُم''۔

ترجمہ: ''جب تم صبح کی نماز ادا کرلو تو اپنے رزق کے لیے جدوجہد کیے بغیر نیند (آرام) کا نام نہ لو، (کنزالعمال، رقم: 9299)''۔ جن ممالک اور علاقوں میں نمازِ فجر کے بعد مختصر وقفے سے معمولاتِ زندگی شروع ہوجاتے ہیں، نمازِ فجر کے بعد سونے کی ممانعت کے حکم کا اطلاق ان ممالک اور خطوں کے بارے میں ہوگا، البتہ جن ممالک اور علاقوں کی موسمی صورتِ حال مختلف ہے کہ فجر کی نماز کے بعد فوراً یا مناسب وقفے کے بعد معمولاتِ زندگی شروع نہیں ہوتے، جیسے یورپی ممالک اور خاص طور پر اسکنڈے نیویا کے ممالک، اُن کے لیے شرعی رخصت پر عمل کرنے کی اجازت ہے۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''لَا تَنَامُوْا عَنْ طَلَبِ اَرْزَاقِکُمْ فِیْمَا بَیْنَ صَلَاۃِ الْفَجْرِ اِلٰی طُلُوْعِ الشَّمْسِ، فَسُئِلَ اَنَسٌ عَنْ ذٰلِکَ، فَقَالَ: تُسَبِّحُ وَتُهَلِّلُ وَتُکَبِّرُ وَتَسْتَغْفِرُ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً، فَعِنْدَ ذٰلِکَ یَنْزِلُ الرِّزْقُ الطَّیِّبُ''۔

ترجمہ: ''نمازِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک اپنے رزق کو طلب کیے بغیر نہ سوؤ، حضرت انس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ستر مرتبہ تسبیح وتہلیل اور تکبیر (یعنی سُبْحَانَ اللهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللهُ اور اَسْتَغْفِرُ اللهَ) پڑھے، کیونکہ اس وقت پاکیزہ رزق نازل ہوتا ہے، (اللآلی المصنوعۃ، جلد 2، ص: 157)''۔

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لَا یَقْعُدَنَّ أَحَدُکُمْ عَنْ طَلَبِ الرِّزْقِ''۔

ترجمہ: ''تم میں سے کوئی شخص بھی طلبِ رزق کی جدوجہد میں پست ہوکر نہ بیٹھ جائے، (التراتیب الاداریۃ، کتانی)''۔

ہمارے علم میں یہ نہیں ہے کہ بہت سے ممالک میں فجر ایک بجے دن کو ہوتی ہے، یہ ضرور ہے کہ اسکنڈے نیویا کے ممالک میں سردیوں میں رات اٹھارہ گھنٹے ہوتی ہے اور

گرمیوں میں دن اٹھارہ گھنٹے تک کا ہوتا ہے اور مقامی علماء نے اپنے موسم اور حالات کے مطابق شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے نماز کے اوقات مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب یا معمولاتِ زندگی شروع کرنے تک کافی وقفہ ہو تو اس صورت میں فجر کے بعد سو سکتے ہیں۔اسلام یُسر کا دین ہے، عُسر کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ''۔

ترجمہ:''اور اللہ نے تمہارے لئے دین میں تنگی نہیں رکھی، (الحج:78)''۔

(۲) ''يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ''۔

ترجمہ:'' اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا، (البقرۃ:185)''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا۔ ترجمہ:'' دین کو آسان کر کے پیش کرو، مشکل کر کے پیش نہ کرو اور لوگوں کو (اللہ کی رحمت کی) بشارت دو، اُنہیں (دین سے) مُتنفّر نہ کرو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:69)''۔البتہ قطبِ شمالی جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، وہاں کے مسائل بھی عام فقہی ضوابط سے مستثنیٰ ہیں۔

اقامت کے وقت کہاں کھڑا ہو

سوال:

میری ناقص معلومات کے مطابق اقامت کہنے کے لیے امام کے پیچھے سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑا ہونا چاہیے، جبکہ ہماری مسجد میں مؤذن کا مصلّیٰ الٹے ہاتھ کی طرف بچھایا جاتا ہے۔ایک صاحب مستقل طور پر مؤذن کے مصلّیٰ کے تہائی حصے پر بیٹھ جاتے ہیں اور مؤذّن صاحب امام صاحب کے الٹے ہاتھ پر کھڑے ہوتے ہیں، کیا یہ طریقہ سنت کے مطابق ہے؟،

(مخدوم حسن صدیقی، ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

اقامت امام کے محاذات میں کہنا سنّت ہے، پھر سیدھے ہاتھ کی جانب مناسب ہے۔
امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: ''اقامت صف کے دہنی جانب کہی جائے یا بائیں، اس میں کوئی فضیلت دہنے بائیں کی ہے یا نہیں''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''اقامت امام کی محاذات میں کہی جائے، یہی سنّت ہے، وہاں جگہ نہ ملے تو دہنی طرف ''لِفَضْلِ الْیَمِینِ عَنِ الشِّمَالِ'' (کیونکہ دائیں جانب کو بائیں پر فضیلت ہے) ورنہ بائیں طرف لِحُصُولِ الْمَقْصُودِ بِکُلِّ حَالٍ (کیونکہ مقصود ہر حال میں حاصل ہوتا ہے)، (فتاویٰ رضویہ، جلد5، ص:397)''۔
مزید سوال کیا گیا: ''اذان واقامت کس جانب کو چاہیے''، آپ نے جواب میں لکھا: ''اور اقامت کی نسبت بھی تعیین جہت کہ دہنی جانب ہو یا بائیں، فقیر کی نظر سے نہ گزری، بلکہ ہمارے ائمہ تصریح فرماتے ہیں: افضل یہ ہے کہ امام خود اذان واقامت کہے:
''فِی الدُّرِّ الْمُخْتَارِ: اَلْاَفْضَلُ کَوْنُ الْاِمَامِ هُوَالْمُؤَذِّنُ، اِنْتَهٰی- وَفِی فَتْحِ الْقَدِیْرِ: اَلْاَفْضَلُ کَوْنُ الْاِمَامِ هُوَالْمُؤَذِّنُ وَهٰذَامَذْهَبُنَاوَعَلَیْهِ کَانَ اَبُوحَنِیفَةَ اِنْتَهٰی، وَفِی رَدِّالْمُحْتَارِ: اَلسُّنَّةُ اَنْ یُّقِیْمَ الْمُؤَذِّنُ ،اِنْتَهٰی- وَفِیْهِ عَنِ السِّرَاجِ اَنَّ اَبَاحَنِیفَةَ کَانَ یُبَاشِرُ الْاَذَانُ وَالْاِقَامَةُ بِنَفْسِهٖ''۔
ترجمہ: '''''درمختار'' میں ہے: افضل یہی ہے کہ امام خود مؤذن ہو، انتہی، اور ''فتح القدیر'' میں ہے: امام کا ہی مؤذن ہونا افضل ہے، یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی امام اعظم کی رائے ہے، انتہی اور ''ردالمحتار'' میں ہے: سنت یہ ہے کہ مؤذن تکبیر کہے، انتہی اور اسی میں ''سراج'' سے ہے: امام اعظم ابوحنیفہ اذان واقامت خود کہتے تھے''۔
اور علماء جائز رکھتے ہیں کہ جہاں اذان ہوئی وہیں اقامت بھی کہی جائے اور ظاہر ہے کہ اذان مسجد کے اندر نہیں ہوتی بلکہ مکروہ ہے، پھر جب بیانِ افضلیت پر آتے ہیں تو اسی قدر فرماتے ہیں کہ اقامت کا مسجد میں ہونا بہتر ہے اور یہاں لفظ کو مطلق چھوڑتے ہیں،

تخصیصِ جہت کچھ نہیں کرتے:

''فِی الْبَحْرِ الرَّائِقِ: یُسْتَحَبُّ التَّحَوُّلُ لِلْاِقَامَةِ اِلٰی غَیْرِ مَوْضِعِ الْاَذَانِ، اِنْتَھٰی وَفِیْهِ یَسُنُّ الْاَذَانُ فِیْ مَوْضِعٍ عَالٍ وَّالْاِقَامَةُ عَلَی الْاَرْضِ''۔

ترجمہ: ''البحر الرائق'' میں ہے: اقامت کے لیے اذان کی جگہ بدل لینا مستحب ہے اور اسی میں ہے اذان کا ''بلند جگہ'' اور اقامت کا فرش زمین پر ہونا مسنون ہے''۔ ہاں اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ اقامت کہتے وقت امام کی محاذات (یعنی امام کے پیچھے سیدھ) میں ہونا یا پھر اس کے دائیں جانب ہونا مناسب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 372)''۔ الغرض جہاں افضلیت کا معاملہ ہو تو اسے اختلاف کا سبب نہیں بنانا چاہیے، علیحدگی میں مؤذن صاحب کو متوجہ کردیں اور امام اہلسنّت نے لکھا ہے کہ امام کے بائیں جانب اقامت کہنے سے بھی مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

خواتین کی امامت

سوال:

کچھ خواتین نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد جاتی ہیں اور ہر فرض نماز کے ساتھ ساتھ رمضان المبارک میں تراویح کا اہتمام بھی کرتی ہیں اور اس کی امامت ایک خاتون کرواتی ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ ایک خاتون امامت کروا رہی ہے اور پیچھے خواتین نماز پڑھتی ہیں کیونکہ امامت تو صرف مرد کرواسکتا ہے، (عمارہ شفیق، مکہ مکرمہ)''۔

جواب:

اس مسئلے پر تفصیلی فتویٰ تفہیم المسائل جلد ششم میں ہے۔ اختصار کے ساتھ یہاں بیان کیا جارہا ہے، تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیں:

''اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور جمعہ کی امامت بھی نہیں کرسکتی۔ ہمارے ائمہ میں سے علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی صاحبِ ''ہدایہ'' نے عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی کہا ہے اور علامہ کمال الدین بن ہمام صاحبِ

''فتح القدیر'' نے لکھا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اَولیٰ ہے۔ تاہم اگر کہیں کوئی عورت، عورتوں کی امامت کرے تو وہ آگے نہ کھڑی ہو بلکہ عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

''وَتُكْرَهُ جَمَاعَتُهُنَّ، يَقِفُ الْاِمَامُ وَسَطَهُنَّ، وَلَا تَصْلَحُ اِمَامًا لِلرِّجَالِ''۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، عورت امام ہو تو وہ صف کے درمیان کھڑی ہو اور عورت مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے، (اَلاَشباہ والنظائر، ص:316)''۔ علامہ ابن نُجیم حنفی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، کیونکہ یہ حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے عورتوں کے امام کا صف کے درمیان کھڑا ہونا، تو ننگے بدن والوں کی جماعت کی طرح یہ جماعت بھی مکروہ ہوگی، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ یہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ امام کا صف سے آگے ہونا واجب ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس پر مُواظَبت (ہمیشگی) فرمائی، اور واجب کا ترک کراہتِ تحریمی کا سبب ہے جو گناہ ہے، (البحرالرائق، جلد:01، ص:614)''۔

امام ابن ہُمام کا عورتوں کے لیے عورت کی امامت کو مکروہِ تنزیہی قرار دینے کا سبب وہ احادیث ہیں، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمِّ ورقہ کو امامت کی اجازت دی اور حضرتِ عائشہ اور حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرمائی۔ امام ابن نُجیم اور صاحبِ ہدایہ ودیگر فقہاءِ امت کا عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی قرار دینا فقہی اصول کی بنا پر ہے، جسے ''البحرالرائق'' میں بیان کیا گیا ہے اور شاید ان ائمہ کے نزدیک وہ اجازت اُمِّ ورقہ اور بعض صحابیات کے ساتھ خاص تھی یا ان کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔ ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام دینی حکمت اور ضرورت کے تحت موقع کی مناسبت سے کسی ایک موقف پر رائے دے سکتے ہیں۔

نماز کے دوران عملِ قلیل مفسدِ نماز نہیں ہے

سوال:

اخبار میں ایک مفتی صاحب نے دورانِ نماز دونوں ہاتھوں سے کپڑے درست کرنے کے بارے میں لکھا: ''رکوع، سجدے یا قعدے سے کھڑے ہونے کے بعد دونوں ہاتھوں سے کپڑا درست کرنے سے احتیاط کرنی چاہیے، اس کی عادت بنالینا مکروہ ہے، تاہم اگر دونوں ہاتھوں سے معمولی حرکت سے کپڑا درست کرلیا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، (شامی: 624/1)''، کیا یہ مسئلہ درست ہے؟، (مولانا منور احمد، ملیر)۔

جواب:

اَحادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) ''وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَمْسَحُ الرَّجُلُ جَبْهَتَهُ مِنَ التُّرَابِ حَتَّى يَفْرُغَ مِنَ الصَّلَاةِ، وَلَا بَأْسَ أَنْ يَمْسَحَ الْعَرَقَ عَنْ صُدْغَيْهِ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُصَلِّي عَلَيْهِ مَا دَامَ أَثَرُ السُّجُودِ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''واثلہ بن اسقع بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: آدمی نماز سے فارغ ہونے تک اپنی پیشانی سے مٹی نہ پونچھے اور اپنی کنپٹی سے پسینہ پونچھنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ جب تک سجدوں کے نشانات باقی رہیں، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں، (مجمع الزوائد: 2456)''۔

(۲) ''وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَمْسَحُ الْعَرَقَ عَنْ وَجْهِهِ فِي الصَّلَاةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز میں اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے تھے، (مجمع الزوائد: 2458)''۔

نماز میں خشوع وخضوع اور سکون وقرار کی کیفیت طاری ہونی چاہیے، اگر ہم کپڑوں کی طرف متوجہ ہوں گے تو نماز میں حضوریِ قلب کی کیفیت کیسے نصیب ہوگی، حدیث میں

ہے:

''عَنْ رَجُلٍ، قَالَ رَاٰی سَعِیدُ بْنُ الْمُسَیِّبِ رَجُلًا وَھُوَ یَعْبَثُ بِلِحْیَتِہٖ فِی الصَّلَاۃِ، فَقَالَ:لَوْ خَشَعَ قَلْبُ ھٰذَا، لَخَشَعَتْ جَوَارِحُہٗ''۔

ترجمہ:''ایک شخص سے روایت ہے:(مشہور تابعی)سعید بن مسیّب نے ایک شخص کو نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو کہا:اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے (اعضاءو)جوارح میں بھی خشوع ہوتا،(مصنف ابن ابی شیبہ:6787)''۔خشوع سے مراد بندے کا قلب اور قالب دونوں سے تواضع اور عاجزی کا پیکر بن جانا ہے۔

لہٰذا نمازی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور حددرجہ احتیاط کرے۔آج کل رکوع وسجود میں جاتے اور اٹھتے وقت لوگ کپڑوں کو کسی نہ کسی انداز میں سمیٹنے میں مبتلا ہیں،یہ عمل پسندیدہ نہیں ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے،لیکن ہم اسے مفسدِ نماز قرار نہیں دے سکتے،اس میں عام لوگوں کے لیے حرجِ عظیم ہے۔لہٰذا ہمارے نزدیک مذکورہ بالا مفتی صاحب کا فتویٰ درست ہے،لیکن مستفتی کا اس عمل سے اجتناب اور احتیاط بہتر ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''اَلْعَمَلُ الْکَثِیْرُ یُفْسِدُ الصَّلٰوۃَ، وَالْقَلِیْلُ لَا، کَذَا فِی مُحِیْطِ السَّرَخْسِیْ، وَاخْتَلَفُوْا فِی الْفَاصِلِ بَیْنَھُمَا عَلٰی ثَلَاثَۃِ اَقْوَالٍ، اَلثَّالِثُ:اَنَّہٗ لَوْ نَظَرَ اِلَیْہِ نَاظِرٌ مِنْ بَعِیْدٍ، اِنْ کَانَ لَا یَشُکُّ اَنَّہٗ فِیْ غَیْرِ الصَّلٰوۃِ فَھُوَ کَثِیْرٌ مُفْسِدٌ، وَاِنْ شَکَّ فَلَیْسَ مُفْسِدٌ، وَھٰذَا ھُوَ الْاَصَحُّ ھٰکَذَا فِی ''التَّبْیِیْنِ'' وَھُوَ اَحْسَنُ کَذَا فِیْ ''مُحِیْطِ السَّرَخْسِیْ'' وَھُوَ اِخْتِیَارُ الْعَامَّۃِ، کَذَا فِی فَتَاوٰی ''قَاضِیخَان'' وَ''الْخُلَاصَۃ''۔

ترجمہ:''عملِ کثیر نماز کو فاسد کردیتا ہے اور قلیل فاسد نہیں کرتا،محیط سرخسی میں اسی طرح ہے،عملِ کثیر وقلیل کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے فقہائے کرام کے تین اقوال ہیں:قولِ ثالث یہ ہے:اگر دور سے دیکھنے والے کو یقین یا ظنِ غالب ہوجائے کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے،تو یہ عملِ کثیر ہے اور مفسدِ نماز ہے اور اگر(اُسے ایسا یقین نہ ہو بلکہ)وہ

شک کرے (کہ یہ نماز میں ہے) تو ایسا عمل (قلیل ہے اور) مفسدِ نماز نہیں ہے، "تبیین الحقائق" میں اس قول کو اصحّ (صحیح ترین)، "محیطِ سرخسی" میں اَحسن (سب سے بہتر) کہا گیا ہے اور عام فقہاء کا مختار یہی ہے اور "فتاویٰ قاضی خان" اور "خلاصہ" میں اسی طرح ہے، (عالمگیری، ج:1،ص:102)"۔

وطنِ اقامت کے باطل ہونے کی صورتیں

سوال:

ایک شخص نے کسی شہر میں پندرہ دن اقامت کی نیت کی، پندرہ دن بعد کسی دوسرے مقام پر یا اپنے وطن اصلی چلا گیا۔ دوبارہ اسی شہر میں آنے پر نمازوں کے لیے کیا حکم ہوگا؟۔ ایک مفتی صاحب سے سوال ہوا: "میں ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہوں، میرے گھر سے یہ ادارہ 250 کلومیٹر دور ہے، میں وہاں 13 دن ڈیوٹی کرتا ہوں اور سات دن گھر پر گزارتا ہوں۔ یہ روٹین ڈپارٹمنٹ کی طرف سے طے شدہ ہے، جب تک ملازمت ہے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ جب ڈیوٹی شروع ہوئی تھی تو ابتداء میں 20 اور 30 دن بھی رکا ہوں، آئندہ بھی شاید 15 یا اس سے زیادہ دنوں کے لیے رکنا ہوگا، اس صورت میں میرے لیے شرعی حکم کیا ہے، قصر نماز پڑھوں یا پوری نماز ادا کروں، نیز اب گھر میں نماز کی صورت کیا ہوگی"۔ انہوں جواب میں لکھا: "ایک مرتبہ جائے ملازمت پر پندرہ دن سے زیادہ قیام کر لینے سے مذکورہ جگہ آپ کے لیے وطنِ اقامت بن چکی ہے۔ اب جب ملازمت کے سلسلے میں وہاں جائیں گے تو پوری نماز پڑھیں گے، اگرچہ وہاں قیام کی مدت پندرہ دن سے کم ہو۔ گھر میں بھی پوری نماز پڑھنا لازم ہے"۔ کیا یہ مذکورہ بالا مسئلہ درست ہے؟، (ابوحذیفہ ہاشمی، لیہ، پنجاب)۔

جواب:

اگر کسی جگہ پندرہ دن اقامت کی نیت کی تو مقیم ہوگیا، اب جب تک وہاں مقیم ہے، نمازیں پوری ادا کرے گا، لیکن وہاں سے شرعی مسافت سفر پر ارادے سے جانے کے بعد

یہ نیتِ اقامت باطل ہوجائے گی اور دوبارہ اس جگہ جانے کی صورت میں دوبارہ نیت کرنا ہوگی۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''وَیَبْطُلُ وَطَنُ الْاِقَامَةِ بِمِثْلِهٖ وَبِالْوَطَنِ الْاَصْلِیِّ وَبِاِنْشَاءِ السَّفَرِ''۔

ترجمہ:''وطنِ اقامت،(دوسرے)وطنِ اقامت اور وطنِ اصلی اور مسافت شرعی پر قصداً سفر کرنے سے باطل ہوجاتا ہے،(جلد4،ص:649،دمشق)''۔

فقہائے کرام نے وطن کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(۱)وطن اصلی (۲)وطن اقامت (۳)وطنِ سُکنیٰ

وطن اصلی اس علاقہ یا شہر کو کہا جاتا ہے،جس میں انسان کی پیدائش ہو یا جس میں کسی نے شادی کی ہو اور اپنے اہل کے ساتھ مُتمکن ہو،وطنِ اصلی کو وطنِ فطرۃ اور وطنِ قرار بھی کہا جاتا ہے۔وطنِ اقامت سے مراد وہ مقام ہے کہ جس میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کی ہو۔بعض فقہائے کرام وطنِ سُکنیٰ کا اعتبار نہیں کرتے۔

مفتی محمد وقار الدین رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا:''ایک شخص ایک جگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لیے مقیم ہوگیا،پھر وہاں سے شرعی مسافت سفر پر گیا اور دوبارہ پندرہ دن سے کم مدت کے لیے وہاں ٹھہرا،تو کیا نماز قصر پڑھے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا:''ایسا شخص مسافر کہلائے گا،وطن اقامت بنالینے کے بعد،پھر اگر یہ شخص سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کو پھر اسی جگہ واپسی پر(پندرہ دن اقامت کی)نیت جدیدہ کرنا ضروری ہوگی،(وقار الفتاویٰ،جلد دوم،ص:139)''۔

امام احمد رضا قادری قدّس سرّہ العزیز لکھتے ہیں:

''وطن اقامت،یعنی جہاں پندرہ دن یا زیادہ قیام کی نیت صحیحہ کرلی ہو،آدمی کو مقیم کردیتا ہے اور اقامت وسفر میں واسطہ نہیں تو وہاں سے بے ارادہ مدت سفر اگر ہزار کوس دورہ کرے مثلاً دس کوس کے ارادے پر وہاں سے چلے،پھر وہاں سے پندرہ کوس کا ارادہ کرے،وہاں سے

بیس کوس کا قصد ہو، مسافر نہ ہوگا اور قصر نہ کر سکے گا جیسے وطن اصلی سے، یوں دورہ کرنے میں حکم ہے، یہاں تک کہ اگر مثلاً وطن اقامت سے بیس کوس گیا اور وہاں سے چھبیس کوس کا ارادہ کر کے چلا اور بیچ میں وطن اقامت آ کر پڑے گا تو سفر جاتا رہے گا، ہاں اگر تین منزل چلنے کے بعد یہ وطن بیچ میں نہ آیا، تو قصد کرنے سے یہ وطن وطن اقامت نہ رہے گا۔

ردالمحتار میں ہے:

"وَالْحَاصِلُ اَنَّ اِنْشَاءَ السَّفَرِ يُبْطِلُ وَطَنَ الْاِقَامَةِ اِذَا كَانَ مِنْهُ، أَمَّا لَوْ اِنْشَاءُهُ مِنْ غَيْرِهِ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيهِ مُرُوْرٌ عَلٰى وَطَنِ الْاِقَامَةِ أَوْ كَانَ وَلٰكِنْ بَعْدَ سَيْرِ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فَكَذٰلِكَ، وَلَوْقَبْلَهُ لَمْ يُبْطِلِ الْوَطَنَ بَلْ يُبْطِلُ السَّفَرَ لِاَنَّ قِيَامَ الْوَطَنِ مَانِعٌ مِنْ صِحَّتِهٖ"۔

ترجمہ: "حاصل یہ ہے کہ (مسافتِ شرعی کے لیے) سفر شروع کرنے سے وطن اقامت باطل ہو جاتا ہے جبکہ سفر وہاں سے ہوا اور اگر سفر کسی اور جگہ سے ہو تو اگر اب وطن اقامت سے گزر نہیں ہوا یا ہوا لیکن تین دن بعد، تو حکم یہی ہے اور اگر اس سے پہلے ہوا تو وطن اقامت بالکل باطل نہ ہوگا بلکہ سفر باطل ہو جائے گا، کیونکہ قیام وطن صحت سفر سے مانع ہوتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:263-262)"۔

مزید لکھتے ہیں:

"اگر پندرہ دن مقیم رہنے کے بعد وہاں سے واپس ہوا اور بیچ میں مسافت شرعی کا سفر نہیں تو اب راہ میں بھی پوری پڑھے گا اور یہاں پہنچ کر بھی کہ قبل سیر سہ روزہ جنگل میں نیتِ اقامت صحیح ہے اور بوجہ عدم اِنشائے سفر اُس کی نہ وہ اقامت باطل ہوئی، نہ وہ وطن اقامت باطل ہوا، اس صورتِ ششم میں اُس کا حکم شقوق صورتِ ثانیہ آئندہ کی طرف عود کا جائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:266-265)"۔

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق وطنِ اصلی دوسرے وطن اصلی سے باطل ہو جائے گا، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے آبائی علاقے (جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہے) کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر مستقل رہائش اختیار کر لی ہے، جیسے لاہور کا شہری کراچی میں

مستقل طور پر آکر رہائش پذیر ہوگیا، اس کے بعد جب وہ لاہور جائے گا، تو اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت سے گیا ہے، تو وہاں قصر کرے گا، کیونکہ اب لاہور اس کا وطنِ اصلی نہیں رہا۔ وطنِ اقامت، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت دونوں سے باطل ہوجاتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص:142 میں ہے:

''وَطَنُ الاِقَامَةِ یُبْطِلُ الاِقَامَةَ وَبِاِنْشَاءِ السَّفرِ وَبِالْوَطنِ الأَصْلِیِّ''، لہٰذا اگر کوئی شخص ملازمت کے سلسلے میں کہیں رہائش پذیر ہو تو وہ اس کا وطنِ اقامت کہلائے گا، جب چھٹیوں میں گھر جائے گا تو چونکہ وطنِ اقامت وطنِ اصلی سے باطل ہوجاتا ہے، لہٰذا وہ وطنِ اقامت باطل ہوجائے گا۔ آئندہ اگر پندرہ دن سے کم کی نیت پر جائے گا تو نمازیں قصر پڑھے گا۔

دینی مسائل کا جواب دیتے ہوئے مفتی صاحب نے ایک سائل کے قصر نماز سے متعلق سوال کے جواب میں لکھا ہے: ''وطنِ اقامت میں پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں بھی پوری نماز پڑھی جائے گی''، ہمارے نزدیک حنفی فقہائے کرام کی تصریحات کے خلاف ہے، فقہ حنفی کی رُو سے صحیح مسئلہ وہی ہے، جو ہم نے بیان کیا ہے۔

نوافل کے ممنوع اوقات اور ماقبل و مابعد فرض سنتوں کی ترتیب

سوال:

کیا ظہر کی پہلی سنتوں اور فرائض کے درمیان نوافل ادا کرسکتے ہیں؟ نوافل کے ممنوع اوقات کون کون سے ہیں اور اگر جماعت میں شرکت کے سبب ظہر کی پہلی چار سنتیں رہ جائیں تو فرض کے بعد سنتوں کی ترتیب کیا ہونی چاہیے، (سفیان سعید، کراچی)۔

جواب:

نوافل کے ممنوع اوقات یہ ہیں:

(۱) طلوعِ فجر کے بعد سوائے فجر کی سنتوں کے نمازِ فجر تک، (۲) فجر کے فرض ادا کرنے کے بعد سے طلوعِ آفتاب کے بیس منٹ بعد تک، (۳) عصر کے فرض پڑھنے کے بعد سے غروبِ آفتاب تک، البتہ امام ابن ہُمام کے نزدیک غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ مغرب سے

پہلے دو خفیف نفل پڑھ سکتے ہیں، (۴) امام کے خطبہ جمعہ شروع کرنے سے لے کر نماز جمعہ سے فراغت تک، (۵) وقتی فرض کی اقامت شروع ہونے پر، البتہ اگر اس دن کی فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھیں، تو جماعت کی جگہ سے پیچھے ہٹ کر پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ سنتیں پڑھنے سے جماعت فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، خواہ تشہّد ہی میں شامل ہو سکے، پس اگر جماعت چھوٹنے کا خوف ہو تو فجر کی سنتیں چھوڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے، (۶) طلوعِ آفتاب کے بعد نمازِ عید سے پہلے عیدگاہ اور گھر دونوں جگہ نفل پڑھنا منع ہے، (۷) نماز عید سے فراغت کے بعد مسجد یا عیدگاہ میں نفل پڑھنا منع ہے، البتہ گھر پر پڑھ سکتے ہیں، (۸) عرفات میں امام الحج کی اقتدا میں ظہر و عصر کی نماز ملا کر پڑھی جا رہی ہو، تو ان دونوں نمازوں کے درمیان اور بعد میں نفل پڑھنا منع ہے، (۹) مُزدلفہ میں جب مغرب اور عشاء کی نماز ملا کر پڑھی جا رہی ہو تو دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا منع ہے، بعد میں منع نہیں ہے، (۱۰) اگر قضائے حاجت بے قرار کر رہی ہو تو اس طبعی تقاضے سے فراغت نماز پر مُقدّم ہے اور ہر طرح کی نماز ممنوع ہے، کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے نماز میں حضوری کی کیفیت قائم نہیں رہتی، لیکن اگر وقت تنگ ہو اور تازہ وضو کرنے کی صورت میں نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ ہو، تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے، کیونکہ قضا سے ادا ہر صورت میں بہتر ہے، (۱۱) جب کسی فرض نماز کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور بقیہ وقت میں صرف اتنی گنجائش ہو کہ وقتی فرض پڑھے جا سکتے ہیں تو اس وقت صرف وقتی فرض کے علاوہ دوسری نماز منع ہے، (۱۲) اگر شدید بھوک لگ رہی ہو اور کھانا حاضر ہو، اس وقت کوئی بھی نماز پڑھنا منع ہے، کیونکہ ایسی حالت میں حضوریِ ذہن مشکل ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 554-550)''۔

ان اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت میں نوافل ادا کیے جا سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''تین مکروہ (تحریمی) اوقات ایسے ہیں کہ جن میں نہ فرض نماز پڑھنا جائز ہے، نہ نمازِ جنازہ اور نہ ہی سجدۂ تلاوت جائز ہے، وہ تین اوقات یہ ہیں: (۱) طلوعِ آفتاب کے وقت یہاں

تک کہ سورج بلند ہوجائے (اس کی مقدار سورج طلوع ہونے کے بعد تقریباً بیس منٹ ہے)، (۲) نصف النہار شرعی سے زوال آفتاب تک (اس کی مقدار موسموں کے اعتبار سے کم وبیش ہوتی رہتی ہے)، (۳) غروب آفتاب سے قبل کے بیس منٹ، لیکن اگر اُس دن کی عصر کی نماز نہیں پڑھی، تو اُسے اس مکروہ وقت میں بھی پڑھ لینا چاہیے، ''فتاویٰ قاضی خان'' میں اِسی طرح ہے''۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اور جب نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت مباح (یعنی صحیح) وقت میں واجب ہوں اور اُنہیں (صحیح وقت میں ادا کرنے کے بجائے) مکروہ وقت تک مؤخر کردیا ہو، تو اب اس مکروہ وقت میں اُن کا پڑھنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر جنازہ اُسی مکروہ وقت میں آیا یا آیتِ سجدہ اسی وقت تلاوت کی اور اُنہیں ادا کردیا تو جائز ہے، کیونکہ یہ ناقص وقت میں واجب ہوئے اور اسی ناقص وقت میں ادا کردیے گئے، ''سراج الوہاج''، ''الکافی'' اور ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، البتہ مکروہ وقت میں آنے والی نماز جنازہ کی صحیح وقت تک تاخیر مکروہ ہے اور سجدۂ تلاوت کو مؤخر کرکے صحیح وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ اِن مکروہ تحریمی اوقات میں فوت شدہ فرض اور واجب (جیسے وتر) کی قضاء پڑھنا جائز نہیں ہے، (کیونکہ وہ فرض یا واجب کامل وقت میں عائد ہوئے تھے، تو اب ناقص وقت میں ان کا ادا کرنا درست نہیں ہے، اپنے اصل وقت سے تو ویسے ہی فوت ہوچکے ہیں)، اگر مکروہ اوقات میں نوافل پڑھ لیے تو کراہت کے ساتھ ادا ہوجائیں گے، ''الکافی'' اور ''شرح الطحاوی'' میں اسی طرح ہے''، (عالمگیری، جلد 1، ص:52)''۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

''وَيَنْعَقِدُ النَّفْلُ بِالشُّرُوعِ فِيهِ مَعَ كَرَاهَةِ التَّحْرِيمِ، فَإِنْ طَرَأَ الْوَقْتُ الْمَكْرُوهُ عَلَى صَلَاةٍ شُرِعَ فِيهَا فَتَبْطُلُ إِلَّا صَلَاةَ جَنَازَةٍ حَضَرَتْ فِيهَا، وَسَجْدَةَ تُلِيَتْ آيَتُهَا فِيهَا، وَعَصْرَ يَوْمِهِ، وَالنَّفْلَ وَالنَّذْرَ الْمُقَيَّدَ بِهَا، وَقَضَاءَ مَا شُرِعَ بِهِ فِيهَا ثُمَّ أَفْسَدَهُ، فَتَنْعَقِدُ هٰذِهِ السِّتَّةُ بِلَا كَرَاهَةٍ أَصْلاً، فِي الْأُولَى مِنْهَا، وَمَعَ الْكَرَاهَةِ التَّنْزِيهِيَّةِ فِي

الثَّانِيَةِ، وَالتَّحْرِيْمِيَّةِ فِي الْبَوَاقِيْ''۔

ترجمہ:''اور نفل نماز اگر مکروہِ تحریمی وقت میں شروع کی ہوتو کراہتِ تحریمی کے ساتھ ادا ہو جائے گی، لیکن اگر نماز صحیح وقت میں شروع کی، پھر (دورانِ نماز) وقتِ مکروہ داخل ہوگیا، تو نماز باطل ہوجائے گی، البتہ مکروہِ تحریمی وقت میں سجدۂ تلاوت اور مندرجہ ذیل نمازیں ادا ہوجائیں گی، ان کی تفصیل یہ ہے: (1) جنازہ اگر اسی وقت آیا ہو، (2) سجدۂ تلاوت، اگر آیتِ سجدہ کی تلاوت اسی وقت کی ہو، (3) اس دن کی نمازِ عصر (اگر کسی وجہ سے صحیح وقت میں نہ پڑھی ہو)، (4) نفل نماز (5) اور اگر تعیین کے ساتھ اُس وقت نفل پڑھنے کی نذر مانی ہو (6) اگر نفل نماز مکروہ وقت میں شروع کر کے (کسی وجہ سے) فاسد کردی ہو، اس کی قضا اسی مکروہ وقت میں ادا کرنا، تو یہ چھ نمازیں مکروہِ تحریمی وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے: ان میں سے پہلی صورت بلا کراہت جائز ہے (یعنی جنازے کی نماز اگر جنازہ اسی وقت آیا ہو)، دوسری صورت کراہتِ تنزیہی کے ساتھ جائز ہے (یعنی آیتِ سجدہ اگر اُسی وقت تلاوت کی ہو)، باقی چار نمازیں کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوجائیں گی، (اَلْفِقْهُ الْإِسْلَامِيُّ وَأَدِلَّتُهُ، ج:2،ص:679)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

''وَعِنْدَنَا الْأَفْضَلُ أَنْ يَقْطَعَهَا وَإِنْ أَتَمَّ فَقَدْ أَسَاءَ وَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، لِأَنَّهُ أَدَّاهَا كَمَا وَجَبَتْ، فَإِذَا قَطَعَهَا لَزِمَهُ الْقَضَاءُ، اِنْتَهٰى، وَيَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ الْقَطْعُ وَاجِبًا خُرُوجًا عَلَى الْمَكْرُوْهِ تَحْرِيمًا وَلَيْسَ بِإِبْطَالٍ لِلْعَمَلِ لِأَنَّهُ إِبْطَالٌ لِيُؤَدِّيَهُ عَلٰى وَجْهٍ أَكْمَلَ، فَلَا يُعَدُّ إِبْطَالًا وَلَوْ قَضَاهُ فِي وَقْتٍ مَكْرُوهٍ آخَرَ أَجْزَأَهُ، لِأَنَّهَا وَجَبَتْ نَاقِصَةً وَأَدَّاهَا كَمَا وَجَبَتْ، فَيَجُوزُ كَمَا لَوْ أَتَمَّهَا فِي ذٰلِكَ الْوَقْتِ''۔

ترجمہ:''اور ہمارے نزدیک افضل یہ ہے کہ اگر مکروہ وقت میں نماز شروع کی تو اسے توڑ دے اور اگر پوری کرلی تو گناہ گار ہوگا اور اس پر قضا نہیں ہے، کیونکہ ناقص واجب ہوئی تھی اور ناقص ہی ادا کردی، پس اگر نماز توڑ دی تو اس پر قضا لازم ہے۔ اور مکروہِ تحریمی سے نکلنے

کے لیے نماز توڑنا واجب ہونا چاہیے اور یہ عمل کا باطل کرنا نہیں ہے، کیونکہ عمل کو اس لیے باطل کیا تاکہ بطریقِ کمال ادا کی جائے، پس اس کو باطل کرنا شمار نہیں ہوگا اور اگر کسی دوسرے مکروہ وقت میں اسے قضا کیا تو ادا ہو جائے گی، کیونکہ یہ ناقص واجب ہوئی تھی اور ناقص ہی ادا ہوئی، پس جائز ہوگی، جیسا کہ اگر اسی مکروہ وقت میں اس کو پورا کیا ہوتا (اور توڑی نہ ہوتی)، (البحر الرائق، ج:2، ص:61)''۔

ظہر کے فرض سے پہلے اور بعد کی سنتیں اپنے اپنے مقام پر پڑھی جائیں، تاہم اگر فرض کی جماعت میں شمولیت کے سبب پہلی چار سنتیں رہ جائیں، تو فرض کے بعد بہتر یہ ہے کہ پہلے دو سنتیں پڑھ لیں اور پھر فرض سے پہلے رہ جانے والی چار سنتیں ادا کریں، کیونکہ پہلے کی چار سنتیں اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں، تو بعد کی دو سنتوں کو اپنے مقام پر پڑھا جائے اور اُس کے بعد پہلے والی چار سنتیں پڑھی جائیں، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَاتَتْهُ الْأَرْبَعُ قَبْلَ الظُّهْرِ، صَلَّاهَا بَعْدَ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ظہر کے فرض سے پہلے والی چار سنتیں رہ جاتیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کو فرض کے بعد والی دو سنتوں کے بعد پڑھتے تھے، (سُنن ابن ماجہ:1158)''۔

حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے طلوعِ شمس سے پہلے صبح کی ایک رکعت کو پالیا، اس نے صبح کو پالیا اور جس نے غروبِ شمس سے پہلے عصر کی ایک رکعت کو پالیا، اس نے عصر کو پالیا، (صحیح البخاری:579)''۔

فقہِ حنفی کی رُو سے اگر غروبِ آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی تو نماز کو مکمل کر لے، کیونکہ وہ صحیح وقت کو فوت کر چکا ہے، غروبِ آفتاب سے پہلے کے آخری بیس منٹ وقتِ مکروہ ہے، تو چونکہ اس نے نماز مکروہ یا ناقص وقت میں شروع کی تو اسی میں مکمل کر لے۔ اس کے برعکس طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کا سارا وقت صحیح ہے (یعنی کراہت سے خالی ہے) تو طلوعِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھنے والے نے کامل وقت میں نماز شروع کی، تو اب ناقص وقت میں اُسے مکمل نہ کرے، بلکہ نماز توڑ دے اور طلوعِ آفتاب کے بیس منٹ بعد صحیح وقت میں اس کی قضا کرے، اس کی بابت فقہِ حنفی کے دلائل کو علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ جو حضرات تفصیلی دلائل جاننا چاہتے ہوں، وہ نعمۃ الباری، ج:2، ص: 397-396 کا مطالعہ کریں۔ اس سلسلے میں اصولی ضابطہ یہ ہے کہ جب روایات میں تعارُض ہو تو سب کو جمع کر کے ان میں تطبیق دی جائے، یہ نہیں کہ غور وفکر کے بغیر کسی ایک روایت پر عمل کر کے باقی کو نظر انداز کر دیا جائے، قرآن فہمی کا اصول بھی یہی ہے کہ کسی ایک مسئلے کے بارے میں متعدد آیاتِ مبارکہ کو سامنے رکھ کر تطبیق کی جائے۔

آپ نے دریافت کیا ہے کہ ظہر کی پہلی سنتوں اور ظہر کے فرضوں کے درمیانی وقت میں قضا نماز اور نوافل پڑھنے کا کیا حکم ہے، تو جواباً عرض ہے کہ اس وقت میں نوافل بھی پڑھ سکتے ہیں اور قضا نماز بھی پڑھ سکتے ہیں، اس کی کہیں بھی ممانعت نہیں آئی۔

اشراق اور چاشت کی نماز

سوال:

نماز اشراق، چاشت اور تہجد کی کتنی رکعات پڑھنا سنت ہے، نماز چاشت کا صحیح وقت کیا ہے، نمازِ اشراق کے فوری بعد نمازِ چاشت پڑھ سکتے ہیں، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

نمازِ اشراق دو رکعت، نمازِ چاشت کم از کم دو رکعت اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہیں اور افضل بارہ رکعات ہیں۔ تہجد کم سے کم دو رکعت اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات ہیں۔

حدیث پاک میں ہے:

(۱): ''عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الْغَدَاةَ فِي جَمَاعَةٍ، ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللهَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد وہیں بیٹھ کر اللہ کے ذکر میں مشغول رہے یہاں تک کہ آفتاب بلند ہوجائے، پھر دو رکعت (اشراق کے نوافل) پڑھے، تو اسے ایک حج اور عمرے کا ثواب ملے گا، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا کہ پورے حج و عمرے کا ثواب ملے گا، (سُنن ترمذی:586)''۔

(۲): ''عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الضُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللهُ لَهُ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے چاشت کی نماز بارہ رکعات پڑھیں، (اس کی جزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں سونے کا محل بنائے گا، (سُنن ترمذی:473)''۔

نمازِ اشراق کا اول وقت وہ ہے، جب سورج ایک نیزہ کی مقدار بلند ہوجائے اور طلوعِ آفتاب کے بعد بیس منٹ گزر جائیں اور آخری وقت وہ ہوتا ہے، جب چاشت کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے، اس لیے چاشت کی نماز اس وقت پڑھنی چاہیے، جب سورج خوب گرم اور سفید ہوجاتا ہے۔ چاشت کا وقت نصف النہار شرعی (عرفِ عام میں زوال کا وقت) تک ہے اور بہتر چوتھائی دن کے حصے میں ادا کرنا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"(وَمِنَ الْمَنْدُوبَاتِ صَلَاۃُ الضُّحٰی) وَأَقَلُّهَا رَكْعَتَانِ وَأَكْثَرُهَا اثِنْتَا عَشْرَۃَ رَكْعَۃً وَوَقْتُهَا مِنِ ارْتِفَاعِ الشَّمْسِ إِلٰى زَوَالِهَا"۔

ترجمہ: "نمازِ چاشت کم از کم دو رکعات اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں اور اس کا وقت سورج بلند ہونے سے زوال (یعنی زوال شروع ہونے سے پہلے) تک ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:112)"۔ اندازاً آپ سورج طلوع ہونے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد چاشت کی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

عید سے قبل مطلقاً اور بعد میں عید گاہ میں نوافل کی ممانعت

سوال:

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن اشراق و چاشت پڑھنا کیوں منع ہے؟، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

نمازِ عید سے پہلے گھر پر یا عید گاہ میں دونوں جگہ نفل نماز مطلقاً مکروہ ہے، یہاں تک کہ عورت اگر چاشت کی نماز گھر میں پڑھنا چاہے تو عید کی نماز ہو جانے کے بعد پڑھے اور نماز عید کے بعد عید گاہ میں نفل پڑھنا مکروہ ہے، گھر میں پڑھ سکتا ہے، بلکہ مستحب یہ ہے نمازِ عید کے بعد چار رکعات گھر میں پڑھے۔ نماز عید سے فراغت کے بعد مسجد یا عید گاہ میں نفل پڑھنا منع ہے، البتہ گھر پر پڑھ سکتے ہیں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"لَا يَتَنَفَّلُ (بَعْدَهَا فِي مُصَلَّاهَا) فَإِنَّهُ مَكْرُوهٌ عِنْدَ الْعَامَّةِ (وَإِنْ) تَنَفَّلَ بَعْدَهَا (فِي الْبَيْتِ جَازَ) بَلْ يُنْدَبُ تَنَفُّلٌ بِأَرْبَعٍ وَهٰذَا لِلْخَوَاصِّ أَمَّا الْعَوَامُّ فَلَا يُمْنَعُونَ مِنْ تَكْبِيرٍ وَلَا تَنَفُّلٍ أَصْلًا لِقِلَّةِ رَغْبَتِهِمْ فِي الْخَيْرَاتِ "بَحْرٌ""۔

ترجمہ: "تمام فقہاء کے نزدیک نمازِ عید کے بعد عید گاہ میں نفل پڑھنا مکروہ ہے اور اگر

نمازِ عید کے بعد گھر میں نفل پڑھیں تو جائز ہے بلکہ مستحب یہ ہے کہ نمازِ عید کے بعد چار رکعات نفل پڑھے، یہ حکم خواص کے لیے ہے، رہے عوام تو انہیں نفل یا تکبیرات پڑھنے سے منع نہیں کیا جائے گا کہ اُن کی رغبت خیر کے کاموں کی طرف کم ہوتی ہے''البحرالرائق''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: ''لِأَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ رَأَىٰ رَجُلًا يُصَلِّي بَعْدَ الْعِيدِ، فَقِيلَ: أَمَا تَمْنَعُهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ؟، فَقَالَ أَخَافُ أَنْ أَدْخُلَ تَحْتَ الْوَعِيدِ قَالَ اللهُ تَعَالٰى: ''أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى ۝ عَبْدًا إِذَا صَلّٰى''۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نمازِ عید کے بعد نفل پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ سے کہا گیا: اے امیر المومنین! کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے؟، آپ نے فرمایا: میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی اس وعید میں شمار نہ کیا جاؤں: ''کیا آپ نے اس کو دیکھا جو منع کرتا ہے ہمارے بندے کو جب وہ نماز پڑھے''، العلق:10-9)''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''(قَوْلُه وَكَذَا لَا يَتَنَفَّلُ إلَخْ) لِمَا فِي الْكُتُبِ السِّتَّةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ فَصَلّٰى بِهِمُ الْعِيدَ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا وَهَذَا النَّفْيُ بَعْدَهَا مَحْمُولٌ عَلَيْهِ فِي الْمُصَلّٰى لِمَا رَوَى ابْنُ مَاجَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْه كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي قَبْلَ الْعِيدِ شَيْئًا فَإِذَا رَجَعَ إِلٰى مَنْزِلِهِ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَذَا فِي ''فَتْحِ الْقَدِيرِ''.

ترجمہ: ''(احادیث کی) کتبِ ستہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نمازِ عید کے لیے تشریف لے گئے اور اس سے پہلے یا بعد میں کوئی نماز ادا نہیں فرمائی، یہ نفی عیدگاہ میں نمازِ عید کے بعد نفل پڑھنے پر محمول ہے۔

امام ابن ماجہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نمازِ عید سے قبل کوئی نفل نماز ادا نہیں فرمائی، پس جب گھر لوٹے تو دو رکعات پڑھیں، جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

"قَالَ فِي مِنَحِ الْغَفَّارِ أَقُولُ: وَهٰكَذَا اسْتَدَلَّ بِهِ الشُّرَّاحُ عَلَى الْكَرَاهَةِ وَعِنْدِي فِي كَوْنِهِ مُفِيدًا لِلْمُدَّعِي نَظَرٌ لِأَنَّ غَايَةَ مَا فِيهِ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ حَكَى أَنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ خَرَجَ فَصَلَّى بِهِمُ الْعِيدَ وَلَمْ يُصَلِّ إِلَخْ وَهٰذَا لَا يَقْتَضِي أَنَّ تَرْكَ ذٰلِكَ كَانَ عَادَةً لَهُ وَبِمِثْلِ هٰذَا لَا تَثْبُتُ الْكَرَاهَةُ، إِذْ لَا بُدَّ لَهَا مِنْ دَلِيلٍ خَاصٍّ كَمَا ذَكَرَهُ صَاحِبُ الْبَحْرِ، قُلْتُ: لٰكِنْ ذَكَرَ الْعَلَّامَةُ نُوحٌ أَفَنْدِي أَنَّ وَجْهَ الِاسْتِدْلَالِ مَا ذَكَرُوهُ فِي كَرَاهَةِ التَّنَفُّلِ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ بِأَكْثَرَ مِنْ رَكْعَتَيْهِ مِنْ أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ حَرِيصًا عَلَى الصَّلَاةِ فَعَدَمُ فِعْلِهِ يَدُلُّ عَلَى الْكَرَاهَةِ، إِذْ لَوْلَاهَا لَفَعَلَهُ مَرَّةً بَيَانًا لِلْجَوَازِ، قُلْتُ هٰذَا مُسَلَّمٌ فِيمَا إِذَا تَكَرَّرَ مِنْهُ ذٰلِكَ"۔

ترجمہ: ""منح الغفار" میں ہے: میں کہتا ہوں: اس سے شارحین نے نمازِ عید کے بعد عید گاہ میں نوافل کی کراہت پر استدلال کیا ہے اور میرے نزدیک یہ محلِ نظر ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس کی مندرجہ بالا روایت سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عید گاہ میں نفل نہیں پڑھے، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی اور نہ اس سے کراہت ہی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اُس کے لیے خاص دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ "صاحبِ البحر الرائق" نے ذکر کیا۔ میں کہتا ہوں: لیکن علامہ نوح آفندی نے ذکر کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے لیے شدید خواہش رکھتے تھے، سو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نمازِ عید کے بعد نفل نہ پڑھنا کراہت کی دلیل ہے، ورنہ بیانِ جواز کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک بار تو پڑھا ہوتا۔ میں کہتا ہوں: یہ بات اس صورت میں تسلیم ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عید کے بعد نفل کبھی نہ پڑھے ہوتے، (جلد 5، ص: 116 تا 118)"۔

نمازِ عید سے پہلے یا بعد مطلق نفل کا وقت تو ہے، اس لیے ان نوافل کی ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا گیا ہے، صرف اس لیے کہ رسول اللہ سے یہ ثابت نہیں ہے، لیکن علامہ ابن عابدین کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں ان نوافل کی کراہتِ تنزیہی پر بھی

اطمینان نہیں ہے۔ نمازِ عید سے پہلے گھر پر یا عید گاہ میں نفل پڑھنے کی ممانعت کی حکمت یہ سمجھ آتی ہے کہ عید کے دن نمازِ عید کی اہمیت لوگوں کے ذہن میں رہے، کیونکہ اس میں رمضان المبارک کی عبادات پر تشکر بھی ہے اور مسلمانوں کی جمعیت اور شوکت کا اظہار بھی ہے۔ نماز کے بعد عید گاہ میں نوافل کی ممانعت کی حکمت یہ سمجھ آتی ہے کیونکہ عیدین کا اجتماع معمول سے زائد ہوتا ہے، لوگ بیک وقت منتشر ہوتے ہیں، تو ایسے میں اگر کوئی وہیں پر نفل پڑھنے کھڑا ہو جاتا ہے تو لوگوں کے لیے دشواری ہوگی اور نماز کی حُرمت پامال ہوگی، البتہ اگر کسی نے عید کے دن فجر کی نماز نہیں پڑھی تو وہ نمازِ عید سے پہلے قضا پڑھ سکتا ہے اور اُسے پڑھنی چاہیے، وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

صلوٰۃ الاوّابین

سوال:

نمازِ مغرب کے تین فرض اور دو سنت و دو نفل کی ادائیگی کے بعد مزید دو نفل پڑھنے سے ''اوّابین'' کے نوافل ادا ہو جائیں گے؟۔ (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا''۔

ترجمہ: ''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تمہارا رب اُسے بخوبی جانتا ہے، اگر تم نیک ہو تو بے شک وہ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے، (بنی اسرائیل: 25)''۔

علامہ ابوعبداللہ محمد مالکی قرطبی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''وَعَدَ بِالْغُفْرَانِ مَعَ شَرْطِ الصَّلَاحِ وَالْاَوْبَةِ إِلَى طَاعَةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى، قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: هُوَ الْعَبْدُ يَتُوبُ ثُمَّ يُذْنِبُ ثُمَّ يَتُوبُ ثُمَّ يُذْنِبُ، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ الْأَوَّابُ اَلْحَفِيظُ الَّذِي إِذَا ذَكَرَ خَطَايَاهُ اسْتَغْفَرَ مِنْهَا وَقَالَ عُبَيْدُ بْنُ عُمَيْرٍ هُمُ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ ذُنُوبَهُمْ فِي الْخَلَاءِ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُونَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَهٰذِهِ الْأَقْوَالُ

مُتَقَارِبَةٌ وَقَالَ عَوْنٌ الْعُقَيْلِيُّ: اَلْأَوَّابُونَ هُمُ الَّذِينَ يُصَلُّونَ صَلَاةَ الضُّحَا"۔

ترجمہ: "اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کی شرط کے ساتھ بخشش کا وعدہ فرمایا ہے اور "اَوّاب" مبالغے کا صیغہ ہے، اس کے معنیٰ ہیں: "اللہ کی طرف بار بار رجوع کرنے والا اور بار بار اللہ کی اطاعت کی طرف لوٹنے والا"، سعید بن مُسیّب نے کہا: "وہ بندہ ہے جو بار بار گناہ کرتا ہے اور ہر بار توبہ کرتا ہے"، حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: "اَوّاب وہ شخص ہے جو گناہوں سے اپنی حفاظت کرتا ہے اور جب بھی اسے اپنی خطائیں یاد آئیں، اللہ تعالیٰ سے اُن کی بخشش مانگتا ہے، عبید بن عُمیر نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں، جو خَلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں اور یہ سب اَقوال معنیٰ قریب ہیں اور علامہ عون عُقیلی نے کہا: اَوّابین وہ لوگ ہیں جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں، (الجامع الاحکام القرآن، جلد 13، ص:63)"۔ چنداَحادیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) "عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، وَمُجَاهِدٍ قَالَا: مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثَمَانَ رَكَعَاتٍ كُتِبَ مِنَ الْأَوَّابِينَ"۔

ترجمہ: "حضرت سعید بن جبیر اور مجاہد فرماتے ہیں: جس شخص نے چاشت کی آٹھ رکعات پڑھیں، اُسے "اَوّابین" میں لکھا جائے گا، (مُصنف عبدالرزاق:4878)"۔

(۲) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "رَأَيْتُ حَبِيبِي رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَقَالَ: مَنْ صَلَّى بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكَعَاتٍ غُفِرَتْ لَهُ ذُنُوبُهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ"۔

ترجمہ: "میں نے اپنے حبیب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا کہ آپ مغرب کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے اور فرماتے تھے: جس نے مغرب کے بعد چھ رکعت نوافل پڑھے، اُس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں، (المعجم الاوسط للطبرانی: 7245، مجمع الزوائد:3380)"۔

(۳) "عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أَهْلِ قُبَاءَ

وَھُمْ یُصَلُّوْنَ، فَقَالَ: صَلَاۃُ الْاَوَّابِیْنَ إِذَا رَمِضَتِ الْفِصَالُ''۔

ترجمہ:''حضرت زید بن ارقم بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اہلِ قباء کے پاس گئے، وہ لوگ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اَوّابین کی نماز اُس وقت ہوتی ہے، جب اونٹ کے بچوں کے پیر گرم ہونے لگیں، (صحیح مسلم:748)''۔

(۴)''عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: صَلَاۃُ الْاَوَّابِیْنَ مَا بَیْنَ اَنْ یَّنْکَفِتَ اَھْلُ الْمَغْرِبِ اِلٰی اَنْ یُّثَوَّبَ اِلَی الْعِشَاءِ''۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: صلوٰۃ الاوابین کا وقت نمازِ مغرب سے فراغت کے بعد عشاء تک رہتا ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ:5973)''۔

(۵)''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اِنَّ الْمَلَائِکَۃَ لَتَحُفُّ بِالَّذِیْنَ یُصَلُّوْنَ بَیْنَ الْمَغْرِبِ اِلَی الْعِشَاءِ وَھِیَ صَلَاۃُ الْاَوَّابِیْنَ''۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: بے شک جو لوگ مغرب سے عشاء تک نوافل پڑھتے ہیں، ملائکہ اُن کو گھیر لیتے ہیں اور یہ صلوٰۃ الاوابین ہے، (شرح السنۃ للبغوی، جلد 2، ص:439)''۔

(۶)''عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَلّٰی بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَکَعَاتٍ لَمْ یَتَکَلَّمْ فِیْمَا بَیْنَھُنَّ بِسُوْءٍ عُدِلْنَ لَہٗ بِعِبَادَۃِ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ سَنَۃً وَقَدْ رُوِیَ عَنْ عَائِشَۃَ، عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ صَلّٰی بَعْدَ الْمَغْرِبِ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعات پڑھے اور ان کے درمیان کوئی بری بات نہ کہے تو اُس کی چھ رکعات کا ثواب بارہ برس کی عبادت کے برابر عطا کیا جائے گا''۔ حضرت عائشہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا:''جو مغرب کے بعد بیس رکعات پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مکان بنائے گا، (سُنن ترمذی:435)''۔

اس کی شرح میں شیخ مبارک پوری لکھتے ہیں:

"قَوْلُهٗ:مَنْ صَلّٰی بَعْدَ الْمَغْرِب أَیْ بَعْدَ فَرْضِهٖ سِتَّ رَکَعَاتٍ اَلْمَفْهُوْمُ أَنَّ الرَّکْعَتَیْنِ الرَّاتِبَتَیْنِ دَاخِلَتَانِ فِی السِّتِّ وَکَذَا فِی الْعِشْرِیْنَ الْمَذْکُوْرَةِ فِی الْحَدِیْثِ الْاٰتِیْ قَالَهُ الطِّیْبِیُّ قَالَ الْقَارِیُٔ:فَیُصَلِّی الْمُؤَکَّدَتَیْنِ بِتَسْلِیْمَةٍ وَفِی الْبَاقِیْ بِالْخِیَارِ"۔

ترجمہ:"جس نے مغرب کے فرض کے بعد چھ رکعات پڑھیں، مفہوم یہ ہے کہ چھ رکعات میں دو رکعت سنت مؤکدہ بھی شامل ہیں، اسی طرح حدیث میں بیس رکعات کے بارے میں جو آیا، اُن میں بھی دو رکعت سنّت شامل ہیں، یہ علامہ طیبی کا قول ہے اور علامہ علی قاری نے فرمایا: دو رکعت سنت مؤکدہ ایک سلام کے ساتھ پڑھے، باقی میں اسے اختیار ہے، (تحفۃ الاحوذی شرح سُنن الترمذی:435)"۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا السِّتَّةُ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فَلِمَا رَوٰی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:مَنْ صَلَّی بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَکَعَاتٍ کُتِبَ مِنَ الْأَوَّابِیْنَ وَتَلَا قَوْلَهٗ تَعَالٰی: فَإِنَّهٗ کَانَ لِلْأَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا،(الإسراء:25)وَذَکَرَ فِی "التَّجْنِیْسِ" أَنَّهٗ یُسْتَحَبُّ أَنْ یُصَلِّیَ السِّتَّ بِثَلَاثِ تَسْلِیْمَاتٍ"۔

ترجمہ:"اور رہے مغرب کے بعد والے چھ نوافل، پس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعات پڑھیں، وہ "اوّابین" میں لکھا جائے گا اور یہ آیت تلاوت فرمائی:"بے شک وہ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے،(بنی اسرائیل:25)"، اور"تجنیس" میں ہے: (بعد مغرب) چھ رکعات تین سلاموں کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے،(البحر الرائق، جلد2،ص:89)"۔

اگر کوئی شخص مغرب کے بعد دو یا چار رکعات نفل پڑھنے کے بعد "اوّابین" کے چھ نوافل پڑھتا ہے تو ماشاء اللہ یقیناً وہ زیادہ اجر کا حقدار ہوگا، لیکن جو شخص قلت وقت یا کم ہمتی کی وجہ سے دونوں طرح کے نوافل الگ الگ نہ پڑھ سکے تو وہ تداخل کرلے اور

دونوں کو ملا کر اَوَّابین کی چھ رکعات پوری کر لے اور اللہ تعالیٰ کی عطا سے حسنِ ظن رکھے کہ وہ دونوں کا اجر عطا فرمائے گا اور یہ اس کے کرم سے بعید نہیں ہے۔

نمازِ مغرب کے فرضوں کے بعد والی سنت کے بارے میں حدیث پاک میں ارشاد فرمایا:

(۱)''مَنْ صَلّٰی بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ أَنْ يَتَكَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ وَفِي رِوَايَةٍ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ رُفِعَتْ صَلَاتُهُ فِي عِلِّيِّينَ''۔

ترجمہ:''جو شخص بعد مغرب کلام کرنے سے پہلے دو رکعات پڑھے، اُس کی نماز علّیین میں اٹھالی جاتی ہے''۔ایک روایت میں چار رکعات ہے،(مشکوٰۃ المصابیح:1184)''۔ایک روایت میں حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۲)''عَجِّلُوا الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فَإِنَّهُمَا تُرْفَعَانِ مَعَ الْمَكْتُوبَةِ''۔

ترجمہ:''مغرب کے بعد کی دونوں رکعتیں جلدی پڑھو کہ وہ فرض کے ساتھ پیش ہوتی ہیں، (مشکوٰۃ المصابیح:1185)''۔

ہم نے یہ تمام روایات بیان کر دی ہیں، جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، وہ حُصولِ ثواب کے لیے مغرب کے بعد اور چاشت دونوں اوقات میں یہ نوافل پڑھے اور اَجر کی توقع رکھے اور جو دونوں اوقات میں نہ پڑھ سکے، وہ حسبِ سہولت بعد مغرب یا چاشت کے وقت پڑھ لے۔نوافل کے معاملے میں ایک دوسرے سے اتنا اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عورت پر نمازِ عید واجب نہیں ہے

سوال:

عورت پر عید کی نماز واجب ہے، کیا عورت نئے کپڑے، نئے جوتے اور انتہائی تیز خوشبو لگا کر نماز عید کے لیے مسجد جاسکتی ہے؟،(سعید یاسین)۔

جواب:

نمازِ جمعہ، عیدین اور پنج وقتہ نمازوں کی جماعت عورتوں پر واجب نہیں ہے'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عہدِ مبارک پاکیزہ اور پُرنور تھا، عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دین کے اَحکام سیکھنے کی ضرورت تھی، اس لئے عورتوں کو مساجد میں اِن قیود کے ساتھ حاضری کی اجازت تھی کہ باپردہ جائیں، بن سنور کر نہ جائیں، زیب وزینت نہ کریں، اس کے باوجود عورتوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں۔

عہدِ فاروقی میں خلیفۂ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فسادِ زمانہ کے سبب عورتوں کے مسجد آنے پر پابندی لگادی:

"عَنْ عَمْرَةَ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، قَالَتْ: لَوْ اَدْرَكَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ، لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي اسْرَائِيل، قُلْتُ: لِعَمْرَةَ اَوَمُنِعْنَ؟، قَالَتْ نَعَمْ"۔

ترجمہ: "عَمرہ بیان کرتی ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عورتوں کے اس بناؤ سنگھار کو دیکھ لیتے جو انہوں نے اب ایجاد کیا ہے، تو اُن کو (مسجد میں آنے سے) منع فرمادیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔ راوی بیان کرتے ہیں: میں نے عَمرہ سے پوچھا: کیا اُن کو منع کر دیا گیا تھا؟، انہوں نے فرمایا: ہاں، (صحیح بخاری:869)"۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی 855ھ لکھتے ہیں:

"لَو شَاهَدَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهَا مَا أَحْدَثَ نِسَاءُ هٰذَا الزَّمَان مِن أَنْوَاعِ الْبِدَعِ وَالْمُنْكَرَاتِ لَكَانَتْ أَشَدَّ إِنكَاراً"۔

ترجمہ: "ہمارے زمانے کی عورتوں نے جو طرح طرح کی بدعات ومنکرات ایجاد کرلی ہیں، اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کو دیکھ لیتیں تو اور شدّت سے ان کو منع فرماتیں، (عمدۃ القاری، جلد6، ص:227)"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"لَا تَمْنَعُوا نِسَائَكُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَهُنَّ"۔

ترجمہ: اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو اور ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں، (سُنن ابوداؤد: 563)''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''صَلَاةُ الْمَرْأَةِ فِي بَيْتِهَا أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهَا فِي حُجْرَتِهَا، وَصَلَاتُهَا فِي مُخْدَعِهَا أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهَا فِي بَيْتِهَا''۔

ترجمہ: عورت کا اپنے (مخصوص) کمرے میں نماز پڑھنا، اپنے گھر کی چاردیواری میں (یعنی کھلی جگہ پر) نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور اس کا باپردہ جگہ میں نماز پڑھنا گھر کے کھلے ماحول میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، (سُنن ابوداؤد: 566)''۔

علامہ زین الدین ابنِ نُجَیم حنفی لکھتے ہیں:

''فَلَا تَجِبُ عَلٰی مُسَافِرٍ وَلَا عَلٰی اِمرَأَۃٍ''۔

ترجمہ: ''مسافر اور عورت پر نمازِ جمعہ واجب نہیں ہے، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 264)''۔

جب نمازِ جمعہ جو فرض ہے، عورت پر واجب نہیں ہے، تو نمازِ عید بطریقِ اَولیٰ واجب نہیں ہے۔

شوہر کی دل داری کی خاطر عورت کے لیے زیب وزینت اور آرائش تو شرعاً جائز ہے، لیکن مردوزن کی مخلوط مجلسوں میں یا نماز کے لیے مسجد میں جاتے وقت خوشبو کا استعمال لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہو تو یہ بھی محرکاتِ گناہ میں سے ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ اَبِي مُوسٰى، عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَالَ ''كُلُّ عَينٍ زَانِيَةٌ، وَالْمَرأَةُ اِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَهِيَ كَذَا وَكَذَا، يَعْنِي زَانِيَةً''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (یعنی جو اجنبی کی طرف شہوت بھری نظر سے دیکھے) اور بے شک عورت عطر لگا کر کھلی مجلس میں جائے تو ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے (یعنی اس کے باعث وہ لوگوں کے لیے مرکزِ توجہ بنتی ہے اور یہ اسباب گناہ میں سے ہے)، (سنن ترمذی: 2786)''۔

نمازِ جمعہ سے متعلق چند سوالات

میرے نماز جمعہ کے بارے میں چند سوالات ہیں، ان کا جواب شریعت کی روشنی میں درکار ہے، (سیدہ آمنہ، کراچی)۔

سوال نمبر:1۔

فقہ حنفی کے تحت خواتین کے لیے جمعۃ المبارک کی نماز کا کیا حکم ہے؟، گھر میں موجود خواتین اگر بآسانی خطبۂ جمعہ سن سکتی ہوں، جیسا کہ مسجد قریب ہونے کی صورت میں سہولت ہوتی ہے، تو کیا ان پر جمعہ واجب ہو جاتا ہے؟۔

جواب: نمازِ جمعہ، عیدین اور پنج وقتہ نمازوں کی جماعت عورتوں پر واجب نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

"اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ فِی جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَمْلُوكٌ، أَوِ امْرَأَةٌ، أَوْ صَبِیٌّ، أَوْ مَرِیضٌ"۔

ترجمہ: "نمازِ جمعہ کا وجوب سوائے غلام یا عورت یا بچے یا مریض کے ہر مسلمان پر ثابت ہے، (سُنن ابوداؤد:1067)"۔ البتہ ان طبقات میں سے جو جمعہ پڑھ لے گا، اس کی نماز ادا ہو جائے گی، ورنہ وہ انفرادی طور پر نمازِ ظہر پڑھے گا۔

علامہ زین الدین ابنِ نُجیم حنفی لکھتے ہیں:

"فَلَا تَجِبُ عَلٰی مُسَافِرٍ وَلَا عَلٰی امْرَأَةٍ"۔

ترجمہ: "مسافر اور عورت پر نمازِ جمعہ واجب نہیں ہے، (البحر الرائق، جلد2، ص:264)"۔

اگرچہ گھر میں بیٹھ کر خطبہ سنے، تب بھی عورتوں پر نمازِ جمعہ واجب نہیں ہے، البتہ خطبہ سننے کا ثواب پائیں گی۔

سوال نمبر2

جمعۃ المبارک کی نماز کے لیے خطبہ کی کیا اہمیت ہے اور جو لوگ جمعۃ المبارک کا خطبہ نہیں سنتے، ان کے لیے کیا حکم ہے؟۔

جواب:

نمازِ جمعہ کے لیے چھ شرائط ہیں ،ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوتو جمعہ نہیں ہوگا،ایک شرط خطبہ بھی ہے۔نمازِ جمعہ کا خطبہ سننا واجب ہے۔ہر وہ کام جونماز میں منع ہے، دورانِ خطبہ بھی جائز نہیں،سماعت کے لیے توجہ اور یکسوئی لازم ہے۔حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ فَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ وَمَنْ مَسَّ الْحَصٰى فَقَدْ لَغَا"۔

ترجمہ:"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اچھی طرح وضوکیا، پھر جمعہ پڑھنے آیا اور خاموش رہ کرتوجہ سے خطبہ سنا،گزشتہ جمعہ سے لے کراس جمعے کے درمیان جوگناہ سرزد ہوئے ،اورمزید تین دن کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور فرمایا: جس شخص نے (دورانِ خطبہ) کنکریاں چھوئیں اس نے لغو کام کیا، (صحیح مسلم:857)"۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف النووی لکھتے ہیں:

"قَولُهُ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ(وَمَنْ مَسَّ الْحَصَا فَقَدْ لَغَا):فِيهِ النَّهْيُ عَنْ مَسِّ الْحَصَا وَغَيْرِهِ مِنْ أَنْوَاعِ الْعَبَثِ فِي حَالَةِ الْخُطْبَةِ وَفِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى إِقْبَالِ الْقَلْبِ وَالْجَوَارِحِ عَلَى الْخُطْبَةِ"۔

ترجمہ:"نبی ﷺ کا ارشادِ مبارک :"جس نے کنکریوں کو چھوا، اُس نے لغو کام کیا"، (محض کنکریوں کو چھونے کی ممانعت تک محدود نہیں ہے بلکہ) اس سے ایسی تمام حرکات مراد ہیں جو آدمی کو بغور خطبہ سننے میں مانع ہوں اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ پورے دل ودماغ اور جسم وجاں کے ساتھ مُتوجہ ہوکر خطبہ سنے،(صحیح مسلم بشرح الامام النووی،جلد2، الجزءُ السادس،ص:147-146،مطبوعہ:مکتبۃ الغزالی،دمشق)"۔

سماعِ خطبہ کے متعلق احادیث میں سخت تاکید وارد ہوئی ہے:

"عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ، أَنَّ أَبَاهُرَيْرَةَ، أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: أَنْصِتْ، وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ"۔

ترجمہ: "ابن شہاب بیان کرتے ہیں: سعید بن مُسیَّب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (اے مخاطب!) جب جمعہ کے دن خطبے کے دوران تُو نے اپنے ساتھی سے کہا: چپ ہو جا، تو تُو نے لغو کام کیا، (صحیح بخاری: 934)"۔ یعنی تو نے خطبے کے دوران بول کر وہی غلطی کی جو دوسرا کر رہا ہے۔

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ يَتَكَلَّمُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ أَنْصِتْ لَيْسَ لَهُ جُمُعَةٌ"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص امام کے خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کرتا ہے، تو وہ اس گدھے کی مانند ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں، اور جو اس سے کہے: "چپ ہو جا"، اس کا جمعہ نہیں، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 230، مطبوعہ: دار الفکر، بیروت)"۔

خطبۂ جمعہ کے دوران جو نمازی دنیاوی باتوں میں مشغول رہا، اس کا فرض تو ساقط ہو جائے گا، لیکن جمعہ کی برکات سے محروم رہے گا۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے دورانِ خطبۂ جمعہ بات کرنے یا کوئی عمل کرنے سے متعلق سوال ہوا، تو آپ نے مُتعدد فقہی حوالہ جات کے ساتھ جواب میں لکھا:

"عامۂ کتب مذہب میں صاف تصریح ہے کہ جو فعل نماز میں حرام ہے، خطبہ ہونے کی حالت میں بھی حرام ہے:

"مَایَحْرُمُ فِی الصَّلٰوۃِ یَحْرُمُ فِی الْخُطْبَۃِ کَالْاَکْلِ وَالشُّرْبِ حَالَ الْخُطْبَۃِ"۔

ترجمہ: "جو کچھ نماز میں حرام ہے، خطبہ میں بھی حرام ہے، مثلاً خطبہ کے دوران کھانا اور پینا"۔

شرح منیہ امام محمد ابن امیر الحاج حلبی میں ہے:

’’ کَمَا یُکْرَہُ الْکَلَامُ بِاَنْوَاعِہٖ یُکْرَہُ مَا یَجْرِیْ مَجْرَاہُ مِنْ کِتَابَۃٍ وَنَحْوِھَا مِمَّا یَشْغَلُ مِنْ سَمَاعِھَا حَتّٰی اَنَّ فِی ’’شَرْحِ الزَّاھِدِیِّ‘‘ وَیُکْرَہُ لِمُسْتَمِعِ الْخُطْبَۃِ مَا یُکْرَہُ فِی الصَّلٰوۃِ کَالْاَکْلِ وَالشُّرْبِ وَالْعَبَثِ وَالْاِلْتِفَاتِ‘‘۔

ترجمہ: ’’جیسے (خطبۂ جمعہ کے دوران) ہر طرح کی گفتگو منع ہے، ویسے ہی اس کے قائم مقام اُمور مثلاً کتابت وغیرہ جو خطبہ کے سماع میں خلل ڈالے حتیٰ کہ ’’شرح الزاہدی‘‘ میں ہے: خطبہ کے سامع کے لیے ہر وہ شے مکروہ ہے، جو نماز میں مکروہ ہے، مثلاً: کھانا پینا، عَبث فعل اور کسی خارج امر کی طرف متوجہ ہونا وغیرہ۔ اسی طرح علامہ سید احمد مصری نے حاشیۂ شرح نور الایضاح میں بحوالہ شرح الکنز للعلامۃ عمر بن نُجیم وشرح القدوری لمختار بن محمود سے نقل کیا، شرح نقایہ علامہ محمد قہستانی میں ہے:

’’کَمَا مُنِعَ الْکَلَامُ مُنِعَ الْاَکْلُ وَالشُّرْبُ وَالْعَبَثُ وَالْاِلْتِفَاتُ وَالتَّخَطِّیْ وَغَیْرُھَا مِمَّا مُنِعَ فِی الصَّلٰوۃِ کَمَا فِی جُلَّابِیْ‘‘۔

ترجمہ: ’’جس طرح دورانِ خطبہ کلام منع ہے، اسی طرح کھانا پینا عَبث کام، کسی امر خارج کی طرف متوجہ ہونا اور گردن پھلانگنا الغرض وہ تمام امور جو نماز میں ممنوع ہیں جیسا کہ ’’جُلَّابی‘‘ میں ہے۔ متن وشرح علامہ حسن شرنبلالی میں ہے:

(کُرِہَ لِحَاضِرِ الْخُطْبَۃِ الْاَکْلُ وَالشُّرْبُ) وَقَالَ الْکَمَالُ یَحْرُمُ (وَالْعَبَثُ وَالْاِلْتِفَاتُ) فَیَجْتَنِبُ مَا یَجْتَنِبُہٗ فِی الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ: ’’خطبہ میں حاضر شخص کے لیے کھانا پینا مکروہ ہے، علامہ کمال الدین ابن ہمام نے کہا: حرام ہے، بے فائدہ کام اور کسی امر خارج کی طرف متوجہ ہونا، پس ہر اس شے سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے نماز میں اجتناب کیا جاتا ہے۔ غنیۃ شرح منیہ للعلامہ ابراہیم الحلبی میں ہے:

’’ اَلْاِسْتِمَاعُ وَالْاِنْصَاتُ وَاجِبٌ عِنْدَنَا وَعِنْدَ الْجُمْھُوْرِ حَتّٰی اَنَّہٗ یُکْرَہُ قِرَاءَۃُ الْقُرْآنِ

وَنَحْوُهَا وَرَدُّ السَّلَامِ وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ وَكَذَا الْاَكْلُ وَالشُّرْبُ وَكُلُّ عَمَلٍ"۔

ترجمہ: ''توجہ کے ساتھ خطبہ سننا اور خاموش رہنا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک واجب ہے حتیٰ کہ اس کے دوران قراءتِ قرآن وغیرہ، سلام کا جواب، چھینک کا جواب مکروہ ہے اور اسی طرح کھانا پینا اور ہر عمل کا یہی حکم ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 330,331، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

سوال نمبر: 3۔

خواتین نماز کے لیے مسجد جا سکتی ہیں یا نہیں؟ حرمین شریفین میں مرد و زن سب ہی جاتے ہیں اور ہمارے ملک میں بھی ایسی مساجد موجود ہیں جہاں خواتین کے لیے علیحدہ اہتمام ہے، اس صورت میں کیا حکم ہے؟۔

جواب:

اسلام کے ابتدائی دور میں عورتوں کو مسجد میں آنے اور نمازِ باجماعت ادا کرنے کی اجازت تھی، چنانچہ حدیثِ پاک میں جماعت کے لیے صف بندی کے حوالے سے مردوں اور عورتوں کے صف میں شامل ہونے کی اَفضلیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:

''عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خَيْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا''۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (نمازِ باجماعت میں اجر کے اعتبار سے) مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور کم تر صف آخری صف ہے (یعنی پہلی صف کی بہ نسبت اس کا اجر اور فضیلت کم ہے)۔ عورتوں کی بہترین صف آخری صف ہے اور کم تر صف پہلی صف ہے (یعنی وہ صف جو مردوں کی صف کے متصل ہے، کیونکہ اس میں نفس کے بہکاوے یا توجہ بٹنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے)، (سُنَن ترمذی: 224)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''اَلرِّجَالُ ثُمَّ الصِّبْيَانُ، ثُمَّ الْخَنَاثَى، ثُمَّ النِّسَاءُ''۔

ترجمہ:'' (جماعت میں ترتیب کے اعتبار سے) پہلے مردوں کی صف، پھر بچوں کی پھر خنثیٰ اور پھر عورتوں کی صفیں بنائی جائیں، (جلد2،ص:270، بیروت)''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عہدِ مبارک پاکیزہ اور پُرنور تھا، عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دین کے اَحکام سیکھنے کی ضرورت تھی، اس لئے عورتوں کو مساجد میں اِن قیود کے ساتھ حاضری کی اجازت تھی کہ باپردہ جائیں، بن سنور کر نہ جائیں، زیب وزینت نہ کریں، اس کے باوجود عورتوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں۔ عہدِ فاروقی میں خلیفۂ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فسادِ زمانہ کے سبب عورتوں کے مسجد آنے پر پابندی لگادی:

''عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: لَوْ اَدْرَكَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ، لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي اِسْرَائِيلَ، قُلْتُ لِعَمْرَةَ أَوَمُنِعْنَ؟، قَالَتْ نَعَمْ''۔

ترجمہ:''حضرت عَمرہ بنت عبدالرحمن بیان کرتی ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان حالات کو دیکھ لیتے، جو عورتوں نے بعد میں اختیار کر لیے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کو مساجد میں آنے سے اسی طرح منع فرمادیتے، جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: میں نے عَمرہ سے کہا: کیا بنی اسرائیل کی عورتوں کو (کنیسہ میں آنے سے) منع کر دیا گیا تھا، اُنہوں نے کہا: ہاں، (صحیح بخاری: 869)''۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی 855ھ لکھتے ہیں:

''(قُلْتُ) لَوْ شَاهَدَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا مَا أَحْدَثَ نِسَاءُ هٰذَا الزَّمَانِ مِنْ أَنْوَاعِ الْبِدَعِ وَالْمُنْكَرَاتِ لَكَانَتْ أَشَدَّ إِنْكَارًا''۔

ترجمہ:''میں کہتا ہوں: ہمارے زمانے کی عورتوں نے جو طرح طرح کی بدعات و منکرات

اختیار کرلی ہیں، اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کو دیکھ لیتیں تو اور شدّت سے ان کو منع فرماتیں، (عمدۃ القاری، جلد6،ص:227)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَ کُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ''۔

ترجمہ: اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو اور ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں، (سُنن ابوداؤد:563)''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''صَلَاۃُ الْمَرْأَۃِ فِی بَیْتِھَا أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِی حُجْرَتِھَا، وَصَلَاتُھَا فِی مُخْدَعِھَا أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِی بَیْتِھَا''۔

ترجمہ:''عورت کا اپنے (مخصوص) کمرے میں نماز پڑھنا، اپنے گھر کی چاردیواری میں (یعنی گھر کے اندر کھلی جگہ پر) نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور اس کا باپردہ جگہ میں نماز پڑھنا گھر کے کھلے ماحول میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، (سُنن ابوداؤد:566)''۔

ہمارے فقہائے کرام کا عمومی موقف تو یہی ہے کہ اَخلاقی تنزّل کی وجہ سے عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن اس کا مقصد تو یہ ہے کہ جب ممکنہ اَخلاقی مفاسد سے بچنے کے لیے مسجد میں نماز کے لیے آنے سے اِن خواتین کا روکنا شریعت کا منشا ہے، تو پھر یہ پابندی انہیں زندگی کے عام معمولات میں بھی اختیار کرنی چاہیے۔ لیکن اب دین دار گھریلو خواتین کے علاوہ بہت سی عورتیں تعلیم، روزگار، بازاروں میں خرید وفروخت، سماجی تقریبات اور روزمرہ معاملات میں بلا روک ٹوک شرعی حجاب کے بغیر گھومتی پھرتی ہیں، تو پھر صرف مسجد یا بالخصوص دینی مجالس میں اُنہیں شرکت سے کیوں روکا جائے، جب کہ مسجد میں نماز کے لیے یا عورتوں کے لیے مخصوص تبلیغی اجتماعات میں آنے والی خواتین شرعی حجاب کے ساتھ آتی ہیں اور انہیں دینی مسائل سننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس

کی رخصت دی ہے، لیکن یہ رخصت اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ خواتین کی نماز کی جگہ مکمل باپردہ ہو اور آمدورفت کا راستہ مردوں سے علیحدہ ہو، ان پر یہ پابندی عائد ہو کہ بالکل ایسے چھوٹے بچوں کو لے کر نہ آئیں جنہیں مسجد، نماز اور دینی شعائر کے ادب واحترام کا شعور نہ ہو۔ آج کل مختلف مسالک کے لوگ عورتوں کے لیے خصوصی اجتماعات کا اہتمام کر رہے ہیں، ملک کے اندر اور باہر آن لائن اور مخصوص ریڈیو چینلز دعوت وتبلیغ کے مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، مساجد میں بھی باجماعت نمازوں اور جمعہ اور دُروسِ قرآن وحدیث کے اجتماعات میں اُن کی باپردہ شرکت کا اہتمام ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دینی ذوق رکھنے والی اہلسنت کی خواتین کے لیے جب اپنے مسلک کے مطابق اس طرح کے انتظامات نہیں ہوتے تو وہ اُن مجالس میں جاتی ہیں اور علم کی کمی کی وجہ سے اُن کے عقائد ونظریات تبدیل ہوجاتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور میں مساجد میں نمازِ جمعہ وتراویح اور دُروس کی مجلسوں میں شرعی حدود کی مکمل پاسداری کے ساتھ خواتین کی شرکت کا اہتمام اباحت وجواز کی حدود سے نکل کر ضرورت کے درجے میں داخل ہوگیا ہے۔ اس لئے میں اس کی تائید کرتا ہوں اور علماء، فقہاء اور مفتیانِ عہد کو اس ضرورت کا احساس دلاتا رہتا ہوں، اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَه، اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ۔

لپٹی ہوئی برہنہ تصویر جیب میں ڈال کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:

اگر کوئی شخص کسی برہنہ تصویر کو تین چار تہہ کرکے یا کسی برہنہ کلپ کو مختصر مائیکروفلم کی صورت میں جیب میں رکھ کر مسجد جائے اور نماز پڑھے اور وہ پوری طرح اس بات سے آگاہ ہو تو کیا اس کی نماز ہوجائے گی؟، (محمد اسلم، کراچی)۔

جواب:

اسلام فحاشی اور بے حیائی سے بچنے کا حکم دیتا ہے:

(1) ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ الْبَغْىِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ عدل اور احسان (نیک کام) کرو اور رشتہ داروں کو دو اور بے حیائی اور برائی اور سرکشی سے منع فرماتا ہے،، وہ تم کو نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو، (النحل: 90)''۔

(2) ''وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾''

ترجمہ: ''اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ تمہیں صرف برائی اور بے حیائی (کے کاموں) کا حکم دیتا ہے اور اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے، جس کو تم نہیں جانتے، (البقرۃ: 169-168)''۔

بے حیائی اور گناہوں سے بچنے کو اہلِ ایمان کی صفات بیان فرمایا:

(3) ''وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ''۔

ترجمہ: ''اور جو لوگ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور وہ غضب کے وقت معاف کر دیتے ہیں، (الشوریٰ: 37)''۔

(4) ''اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ''۔

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، (النور: 19)''۔

برہنہ تصویر رکھنے پر حُبِّ فاحشہ اور اشاعتِ فاحشہ کا حکم یقیناً لگے گا، جس پر قرآنِ کریم میں عذابِ آخرت کی شدید وعید آئی ہے۔ مزید یہ کہ برہنہ تصویر وہی رکھتا ہے جو اسے وقتاً فوقتاً دیکھتا ہے اور لذّتِ نظر کا اَخلاقی مریض ہے، حدیث پاک میں اِسے

''آنکھوں کے زنا'' اور ''مُحرّکاتِ زنا'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔حدیث پاک میں ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَزِنَا العَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَا اللِّسَانِ المَنْطِقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَشْتَهِي، وَالفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ كُلَّهُ أَوْ يُكَذِّبُهُ''۔

ترجمہ:''بیشک اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدم پر اُس کے زنا کا حصہ لکھ دیا ہے، جس کو وہ لامحالہ پائے گا، پس آنکھوں کا زنا (اجنبی عورت کو لذّتِ نظر سے) دیکھنا ہے اور زبان کا زنا (فحش کلام کرنا ہے اور نفس اس کی تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے، (صحیح البخاری:6243)''۔

الغرض لپٹی ہوئی برہنہ تصویر یا برہنہ وڈیو کلپ جیب میں ڈال کر نماز پڑھنے سے فقہی اعتبار سے تو نماز ادا ہوجائے گی اور فرض ساقط ہوجائے گا، تاہم ایسا شخص نماز کے روحانی نور وسرور اور اجرِ کامل سے محروم رہے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ''۔

ترجمہ:''بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، (العنکبوت:45)''۔یہ طرزِ عمل اس حدیث کا مصداق ہے:''وَرُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ''۔

ترجمہ:''اور بہت سے (راتوں کو) قیام کرنے والے ایسے ہیں، جنہیں اُن کے قیام سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، (سنن ابن ماجہ:1690)''۔

نوافل کی جماعت

سوال:

سال میں ایک بار 27 رمضان المبارک نمازیوں کی خواہش پر صلوٰۃ التسبیح کی جماعت وقت کے اعلان کے ساتھ پڑھنا جائز ہے؟، (نورانی جامع مسجد، بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

''تداعی'' کے لفظی معنی بلانے کے ہیں اور اصطلاحی معنی کے بارے میں تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَلَا يُصَلِّي الْوِتْرَ وَلَا التَّطَوُّعَ بِجَمَاعَةٍ خَارِجَ رَمَضَانَ أَيْ يُكْرَهُ ذٰلِكَ عَلٰى سَبِيلِ التَّدَاعِي، بِأَنْ يَقْتَدِيَ أَرْبَعَةٌ بِوَاحِدٍ، كَمَا فِي الدُّرَرِ، وَلَا خِلَافَ فِي صِحَّةِ الِاقْتِدَاءِ إِذْ لَا مَانِعَ نَهْرٌ۔ وَفِي الْأَشْبَاهِ عَنِ الْبَزَّازِيَّةِ يُكْرَهُ الِاقْتِدَاءُ فِي صَلَاةِ رَغَائِبَ وَبَرَاءَةٍ وَقَدْرٍ۔

ترجمہ: ''اور رمضان المبارک کے علاوہ وتر اور نفل باجماعت نہ پڑھے اور اگر (نوافل کی جماعت) ''تداعی'' کے طور پر ہو تو مکروہ ہے، (اور) تداعی یہ ہے کہ چار افراد ایک شخص کی اقتدا کریں، جیسا کہ ''الدُّرَر'' میں ہے اور (اگر پڑھ لی تو) صحت اقتدا میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اس کے لیے کوئی مانع نہیں ہے۔ اور ''الاشباہ والنظائر'' میں ''بزازیہ'' کے حوالے سے ہے: صلوٰۃ الرغائب (رجب کے مخصوص نوافل) شبِ براءت اور شبِ قدر کے نوافل باجماعت مکروہ ہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''اَلظَّاهِرُ أَنَّ الْجَمَاعَةَ فِيهِ غَيْرُ مُسْتَحَبَّةٍ، ثُمَّ إِنْ كَانَ ذٰلِكَ أَحْيَانًا كَمَا فَعَلَ عُمَرُ كَانَ مُبَاحًا غَيْرَ مَكْرُوهٍ، وَإِنْ كَانَ عَلٰى سَبِيلِ الْمُوَاظَبَةِ كَانَ بِدْعَةً مَكْرُوهَةً لِأَنَّهُ خِلَافُ الْمُتَوَارَثِ''۔

ترجمہ: ''بظاہر اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ نوافل کی جماعت مستحب نہیں ہے، پھر اگر کبھی کبھار ہو، جیسا کہ حضرت عمر نے (تراویح کی جماعت کے لیے) کیا، تو یہ مباح ہوگا، مکروہ نہیں، البتہ اگر اس پر دوام کیا جائے تو بدعتِ مکروہہ ہے، کیونکہ یہ سنتِ مُتوارثہ کے خلاف ہے۔۔۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وَيُؤَيِّدُهُ أَيْضًا مَا فِي ''الْبَدَائِعِ'' مِنْ قَوْلِهٖ: إِنَّ الْجَمَاعَةَ فِي التَّطَوُّعِ لَيْسَتْ بِسُنَّةٍ إِلَّا فِي قِيَامِ رَمَضَانَ''۔

ترجمہ: '''''بدائع الصنائع'' کا یہ قول بھی اس کا مؤیِّد ہے کہ: رمضان المبارک کے علاوہ نوافل کی جماعت سنت نہیں ہے''۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''قَوْلُهُ أَرْبَعَةٌ بِوَاحِدٍ أَمَّا اقْتِدَاءُ وَاحِدٍ بِوَاحِدٍ أَوْ اثْنَيْنِ بِوَاحِدٍ فَلَا يُكْرَهُ''۔

ترجمہ: ''یہ جو چار افراد کی جماعت کو ''تداعی'' قرار دیا گیا ہے، اس کا مستفاد یہ ہے کہ ایک سے تین افراد تک نوافل میں کسی امام کی اقتدا کریں تو مکروہ نہیں ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص: 376-375، دمشق)''۔

نوافل کی جماعت تداعی کے ساتھ اگر ہمیشہ ہو، تو فقہاء نے اسے مکروہ لکھا ہے اور اگر ہمیشہ یا اکثر نہ ہو بلکہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ہو، تو یہ بہت سے علماء متقدمین سے ثابت ہے، جن میں حضرت لقمان بن عامر، خالد بن معدان اور امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں ہے:

''فَأَنكَرَهُ أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ مِن أَهْلِ الْحِجَازِ مِنهُمْ عَطَاءُ وَابْنُ أَبِي مُلَيكَةَ وَفُقَهَاءُ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَأَصْحَابُ مَالِكٍ وَغَيْرُهُم، وَقَالُوْا ذٰلِكَ كُلُّهُ بِدْعَةٌ وَلَمْ يُنْقَلْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا عَنْ أَصْحَابِهِ إِحْيَاءُ لَيْلَتَيِ الْعِيْدَيْنِ جَمَاعَةً، وَاخْتَلَفَ عُلَمَاءُ الشَّامِ فِي صِفَةِ إِحْيَاءِ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ عَلٰى قَوْلَيْنِ، أَحَدُهُمَا أَنَّهُ أُسْتُحِبَّ إِحْيَاؤُهَا بِجَمَاعَةٍ فِي الْمَسْجِدِ طَائِفَةٌ مِنْ أَعْيَانِ التَّابِعِيْنَ كَخَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ وَلُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ وَوَافَقَهُمْ إِسْحٰقُ بْنُ رَاهَوَيْه، وَالْقَوْلُ الثَّانِي أَنَّهُ يُكْرَهُ الِاجْتِمَاعُ لَهَا فِي الْمَسَاجِدِ لِلصَّلَاةِ وَهٰذَا قَوْلُ الْأَوْزَاعِيِّ إِمَامِ أَهْلِ الشَّامِ وَفَقِيْهِهُمْ وَعَالِمِهُمْ''۔

ترجمہ: ''اہل حجاز میں سے اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے، ان میں امام عطاء، ابن ابی ملیکہ، فقہاءِ مدینہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب وغیرہم فرماتے ہیں: یہ سب بدعت (نیا کام) ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ سے عیدین کی دونوں راتوں میں باجماعت شب بیداری منقول نہیں ہے۔ علماءِ شام سے شعبان المعظم کی پندرہویں شب کے بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے: مسجدوں میں جماعت کے ساتھ بیداری مستحب ہے، یہ قول اکابر تابعین جیسے: خالد بن معدان اور لقمان بن عامر کا ہے، امام مجتہد اسحاق بن راہویہ نے ان کی موافقت فرمائی۔ دوسرا قول: کہ مسجد میں نوافل کے لیے جماعت مکروہ ہے، اہلِ شام کے فقیہ، عالم امام اوزاعی کا ہے، (جلد 1، ص: 547)''۔

امامِ اہلسنّت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرّہ العزیز ''فتاویٰ رضویہ'' میں لکھتے ہیں: ''بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتّداعی ثابت ہے اور عوام فعلِ خیر سے منع نہ کیے جائیں گے، علمائے اُمّت وحکمائے ملت نے ایسی ممانعت سے منع فرمایا ہے۔''

آگے ایک اور مقام پر ''الحدیقۃ الندیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ نَهْيُ النَّاسِ عَنْ صَلٰوةِ الرَّغَائِب بِالْجَمَاعَةِ وَصَلٰوةِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ وَاِنْ صَرَّحَ الْعُلَمَاءُ بِالْكَرَاهَةِ بِالْجَمَاعَةِ فِيْهَا، فَلَا يُفْتٰى بِذٰلِكَ الْعَوَامُّ لِئَلَّا تَقِلَّ رَغْبَتُهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ وَقَدِ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي ذٰلِكَ فَصَنَّفَ فِي جَوَازِهَا جَمَاعَةٌ مِّنَ الْمُتَاَخِّرِيْنَ وَاِبْقَاءُ الْعَوَامِ رَاغِبِيْنَ فِي الصَّلٰوةِ اَوْلٰى مِنْ تَنْفِيْرِهِمْ''۔

ترجمہ: ''اور لوگوں کو ''صلوٰۃ الرّغائب'' (رجب کے نوافل) جماعت کے ساتھ ادا کرنے اور لیلۃ القدر کے نوافل سے روکنا، اسی قبیل سے ہے، (یعنی لوگوں کو منع نہ کیا جائے)، اگرچہ علماء نے ان کی جماعت کے بارے میں کراہت کی تصریح کی ہے، مگر عوام کو فتویٰ نہ دیا جائے تاکہ نیکیوں میں ان کی رغبت کم نہ ہو، علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور متاخرین میں سے بعض نے اس کے جواز پر لکھا بھی ہے، عوام کو نماز کی طرف راغب رکھنا اُنہیں اس سے دور کرنے سے بہتر ہے، (جلد 7،ص:566-465)''۔

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی لکھتے ہیں:

''وَأَمَّا الْعَوَامُّ فَلَا يُمْنَعُوْنَ مِنْ تَكْبِيْرٍ قَبْلَهَا قَالَ أَبُوْ جَعْفَرٍ لَا يَنْبَغِيْ أَنْ يُمْنَعَ الْعَامَّةُ مِنْ ذٰلِكَ لِقِلَّةِ رَغْبَتِهِمْ فِي الْخَيْرَاتِ وَكَذَا فِي التَّنَفُّلِ قَبْلَهَا''۔

ترجمہ: ''اور رہے عوام تو انہیں نماز سے پہلے تکبیرات سے منع نہ کیا جائے، ابوجعفر فرماتے ہیں: عوام کو روکنا مناسب نہیں ہے کہ ان کی خیر کے کاموں کی طرف رغبت کم ہوتی ہے اور اسی طرح (نماز سے پہلے) نفل پڑھنے سے بھی نہیں روکے جائیں گے، (البحر الرائق، جلد 2،ص:280)''۔ ویسے نماز تراویح کی صورت میں نوافل کی جماعت کی ایک اصل موجود ہے، کہ اس پر صحابۂ کرام کا اِجماعِ فعلی ہے۔

حج اور عمرہ کے مسائل

فرض کی ادائیگی مُقدّم ہے

سوال:

میں نے اپنا فرض حج ادا نہیں کیا، لیکن ایک ضعیف، بے بس ومجبور شخص جو حج کی شدید خواہش رکھتا تھا، اُسے حج پر بھیج دیا۔ میرے پاس صرف اتنی ہی رقم تھی، جس سے ایک شخص حج کرسکتا تھا اور اُس شخص کی تڑپ اور چاہ کو دیکھ کر میں نے اسے حج پر بھیج دیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ میرا خود جانا افضل تھا یا یہ عمل افضل ہے؟، (احتشام الدین، ولایت آباد)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ''۔

ترجمہ: ''بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے، جو اس کے راستے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے انکار کیا تو بے شک اللہ سارے جہانوں سے بے پرواہے، (آل عمران: 97)''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۱): ''مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا، أَوْ نَصْرَانِيًّا''۔

ترجمہ: ''جو شخص سفر کے خرچ اور سواری پر قادر ہو، جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو عملاً اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے، (سُنن ترمذی: 812)''۔

(۲): ''مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ حَجَّةَ الْإِسْلَامِ لَمْ يَمْنَعْهُ مَرَضٌ حَابِسٌ، أَوْ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ، أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ، فَلْيَمُتْ عَلَى أَيِّ حَالٍ شَاءَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا''۔

ترجمہ: ''جو فریضۂ حج ادا کیے بغیر فوت ہوگیا جب کہ کوئی رکاوٹ کا سبب بننے والی بیماری یا کوئی ظاہری حاجت یا ظالم حکمران (رکاوٹ نہ بنا ہو اور اس کے باوجود حج نہیں کیا)، تو وہ یہودی ہوکر یا نصرانی ہوکر جس حال میں چاہے مرے، (یعنی اس کا عمل مومنوں والا نہیں ہے)، (مُصنف ابن ابی شیبہ:14450)''۔

جب فرضیتِ حج کی شرائط پوری ہوجائیں تو ائمۂ احناف کا مختار قول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی فوراً بلا تاخیر واجب ہے اور تاخیر مکروہ تحریمی ہے اور کئی سالوں تک مؤخر کرنا فسق ہے، حدیث پاک میں ہے:

''مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ، فَلْيَتَعَجَّلْ، فَإِنَّهُ قَدْ يَمْرَضُ الْمَرِيضُ، وَتَضِلُّ الضَّالَّةُ، وَتَعْرِضُ الْحَاجَةُ''۔

ترجمہ: ''جو حج کا ارادہ رکھتا ہے، وہ (ادائیگی میں) جلدی کرے، کیونکہ کبھی انسان بیمار ہوجاتا ہے، کبھی سواری گم ہوجاتی ہے اور کبھی کوئی کام درپیش ہوجاتا ہے، (سُنن ابن ماجہ: 2883)''۔ یعنی ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں جو حج کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور موت کا عقلی امکان تو ہر وقت رہتا ہے۔ آج کل سواری گم ہونے کی تعبیر اس سے کی جائے گی کہ رقم تلف ہوجائے یا خرچ ہوجائے اور مصارف سفر نہ رہیں۔

لہٰذا آپ پر خود حج کرنا لازم تھا، کسی کو حج کرانا یقیناً باعثِ اجر ہے، لیکن اس کے سبب انسان اپنے فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی کے ذمے مثلاً ایک لاکھ روپے قرض ہے، وہ اپنے قرض خواہ کو تو قرض ادا نہیں کرتا، مگر ایک لاکھ روپے غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس نفلی خیرات کا تو اسے ثواب ملے گا، لیکن قرض بہرحال اس کے ذمے واجب الادا رہے گا اور اسے ادا کیے بغیر وہ بری الذمہ نہیں ہوگا، اِلَّا یہ کہ قرض خواہ اپنا قرض لِوَجہ اللہ معاف کردے۔ پس آپ پر حج فرض ہوچکا تھا، آپ نے ادا نہیں کیا اور اب آپ کے پاس مصارفِ حج کے لیے رقم نہیں ہے، تو آپ پر لازم ہے کہ قرض لے کر حج ادا کریں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''لَولَم يَحُجَّ حتّٰى أتلَفَ مَالُهُ وَسِعَهُ أَن يَستَقرِضَ وَيَحُجَّ وَلَو غَيرَ قَادِرٍ عَلٰى وَفَائِهٖ، وَيُرجٰى أَنْ لَايُؤاخِذَهُ اللهُ بِذٰلِكَ، أَيْ نَاوِياً وَفَاءَهُ إِذَا قَدَرَ''۔

ترجمہ: ''اگر (مال موجود ہونے کے باوجود) حج نہ کیا، پھر وہ مال تلف ہوگیا تو اس کے لیے گنجائش ہے کہ قرض لے کر حج ادا کرے، اگرچہ (بظاہر) ادا کرنے کی قدرت نہ ہو، مگر یہ نیت رکھے کہ اللہ تعالیٰ قدرت دے گا تو ادا کردوں گا (پھر اگر عدمِ استطاعت کی بنا پر ادا نہ کرسکا) تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا، (جلد6،ص:461، دمشق)''۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَأَمَّاطَرِيقُ عَامَّةِ الْمَشَائِخِ فَإِنَّ لِلْحَجِّ وَقْتًا مُعَيَّنًا مِنَ السَّنَةِ يَفُوتُ عَن تِلْكَ السَّنَةِ بِفَوَاتِ ذٰلِكَ الْوَقتِ، فَلَوْ أَخَّرَهُ عَنِ السَّنَةِ الأُوْلٰى تَفوِيتاً لَهٗ لِلْحَالِ، لِأَنَّهٗ لَايُمْكِنُهُ الأَدَاءُ لِلْحَالِ إِلٰى أَنْ يَّجِيئَ وَقتُ الْحَجِّ مِنَ السَّنَةِ الثَّانِيَةِ، وَفِي إِدْرَاكِهِ السَّنَةِ الثَّانِيَةِ شَكٌّ فَلَا يَرْتَفِعُ الْفَوَاتُ الثَّابِتُ لِلْحَالِ بِالشَّكِّ وَالتَّفْوِيْتُ حَرَامٌ''۔

ترجمہ: ''ہمارے مشائخ کا شِعار یہ ہے کہ حج کے لیے وقت اسی سال (یعنی جب وہ صاحبِ استطاعت ہوا) مُقرّر رہے، سواسی سال مقررہ وقت پر اگر حج ادا نہ کیا تو حج فوت ہوگیا، پس اگر اس سال سے مؤخر کیا تو فی الحال تو فوت ہوگیا، کیونکہ آئندہ سال ایامِ حج آنے سے پہلے اس کے لیے اُس کی ادائی ممکن نہیں ہے اور اس کا آئندہ سال کو پانا مشکوک ہے (کیونکہ قضائے الٰہی سے موت واقع ہوسکتی ہے)، سواس شک کی بنا پر فی الحال تو حج کا فوت ہونا ثابت ہے اور فرض کا فوت کرنا حرام ہے، (بدائع الصنائع، جلد2،ص:181)''۔

پس آپ کا یہ سوال کرنا غلط ہے کہ آپ کو اپنا فریضۂ حج ادا کرنا افضل تھا یا کسی دوسرے خواہش مند کو نفلی حج کرانا؟، آپ پر اپنا فریضہ ادا کرنا ہر صورت میں لازم تھا۔

فرضِ حج کی ادائیگی کی ایک صورت

سوال:

میرے والد بہت ضعیف ہیں، اُن کی تیمار داری میں ہی کرتا ہوں۔ گزشتہ دنوں گورنمنٹ حج اسکیم میں میرا نام آگیا ہے، میں اور میری بیوی حج پر جارہے ہیں، والد صاحب کی تیمارداری کے لیے بہن کو بلالیا ہے، علاوہ ازیں ایک تایا زاد بھائی اور اُس کی بیوی بھی موجود ہیں۔ 40 روز کے اخراجات، دوائیں وغیرہ مہیا کرنے کا انتظام بھی کرلیا ہے، کیا میں حج کے لیے جاسکتا ہوں؟، (فرحت اللہ، کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رُو سے آپ حج کے لیے کسی تردُّد کے بغیر جاسکتے ہیں، کیونکہ والد کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لیے آپ کی بہن اور تایا زاد بھائی موجود ہیں اور آپ نے ضروری اخراجات اور دواؤں کا بھی انتظام کردیا ہے، محض والد کی بیماری حج کے لیے جانے میں شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَتَفْسِيْرُ مِلْكِ الزَّادِ وَالرَّاحِلَةِ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ مَالٌ فَاضِلٌ عَنْ حَاجَتِهٖ وَهُوَ مَاسِوٰى مَسْكَنِهٖ وَلُبْسِهٖ وَخَدَمِهٖ وَأَثَاثِ بَيْتِهٖ قَدْرَ مَا يُبَلِّغُهٗ إِلٰى مَكَّةَ ذَاهِبًا وَجَائِيًا رَاكِبًا أَوْ مَاشِيًا وَسِوٰى مَايَقْضِيْ بِهٖ دُيُوْنَهٗ وَيُمْسِكُ لِنَفَقَةِ عِيَالِهٖ وَمَرَمَّةِ مَسْكَنِهٖ وَنَحْوِهٖ إِلٰى وَقْتِ إِنْصِرَافِهٖ كَذَا فِي "مُحِيْطِ السَّرَخْسِيْ"۔ وَالْعِيَالُ مَنْ تَلْزَمُهٗ نَفَقَتُهٗ كَذَا فِي "اَلْبَحْرِ الرَّائِقِ"۔

ترجمہ: "سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے معنیٰ ہیں: اس کے پاس موجود مال اس کے مکان، لباس، خادم، گھریلو سامان، قرض کی ادائی، اہل وعیال کے نفقہ اور مکہ مکرمہ تک آمد ورفت کے خرچ کے لیے کافی ہو، "محیط سرخسی" میں اسی طرح ہے۔۔۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کا نفقہ اُس پر واجب ہے، "البحر الرائق" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ

عالمگیری، جلد 1، ص: 217)''۔

قرض لے کر والد کو عمرہ کرانا

سوال:

میں مقروض ہوں، لیکن اپنے والد کو عمرہ کرانا چاہتا ہوں، اس میں میرے لیے کوئی گناہ تو نہیں ہے، (نوید، لاہور)۔

جواب:

عمرہ نفلی عبادت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنّت ہے، واجب نہیں۔ لیکن اگر آپ مقروض ہیں تو قرض کی ادائیگی کو ترجیح دینا چاہیے، کیونکہ قرض کی باز پرس آخرت میں بھی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ اور زجر کے طور پر مقروض کا جنازہ خود پڑھانے سے گریز فرمایا تھا، پھر جب ایک صحابی نے اس کے قرض کی ادائیگی اپنے ذمے لے لی تو آپ ﷺ نے خود اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی، حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ جَابِرٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي عَلٰى رَجُلٍ عَلَيْهِ دَيْنٌ، فَأُتِيَ بِمَيِّتٍ، فَسَأَلَ: أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟، قَالُوا: نَعَمْ، عَلَيْهِ دِينَارَانِ، قَالَ: صَلُّوا عَلٰى صَاحِبِكُمْ، قَالَ أَبُو قَتَادَةَ: هُمَا عَلَيَّ يَا رَسُولَ اللهِ! فَصَلّٰى عَلَيْهِ، فَلَمَّا فَتَحَ اللهُ عَلٰى رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: أَنَا أَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ، مَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ، وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ (خود) اس شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے، جس پر قرض ہو، سو ایک میّت لائی گئی تو آپ ﷺ نے پوچھا: کیا اس پر قرض ہے؟، صحابہ نے کہا: جی ہاں، اس پر دو دینار قرض ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھو، حضرت ابوقتادہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ دو دینار میرے ذمے ہیں، تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر کشادگی فرمائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں ہر مومن کی جان سے بھی

زیادہ اس کے قریب ہوں، جس نے (مرتے وقت) قرض چھوڑا، تو وہ میرے ذمے ہے اور جس نے (اپنے پیچھے) مال چھوڑا، تو وہ اس کے وارثوں کا ہے، (سنن نسائی:1962)"۔

شاید رسول اللہ ﷺ نے خود نمازِ جنازہ پڑھانے سے گریز اس لیے فرمایا ہو کہ میت کے قرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی سبیل نکل آئے اور ایسا ہی ہوا، نبی ﷺ کا نمازِ جنازہ پڑھانے سے گریز میت کے قرض کی ادائیگی کا سبب بن گیا۔

حدیث پاک میں ہے: "اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ"۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل (یعنی شہادت) سے بندے کے تمام گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، لیکن قرض کی مسئولیت باقی رہتی ہے (کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہے)، (صحیح مسلم:4880)"۔ تاہم اگر آپ قرض لے کر اپنے والد کو عمرہ کرانا چاہتے ہیں، تو اس پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں ہے، اُن کا عمرہ ادا ہوجائے گا، والد کے عمرے کے لیے لیے گئے قرض سمیت سابق اور موجودہ پورے قرض کی ادائیگی آپ پر لازم ہوگی۔ ترجیحات طے کرنا آپ کی اپنی صوابدید ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے شہادت پر حقوق اللہ کی معافی کی نوید تو سنائی ہے، لیکن حقوق العباد سے براءت کی بشارت نہیں سنائی۔

مسجد اور وقف کے مسائل

مسجد میں تعلیم وتعلّم کے لیے پروجیکٹر کا استعمال

سوال:

ہماری مسجد میں خطیب صاحب ہمیں پروجیکٹر پر دینی مسائل سکھاتے ہیں، کیا مسجد میں پروجیکٹر کے ذریعے دینی تعلیم دینا جبکہ بعض اوقات وہ بدمذہبوں کا وڈیو کلپ چلاکر اس کا رَد کرتے ہیں، کیا مسجد میں جمعہ کے دن ایسا عمل درست ہے؟، (مبارک اظہر ضیاء، فیصل آباد)۔

جواب:

مسجد کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور دین کی تفہیم کے لیے وعظ ودرس کی مجالس کا انعقاد مسجد کے مقاصد سے مطابقت رکھتا ہے، اس لیے یہ شِعار الحمدللہ ہر جگہ رائج ہے۔ پروجیکٹر پر دینی مسائل کی تفہیم جدید دور کی ایک سہولت ہے، اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ لوگوں کی عبادت میں خلل واقع نہ ہو، ہرکوئی اپنے اپنے انداز سے نماز، تلاوت، اذکار وتسبیحات اور درود شریف پڑھ سکے۔ اگر تعلیم وتعلم کے لیے مسجد کے مین ہال سے ہٹ کر الگ کوئی جگہ مخصوص ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ دلائل کے ساتھ کسی باطل عقائد کے رَد کے لیے وڈیو کلپ چلانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کی تحریر یا اقوال کا سند کے ساتھ حوالہ دینا کافی ہے، کیونکہ کسی کی طرف غیر مُصدَّقہ یا غیر ثابت شدہ بات منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔

مساجد کے احترام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ وَشِرَاءَکُمْ وَبَیْعَکُمْ وَخُصُوْمَاتِکُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِکُمْ وَاِقَامَةَ حُدُوْدِکُمْ وَسَلَّ سُیُوْفِکُمْ"۔

ترجمہ: "اپنی مساجد کو بچوں، پاگلوں، خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، اپنی آوازیں بلند کرنے اور (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 750)"۔

مسجد کی انتظامیہ کا رکن بننے کی اہلیت

سوال:

میں نیشنل بینک کی چالیس سالہ ملازمت کے بعد 2013ء میں ریٹائر ہوا ہوں۔ محلے کی ایک مسجد کی انتظامی کمیٹی میں نائب صدر ہوں، کمیٹی 18 ارکان پر مشتمل ہے۔ انہی ارکان میں سے ایک تعمیراتی کمیٹی بنائی گئی ہے، جس کا میں صدر منتخب کیا گیا ہوں۔ مسجد کمیٹی کے صدر اس پر ناراض ہوئے کہ مجھے تعمیراتی کمیٹی کا صدر ہونا چاہیے، دوبارہ تعمیراتی کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اور 16 ممبران کی رائے سے میں دوبارہ منتخب ہوگیا، اب صدر صاحب کا اعتراض ہے کہ بینک کا ملازم مسجد کمیٹی کا صدر نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟، (راجہ اصغر علی، اسلام آباد)۔

جواب:

مسجد کی انتظامی کمیٹی کے تمام اراکین کا دین دار اور دیانت دار ہونا شرط ہے اور اکثریتی رائے سے جسے منتخب کیا گیا ہو، اگر وہ اہل اور دیانتدار بھی ہو تو اس خدمت کا وہی مستحق ہے۔ جو کسی منصب وعہدے کا طالب ہو، اُسے ہرگز وہ منصب نہ دیا جائے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

''قَالُوْا: مَنْ طَلَبَ التَّوْلِيَةَ عَلَى الْوَقْفِ لَا يُعْطٰى لَهٗ''۔

ترجمہ: ''فقہاء نے فرمایا: جو شخص وقف مال کا مُتولی ہونے کا خواہشمند ہو یا اس کا مطالبہ کرے، اس کو مُتولی نہ بنایا جائے، (جلد 13، ص: 501، دمشق)''۔

مزید لکھتے ہیں:

''ثُمَّ ذَكَرَ عَنِ التَّتَارْخَانِيَةِ: مَا حَاصِلُهٗ أَنَّ أَهْلَ الْمَسْجِدِ لَوِ اتَّفَقُوْا عَلٰى نَصْبِ رَجُلٍ مُتَوَلِّيًا لِمَصَالِحِ الْمَسْجِدِ فَعِنْدَ الْمُتَقَدِّمِيْنَ يَصِحُّ''۔

ترجمہ: ''پھر تتارخانیہ سے نقل کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر لوگ کسی شخص کو مسجد کی دیکھ بھال کے لیے مُتفقہ طور پر مقرر کردیں، مُتقدّمین فقہاء کے نزدیک یہی صحیح ہے، (ج:

13،ص:615،دمشق)‘‘۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آپ کے حریف کا یہ موقف اصولی یا شرعی نہیں ہے کہ اب کوئی دوسرا اعتراض نہ کیا جاسکتا ہو تو بینک کی ملازمت کو مسئلہ بنا کر آپ کو نا اہل ثابت کیا جائے۔ آپ کا انتخاب کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہے، اگر آپ اہل اور دیانتدار ہیں تو مذکورہ خدمت انجام دیتے رہیں۔ البتہ آپ نے ایک سودی ادارے میں ملازمت کا طویل عرصہ گزارا ہے، اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمیشہ توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ مسجد کی خدمت یقیناً باعثِ اجر ہے، لیکن اس سے کسی دوسرے گناہ کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

فنائے مسجد میں طالبات کا مدرسہ قائم کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

جامع مسجد گلزارِ مدینہ بفرزون میں شمالی اور جنوبی اطراف میں وضوخانہ بنا ہوا ہے، جنوبی وضوخانہ کی چھت پر امام صاحب، مؤذن اور خادم کی رہائش گاہیں ہیں، جبکہ شمالی وضوخانے کی چھت پر انتظامیہ بچیوں کا مدرسہ قائم کرنا چاہتی ہے، اس کا داخلی اور خارجی راستہ مسجد کے باہر سے ہوگا۔ کچھ لوگ اس کی مخالفت کررہے ہیں، آپ سے شرعی رہنمائی کی درخواست ہے، (محمد فرید اختر، بفرزون کراچی)۔

جواب:

فی نفسہٖ مسجد میں بھی قرآن کریم اور دینی علوم کی تعلیم وتعلّم جائز ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

’’یَجُوْزُ الدَّرْسُ فِی الْمَسْجِدِ وَاِنْ کَانَ فِیہِ اِسْتِعمَالُ اللُّبُوْدِ وَالْبَوَارِی الْمُسْبَلَۃِ لِاَجْلِ الْمَسْجِدِ کَذَا فِی ’’الْقُنْیَۃ‘‘۔

ترجمہ: ’’مسجد میں درس وتدریس جائز ہے اگرچہ اس میں مسجد کی دریاں، نمدے جو مسجد کے لیے وقف ہیں، استعمال ہوں، ’’قنیہ‘‘ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5ص:320 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)‘‘۔

بعض فقہی عبارات سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے کہ مسجد میں تعلیم وتعلّم کی ممانعت ہے، ذیل میں ہم وہ عبارات اور اس پر اپنا تبصرہ درج کر رہے ہیں:

علامہ زین الدین ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمُعَلِّمُ الصِّبْيَانِ الْقُرْآنَ كَالْكَاتِبِ إِنْ كَانَ لِأَجْرٍ لَا وَحِسْبَةٍ لَا بَأْسَ بِهِ''۔

ترجمہ: ''اور معلّم کا بچوں کو قرآن کی تعلیم دینا اگر تنخواہ کے عوض ہے، تو اسے کاتب پر قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ یہ جائز نہیں ہے اور اگر خالصاً لوجہِ اللہ بلا مشاہرہ پڑھا رہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، (البحر الرائق، ج:2،ص:38)''۔ مسجد میں تنخواہ کے بغیر بچوں کو پڑھانے کی اجازت دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ فی نفسہٖ تعلیمِ قرآن مسجد کے مقاصد اور آداب کے منافی نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَأَمَّا الْمُعَلِّمُ الَّذِیْ يُعَلِّمُ الصِّبْيَانَ بِأَجْرٍ إِذَا جَلَسَ فِی الْمَسْجِدِ يُعَلِّمُ الصِّبْيَانَ لِضَرُوْرَةِ الْحَرِّ أَوْ غَيْرِهٖ لَا يُكْرَهُ وَفِیْ نُسْخَةِ الْقَاضِي الْإِمَام، وَفِي إِقْرَارِ الْعُيُوْنِ: جَعَلَ مَسْئَلَةَ الْمُعَلِّمِ كَمَسْئَلَةِ الْكَاتِبِ وَالْخَيَّاطِ، كَذَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ: ''لیکن وہ معلّم جو بچوں کو مشاہرے پر تعلیم دیتا ہے، جب وہ مسجد میں گرمی سے بچنے کے لیے یا کسی اور سبب سے (پڑھانے کے لیے) بیٹھے، تو مکروہ نہیں ہے اور اقرار العیون میں معلّم کے مسئلے کو کاتب اور درزی کے مسئلے پر قیاس کیا ہے (یعنی عدمِ جواز کا قول کیا ہے)، خلاصہ میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص:110)''۔

چونکہ تعلیم وتعلّم مسجد اور مقاصدِ مسجد سے تعلق رکھتے ہیں اور مسجد کے بامشاہرہ امام وخطیب بھی اپنے دروس وخطبات میں لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں، لہٰذا دینی ضرورت کے پیشِ نظر اسے کاتب اور درزی کے مسئلے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، کیونکہ درزی کے پیشے کی مسجد سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

البتہ مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کا شور نمازیوں کی نماز میں

خلل انداز نہ ہو، لہٰذا نماز کے اوقات میں درس وتدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَاءَ كُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُومَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُودِكُمْ وَسَلَّ سُيُوفِكُمْ"۔

ترجمہ: "اپنی مسجدوں کو بچوں، پاگلوں، خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، شور وشغب، (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور (ایک دوسرے پر) تلواریں سونتنے (یعنی آپس کے لڑائی جھگڑوں) سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 750)"۔ دار الفکر کے مطبوعہ نسخے میں "شراء" کی بجائے "شرار" (شریر کی جمع) کا لفظ ہے، ممکن ہے یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو۔

اگر وضوخانہ مسجد سے ہٹ کر ہے یا فنائے مسجد میں ہے اور آپ کے بیان کے مطابق اس کا داخلی وخارجی راستہ بھی مسجد سے باہر ہے، تو اُس کی چھت پر طالبات کے لیے مدرسہ بنانا جائز ہے۔ کسی شرعی دلیل کے بغیر لوگوں کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"مسجد کے اندر علمِ دین کی تعلیم جائز اور اس کے جواز پر قرآن وحدیث شاہد، قَالَ اللهُ تَعَالٰی: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا،

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو مساجد میں ذکرِ الٰہی کو روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے، (البقرۃ: 114)"۔

حدیث میں ہے:

"خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ فِي الصُّفَّةِ، فَقَالَ: أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَغْدُوَ كُلَّ يَوْمٍ إِلٰى بُطْحَانَ أَوْ إِلَى الْعَقِيْقِ فَيَأْتِيَ مِنْهُ بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ فِيْ غَيْرِ إِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحِمٍ، فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! كُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِكَ، قَالَ: أَفَلَا يَغْدُوْ أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيُعَلِّمُ أَوْ يَقْرَأُ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللهِ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ نَاقَتَيْنِ وَثَلٰثٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلٰثٍ وَأَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ

اَرْبَعٍ وَمِنْ اَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْاِبِلِ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ"۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرۂ اقدس سے) نکلے اور ہم (اس وقت) صفہ میں تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ ہر روز صبح بطحان یا عقیق کی طرف نکلے اور کسی گناہ یا قطعِ رحمی (یعنی کسی کا حق مارنے) کے بغیر دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لائے، تو ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! (بلاشبہ) ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرے گا، (تو رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: تو تم میں سے ہر شخص (ہر روز) صبح کے وقت مسجد کی طرف کیوں نہیں نکل جاتا تاکہ وہ قرآنِ کریم کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے، یہ (عمل) اس کے لیے دو بلند کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتوں کا پڑھنا یا پڑھانا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا یا پڑھانا چار اونٹنیوں سے بہتر ہے اور اِسی طرح پڑھنے پڑھانے میں آیاتِ قرآنی (کی تعداد میں اضافہ کرنا) اتنی ہی تعداد میں اونٹنیوں سے بہتر ہے، (صحیح مسلم: 1842، اس حدیث کو امام مسلم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے)''۔ فی نفسہٖ تعلیم سے مسجد کی کوئی بے حرمتی نہیں ہے، البتہ اگر پڑھنے یا پڑھانے والے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوں تو ان کو اس سے منع کیا جائے اور روکا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 256 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)''۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''مسجد میں دینی علوم کی تعلیم جائز ہے، رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں مسجد نبوی میں دین کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک حرمین طیّبین میں دین کی تعلیم بلانکیر جاری ہے، حدیثوں سے اس کا جواز ثابت ہے، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 269 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)''۔ بلانکیر کے معنی یہ ہیں کہ سَلف سے لے کر خَلف تک اہلِ علم میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا، البتہ جہاں گنجائش ہو، وہاں الگ تدریسی بلاک بنانا بہتر ہے۔

فنائے مسجد کے بارے میں امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''اقول: وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق، اِعْلَمْ وَفَّقَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَ اِیَّاکَ اَنَّ لِلْمَسْجِدِ اِطْلَاقَیْنِ اَحَدُھُمَا مَوْضِعُ الصَّلٰوۃِ مِنَ الْاَرْضِ الْمَوْقُوفَۃِ لَھَا وَھُوَالْاَصْلُ وَبِھٰذَا الْمَعْنٰی لَایَدْخُلُ فِیْہِ الْبِنَاءُ فَاِنَّ الْبِنَاءَ مِنَ الْاَوْصَافِ کَالْاَطْرَافِ فَالْبَابُ وَالْجِدَارُ خَارِجٌ عَنِ الْمَسْجِدِ، وَکَذَا الدَّکَۃُ وَالْمَنَارُ وَالْحِیَاضُ وَالْاٰبَارُ وَاِنْ کَانَتْ فِی حُدُودِہٖ بَلْ فِی جَوْفِہٖ اِذَا بُنِیَتْ قَبْلَ تَمَامِ الْمَسْجِدِیَّۃِ، اَمَّا بَعْدَہٗ فَلَا یَجُوْزُ تَغْیِیْرُ شَیْءٍ مِّنَ الْاَوْقَافِ عَنْ ھَیْئَتِہٖ اِلَّا بِشَرْطِ الْوَاقِفِ لِحَاجَۃِ الْوَقْفِ وَمَصْلِحَتِہٖ'' ــــــ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''فِی وَقْفِ الدُّرِّ مِنْ ''اَحْکَامِ الْمَسْجِدِ'' لَوْبَنٰی فَوْقَہٗ بَیْتًا لِلْاِمَامِ لَایَضُرُّ، لِاَنَّہٗ مِنَ الْمَصَالِحِ اَمَّا لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ، ثُمَّ اَرَادَ الْبِنَاءَ، مُنِعَ، وَلَوْقَالَ عَنَیْتُ ذٰلِکَ لَمْ یُصَدَّقْ ''تاتارخانیۃ'': فَاِذَا کَانَ ھٰذَا فِی الْوَاقِفِ، فَکَیْفَ بِغَیْرِہٖ فَیَجِبُ ھَدْمُہٗ وَلَوعَلٰی جِدَارِ الْمَسْجِدِ''۔

ترجمہ: ''میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کہتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے: مسجد کی دو اطلاقات ہیں (ا) زمین کا وہ حصہ جو نماز کے لیے وقف کیا گیا ہے، وہی اصلِ مسجد ہے، اِس اطلاق میں مسجد کی بنیادیں مسجد میں داخل نہیں کہ بنیادیں اوصاف کے حکم میں ہیں جیسے کہ اطراف (وحدود)، پس مسجد کا دروازہ اور دیواریں مسجد سے خارج ہیں، اسی طرح اذان کے چبوترے، میناریں، حوض اور کنویں (وغیرہ)، خواہ وہ حدودِ مسجد یا مسجد کے وسط ہی میں ہوں، بشرطیکہ مسجد کے مکمل ہونے سے پہلے بنائے گئے (تو مسجد سے خارج ہیں)۔ البتہ مسجد مکمل ہو جانے کے بعد اگر ان چیزوں کو مسجد میں بنایا تو یہ جائز نہیں کیونکہ یہ وقف کو بدلنا ہوگا۔ ہاں! اگر واقف نے وقف کی ضرورت اور اس کے فائدے کے لیے شروع میں اس کی اجازت دے رکھی ہو، تو جائز ہے''۔ ــ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''درمختار کے کتاب الوقف کے تحت ''باب احکام المسجد'' میں ہے: اگر مسجد کے اوپر امام مسجد کے لیے کمرہ بنایا تو حرج نہیں کہ یہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن اگر مسجد مکمل ہو

گئی ہے تو مسجد کی چھت پر مکان بنانے کو منع کیا جائیگا، اگر وہ یہ کہے کہ میری نیت پہلے ہی کمرہ بنانے کی تھی، تو اس قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، بحوالہ: ''تاتارخانیہ''، تو جب واقف کے لیے تکمیلِ مسجد کے بعد وقف کی ہیئت میں تبدیلی جائز نہیں ہے، تو غیرِ واقف کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے، پس تکمیلِ مسجد کے بعد کسی بھی تبدیلی کو ڈھانا ضروری ہے، خواہ وہ مسجد کی دیوار پر ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 28، ص:136)''۔

مسجد کی سہولتوں کا ناجائز استعمال منع ہے

سوال:

اہلِ محلہ نے مسجد سے ملحق، مسجد کی ملکیتی جگہ پر بچیوں کے لیے مدرسہ تعمیر کیا۔ کچھ عرصہ بعد امام صاحب نے وقف مدرسہ کو اپنے بیٹے کی رہائش بنادیا اور بچیوں کی کلاس مسجد کی جانب سے دی گئی امام صاحب کی رہائش گاہ میں لگادی۔ دو سال بعد مدرسے میں نئے داخلے بند کردیے، جس سے بچیوں کی تعداد نہیں بڑھتی۔ ان دو ڈھائی سالوں میں امام صاحب کا بیٹا مدرسہ کی بجلی پر ایئر کنڈیشن بھی چلاتا رہا اور مدرسہ کے فنڈ سے بل کی ادائیگی ہوئی، جبکہ امام صاحب کے بیٹے کے بقول اس کی ماہانہ آمدنی ساٹھ تا ستر ہزار روپے ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (امیر حمزہ، اسلام آباد)۔

جواب:

امام صاحب کا مدرسہ کو ذاتی رہائش میں تبدیل کرنا اپنے فرائضِ منصبی سے تجاوز کرنا ہے اور وقف کی جگہ کی حیثیت کو تبدیل کرنا ہے، جو ناجائز ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ ھَیْئَتِہٖ''۔ ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)''۔ اور اگر مسجد انتظامیہ کی اجازت سے انہوں نے ایسا کیا تو انتظامیہ بھی گنہگار ہے۔

امام صاحب کا مذکورہ عمل کئی خرابیوں کے سبب ناجائز ہے کہ وقف میں تغییر کی اور

مدرسہ کو بطور رہائش استعمال کیا، جبکہ مسجد کی موقوف جائیداد بھی امام و مؤذن کے تصرُّف میں نہیں دی جاسکتی۔

علامہ عالم بن العلاء انصاری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"مُتَوَلِّي الْمَسْجِدِ إِذَا اشْتَرَىٰ بِالْغَلَّةِ الَّتِيْ اِجْتَمَعَتْ عِنْدَهُ مِنَ الْوَقْفِ مَنْزِلًا وَدَفَعَ الْمَنْزِلَ إِلَى الْمُؤَذِّنِ لِيَسْكُنَ فِيْهِ إِنْ عَلِمَ الْمُؤَذِّنُ ذٰلِكَ كَرِهَ لَهُ أَنْ يَّسْكُنَ فِيْ ذٰلِكَ الْمَنْزِلِ لِأَنَّ هٰذَا الْمَنْزِلَ مِنْ مُسْتَغَلَّاتِ الْمَسْجِدِ فَهٰذِهِ الْمَسْئَلَةُ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ مُتَوَلِّي الْمَسْجِدِ إِذَا دَفَعَ إِلَى الْمُؤَذِّنِ أَوْ إِلَى الْإِمَامِ مَاهُوَ مِنْ مُسْتَغَلَّاتِ الْمَسْجِدِ لَايَجُوْزُ ذٰلِكَ لِلْمُتَوَلِّيْ وَيُكْرَهُ لِلْإِمَامِ وَالْمُؤَذِّنِ أَنْ يَّسْكُنَ فِيْ ذٰلِكَ الْمَنْزِلِ"۔

ترجمہ: ''مسجد کے اوقاف کی آمدنی سے متولی نے کوئی مکان خریدا اور یہ مکان مؤذن یا امام کو رہنے کے لیے دیا اگر ان کو معلوم ہے، تو اس میں رہنا مکروہ وممنوع ہے کہ اس وقف کی آمدنی مسجد کے لیے ہے۔ یونہی مسجد پر جو مکان اس لیے وقف ہیں کہ اُن کا کرایہ مسجد میں صرف ہوگا، تو متولی مسجد یہ مکان بھی امام و مؤذن کو رہنے کے لیے نہیں دے سکتا اور دے دیا تو ان کا رہنا مکروہ ہے، (فتاویٰ تاتارخانیہ، جلد 3، ص: 294)''۔

دوسری خرابی یہ کہ بجلی ودیگر اخراجات مالِ وقف سے کیے گئے ہیں، جس کا تاوان دینا لازم ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ مدرسہ کا قیام بچیوں کی تعلیم کے لیے تھا، محلے کی بچیاں استفادہ کرتیں، مزید بچیوں کا داخلہ بند کر کے علم کے دروازے بند کردیے۔

وقف کی جگہ رہائش اختیار کرنے پر اُس کی اُجرتِ مثل (یعنی اس حیثیت کے مکان کا جو کرایہ وہاں ہو، اُس کے مطابق) ادا کرنا لازم ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"وَلَوسَکَنَهُ الْمُشْتَرِي أَوِ الْمُرْتَهِنُ، ثمّ بَانَ أَنَّهٗ وَقْفٌ، أَولِصَغِيرٍلَزِمَ أجرُالمِثْلِ "قُنية"۔

ترجمہ: ''اگر خریدار یا رہن رکھنے والے نے اُس جگہ سکونت اختیار کی، پھر معلوم ہوا کہ یہ (جگہ) وقف ہے یا کسی نابالغ بچے کی ہے، تو اُس پر اُجرتِ مثل لازم ہے، بحوالہ:

''قُنیہ''، (جلد 13،ص:418،دمشق)''۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''متاخرین کا مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ اُجرتِ مثل دے گا''۔

امامت کل وقتی منصب ہے اور امام مسجد کے لیے رہائش لازم ہے، لیکن اگر امام صاحب کے بچے بالغ، خود مختار اور صاحبِ حیثیت ہیں، اُن کے زیرِ کفالت نہیں اور آپ کے بقول امام صاحب کے بیٹے کی تنخواہ بھی معقول ہے، تو انہیں بیٹے کی رہائش کا علیحدہ انتظام کرنا چاہیے اور مسجد پر اضافی بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

مسجد کے ہال میں کھانا کھلانا

سوال:

ہماری مسجد کے امام صاحب نے مسجد میں نکاح پڑھایا، تقریباً 100 افراد مہمان تھے، نکاح کے بعد مسجد کے ہال میں کھانے کا انتظام تھا۔ تمام مہمانوں اور اہل محلہ کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیورز نے بھی کھانے میں شرکت کی۔ محلے کے چند افراد کے احتجاج پر امام صاحب نے کہا کہ ہم نے مہمانوں کو اعتکاف کی نیت کرنے کا کہہ دیا تھا۔ امام صاحب نے کہا کہ اہلِ محلہ کو بھی اجازت ہے کہ مسجد میں شادی کی تقریب رکھ سکتے ہیں، شریعت اس کی اجازت دیتی ہے، ڈھول اور کیمرہ کا استعمال نہ کریں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (امیر حمزہ، اسلام آباد)۔

جواب:

مسجد میں نکاح منعقد کرنا مستحب ہے، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مُبَاشَرَۃُ عَقْدِ النِّکَاحِ فِی الْمَسَاجِدِ مُسْتَحَبٌّ''۔

ترجمہ: ''مسجد میں نکاح منعقد کرنا مستحب ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:5،ص:321)''۔

اگر نکاح کی تقریب مسجد میں رکھی جائے تو مسجد کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے اور مسجد میں نکاح منعقد کرنے میں اس کی تشہیر ہوتی ہے اور اعلان مقاصدِ نکاح میں سے ہے، حضرت عائشہ صدیقہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ"۔

ترجمہ: "(لوگو!) نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کرو اور اس کی تشہیر کے لیے دف بجایا کرو، (سُنن ترمذی:1089)"۔

بہتر تو یہ ہے کہ کھانے کا اہتمام گھر یا کسی ہال وغیرہ میں کیا جائے، مسجد میں کھانے کے اہتمام سے مسجد کے فرش، دریوں یا قالینوں کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ نیز بڑے پیمانے پر کھانے کا اہتمام کرنے سے لوگوں کے شور وشغب سے مسجد کی حُرمت پامال ہوگی، امام صاحب کا لوگوں کو شادی کی تقریب مسجد میں رکھنے کا اذنِ عام دینا درست نہیں، صرف نکاح مسجد میں مستحب ہے۔ البتہ کسی ضرورت کے تحت مسجد میں کھانا یا سونا ہو، تو اعتکاف کی نیت کر لینی چاہیے، اس حد تک امام صاحب کی بات درست ہے۔ نفلی اعتکاف تھوڑے وقت کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور اس کے لیے روزہ لازم نہیں ہے۔

مسجد کے نام پر وقف کے لیے زمین کا معین ہونا ضروری ہے

سوال:

2003ء میں اسکیم نمبر 33 میں "مدینہ سوسائٹی" والوں نے مسجد کے لیے بلا قیمت زمین دینے کا وعدہ کیا تھا، اس پر میں نے اور میرے دوستوں نے مل کر مسجد کی تعمیر کے لیے رقم جمع کی، اس کے بعد کسی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس رقم میں سے روڈ ڈویلپمنٹ کی مد میں ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کر دیے۔ میری عمر خاصی ہوگئی ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ وہ رقم کسی اور جگہ مسجد کی تعمیر میں صرف کر دوں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟۔ کیونکہ اب تک اس سوسائٹی والوں نے مسجد کے لیے کوئی جگہ مختص کر کے ہمارے قبضے میں نہیں دی اور نہ ہی یہ بتایا کہ کتنے رقبے کا پلاٹ دیا جائے گا، نہ ہی اس سوسائٹی میں کوئی ترقیاتی کام ہوا ہے، (محمد اقبال، میٹھادر کراچی)"۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بیان کے مطابق مسجد کے لیے جگہ مختص نہیں ہوئی، صرف

ارادہ کیا گیا ہے جو وقف ہونے کے لیے کافی نہیں۔ وقف صحیح ہونے کے لیے زمین یا مکان کا معین ہونا اور واقف کی مِلک میں ہونا ضروری ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''(قَوْلُهُ: مَعْلُومًا) حَتّٰى لَوْ وَقَفَ شَيْئًا مِنْ أَرْضِهِ وَلَمْ يُسَمِّهِ لَا يَصِحُّ وَلَوْ بَيَّنَ بَعْدَ ذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''(وقف معلوم ہو) یہاں تک کہ اگر زمین کا کوئی حصہ وقف کیا اور اُس کو معین نہ کیا، وقف صحیح نہیں اگرچہ بعد میں اُسے واضح کر دیا ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:6،ص: 410، بیروت)''۔

مسجد کے لیے لازم ہے کہ اپنی مِلک سے اس کو بالکل جدا کر دے کہ اُس کی مِلک باقی نہ رہے۔ مسجد کے لیے زمین یا مکان وقف کرنے کا معنی ہے: اُس سے اپنی ملکیت کو ساقط کر دینا، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

''وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ فِيْ وَقْفِ الْمَسَاجِدِ اَنَّهَا مِنْ بَابِ الْاِسْقَاطِ وَالْعِتْقِ، لَا مِلْكَ لِأَحَدٍ فِيْهَا، وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ تَعَالٰى''۔

ترجمہ: ''وقف مساجد میں علماء کا اتفاق ہے کہ یہ 'بابِ اسقاط' (اپنی حقِ ملکیت کو ساقط کرنے) اور اعتاق (آزاد کرنے) میں سے ہے اور اس میں کسی (بندے) کی ملکیت نہیں رہتی اور مساجد صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 10،ص: 7602)''۔

عطیات، عطیہ دہندہ کی ملکیت پر باقی رہتے ہیں۔ عطیہ جمع کرنے والے کی ذمے داری ہے کہ جس مقصد کے لیے لوگوں نے عطیات دیئے ہیں، اُسی پر خرچ کرے۔ مذکورہ صورت میں چونکہ کوئی مسجد معین نہیں تھی، محض مسجد کی تعمیر کے لیے عطیات لیے گئے تھے، اس لیے کسی بھی مسجد کی تعمیر پر یہ عطیات خرچ کیے جا سکتے ہیں، اگر عطیات دینے والے دوستوں کو آپ جانتے ہیں تو ان سے اجازت لے کر یہ رقم کسی دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے

دے سکتے ہیں اور آپ نے ترقیاتی کاموں کے لیے جو رقم دی ہے، وہ بھی سوسائٹی سے واپس لے سکتے ہیں، کیونکہ اب آپ کا اس سوسائٹی میں کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے اور سوسائٹی والوں کے لیے کسی عِوض کے بغیر آپ کی رقوم کو روکے رکھنا جائز نہیں ہے۔

مسجد کے لوحِ افتتاح کی شرعی حیثیت

سوال:

محلہ اسلام آباد گلیانہ روڈ کھاریاں میں عرصہ 37 سال سے ایک مسجد بنام ''حضرت بلال'' مقامی اہلسنت آبادی نے تعمیر کی، اہل علاقہ کی خواہش پر حضرت پیر سید حاجی احمد شاہ نقشبندی گجراتی رحمۃ اللہ علیہ نے سنگ بنیاد رکھا۔ مسجد انتظامیہ اور معززین نے بزرگوں کی تشریف آوری اور افتتاح مسجد کو اعزاز سمجھتے ہوئے مشاورت سے فیصلہ کیا کہ لوح بنوائی جائے، جس میں مسجد کا نام، افتتاح کرنے والے بزرگ کا نام وغیرہ درج کیا جائے اور مسجد کے گیٹ پر نصب کیا جائے۔ مگر مالی وسائل کی کمی کے سبب مسجد کی تعمیر مختلف مراحل میں ہوئی اور مین گیٹ کی جگہ کچی اینٹیں جوڑ کر عارضی طور پر بند کر دی گئی اور آمد و رفت کے لیے ایک چھوٹا دروازہ بنا دیا۔ لوح مسجد میں تو نہ لگ سکی لیکن محفوظ رکھ دی گئی۔ اب جبکہ مسجد کی از سرِ نو تزئین و آرائش کی گئی اور مالی وسائل بھی کافی موجود ہیں اور عرصہ دراز سے رکھی ہوئی لوح افتتاح بھی مناسب مقام پر نصب ہو سکتی ہے، تو جو شخص اس لوح افتتاح کو نصب کرنے سے مانع ہے، اس کے لیے کیا حکم شرعی ہے؟ (محمد عمر حیات قادری، محلہ اسلام آباد، کھاریاں، گجرات)۔

جواب:

مسجد ''وقف لِلّٰہ'' ہوتی ہے، کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے، جس فرد یا افراد نے اپنی ذاتی ملکیت سے نکال کر یا اپنے حلال مال سے مسجد کے لیے زمین خرید کر وقف کی ہے، ان کے لیے وہ تاحیات صدقۂ جاریہ ہے اور اس پر انہیں اجر ملتا رہے گا۔ اگر کسی نے یہ کام ذاتی نمود کے لیے کیا ہے، تو اس کی شہرت اور واہ واہ تو ہو جائے گی، مگر وہ عنداللہ

اجرِ آخرت سے محروم رہے گا۔ دنیا کی ہر مسجد پر کسی کے افتتاح کی تختی لگانا نہ شرعی ضروریات میں سے ہے اور نہ ہی شرعاً حرام وممنوع ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک مباح کام ہے۔
اس پر تو قرآن شاہد ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کی ہے، لیکن بیت اللہ کی عمارت پر ان کے نام کی ''لوحِ تعمیر'' یا ''لوحِ افتتاح'' نصب نہیں ہے، ہاں! قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ البقرۃ:129-125 تا قیامت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے اس اعزاز پر شاہد رہیں گی اور اس سے زیادہ ثقہ شہادت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح مسجد نبوی کی تعمیر سید المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اصحاب کے ہمراہ فرمائی، وہاں بھی ایسی کوئی ظاہری علامت نہیں ہے، یہی صورت اَطرافِ عالم میں پھیلی ہوئی عالمِ اسلام کی بے شمار تاریخی ودیگر عام مساجد کی ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ کئی مساجد پر ''سنگِ بنیاد'' یا ''لوحِ افتتاح'' یا کسی ادارے کے ساتھ ''لوحِ الحاق'' نصب ہوتی ہے اور اس ''بدعتِ حَسَنہ'' کو اُن حضرات نے بھی بہ طیبِ خاطر قبول کیا ہے، جن کا من پسند مشغلہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد سے لے کر آج تک مختلف ادوار میں دینی امور کی ''ہیئتِ کذائی'' کو ''بدعتِ سیّئہ'' کے عنوان سے نشانے پر رکھنا ہوتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں تولیت واہتمام (Trusteeship) اور شِعار ومعمولات کے حوالے سے مساجد کو بنائے اختلاف نہ بنایا جاسکے اور معاملات حسن وخوبی سے جاری وساری رہیں۔ لہٰذا اگر انتظامیہ کے سب افراد یا اکثر افراد متفق ہیں اور اختلافی رائے رکھنے والے اس کو بنائے فساد نہیں بناتے تو لوحِ افتتاح نصب کر دیں اور اگر اس پر کلی یا اکثری اتفاق نہیں ہو پارہا، تو اس کے نصب نہ کرنے سے کوئی شرعی خرابی لازم نہیں آتی اور نہ ہی اس پر کوئی فتویٰ صادر کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا صبر وضبط سے کام لیں اور مسجد کا انتظام خوش اسلوبی سے چلنے دیں۔ جناب پیر سید حاجی احمد شاہ نقشبندی گجراتی مرحوم کے نام سے ہم واقف نہیں ہیں، لیکن ان کے بارے میں ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ انہوں نے مسجد کی تعمیر کا افتتاح یقیناً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا ہوگا، پس ''لوحِ افتتاح'' مسجد کے

گیٹ پر نصب ہو یا نہ ہو، انہیں اِس صدقۂ جاریہ کا اجر ملتا رہے گا، آپ اس پر مطمئن رہیں،
وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

قبرستان میں مسجد کی توسیع منع ہے

سوال:

ہمارے قریب ایک بہت پرانا قبرستان ہے، جس میں قبروں کے نشانات تک ختم ہو چکے ہیں، البتہ بعض اوقات کھدائی کرتے وقت پتا چلتا ہے کہ یہاں قبر تھی۔ کیا بوقتِ ضرورت مسجد یا مدرسہ کشادہ کرنے کے لیے اس جگہ کو استعمال کیا جاسکتا ہے؟، (محمد علی، کوٹلی آزاد کشمیر)۔

جواب:

قبرستان ایک علیحدہ وقف کی حیثیت رکھتا ہے اور وقف کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے،
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
"وَلَایَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَیْئَتِهٖ"۔
ترجمہ: "وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:490)"۔
مسلمانوں کے قبرستان کو، خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو، مسمار کرنا یا کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں۔
علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:
وَسُئِلَ هُوَ(اَیِ الْقَاضِی الْاِمَامُ شَمْسُ الْاَئِمَّةِ مَحْمُوْدُ الْاُوْزْجَنْدِیُّ)عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِی الْقُریٰ اِذَا انْدَرَسَتْ وَلَمْ یَبْقَ فِیْهَا اَثَرُ الْمَوْتیٰ لَا الْعَظْمُ وَلَا غَیْرُهٗ هَلْ یَجُوْزُ زَرْعُهَا وَاسْتِغْلَالُهَا؟، قَالَ لَا، وَلَهَا حُکْمُ الْمَقْبَرَةِ، کَذَا فِی "الْمُحِیْطِ"۔
ترجمہ: "شمس الائمہ امام قاضی محمود اوزجندی سے دیہات میں موجود ایسے قبرستان کی بابت پوچھا گیا کہ جس قبرستان کے نشانات مٹ چکے ہوں اور اُس میں میت کی ہڈیاں یا کوئی دوسرے آثار اعضاء وغیرہ باقی نہ رہے ہوں، تو کیا اس پر کاشت کرنا اور اس سے غلہ حاصل

کرنا جائز ہے؟، آپ نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔ محشی نے اس پر حاشیہ لکھا:

''قَوْلُهٗ قَالَ لَا، هٰذَا لَایُنَافِیْ مَاقَالَهُ الزَّیْلَعِیُّ فِیْ بَابِ الْجَنَائِزِ مِنْ أَنَّ الْمَیِّتَ اِذَا بَلِیَ وَصَارَ تُرَابًا جَازَ زَرْعُهٗ وَالْبِنَاءُ عَلَیْهِ اه لِاَنَّ الْمَانِعَ هُنَا كَوْنُ الْمَحَلِّ مَوْقُوْفًا عَلَی الدَّفْنِ فَلَا یَجُوْزُ اِسْتِعْمَالُهٗ فِیْ غَیْرِهٖ فَلْیَتَاَمَّلْ وَلْیُحَرَّرْ''۔

ترجمہ: ''مصنف کا قول ''لا''، ''امام زیلعی'' کے اُس قول کے منافی نہیں ہے جو باب الجنائز میں ہے کہ ''جب قبر میں میت بوسیدہ اور مٹی ہوجائے، تو اُس پر کاشت کرنا اور تعمیر کرنا جائز ہے''، یہاں زراعت سے ممانعت اس لئے ہے کہ یہ مقام میتوں کو دفن کرنے کے لیے وقف ہے، اس کا دوسرے مصرف میں استعمال جائز نہیں، پس غور کر کے مسئلہ لکھنا چاہیے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد2،ص:470، 471، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ یعنی جہاں قبر بوسیدہ اور میت کے آثار باقی نہ رہے ہوں اور وہ جگہ قبرستان کے لیے وقف نہیں تھی، تو اس پر کاشت کرنا یا کوئی عمارت بنانا جائز ہے، لیکن جو جگہ قبرستان کے لیے وقف ہے، اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز اسی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صاحبو! اس سے مقصود زمینِ مملوک ہے، یعنی اگر کسی کی ملک میں کوئی میت دفن کردی گئی ہو، تو جب وہ بالکل خاک ہوجائے، مالک کو روا ہے کہ وہاں کھیتی کرے، گھر بنائے، جو چاہے کرے: ''لِاَنَّ الْمِلْكَ مُطْلَقٌ وَالْمَانِعُ زَالَ وَهٰذَا اَیْضاً اِذَا كَانَ ذٰلِكَ بِاِذْنِهٖ وَاِلَّا فَفِی الْغَصْبِ لَهٗ اِخْرَاجُ الْمَیِّتِ وَتَسْوِیَةُ الْاَرْضِ كَمَا هِیَ لِحَدِیْثِ مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیْتَةً فَهِیَ لَهٗ، وَلَیْسَ لِعِرْقِ ظَالِمٍ حَقٌّ''۔

ترجمہ: ''کیونکہ مِلک مطلق ہے اور مانع زائل ہوگیا ہے اور یہ بھی اس صورت میں ہے جبکہ (میت کی تدفین) اُس کی اجازت سے ہوئی ہو، ورنہ غصب کی صورت میں اُسے حق ہے کہ میت کو نکالے اور زمین سابق صورت پر برابر کرے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جس نے

غیر آباد زمین کو آباد کیا تو وہ اُس کی ملک ہے اور زمین پر ظالم کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:474، رضافاؤنڈیشن لاہور)''۔

ایک اور مقام پر آپ لکھتے ہیں:

''حَقَّقَ الْعَبْدُ الضَّعِیفُ فِیْ فَتَاوِیه: اَنَّ کَلَامَ الْاِمَامِ الزَّیْلَعِیِّ هٰذَا فِی الْاَرْضِ الْمَمْلُوْکَةِ دُوْنَ الْمَوْقُوفِ فَلْیَکُنِ التَّوْفِیْقُ ''۔

ترجمہ: بندہ ضعیف نے اپنے فتاویٰ (کے باب الوقف) میں اس بات کی تحقیق کی ہے کہ امام زیلعی کے جواز کا قول کسی کی ملکیتی زمین کے بارے میں ہے اور یہ جواز وقف شدہ زمین میں نہیں ہے، اس طرح (تتارخانیہ اور زیلعی کے) اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے، (جِدُّ الْمُمْتَار ج:3،ص:409)''۔

مختصر یہ کہ مسجد یا مدرسے کو کشادہ کرنے کے لیے بھی قبرستان کی جگہ استعمال نہیں کی جاسکتی ۔صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا:'' مسجد بڑی کرنے کی ضرورت ہے، مگر مسجد سے متصل دائیں بائیں بہت سی قبریں ہیں، تو اس صورت میں قبروں کو شہید کر کے وہاں پکی مسجد بنوانا جائز ہے یا نہیں؟''۔آپ نے جواب میں لکھا:''مسلمان کی قبر بلاوجہِ شرعی کھود کر برابر کر دینا حرام ہے، فتاویٰ خیریہ میں ہے:

''وَقَدْ صَرَّحُوا بِحُرْمَةِ النَّبْشِ لِغَیْرِ ضَرُورَةٍ''، (ترجمہ: اور فقہاء نے بلا ضرورت قبر کو کھودنے کے حرام ہونے کی صراحت کی ہے)، ردالمحتار میں ہے:''اَلنَّبْشُ حَرَامٌ'' اور مسجد کی توسیع قبر کھود ڈالنے کے لیے ضرورت شرعیہ نہیں، درمختار میں ہے: (لَا یُخْرَجُ مِنْہُ بَعْدَ اِهَالَةِ التُّرَابِ (اِلَّا) لِحَقِّ آدَمِیٍّ، (ترجمہ: مٹی ڈال دینے کے بعد میّت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا، سوائے اس کے کہ کسی انسان کا حق اس سے متعلق ہو)۔

ردالمحتار میں فرمایا:

'' اِحْتِرَازٌ عَنْ حَقِّ اللهِ تَعَالٰی کَمَا إِذَا دُفِنَ بِلَا غُسْلٍ أَوْ صَلَاةٍ أَوْ وُضِعَ عَلٰی غَیْرِ یَمِینِہٖ أَوْ إِلٰی غَیْرِ الْقِبْلَةِ فَإِنَّهٗ لَا یُنْبَشُ عَلَیْهِ بَعْدَ إِهَالَةِ التُّرَابِ کَمَا مَرَّالخ، فَعُلِمَ مِنْ هٰذَا اَنَّ

النَّبْشَ لِتَوْسِيْعِ الْمَسْجِدِ لَا يَجُوْزُ لِعَدَمِ تَعَلُّقِ حَقِّ الْآدَمِيِّ بِالْمَيِّتِ"۔

ترجمہ: "یہ جو کہا گیا کہ میت کو صرف کسی انسان کے حق کے لیے قبر سے نکالا جا سکتا ہے، یہ "حق اللہ" کے استثناء کو بیان کرنے کے لیے ہے، مثلاً: میت کو غسل یا جنازہ کے بغیر دفن کر دیا گیا یا اسے قبر میں قبلہ رُخ نہیں رکھا گیا، تو ان مقاصد کے لیے قبر پر مٹی ڈالے جانے کے بعد اسے دوبارہ نہیں کھولا جائے گا، جیسا کہ مسئلہ بیان ہوا۔ پس اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسجد کی توسیع کے لیے قبر کو کھود کر برابر کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ صورت آدمی کے حق سے متعلق نہیں ہے) اور قبر کو جب برابر کر کے اسے مسجد میں شامل کریں گے تو اس پر چلنا پھرنا پاؤں رکھنا بھی ہوگا اور قبر پر چلنا، پاؤں رکھنا حرام۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

"اَنْ اَمْشِيَ عَلٰى جَمْرَةٍ أَوْ سَيْفٍ، أَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَمْشِيَ عَلٰى قَبْرِ مُسْلِمٍ" (مسلمان کی قبر پر چلنے سے انگارے یا تلوار پر چلنا مجھے زیادہ پسند ہے)، (ابن ماجہ: 1568) کہ اس سے میت کو ایذا ہوگی اور ایذائے مسلم حرام۔ حدیث پاک میں ہے:

"اَلْمَيِّتُ يُؤْذِيْهِ فِيْ قَبْرِهٖ مَا يُؤْذِيْهِ فِيْ بَيْتِهٖ"۔

(ترجمہ: "میت کو قبر میں بھی ان چیزوں سے اذیت پہنچتی ہے، جن سے (حیاتِ دنیوی) گھر میں اسے اذیت ہوتی ہے۔

علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: "اَفَادَ اَنَّ حُرْمَةَ الْمُؤْمِنِ بَعْدَ مَوْتِهٖ بَاقِيَةٌ"۔ یعنی اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤمن کی حُرمت مرنے کے بعد باقی رہتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اَذَى الْمُؤْمِنِ فِيْ مَوْتِهٖ كَاَذَاهُ فِيْ حَيَاتِهٖ" مؤمن کو مرنے کے بعد تکلیف پہنچانے کا وہی حکم ہے، جو اس کی زندگی میں تکلیف پہنچانے کا ہے۔

ردالمحتار میں ہے: "اَلْمَيِّتُ يَتَاَذّٰى بِمَا يَتَاَذّٰى بِهِ الْحَيُّ"۔ (ترجمہ: "جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، اس سے مردے کو بھی تکلیف ہوتی ہے)"۔ یہاں تک کہ علماء

تصریح فرماتے ہیں کہ قبرستان میں جو نیا راستہ نکالا گیا ہے، اس پر چلنا جائز نہیں۔ طحطاوی میں ہے: ''نَصُّوْا عَلٰی اَنَّ الْمُرُوْرَ فِیْ سَکَّۃٍ حَادِثَۃٍ فِیْہَا حَرَامٌ''۔ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قبرستان میں کسی نئے راستے پر چلنا حرام ہے۔

نیز قبر، حقِ میت ہے اور کسی کا حق باطل کرنا ناجائز ہے، ''قنیہ'' میں ہے: ''یَأْثِمُ بِوَطْأِ الْقُبُوْرِ لِاَنَّ سَقْفَ الْقَبْرِ حَقُّ الْمَیِّتِ''۔ ترجمہ: ''قبر پر چلنے یا بیٹھنے سے گنہگار ہوگا، کیونکہ قبر کی چھت میت کا حق ہے''۔

سوال کے یہ الفاظ: ''مسجد کے متصل کثرت سے قبریں ہیں''، سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین غالباً وقفی قبرستان ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی قبور کے لیے وقف ہے، تو پھر اگر اتنے ٹکڑے میں قبریں نہ بھی ہوتیں، تب بھی قبرستان کی حدود میں مسجد کی توسیع ناجائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''لَا یَجُوْزُ تَغْیِیْرُ الْوَقْفِ عَنْ ہَیْئَتِہٖ، فَلَا یُجْعَلُ الدَّارُ بُسْتَانًا وَلَا الْخَانُ حَمَّامًا وَلَا الرِّبَاطُ دُکَّانًا اِلَّا اِذَا جَعَلَ الْوَاقِفُ اِلَی النَّاظِرِ مَا یَرٰی فِیْہِ مَصْلَحَۃَ الْوَقْفِ''۔

ترجمہ: وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں ہے، پس گھر کو باغ نہیں بنایا جائے گا، نہ سرائے کو حمام اور نہ ہی رباط (سرائے) کو دکان بنایا جائے گا، سوائے اس کے کہ واقف نے متولی کو اجازت دے رکھی ہو کہ وہ اس جگہ کو وقف کے مفاد میں اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرسکتا ہے)۔

فتح القدیر میں ہے: اَلْوَاجِبُ اِبْقَاءُ الْوَقْفِ عَلٰی مَا کَانَ عَلَیْہِ (ترجمہ: وقف کو اپنی ہیئتِ سابقہ پر قائم رکھنا واجب ہے)، نیز وقف کرنے کے لیے مِلک شرط ہے اور جب زمین قبرستان کے لیے وقف ہوچکی تو مِلک نہ رہی، پس اب مسجد کے لیے وہ زمین کیسے وقف ہوسکتی ہے۔ ہاں! اگر وہ زمین قبرستان کے لیے وقف نہ ہو اور ان قبروں کو بدستور باقی رکھ کر قبروں کے آس پاس سے ستون قائم کر کے اوپر چھت قائم کردیں کہ نیچے کے درجہ میں

قبریں ہوں اور چھت کو توسیع مسجد کے کام میں لائیں تو جائز ہے، (فتاویٰ امجدیہ، سوم، ص: 6-4، بتصرف)''۔

مسجد میں کاروبار کی ممانعت

سوال:

بعض اوقات گلی محلے میں کچھ بائنڈر مسجد کے ایسے قرآن مجید جن کی بائنڈنگ کھل گئی ہو، مسجد کمیٹی سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرنے کی اجازت لے کر مسجد کے قرآن مجید کی بلامعاوضہ بائنڈنگ کا کام شروع کردیتے ہیں، اعلان سن کر جو لوگ مسجد میں قرآن پاک لے کر آتے ہیں، ان کے سامنے یہ خلاصہ پیش کرتے ہیں کہ ہم قرآن کی خدمت کرتے ہیں، آپ اپنی مرضی سے جو چاہیں ہدیہ عنایت کردیں، مسجد سے اس طرح اعلان کرنا اور لوگوں سے اس طرح کہنا درست ہے؟، (مسجد کمیٹی دارالحمد، قصبہ کالونی، کراچی)۔

جواب:

مسجد کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مسجد میں کسی قسم کا سوال نہ کیا جائے، حدیث پاک میں ہے:

''مَنْ سَمِعَ رَجُلًا يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا''۔

ترجمہ: ''جو شخص بآوازِ بلند کسی شخص کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کرتے ہوئے سنے تو کہے: اللہ کرے تیری چیز نہ ملے کیونکہ مساجد اس لیے نہیں بنائی گئیں، (صحیح مسلم: 568)''۔

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ، فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللهُ تِجَارَتَكَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَنْشُدُ فِيهِ ضَالَّةً، فَقُولُوا: لَا رَدَّ اللهُ عَلَيْكَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی کو مسجد میں خرید وفروخت کرتے دیکھو تو اس سے کہو: اللہ تیری تجارت میں نفع نہ دے اور

جب کسی کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کرتے دیکھو تو اس سے کہو: اللہ کرے تجھے تیری چیز نہ ملے، (سُنن ترمذی: 1321)''۔

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''کسی شخص کا مسجد میں اپنے لیے سوال کرنا ممنوع ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں: مسجد میں سوال کرنا حرام ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے لیے سوال کرنا تو حرام ہے البتہ دوسرے مسلمان کی مدد کے لیے سوال کرنا جائز ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز کے بعد مُضَر کے خستہ حال لوگوں کے لیے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دی، مسجد میں سائل کو دینے کے بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ حصکفی نے اس کو مطلقاً مکروہ قرار دیا ہے اور علامہ شامی لکھتے ہیں کہ اگر سائل لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر سوال کرتا ہے تو اسے دینا مکروہ ہے (کیونکہ یہ معصیت پر معاونت ہے، سعیدی) ورنہ نہیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مسجد میں سائل کو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ حدیث صحیح میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی شخص نے آج کسی مسکین کو کھانا کھلایا؟، حضرت ابو بکر کہتے ہیں: میں مسجد میں داخل ہوا، وہاں ایک سائل کو دیکھا، میں نے عبدالرحمن کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا لے کر اس کو دے دیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیز لکھتے ہیں:

''مسجد میں اپنے لیے مانگنا جائز نہیں اور اسے دینے سے بھی علماء نے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ امام اسماعیل زاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جو مسجد کے سائل کو ایک پیسہ دے، اسے چاہیے کہ ستر پیسے اللہ کے نام پر اور دے کہ اس پیسے کا کفارہ ہوں اور کسی دوسرے کے لیے مانگنا یا مسجد میں کسی اور دینی ضرورت کے لیے چندہ کرنا جائز اور سنت سے ثابت ہے۔ فاضل بریلوی نے امام زاہد رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ اسی سائل پر محمول ہے، جو لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر سوال کرے، ایسے سائل کو دینا مکروہ ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 2، ص: 135-136)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اَلْخَیَّاطُ اِذَا کَانَ یَخِیْطُ فِی الْمَسْجِدِ یُکْرَهُ اِلَّا اِذَا جَلَسَ لِدَفْعِ الصِّبْیَانِ وَصِیَانَةِ الْمَسْجِدِ فَحِیْنَئِذٍ لَا بَأْسَ بِهٖ، وَکَذَا الْکَاتِبُ اِذَا کَانَ یَکْتُبُ بِأَجْرٍ یُکْرَهُ وَبِغَیْرِ اَجْرٍ لَا، وَأَمَّا الْمُعَلِّمُ الَّذِیْ یُعَلِّمُ الصِّبْیَانَ بِأَجْرٍ اِذَا جَلَسَ فِی الْمَسْجِدِ یُعَلِّمُ الصِّبْیَانَ لِضَرُوْرَةِ الْحَرِّ اَوْ غَیْرِهٖ لَا یُکْرَهُ"۔

ترجمہ: "درزی کا مسجد میں بیٹھ کر (اجرت پر) کپڑے سینا مکروہ ہے، البتہ اگر بچوں کو روکنے اور مسجد کی حفاظت کے لیے بیٹھا ہے تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح کاتب کو مسجد میں بیٹھ کر اجرت پر لکھنے کی اجازت نہیں، بغیر اجرت لکھ سکتا ہے، لیکن اگر معلم بچوں کو اجرت پر تعلیم دیتا ہے اور گرمی یا کسی اور ضرورت سے مسجد میں بیٹھتا ہے، تو مکروہ نہیں ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:110)"۔

اس تمام تفصیل کے بعد شرعی حکم یہ ہے کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کی اجازت نہ دی جائے، البتہ اگر ساؤنڈ سسٹم مسجد سے باہر ہے، تو اعلان کیا جا سکتا ہے۔

جلد بندی کرنے والوں کو بھی مسجد میں یا مسجد کے صحن میں نہ بیٹھنے دیا جائے، بعد کی علیحدہ مقام پر یہ کام انجام دیں تو اُس کی طے شدہ اجرت لے سکتے ہیں، لیکن مسجد کے اندر کسی سے اجرت کا تقاضا کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا کاروبار ہے اور مسجد میں کاروبار کی ممانعت ہے، حدیث پاک میں ہے:

"جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ وَشِرَاءَکُمْ وَبَیْعَکُمْ وَخُصُوْمَاتِکُمْ وَرَفْعَ اَصْوَاتِکُمْ وَاِقَامَةَ حُدُوْدِکُمْ وَسَلَّ سُیُوْفِکُمْ"۔

ترجمہ: "اپنی مسجدوں کو بچوں، پاگلوں، خرید و فروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، شور و شغب، (مجرموں پر) حدود الٰہی قائم کرنے اور (ایک دوسرے پر) تلواریں سونتنے (یعنی آپس کی لڑائی جھگڑوں) سے بچاؤ۔ (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:750)"۔

جنازے کے مسائل

امامت نمازِ جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

سوال:

نمازِ جنازہ کی امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟، امام محلہ یا میت کا ولیِ اقرب، اگر میت نے کسی کے بارے میں وصیت کی کہ یہ میری نمازِ جنازہ پڑھائے تو اس کی رعایت جائز ہے یا فقہی ترتیبِ اولویت کو ملحوظ رکھا جائے گا، فقہ حنفی کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں، (انتظامیہ جامع مسجد المصطفیٰ، بلاک 14، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(وَيُقَدَّمُ فِي الصَّلَاةِ عَلَيْهِ السُّلْطَانُ) إِنْ حَضَرَ (أَوْ نَائِبُهُ) وَهُوَ أَمِيرُ الْمِصْرِ (ثُمَّ الْقَاضِي) ثُمَّ صَاحِبُ الشُّرَطِ ثُمَّ خَلِيفَةُ الْقَاضِي (ثُمَّ إِمَامُ الْحَيِّ) فِيهِ إِيهَامٌ، وَذٰلِكَ أَنَّ تَقْدِيمَ الْوُلَاةِ وَاجِبٌ وَتَقْدِيمَ إِمَامِ الْحَيِّ مَنْدُوبٌ، فَقَطْ''۔

ترجمہ: ''اگر خلیفۂ وقت موجود ہے تو نماز جنازہ کی امامت کیلئے اسے مقدم کیا جائے گا یا اس کے نائب کو یعنی اس شہر کا امیر، پھر قاضی کو، پھر امیر لشکر کو، پھر قاضی کا نائب، پھر امام الحیّ (یعنی اس بستی یا محلے کے امام) کو، اس میں ایہام ہے اور یہ اس لیے کہ میت کے اولیاء کی تقدیم واجب ہے اور ''اِمام الحیّ'' (یعنی محلے کی مسجد کے امام) کی تقدیم مستحب ہے''، (جلد:3، صفحہ:112)۔ تقدیم سے مراد ہے: امامت کے لیے ترجیح دینا۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَهُوَ إِمَامُ الْمَسْجِدِ الْخَاصِّ بِالْمَحَلَّةِ، وَإِنَّمَا كَانَ أَوْلٰى، لِأَنَّ الْمَيِّتَ رَضِيَ بِالصَّلَاةِ خَلْفَهُ فِي حَالِ حَيَاتِهِ، فَيَنْبَغِي أَنْ يُّصَلِّيَ عَلَيْهِ بَعْدَ وَفَاتِهِ، قَالَ فِي ''شَرْحِ الْمُنْيَةِ'' فَعَلٰى هٰذَا لَوْ عَلِمَ أَنَّهُ كَانَ غَيْرَ رَاضٍ بِهِ حَالَ حَيَاتِهِ يَنْبَغِي أَنْ لَّا يُسْتَحَبَّ تَقْدِيمُهُ، قُلْتُ: هٰذَا مُسَلَّمٌ إِنْ كَانَ عَدَمُ رِضَاهُ بِهِ لِوَجْهٍ صَحِيحٍ، وَإِلَّا فَلَا، تَأَمَّلْ''۔

ترجمہ:''اِمَامُ الْحَیِّ'' سے مراد خاص طور پر اس محلے کی مسجد کا امام ہے اور اس کو امامت کیلئے''اَوْلیٰ'' قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ وفات یافتہ شخص اپنی زندگی میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی تھا، تو مناسب یہی ہے کہ وہی اس کی نماز جنازہ پڑھائے،''شَرْحُ الْمُنْیَۃ'' میں کہا: اس اصول کی بنا پر اگر یہ معلوم ہو کہ اپنی زندگی میں وہ اس سے راضی نہیں تھا، تو اس کو امامت کے لیے آگے کرنا مستحب نہیں رہے گا۔ میں (ابن عابدین شامی) کہتا ہوں کہ یہ بات اس صورت میں تسلیم کی جائے گی، جبکہ یہ معلوم ہو کہ اپنی زندگی میں فوت شدہ شخص کی امام محلہ سے ناراضی کا سبب کسی جائز شرعی وجہ کی بنا پر ہو، ورنہ نہیں (یعنی اگر اُس کی ناراضی کسی شرعی سبب کی بنا پر نہیں تھی تو پھر ہر صورت میں امام الحی ہی امامتِ جنازہ کا زیادہ حق دار ہے)، اس مسئلے کی حکمت پر غور کرو، (جلد:3، صفحہ:112 ، بیروت)''۔اس مسئلے کی ایک حکمت یہ ہے کہ مسجدوں میں نزاع پیدا ہوگا اور کسی ضرورتِ شرعی یا سبب شرعی کے بغیر مساجد میں خصومات (جھگڑے) پیدا کرنے سے حدیث پاک میں منع فرمایا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''ذَکَرَالْحَسَنُ عَنْ أَبِی حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی أَنَّ الْاِمَامَ الْاَعْظَمَ وَھُوَالْخَلِیْفَۃُ أَوْلٰی اِنْ حَضَرَ، فَاِنْ لَمْ یَحْضُرْ فَاِمَامُ الْمِصْرِ، فَاِنْ لَمْ یَحْضُرْ فَالْقَاضِی، فَاِنْ لَمْ یَحْضُرْ فَصَاحِبُ الشُّرَطِ، فَاِنْ لَّمْ یَحْضُرْ فَاِمَامُ الْحَیِّ، فَاِنْ لَمْ یَحْضُرْ فَالْاَقْرَبُ مِنْ ذَوِی قَرَابَتِہٖ وَبِھٰذِہٖ الرِّوَایَۃِ اَخَذَ کَثِیْرٌ مِنْ مَشَایِخِنَا رَحِمَھُمُ اللہُ ، کَذَا فِی ''الْکِفَایَۃِ'' وَ ''النِّھَایَۃِ'' وَ ''مِعرَاجِ الدِّرَایَۃِ'' وَ''الْعِنَایَۃِ''۔

ترجمہ:''حسن نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ امامت جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار خلیفہ ہے، اگر وہ موجود ہے۔ اگر وہ موجود نہ ہو تو امام شہر، اگر وہ بھی نہ ہو تو قاضی، اگر وہ بھی نہ ہو تو سالارِ لشکر اور اگر وہ بھی نہ ہو تو'' محلے کا امام'' اور اگر وہ بھی نہ ہو تو پھر قریب ترین ولی جنازہ پڑھانے کا حق دار ہے (اور اس کی عدم موجودگی کی صورت میں درجہ بدرجہ قریب ترین ولی پڑھائے گا)، ہمارے (احناف کے) اکثر مشائخ نے اسی روایت سے

نمازِ جنازہ کی امامت کے استحقاق کا یہ مسئلہ اَخذ کیا ہے، ''کفایہ''، ''نہایہ''، ''معراج الدرایہ'' اور ''عنایہ'' میں اسی طرح ہے، (جلد:1،ص:163)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے دریافت کیا گیا: ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میت خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اُس کے جنازے میں ولی داخل نہیں ہوا، تو اس کا جنازہ ہوا یا نہیں؟''۔

آپ نے جواب دیا: ''نماز ہوگئی، مگر جو نماز جنازہ بے اجازت ولی پڑھی جائے، ولی کو اختیار ہے کہ دوبارہ پڑھے، مگر جو پہلے پڑھ چکے ہیں وہ دوبارہ نہیں پڑھ سکتے۔ پھر یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی نماز کسی ایسے نے پڑھائی، جس پر ولی کو ترجیح تھی، ورنہ اگر مثلاً بادشاہِ اسلام یا قاضی شرع یا امامِ محلہ نے نماز پڑھادی، تو پھر ولی کو اعادہ کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ جنازہ پڑھانے میں امام محلہ کا حق ولی پر مُقدَّم ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، صفحہ: 182-183)''۔

صدرالشریعہ علامہ مفتی امجد علی اعظمی قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز مصنفِ ''بہارِ شریعت'' نمازِ جنازہ کی امامت کے استحقاق کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مگر جب کہ نمازِ جنازہ کے وقت امامِ جمعہ حاضر ہو، تو ولی یا امام الحی سے زیادہ حق اُسی امام جمعہ کا ہے۔ اور ایسے وقت کہ ولی سے اَفضل و اَحَقّ موجود ہے تو ولی کو یہ نہ چاہیے کہ دوسرے سے پڑھوائے یا خود پڑھادے، بلکہ وہی امامِ جمعہ پڑھائے۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''امامِ جمعہ کو ولی سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ضرورت جب ہوتی کہ یہ خود صاحبِ حق نہ ہوتا اور او پر معلوم ہو چکا ہے کہ امامِ جمعہ ولی پر مقدم ہے اور امامِ جمعہ پڑھادے گا تو ولی نماز کا اعادہ نہیں کرسکتا''۔

ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں امامِ موصوف سے ناراض تھا اور اس نے اپنی نماز جنازہ کسی اور شخص سے پڑھوانے کی وصیت کی، تو وصیت جاری ہوگی یا نہیں؟، اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں: ''امام سے ناراض ہونا اگر کسی ایسی خرابی کے باعث تھا، جو امام میں تھی، تو امام کو ولی پر ترجیح نہیں کیونکہ امام کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ جب اس شخص نے اپنی

زندگی میں اسے امام بنایا اور اُس پر راضی رہا تو بعد موت، نمازِ جنازہ کا حق دار بھی وہی امام ہوگا۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اور اگر امام سے ناراضی کسی شرعی سبب کے بغیر ہو، تو اس ناراضی کا کچھ اثر نہیں''۔ ردالمحتار میں ''غُنْیَۃ'' کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا:

''قُلْتُ ھٰذَا مُسَلَّمٌ اِنْ کَانَ عَدمُ رِضَاہُ بِہٖ لِوَجہٍ صَحِیحٍ، وَاِلَّا، فَلَا''۔

(ترجمہ: میں کہتا ہوں: یہ امر مُسلّم ہے کہ اگر امام محلہ سے فوت شدہ شخص کی ناراضی کسی جائز شرعی سبب کی بنا پر تھی تو درست ہے، ورنہ اس کی وصیت پر عمل نہیں کیا جائے گا)۔

نمازِ جنازہ کی وصیت باطل ہے، یعنی صاحبِ حق کے سوا دوسرے کو نماز پڑھانے کی وصیت کر گیا تو وہ وصیت شرعاً معتبر نہیں ہوگی۔

درمختار میں ہے: ''وَالْفَتْوٰی عَلٰی بُطْلَانِ الْوَصِیَّۃِ بِغُسْلِہٖ وَالصَّلٰوۃِ عَلَیْہِ''۔

ترجمہ: یعنی فتویٰ اسی پر ہے کہ میت کو غسل دینے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بارے میں اس کی وصیت باطل ہے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد:1، ص:309 مکتبۂ رضویہ، کراچی)۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''عَزَاہُ فِی ''الْھِنْدِیَّۃِ'' اِلَی ''الْمُضْمَرَاتِ'' أَیْ لَوْأَوْصٰی بِاَنْ یُّصَلِّیَ عَلَیْہِ غَیْرُمَنْ لَہٗ حَقُّ التَّقَدُّمِ أَوْبِاَنْ یَّغْسِلَہٗ فُلَانٌ لَایَلْزَمُ تَنْفِیْذُ وَصِیَّۃٍ وَلَایَبْطُلُ حَقُّ الْوَلِیِّ بِذٰلِکَ''۔

ترجمہ: ''اسے فتاویٰ ''ہندیہ'' میں ''مُضْمَرَات'' کی طرف منسوب کیا، یعنی اگر کسی شخص نے اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کی بابت کسی ایسے شخص کے امام بنانے کی وصیت کی، جسے شرعاً ''تَقَدُّمْ فِی الْاِمَامَتْ'' کا حق حاصل نہیں ہے یا یہ وصیت کی کہ اسے فلاں شخص غسل دے تو وصیت کا نافذ کرنا لازم نہیں ہے اور اس (وصیت) کی بناء پر اس سلسلے میں ولی کا حق باطل نہیں ہوگا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:115 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔ ظاہر ہے کہ جب وصیت کی بناء پر ولی کا حق باطل نہیں ہوگا تو پھر امامِ محلہ جسے ولی پر امامت جنازہ میں ترجیح کا شرعی حق حاصل ہے، اس کا حق بھی باطل نہیں ہوگا، بلکہ قائم و ثابت رہے گا اور اس ضمن میں وصیت غیر مؤثر ہو جائے گی۔ ہمارے فقہائے کرام کی یہ

رائے اس حکمت پر بھی مبنی ہے کہ امامتِ جنازہ کو مساجد میں اختلاف وفساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

نمازِ جنازہ کی یہ صورت درست ہے

سوال:

مسجد کے سامنے 6 تا 10 فٹ زمین خالی پڑی ہے، مسجد کا فرش باہر کی زمین سے ایک فٹ نیچے ہے۔ ایک چبوترہ ایک فٹ اونچا بنا ہوا ہے۔ ہم اس جگہ کو جنازہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ امام جنازہ کے ساتھ اوپر کھڑے ہو جائے اور امام کے ساتھ دو صفیں بن جائیں بقیہ نمازی چبوترے کے نیچے کھڑے ہو جائیں، اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟، (جامع مسجد قلندریہ، شادمان ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

جنازہ زمین پر رکھا ہو یا ہاتھ پر اٹھایا ہوا ہو یا اونچے چبوترے پر ہو یا چارپائی یا مسہری پر رکھا ہو، خواہ اس کی بلندی کم ہو یا زیادہ، نمازِ جنازہ ہر صورت میں جائز ہے۔ نمازِ جنازہ کی شرائط میں ہے کہ: جنازہ زمین پر رکھا ہو یا ہاتھوں پر ہو مگر قریب ہو۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَشَرْطُهَا أَيْضاً حُضُورُهُ (وَوَضْعُهُ)''۔

ترجمہ: ''نمازِ جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط میت کا موجود ہونا (اور زمین پر) رکھا ہوا ہونا ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

''أَيْ عَلَى الْأَرْضِ أَوْ عَلَى الْأَيْدِي قَرِيبًا مِنْهَا''۔

ترجمہ: ''یعنی جنازہ زمین پر رکھا ہوا ہو یا (اگر چھوٹے بچے کا جنازہ ہے تو) ہاتھوں پر بھی ہو سکتا ہے، مگر قریب ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 98)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال کیا گیا: زید کہتا ہے اگر جنازے کو

ایسی چار پائی پر رکھ کر نماز پڑھی کہ جس کے پائے ایک بالشت سے کم تھے تب تو نماز ہوگئی ورنہ نہیں، اور ثبوت میں شامی اور کبیری (کا حوالہ) پیش کر کے کہتا ہے کہ جنازہ مثلِ امام کے ہے، جس طرح امام کا ایک بالشت سے اوپر کھڑا ہونا مفسدِ صلوٰۃ ہے، اسی طرح جنازہ کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ اونچے ہوں تو جنازہ جائز نہیں ہے، کیا یہ قول درست ہے، لہٰذا اگر جنازے کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ بلند ہوں تو نمازِ جنازہ فاسد ہوجائے گی یا ایک بالشت ہونا اَولیٰ اور اس سے زائد مکروہ ہے یا مطلقاً خواہ جس قدر بھی پائے لمبے ہوں جائز ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا: ''زید کے سب اَقوال باطل و بے اصل ہیں، جنازے کی مسہری کے پایوں کی بلندی کی شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں کی گئی، نہ ایک بالشت بلندی میں کچھ اَولَوِیَّت (افضلیت)، نہ ایک بالشت یا ایک گز امام کی بلندی مُفسدِ نماز، نہ ہر بات میں جنازہ مثلِ امام، یہ ہَوَساتِ عاطِلہ واَوہامِ باطلہ (یعنی باطل وہم اور بے کار باتیں) ہیں، جنازہ کا زمین پر رکھا ہونا ضرور شرط ہے اگرچہ پائے کتنے ہی بلند ہوں اور امام کا اتنی مقدار میں مقتدیوں سے اونچا ہونا کہ سب سے ممتاز نظر آئے، صرف مکروہ ہے، مفسدِ نماز نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:190)''۔ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر ہونا چاہیے، لیکن جہاں آبادی تنگ ہو اور مسجد کے باہر جنازہ کے لیے کھلی جگہ دستیاب نہ ہو تو پھر سوال میں درج صورت کے مطابق نمازِ جنازہ پڑھائی جاسکتی ہے۔

نمازِ جنازہ کے وقت امام کہاں کھڑا ہو

سوال:

جنازہ امام کے بائیں طرف ہو اور میت کا سرہانہ امام کے سامنے آئے تو کیا نمازِ جنازہ ادا ہوجائے گی؟، (جامع مسجد قلندریہ، شادمان کراچی)۔

جواب:

مستحب یہ ہے کہ امام میت کے سینے کے سامنے کھڑا ہو اور میت سے دور نہ ہو، میت خواہ مرد ہو یا عورت، بالغ ہو یا نابالغ، یہ اُس وقت ہے کہ ایک ہی میت کی نماز پڑھانی ہو اور اگر

ایک سے زائد جنازے ہوں تو ایک کے سینہ کے مقابل اور قریب کھڑا ہونا کافی ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" یَقُومُ لِلرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ بِحِذَاءِ الصَّدْرِ وَهٰذَا أَحْسَنُ مَوَاقِفَ الْإِمَامِ مِنَ الْمَيِّتِ لِلصَّلَاةِ عَلَيْهِ وَإِنْ وَقَفَ فِي غَيْرِهٖ جَازَ"۔

ترجمہ: "میت خواہ مرد کی ہو یا عورت کی، نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے بہتر یہ ہے کہ امام اس کے سینے کے محاذات (سامنے) میں کھڑا ہو اور اگر وہ کسی دوسری جگہ (یعنی میت کے سینے سے دائیں یا بائیں جانب) بھی کھڑا ہوا تو جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:164)"۔

علامہ شیخ زین الدین بن ابراہیم بن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(قَوْلُهٗ: وَيَقُومُ مِنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ بِحِذَاءِ الصَّدْرِ)؛ لِأَنَّهٗ مَوْضِعُ الْقَلْبِ وَفِيْهِ نُورُ الْإِيمَانِ، فَيَكُونُ الْقِيَامُ عِنْدَهٗ إِشَارَةً إِلَى الشَّفَاعَةِ لِإِيمَانِهٖ وَهٰذَا ظَاهِرُ الرِّوَايَةِ، وَهُوَ بَيَانُ الِاسْتِحْبَابِ حَتّٰى لَوْ وَقَفَ فِي غَيْرِهٖ أَجْزَأَهٗ كَذَا فِي كَافِي الْحَاكِمِ، وَمَا فِي الصَّحِيحَيْنِ أَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ صَلّٰى عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نِفَاسِهَا، فَقَامَ وَسَطَهَا لَا يُنَافِي كَوْنَهُ الصَّدْرَ بَلِ الصَّدْرُ وَسَطٌ بِاعْتِبَارِ تَوَسُّطِ الْأَعْضَاءِ إِذْ فَوْقَهٗ يَدَاهُ وَرَأْسُهٗ وَتَحْتَهٗ بَطْنُهٗ وَفَخِذَاهُ۔

ترجمہ: "مرد وعورت کے جنازے میں امام میت کے سینے کے سامنے کھڑا ہوگا)"، مصنف کنز الدقائق علامہ احمد بن محمود نسفی کے اس قول کی حکمت یہ ہے کہ سینے میں دل ہوتا ہے اور دل میں ایمان کا نور ہوتا ہے، پس اس کے سامنے قیام اُس کے ایمان کی شفاعت کے بارے میں اشارہ ہے اور یہی "ظاہر الروایہ" ہے اور یہ بیانِ استحباب کے لیے ہے یہاں تک کہ اگر جسم کے کسی دوسرے جز کے سامنے بھی کھڑا ہوا تب بھی صحیح ہے، جیسا کہ "کافی الحاکم" میں ہے اور صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک عورت کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی، جو نفاس کی حالت میں فوت ہوگئی تھی، آپ اس (میت کے بدن) کے وسط میں کھڑے ہوئے، یہ سینے کے سامنے کھڑے ہونے

کے قول کے منافی نہیں ہے، کیونکہ سینہ تمام اعضاء کے اعتبار سے وسط ہے، کیونکہ اوپر کی جانب اس کے ہاتھ ہیں اور سر ہے اور نیچے کی جانب اس کا پیٹ اور رانیں ہیں، (البحرالرائق، جلد2، ص:327)''۔

ٹیلیویژن پر بعض جنازوں کے مناظر آئے کہ کئی جنازے ایک لائن میں رکھے ہوئے تھے اور امام صاحب کے بالکل سامنے صرف ایک جنازہ رکھا ہوا تھا، یعنی دوسرے جنازے امام کے سامنے نہیں تھے، اگرچہ تمام اَموات کی نیت کرنے سے سب کی نمازِ جنازہ ادا ہو جاتی ہے، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ تمام جنازے آگے پیچھے امام کے سامنے ایک ہی ترتیب سے رکھے ہوئے ہوں اور امام براہِ راست ایک جنازے کے سامنے ہو اور متعدد جنازوں کو آگے پیچھے رکھنے کی صورت میں ترتیب میں افضلیت کو ملحوظ رکھا جائے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''ثُمَّ هٰذَا ظَاهِرٌ إِذَا كَانَ الْمَيِّتُ وَاحِدًا، وَإِلَّا فَيُحَاذِي وَاحِدًا مِنْهُمْ بِدَلِيلِ مَا سَيَأْتِي مِنَ التَّخْيِيرِ فِي وَضْعِهِمْ صَفًّا طُولًا أَوْ عَرْضًا۔۔۔إِنَّ هَذَا ظَاهِرٌ فِي الْإِمَامِ لِأَنَّ صَفَّ الْمُؤْتَمِّينَ قَدْ يَخْرُجُ عَنِ الْمُحَاذَاةِ''۔

ترجمہ: ''جنازے کے وقت میت کے سامنے ہونے کی شرط اس صورت میں ہے کہ میت ایک ہو اور اگر میتیں زیادہ ہوں تو ایک میت کا امام کے سامنے ہونا ضروری ہے، کیونکہ آگے دلیل آرہی ہے کہ ایک سے زیادہ میتوں کو لمبائی یا چوڑائی دونوں صورتوں میں ایک لائن میں رکھنے کا اختیار ہے''۔۔۔۔۔اور آگے چل کر لکھتے ہیں: ''میت کے امام کے سامنے ہونے کی شرط امام کے لیے ہے، کیونکہ مقتدیوں کی صفیں لمبی ہو جاتی ہیں اور ان کے لیے محاذات (یعنی میت کا سامنے ہونا) عملاً ممکن نہیں ہے، (جلد3، ص:99، بیروت)''۔

مجنون کی دعائے جنازہ

سوال: ہمارے علاقے میں ایک بیس سال کا نوجوان جو ذہنی معذور تھا، فوت ہوگیا، اس کا

جنازہ پڑھاتے وقت امام صاحب نے کہا کہ اس کا جنازہ بچوں والا پڑھا جائے گا، اس سلسلے میں شرعی حکم کیا ہے، (فرحان انجم خان)۔

جواب:

نمازِ جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء، دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھا جاتا ہے اور تیسری تکبیر کے بعد بالغ میت کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی ہے، اگر میت نابالغ یا مجنون کی ہوتو دونوں صورتوں میں نابالغ والی دعا پڑھی جائے گی، جو یہ ہے:

''اَللّٰھُمَّ اجْعَلہُ لَنَا فَرَطاً وَّاجْعَلْہُ لَنَا ذُخْراً وَّاجْعَلْہُ لَنَا شَافِعاً وَّ مُشَفَّعاً''۔

لڑکی کی میت ہوتو خط کشیدہ الفاظ کو ''اِجْعَلْھَا'' اور ''شَافِعَۃً وَّ مُشَفَّعَۃً'' پڑھا جائے گا۔

مجنون سے مراد وہ شخص ہے جو بچپن سے ہی عقل وشعور سے محروم ہو، ورنہ اگر بالغ ہونے پر اس کی عقل سلامت تھی، بعد کو اسے جنون لاحق ہوا، تو اس کی نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد بالغ والی دعا پڑھی جائے گی، جو دعائے مغفرت ہے۔

علامہ حسن بن عمار لکھتے ہیں:

''وَلَایُسْتَغْفَرُ لِمَجْنُوْنٍ وَصَبِیٍّ''۔

ترجمہ: ''مجنون اور نابالغ بچے کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی جائے گی، (مراقی الفلاح، ج:2، ص:229)''۔ اس کی شرح میں علامہ شیخ احمد طحطاوی لکھتے ہیں:

''قَالَ الْبُرْھَانُ الحَلَبِی یَنْبَغِی أَنْ یُّقَیَّدَ بِالْأَصْلِیِّ لِأَنَّہٗ لَمْ یُکَلَّفُ، بِخلَافِ الْعَارِضِ فَاِنَّہٗ قَدْ کُلِّفَ، وَعُروضُ الْمَجْنُوْنِ لَایَمْحُوْمَا قَبلَہٗ''۔

ترجمہ: ''علامہ برہان حلبی نے کہا: مناسب یہ ہے کہ مجنون کے ساتھ اصلی کی قید لگائی جائے کہ وہ (شروع ہی سے) مکلف نہیں رہا، اس کے برعکس اگر کسی کو بلوغت کے بعد جنون لاحق ہوا، تو وہ مُکلَّف رہ چکا ہے اور بالغ ہونے کے بعد جنون لاحق ہونے سے ماقبل کے گناہ ختم نہیں ہوجاتے (یعنی آخرت میں ان کا حساب کتاب ہوگا)، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 2، ص:229)''۔

پس بالغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ جس شخص کی عقل سلامت رہی اور بعد میں کسی وقت اس کو جنون لاحق ہوگیا، جو موت تک جاری رہا، تب بھی اس کی نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد بالغ والی دعا پڑھی جائے گی۔

روزے کے مسائل

نفلی روزے توڑنے پر کفارہ نہیں، قضا ہے

سوال:

ایک شخص نے نفلی روزہ رکھا اور پھر قصداً اُسے توڑ دیا، اس کا کفارہ یا شرعی حکم کیا ہے؟،

(محمد احمد، لودھراں)۔

جواب:

نفلی نماز، نفلی روزہ اور دیگر نفلی عبادات کو جب شروع کرلیا جائے تو اُن کی تکمیل واجب ہوجاتی ہے اور بلاعذر اُنہیں توڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسی عبادات ہیں جو بندہ رضا کارانہ طور پر خود اپنے اوپر لازم کرتا ہے، لہٰذا اگر انہیں توڑ دیا جائے تو ان کی قضا لازم ہوگی، خواہ کسی عذر کے بغیر توڑا جائے یا عذر کی بنا پر۔

علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

''وَرُوِیَ وُجُوْبُ الْقَضَاءِ عَنْ أَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ وَعَلِیٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرِ بْنِ عبد الله وَعَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمْ، وَهُوَ قَوْلُ الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ وَسَعِیْد بن جُبَیْرٍ فِیْ قَوْلٍ، وَأَبِیْ حَنِیْفَةَ وَمَالِكٍ وَأَبِیْ یُوْسُفَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمُ اللهُ وَمَذْهَب مُجَاهِد وَطَاوُوْس وَعَطَاء وَالثَّوْرِی وَالشَّافِعِیّ وَأحمد وَإِسْحَاق أَنَّ الْمُتَطَوع بِالصَّوْمِ إِذا أفطر بِعُذْرٍ أَو بِغَیْرِ عُذْرٍ لَا قَضَاءَ عَلَیْهِ، إِلَّا أَنَّهٗ یُحِبُّ هُوَ أَنْ یَّقْضِیَهٗ''۔

ترجمہ: '' حضراتِ ابوبکر، عمر، علی، ابن عباس، جابر بن عبداللہ، عائشہ اور اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ نفلی روزہ (خواہ عذر کی بنا پر توڑا ہو یا عذر کے بغیر) کی قضا واجب ہے۔ حضراتِ حسن بصری، ایک قول کی رُو سے سعید بن جبیر، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام ابویوسف اور محمد رحمہ اللہ علیہم کا یہی قول ہے اور حضراتِ مجاہد، طاوس، عطاء، ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق کے نزدیک نفلی روزہ عذر کی بنا پر یا بغیر عذر کے توڑ دیا جائے، تو اس پر کوئی قضا نہیں ہے، مگر مستحسن بات یہ ہے کہ قضا کرلے، (عمدۃ القاری، ج:11، ص:

112، دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

علامہ علاء الدین کاسانی متوفّٰی 587ھ، لکھتے ہیں:

''وَاَمَّاصَوْمُ التَّطَوُّعِ فَعَلَيْهِ قَضَاؤُهُ عِنْدَنَا، خَلَافًا لِلشَّافِعِيِّ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، قَالَتْ: كُنْتُ أَنَا وَحَفْصَةُ صَائِمَتَيْنِ، فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اشْتَهَيْنَاهُ فَأَكَلْنَا مِنْهُ فَجَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَبَدَرَتْنِي إِلَيْهِ حَفْصَةُ وَكَانَتِ ابْنَةُ أَبِيهَا، فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللهِ: إِنَّا كُنَّا صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اشْتَهَيْنَاهُ فَأَكَلْنَا مِنْهُ قَالَ: اِقْضِيَا يَوْمًا آخَرَ مَكَانَهُ''۔

ترجمہ: ''رہا نفلی روزہ، تو ہمارے نزدیک اس کی قضا لازم ہے، اس میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں اور حفصہ نفلی روزے سے تھیں، ہمارے سامنے کھانا پیش کیا گیا، جس کی ہمارے دل میں رغبت پیدا ہوئی، تو ہم نے اس سے کھالیا، پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور حضرت حفصہ (اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے) جلدی سے رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھیں اور وہ اپنے باپ کے مزاج کی حامل تھیں، تو انہوں عرض کیا: یارسول اللہ! ہم دونوں روزے سے تھیں، تو ہمارے سامنے کھانا پیش کیا گیا، ہمارے دل میں اس کی چاہت پیدا ہوئی، تو ہم نے اس سے کھالیا (اب کیا حکم ہے؟)، آپ ﷺ نے فرمایا: تم دونوں اس کی جگہ کسی دوسرے دن روزہ رکھنا، (سنن ترمذی: 735، سنن ابوداؤد: 2457)، (بدائع الصنائع، ج:2، ص:153)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفلی عبادت (نماز ہو یا روزہ) شروع کرنے کے بعد عذر کی بنا پر یا عذر کے بغیر توڑ دی ہو، تو اس کی قضا لازم ہے، کیونکہ یہ عبادت انسان نے خود رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر لازم کی ہے، یہی حکم نذر کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ''، ترجمہ: ''اپنے اعمال کو باطل نہ کرو، (محمد: 33)''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کو باطل کرنے سے منع فرمایا ہے، خواہ تکمیل تک

پہنچنے سے باطل کیا جائے یا تکمیل کے بعد کوئی ایسا عمل کیا جائے ،جس کی وجہ سے اُس کا اجر ضائع ہوجائے اور چونکہ نفلی روزہ بھی ایک عمل ہے،لہٰذا نفلی روزہ شروع کرنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ اسے باطل نہ کرے، بلکہ اُسے تکمیل تک پہنچائے اور فاسد کرنے کی صورت میں اُس کے ذمے قضا واجب ہوگی، کیونکہ اُس نے ایسی عبادت کو فاسد کیا ہے، جس کی ادائی شروع کرنے سے اُس کے ذمے لازم ہوگئی تھی ۔اس کی تائید مندرجہ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں :''دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ، فَقُلْتُ: خَبَأْنَا لَكَ حَيْسًا، فَقَالَ: إِنِّي كُنْتُ أُرِيدُ الصَّوْمَ وَلَكِنْ قَرِّبِيهِ وَأَقْضِي يَوْمًا مَكَانَهُ''۔

ترجمہ:''نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے ،میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ! آج ہم نے آپ کے لیے حَیس (ایک خاص قسم کا حلوا) بنایا ہے،آپ ﷺ نے فرمایا: میرا روزہ رکھنے کا ارادہ کیا تھا،لیکن تم حلوا لے آؤ، میں اس کے بدلے کسی اور دن قضا رکھ لوں گا،(سنن بیہقی:4341،شرح معانی الآثار:3489)''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

''وَلَا تَجِبُ الْكَفَّارَةُ بِالْفِطْرِ فِي غَيْرِ رَمَضَانَ فِي قَوْلِ أَهْلِ الْعِلْمِ وَجُمْهُورِ الْفُقَهَاءِ''۔

ترجمہ:''اہلِ علم اور جمہور فقہا کے نزدیک رمضان کے علاوہ روزے توڑنے کی صورت میں (خواہ قضائے رمضان کا روزہ ہو، منّت کا روزہ ہو یا نفلی روزہ ہو)،اس پر کفارہ لازم نہیں آتا (صرف قضا کرنی ہوگی)،(المغنی: ج:4،ص:378)''۔

رمضان کا روزہ عذر کے بغیر چھوڑ دینا

سوال:

یہ توہمیں معلوم ہے کہ اگر کسی نے رمضان کا روزہ رکھ لیا اور پھر عذرِ شرعی کے بغیر اُسے توڑ دیا،تو اُس پر کفارہ لازم ہے،لیکن اگر کسی نے بدقسمتی سے رمضان کا روزہ سرے سے رکھا ہی نہیں، بلکہ اُسے چھوڑ دیا ہے،تو از روئے شرع اس پر کفارہ لازم آئے گا یا صرف ایک

دن کا قضا روزہ رکھنا ہوگا، (صاحبزادہ معصوم زبیر، اوسلو، ناروے)۔

جواب:

اگر کسی نے بدقسمتی سے رمضان کا روزہ سرے سے رکھا ہی نہ ہو اور کسی شرعی عذر کے بغیر چھوڑ دیا ہو، تو اس پر کفارہ نہیں ہے، بلکہ صرف ایک دن کی قضا ہے، اگرچہ وہ قضا روزہ رکھ کر رمضانِ مبارک کے روزے کے اجرِ کامل سے محروم رہ جاتا ہے، لیکن فرض ساقط ہوجاتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَفْطَرَ يَوْمًا مِنْ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ رُخْصَةٍ وَلَا مَرَضٍ، لَمْ يَقْضِ عَنْهُ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهِ وَإِنْ صَامَهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے شرعی رخصت (عذر) یا بیماری کے بغیر رمضان کا روزہ چھوڑا ہو، تو اگرچہ وہ سارا زمانہ روزہ رکھتا رہے، رمضانِ مبارک کے اس (چھوڑے ہوئے) روزے کے کامل اجر کو نہیں پاسکتا، (سنن ترمذی: 723)''، اس کی شرح میں علامہ علی القاری الحنفی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''جس نے رمضان کا ایک روزہ، شرعی عذر یا ایسی بیماری جس کے سبب روزہ توڑنے کا جواز پیدا ہوتا ہے، چھوڑا تو پوری عمر کا روزہ رمضان کے روزے کے فوت شدہ ثواب کی تلافی نہیں کرے گا، علامہ طیبی نے کہا: ''اگر وہ پوری زندگی بھی نفلی روزے رکھ لے، رمضان کے روزے کی فضیلت کو نہیں پاسکتا، اگرچہ اس سے رمضان کے (بلاعذر و مرض) چھوڑے ہوئے روزے کی ایک دن کی قضا رکھنے سے فرض ساقط ہوجائے گا''، علامہ طیبی نے مزید کہا: ''نبی کریم ﷺ نے پوری زندگی کے نفلی روزوں کے ذریعے رمضان کے بلاعذر چھوڑے ہوئے ایک روزے کی تلافی نہ ہوسکنے کی بات مبالغہ کے طور پر فرمائی اور شدت کا اظہار فرمایا ہے (تاکہ لوگ بلاعذر رمضان کا روزہ چھوڑنے کی جسارت نہ کریں)''۔ علامہ علی القاری حنفی نے آگے چل کر فرمایا: ابن الملک نے کہا: ''اس پر فقہاء کا اجماع ہے کہ (رمضان کے بلاعذر و مرض چھوڑے ہوئے ایک روزے کی) صرف ایک دن کی قضا ہے'،

(مرقاۃ المفاتیح، ج:4،ص:444)"۔

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی متوفّٰی 587ھ، لکھتے ہیں:

"رہا کفارے کا وجوب، تو وہ روزے کے مخصوص توڑنے پر ہے (یعنی چھوڑنے پر نہیں ہے) اور اس سے مراد (کسی عذرِ شرعی یا مرضِ شدید کے بغیر روزہ رکھ کر) قصداً کھانے، پینے اور صورتاً یا معناً جماع کرنے سے لازم آتا ہے، (بدائع الصنائع، ج:2،ص:127)"۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں:

"وَأَجْمَعَتِ الْأُمَّةُ وَنَقَلَتِ الْكَافَّةُ فِيمَنْ لَمْ يَصُمْ رَمَضَانَ عَامِدًا وَهُوَ مُؤْمِنٌ بِفَرْضِهِ وَإِنَّمَا تَرَكَهُ أَشَرًا وَبَطَرًا تَعَمَّدَ ذٰلِكَ ثُمَّ تَابَ عَنْهُ أَنَّ عَلَيْهِ قَضَاءَهُ فَكَذٰلِكَ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ عَامِدًا"۔

ترجمہ: "اور امت کا اس پر اجماع ہے اور بہت سے علماء سے منقول ہے: جس نے روزے کی فرضیت پر ایمان رکھتے ہوئے جان بوجھ کر رمضان کا روزہ نہ رکھا اور اُسے قصداً سرکشی کے طور پر چھوڑ دیا (یہاں توڑنے اور چھوڑنے کے فرق کو سمجھا جائے)، پھر اُس (سرکشی اور قصور) سے توبہ کی، تو اُس پر (صرف) اس کی قضا ہے، اسی طرح جس نے قصداً نماز چھوڑی، اس پر صرف (اس نماز کی) قضا ہے، (الاستذکار، ج:1،ص:77، دارالکتب العلمیہ، بیروت)"۔

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"(بلاعذر یا عذر کی بنا پر چھوڑے ہوئے) ایک روزے کی قضا ایک ہی ہے، ساٹھ روزوں کا حکم کفارہ میں ہے کہ کسی نے بلاعذرِ شرعی رمضانِ مبارک کا ادا روزہ، جس کی نیت رات سے کی تھی، بالقصد کسی غذا یا دوا یا نفع رساں شے سے توڑ ڈالا اور شام تک کوئی ایسا عارضہ لاحق نہ ہوا جس کے باعث شرعاً آج روزہ رکھنا ضرور نہ ہوتا، تو اُس جرم کے جرمانے میں ساٹھ روزے پے در پے رکھنے ہوتے ہیں، ویسے (بلاعذر یا عذر کی بنا پر) جو روزہ نہ رکھا ہو، اس

کی قضا صرف ایک روزہ ہے"، (فتاویٰ رضویہ، ج:10، ص:519، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔ اگرچہ بلاعذر روزہ چھوڑنا رمضان کے ثواب سے محروم ہونے کا باعث ہے، لیکن قضا رکھنے سے فرض ساقط ہو جائے گا۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جس جگہ روزہ توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے، اس میں شرط یہ ہے کہ رات ہی (سحری) سے روزۂ رمضان کی نیت کی ہو، اگر دن میں نیت کی اور توڑ دیا تو کفارہ لازم نہیں (یعنی صرف قضا لازم ہے)، بحوالہ: الجوهرةُ النيّرة، کتاب الصوم، ج:1، ص:181۔180، (بہارِ شریعت، حصہ پنجم، ص:991)"۔

علامہ احمد بن محمد صاحب مختصر القدوری لکھتے ہیں:

"(قَوْلُهٗ وَلَيْسَ فِيْ اِفْسَادِ صَوْمِ غَيْرِ شَهْرِ رَمَضَانَ كَفَّارَةٌ)"۔

ترجمہ: "ماہِ رمضان کے علاوہ (اور دنوں میں) روزہ توڑنے میں کفارہ نہیں ہے (خواہ وہ قضائے رمضان ہی کا روزہ ہو)، اس کی شرح میں علامہ ابوبکر بن علی یمنی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"لِاَنَّهٗ فِيْ رَمَضَانَ اَبْلَغُ فِي الْجِنَايَةِ، لِاَنَّهٗ جِنَايَةٌ عَلَى الصَّوْمِ وَالشَّهْرِ وَفِيْ غَيْرِهٖ جِنَايَةٌ عَلَى الصَّوْمِ لَا غَيْرَ"۔

ترجمہ: "کیونکہ رمضان میں (روزہ توڑنے) کا جرم بڑا ہے، کیونکہ اس میں فرض روزے اور ماہِ رمضان (کی بے حرمتی) کا جرم ہے، جبکہ غیرِ رمضان میں صرف روزہ توڑنے (خواہ قضائے رمضان کا روزہ ہو یا نذر کا یا نفلی) کا جرم ہے، (الجوہرۃ النیّرۃ، ج:1، ص:173)"۔

صومِ یومِ عَرَفَہ کی فضیلت اور حاجی کے لیے عَرَفَہ کے روزے کا حکم

سوال:

یومِ عرفہ کے حوالے سے حدیث پاک میں ہے: "جس شخص نے یومِ عرفہ کا روزہ رکھا، اس کے گزشتہ ایک سال اور آئندہ ایک سال کے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے"۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ یومِ عرفہ اس دن کو کہیں گے، جب حجاج عرفہ کے میدان میں جمع ہوتے

ہیں، کیا پاکستان کے مسلمان بھی اس دن روزہ رکھیں گے، جس دن حج ادا کیا جاتا ہے یعنی وقوفِ عرفہ ہوتا ہے یا پاکستان کی رویت کے مطابق جس دن نو ذوالحجہ ہوتی ہے، اس دن روزہ رکھنا ہے۔ نیز پاکستان کے مسلمان جس دن روزہ رکھیں گے، وہ یومِ عرفہ ہوگا یا نو ذوالحجہ۔ اور اگر وقوفِ عرفہ اور پاکستان میں نو ذوالحجہ میں ایک دن کا فرق ہو، تو کیا یہاں روزہ رکھنے والے کو پورا اجر ملے گا؟، (حماد، اسلام آباد)۔

جواب:

ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو عَرَفَہ کہتے ہیں اور جس جگہ حجاج کرام وقوف کرتے ہیں اُس جگہ کا نام بھی عَرَفَہ ہے اور اُسے عرفات بھی کہتے ہیں۔ اسے عَرَفَہ کہنے کی وجہ تسمیہ بعض اہلِ علم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ زمین پر اُترنے کے بعد حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی ملاقات اس مقام پر ہوئی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب حضرت جبریل امین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کا طریقہ سکھایا اور میدانِ عرفات میں اُن سے پوچھا: ''قَدْ عَرَفْتَ (آپ نے جان لیا)''، تو انہوں نے جواب دیا: ''قَدْ عَرَفْتُ (میں نے جان لیا)''، پس اسی وجہ سے اس میدان کا نام عَرَفہ پڑ گیا، کیونکہ یہاں معرفت ہوئی تھی۔

راجح بات یہ ہے کہ اس مقام کو عَرَفَہ اس لیے کہتے ہیں کہ زمین کا یہ حصہ اپنے گرد وپیش کے مقابلے میں بلندی پر واقع ہے اور اہلِ عرب کے ہاں بلندی پر واقع زمین کے حصے کو ''عرفاء'' کہتے ہیں۔ اسی سے قرآن مجید میں ''الاعراف'' آیا ہے جو کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک بلند مقام کا نام ہے۔

عشرۂ ذوالحجہ کے روزے مستحب ہیں، خصوصاً نو ذوالحجہ یعنی عرفہ کے روزے کی بہت فضیلت ہے:

(۱) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''ثَلَاثٌ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ، فَهٰذَا صِيَامُ الدَّهْرِ كُلِّهِ، صِيَامُ يَوْمِ

عَرَفَةَ، أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ، وَالسَّنَةَ الَّتِي بَعْدَهُ، وَصِيَامُ يَوْمِ عَاشُورَاءَ، أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ"۔

ترجمہ: ''ہر ماہ تین دن کے روزے رکھنا، ایک رمضان کے بعد دوسرے رمضان کے روزے رکھنا، یہ تمام عمر کے روزے (رکھنے کے مترادف) ہے اور یومِ عرفہ کا روزہ رکھنے سے مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف فرما دے گا اور مجھے اُمید ہے کہ یومِ عاشور کا روزہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ ایک سال پہلے کے گناہ معاف فرمادے گا، (صحیح مسلم:1162)''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ''أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ'' کے کلمات استعمال فرمائے ہیں، اس کے بارے میں علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: ''اعمال صالحہ میں احتساب کا معنی ہے: اخلاص وللّٰہیت اور حصولِ ثواب کے پیشِ نظر کیے گئے اعمالِ صالحہ پر اجر وثواب کا طلب گار ہونا''۔

علامہ طیبی ودیگر شارحین فرماتے ہیں: ''اصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی اُمید رکھتے ہوئے کہا جائے: ''أَرْجُو مِنَ اللهِ'' (یعنی مجھے اللہ سے اُمید ہے)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُمید وابستہ کرنا ذاتِ باری تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، جبکہ اس حدیث میں اس کے بجائے ''أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ'' کہا گیا ہے، جس سے وجوب اور لزوم کا معنی ظاہر ہوتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمے کوئی شے واجب نہیں، سوا اس کے کہ وہ خود کوئی چیز اپنے ذمۂ کرم پر لے لے، لہٰذا اس کی مناسبت تشریح یہ ہے کہ یہ اجر وثواب کے حصول میں مبالغہ کے لیے کہا گیا ہے۔

اہلِ سنت کے نزدیک یومِ عَرَفَہ کے روزے اور اس کے علاوہ فضیلتوں والے دیگر اعمال کی برکت سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اگر کسی خوش نصیب مومن کے صغیرہ گناہ نہ ہوں تو اس کے کبیرہ گناہوں میں تخفیف ہو جاتی ہے اور اگر کبیرہ گناہ بھی نہ ہوں تو اس کے درجات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے گناہوں کا معاف ہونا تو سمجھ میں آتا

ہے، لیکن اگلے سال کے گناہ تو ابھی سرزد ہوئے ہی نہیں، تو ان کی معافی کا کیا مطلب ہے، کیونکہ معافی کا موقع گناہ کے ارتکاب کے بعد آتا ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے: اگلے سال کے گناہوں کے معاف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے اگلے سال گناہوں سے محفوظ فرماتا ہے، اس سے ہر حاجی اندازہ لگا سکتا ہے کہ آیا اس کا حج عنداللہ مقبول ہوا یا نہیں، یعنی حج کی قبولیت کا اثر آئندہ زندگی میں گناہوں سے اجتناب کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے، نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے نبی! آپ کی طرف جو کتاب وحی کی گئی ہے، اس کی تلاوت کیجیے اور نماز قائم کیجیے، بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، (العنکبوت:43)''۔ اس کی تفسیر میں علامہ طبرسی نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''جو شخص یہ جاننا چاہے کہ آیا اس کی نماز بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی ہے یا نہیں، تو وہ اپنا جائزہ لے کہ کیا اس کی نماز نے اسے بے حیائی اور برائی سے روکا ہے، سو جس قدر اس کی نماز نے اسے برائی سے روکا ہے، اسی قدر وہ نماز قبول ہوئی ہے، (مجمع البیان، ج:7، ص:447)''۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے اس قدر اجر و ثواب عطا فرماتا ہے جو گزشتہ سال اور آنے والے سال کے گناہوں کے کفارے کے لیے کفایت کرتا ہے۔

(۲) اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

''أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَعْدِلُہُ بِصِیَامِ أَلْفِ یَوْمٍ''۔

ترجمہ: ''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عرفہ کے روزہ کو ہزار دنوں کے روزوں کے برابر شمار فرماتے تھے، (اَلْمُعْجَمُ الْاَوْسَط:6802)''۔

(۳) سعید بن جُبیر بیان کرتے ہیں:

''سَأَلَ رَجُلٌ ابْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَرَفَۃَ قَالَ کُنَّا وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعْدِلُہُ بِصَوْمِ سَنَۃٍ''۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عرفہ کے روزے کے متعلق

پوچھا (کہ اس دن روزے رکھنا کیسا ہے)، اُنہوں نے فرمایا: جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ہم اس دن کے روزے کے ایک سال کے روزوں کے برابر سمجھتے تھے، (شرح معانی الآثار:3269، السُّنَنُ الکبریٰ لِلنَّسائی:2841)''۔

یومِ عرفہ کی فضیلت کی بابت حدیث پاک میں ہے: اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتِقَ اللهُ فِيهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ، مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ، وَإِنَّهُ لَيَدْنُو، ثُمَّ يُبَاهِي بِهِمِ الْمَلَائِكَةَ، فَيَقُولُ مَا أَرَادَ هٰؤُلَاءِ؟''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ یومِ عرفہ سے زیادہ کسی دن بندوں کو دوزخ سے آزاد نہیں کرتا۔ اللہ (اپنے بندوں سے) قریب ہوتا ہے اور فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے: یہ بندے کس ارادے سے آئے ہیں، (صحیح مسلم:1348)''۔

عرفہ کے دن روزہ رکھنا تمام مسلمانوں کے لیے فضیلت اور اجر وثواب حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور کوئی چاہے تو نو ذوالحجہ کے ساتھ سات اور آٹھ ذوالحجہ کے روزے بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن حج کرنے والے پر جو میدان عرفات میں موجود ہو گر اُسے روزہ رکھنے کی صورت میں کمزوری اور نقاہت کا اندیشہ ہو تو اُس کے لیے عرفہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے دن عرفہ میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا، (سُنن ابوداؤد:2437)''۔

(۲) ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْطَرَ بِعَرَفَةَ، وَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِ أُمُّ الْفَضْلِ بِلَبَنٍ فَشَرِبَ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھا، حضرت ام الفضل نے آپ کی خدمت میں دودھ بھیجا تو آپ نے نوش فرمایا اور اس

باب میں حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ام الفضل سے روایات ہیں، (سنن ترمذی:750)''۔

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں:

''حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، وَقَدْ رُوِيَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: حَجَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَصُمْهُ، يَعْنِي يَوْمَ عَرَفَةَ، وَمَعَ أَبِي بَكْرٍ فَلَمْ يَصُمْهُ، وَمَعَ عُمَرَ فَلَمْ يَصُمْهُ، وَمَعَ عُثْمَانَ فَلَمْ يَصُمْهُ، وَالعَمَلُ عَلَى هٰذَا عِنْدَ أَكْثَرِ أَهْلِ العِلْمِ يَسْتَحِبُّونَ الإِفْطَارَ بِعَرَفَةَ لِيَتَقَوّٰى بِهِ الرَّجُلُ عَلَى الدُّعَاءِ، وَقَدْ صَامَ بَعْضُ أَهْلِ العِلْمِ يَوْمَ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس کی حدیث حسن صحیح ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حج کیا تو آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہیں رکھا، پھر میں نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ حج کیا، تو انہوں نے بھی روزہ نہیں رکھا اور اکثر اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے کہ وہ عرفہ کے دن روزہ نہ رکھنے کو پسند کرتے ہیں تاکہ انسان کو دعا کے لیے قوت حاصل رہے اور بعض اہلِ علم نے عرفہ کے دن عرفہ کے مقام پر روزہ رکھا بھی ہے''۔

بعض اہلِ علم نے عرفہ کے دن حاجی کے لیے روزے کی کراہت کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ اُن کے لیے عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یوم عرفہ، یوم النحر اور ایامِ تشریق ہم اہلِ اسلام کی عید اور کھانے پینے کے دن ہیں، (سنن نسائی:3004، سنن ترمذی:773، سنن ابوداؤد:2419)''۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''وَعَنِ بْنِ الزُّبَيْرِ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ وَعَائِشَةَ أَنَّهُمْ كَانُوا يَصُومُونَهُ أَيْ يَصُومُونَ يَوْمَ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ وَكَانَ ذٰلِكَ يُعْجِبُ الْحَسَنَ وَيَحْكِيهِ عَنْ عُثْمَانَ، وَعَنْ قَتَادَةَ مَذْهَبٌ

آخَرُ، قَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ إِذَا لَمْ يُضْعِفْ عَنِ الدُّعَاءِ، وَنَقَلَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الْمَعْرِفَةِ عَنِ الشَّافِعِيِّ فِي الْقَدِيمِ وَاخْتَارَهُ الْخَطَّابِيُّ وَالْمُتَوَلِّي مِنَ الشَّافِعِيَّةِ وَقَالَ الْجُمْهُورُ: يُسْتَحَبُّ فِطْرُهُ حَتَّى قَالَ عَطَاءٌ: مَنْ أَفْطَرَهُ لِيَتَقَوَّى بِهِ عَلَى الذِّكْرِ كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ الصَّائِمِ۔ وَقَالَ الطَّبَرِيُّ: إِنَّمَا أَفْطَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَفَةَ لِيَدُلَّ عَلَى الاِخْتِيَارِ لِلْحَاجِّ بِمَكَّةَ لِكَيْ لَا يَضْعُفَ عَنِ الدُّعَاءِ وَالذِّكْرِ الْمَطْلُوبِ يَوْمَ عَرَفَةَ، وَقِيلَ: إِنَّمَا كُرِهَ صَوْمُ يَوْمِ عَرَفَةَ لِأَنَّهُ يَوْمُ عِيدٍ لِأَهْلِ الْمَوْقِفِ لِاجْتِمَاعِهِمْ فِيهِ وَيُؤَيِّدُهُ مَا رَوَاهُ أَصْحَابُ السُّنَنِ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ مَرْفُوعًا يَوْمُ عَرَفَةَ وَيَوْمُ النَّحْرِ وَأَيَّامُ مِنًى عِيدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ انْتَهٰى۔

ترجمہ: ''اور عبداللہ بن زبیر، اسامہ بن زید اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہے کہ وہ عرفہ کے دن مقامِ عرفہ میں بھی روزہ رکھتے تھے اور حضرت حسن بصری اس کو پسند کرتے تھے اور انہوں نے حضرت عثمان سے یہی روایت کیا ہے اور قتادہ سے ایک دوسرا مذہب روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: اگر دعا کے لیے کمزوری لاحق نہ ہوتو عرفہ میں روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اِسے امام بیہقی نے امام شافعی سے اُن کے قولِ قدیم کے حوالے سے روایت کیا ہے اور اسے شوافع میں سے خطابی اور مُتوَلِّی نے بھی مختار قرار دیا ہے اور جمہور نے کہا: (عرفہ کے دن) روزہ نہ رکھنا مستحب ہے، حتیٰ کہ عطاء نے کہا: جس نے عرفہ کے دن اس نیت سے روزہ نہ رکھا کہ اُسے ذکر پر قوت حاصل ہو، تو اُسے روزہ دار کے برابر اجر ملے گا اور طبری نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے دن روزہ اس لیے نہ رکھا تاکہ حاجی کے لیے (رکھنے اور نہ رکھنے کے) اختیار (Option) پر دلالت کرے کہ وہ دعا اور ذکر میں ضُعف محسوس نہ کرے، جو کہ عرفہ کے دن مطلوب ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یومِ عرفہ کا روزہ اس لیے مکروہ ہے کہ وقوف کے لیے جمع ہونے والوں کے لیے یہ یومِ عید ہے اور اس کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جو اصحابِ سُنَن نے عقبہ بن عامر سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ یومِ عرفہ، یوم النحر اور ایامِ منیٰ ہمارے نزدیک اہلِ اسلام کی عید ہے، (فتح

الباری، ج:4،ص:238)''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ کے دن روزہ رکھنا فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ رکھنے یا نہ رکھنے کی ترجیح حاجی کے حال پر موقوف ہے کہ روزے سے اس پر ضُعف طاری ہوتا ہے یا نہیں، کسی صاحبِ علم کے نزدیک یومِ عرفہ کا عید قرار دیا جانا، اس معنی میں بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے انتہائی مسرّت کا دن ہے، البتہ جس کے نزدیک یہ حقیقی عید کے معنی میں ہو، وہ اسے ترک کرسکتا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت اسامہ بن زید اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے براہِ راست فیض یافتہ تھے، آپ کے مقرّبین میں سے تھے اور منشائے رسالت کو بخوبی جانتے تھے۔

علامہ بدرالدین عینی متوفی 855ھ فرماتے ہیں:

''تابعین وتبعِ تابعین اور ان کے بعد آنے والے اہلِ علم حضرات میں سے جُمہور فقہاء ومُحدّثین مثلاً مسروق، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابویوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ حاجی کے لیے عرفہ کے دن عرفات میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے اور غیر حاجی کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے۔ قاضی عیاض مالکی نے کہا: ''اہلِ علم کی ایک جماعت کے نزدیک عرفہ کے دن حاجی کے لیے روزہ نہ رکھنا مستحب ہے اور یہ امام مالک، امام شافعی، اہلِ کوفہ اور اسلاف کی ایک جماعت کا مذہب ہے، (نُخَبُ الاَفکار، ج:8،ص:378)''۔

اس کی وجہ یہ ہے حج انتہائی دشوار اور مشقت سے بھرپور عبادت ہے، جس میں اُمورِ حج کی ادائیگی کے لیے حاجی کو ہجوم میں بہت زیادہ پیدل چلنا پڑتا ہے اور مختلف مناسک حج ادا کرتے ہوئے وہ شدید تھکاوٹ اور نقاہت میں مبتلا ہوجاتا ہے، جبکہ وقوفِ عرفہ میں حاجی کی اصل عبادت یہ ہے کہ وہ اس وقت کو خوب ذکر واذکار، استغفار، گریہ وزاری انتہائی تضرُّع اور عاجزی کے ساتھ دعاؤں میں گزارے۔ پس اگر حاجی روزہ سے ہوگا تو وہ اِن عبادات کو کماحقہٗ ادا نہیں کرپائے گا تو اس سے وقوفِ عرفہ اور حج کے اصل مقصد میں کوتاہی

اور نقص آجائے گا۔ اسی شرعی مصلحت کی بنا پر حاجی کے لیے روزہ نہ رکھنے کو افضل اور مستحب قرار دیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت پر رحمت ورأفت کے پیشِ نظر خود بھی روزہ نہیں رکھا، بلکہ منع فرمایا (حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی جسمانی وروحانی قوت سے نوازا تھا کہ آپ بعض اوقات صومِ وصال رکھتے تھے)، (سنن ابوداؤد: 2440)۔ پس تمام لوگوں کے سامنے آپ نے دودھ نوش فرما کر بتادیا کہ یہاں اس مقام پر حاجی کے لیے روزہ رکھنا مناسب نہیں۔ چونکہ خلفائے راشدین بھی اُمت کے رہبر اور پیشوا تھے اور لوگ اُن کی اتباع اور اقتدا کرتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے بھی اِسی مصلحت کے پیشِ نظر اُس دن روزہ رکھنے سے گریز کیا کہ کہیں لوگ انہیں دیکھ روزہ رکھنا شروع کردیں اور اپنے آپ کو اتنی مشقت میں مبتلا کردیں کہ مناسکِ حج ادا کرنے میں ضُعف لاحق ہوجائے۔

اگر کوئی حاجی جسمانی اعتبار سے صحت مند اور طاقتور ہو، روزے کی وجہ سے اُسے کمزوری نہ محسوس ہوتی ہو اور حج کی عبادات کی بجا آوری میں نقص اور کوتاہی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، تو اُس کے لیے روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ روزہ رکھنا افضل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اَسلاف سے اس دن روزہ رکھنے کی روایات بھی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کا حوالہ گزر چکا ہے کہ اس دن حضرات عبداللہ بن زبیر، اسامہ بن زید اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم روزہ رکھتے تھے، یقیناً اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ جسمانی قوت سے نوازا تھا۔

جس طرح پوری دنیا میں جمعہ ایک وقت میں نہیں ہوتا اور نہ ہی قدرت کے بنائے ہوئے نظامِ گردشِ لیل ونہار کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے، مثلاً پاکستان میں جب جمعے کا دن ہوتا ہے، تو امریکا میں رات ہوتی ہے، لہٰذا ساری دنیا میں جمعۃ المبارک کے دن دعا کی قبولیت کی مبارک ساعت اپنے اپنے حساب سے آئے گی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو بھی محروم نہیں فرماتا، جس کے لیے جہاں جہاں اُن کے اپنے وقت اور تاریخ کے مطابق وہ ساعت آئے گی، اُس وقت وہاں پر اللہ کے جو بندے مصروفِ دعا ہوں گے، انہیں اللہ تعالیٰ کی عطا سے قبولیت نصیب ہوجائے گی۔ اِسی طرح نو ذوالحجہ کی برکات وسعادات

بھی روئے زمین پر تمام مسلمانوں کو اپنے اپنے مقامی حساب کے مطابق عطا کر دی جائیں گی، جو لوگ حج پر گئے ہوئے ہیں، ان کے لیے یومِ عَرَفہ وہاں کے مطابق ہوگا اور جو دور دراز ممالک میں مقیم ہیں، اُن کے لیے یومِ عَرَفہ ان کے اپنے جاری کیلنڈر کے مطابق ہوگا۔ مکہ والے وہاں کے مطابق عَرَفہ کا روزہ رکھیں گے اور دوسرے ممالک والے اپنے اپنے نظام الاوقات کے مطابق رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ شبِ قدر، شبِ براءت اور جمعۃ المبارک کی ساعتِ قبولیت کی طرح ہر عبادت گزار اور سائل کو نوازے گا، ہمیں اللہ تعالیٰ کی عطا اور کرم ورحمت کو محدود و مقید نہیں سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)''وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ''۔ ترجمہ:''اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، (الاعراف:156)''۔

(۲)''اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ''۔ ترجمہ:'' سنو! اس کی قدرت ہر چیز پر محیط ہے، (فصلت:54)''۔

یہ وضاحت ہم نے اس لیے کی کہ بعض لوگ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً سوال کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کے مسائل

پلاٹ پر زکوٰۃ

سوال:

میں نے لاہور میں ایک پلاٹ چار سال کی قسطوں پر لیا، 35 ہزار درہم میں پلاٹ کی قسطیں مکمل ہوگئیں، حال ہی میں 75 ہزار درہم میں پلاٹ فروخت کردیا۔ اب میں زکوٰۃ کی ادائیگی کس طرح کروں، جس سال قسطیں مکمل ہوئیں یا جب قسطیں شروع ہوئی تھیں۔ نیز کیا 35 ہزار پر زکوٰۃ دینا ہوگی یا 75 ہزار درہم پر؟، (محمد انور، متحدہ عرب امارات)۔

جواب:

سرمایہ کاری (INVESTMENT) کے طور پر پلاٹ اور جائیدادیں خریدنے والوں کے لیے یہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹ، دکانیں یا فلیٹ جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لیے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے خریدے گئے ہیں، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ قیمتِ فروخت (Market Value) کا اعتبار ہوگا۔ اگر آپ نے یہ پلاٹ کاروبار کی نیت سے خریدا تھا تو جب سے آپ کو پلاٹ کا قبضہ ملا ہے اور اس پر مالکانہ تصرُّف کا آپ کو حق حاصل ہوا ہے، اس مال سے آپ بازاری قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کریں۔ اور اگر آپ کا پلاٹ خریدتے وقت کاروباری مقصد نہیں تھا، تو جب آپ نے فروخت کیا ہے، اس سال کی زکوٰۃ آپ پر عائد ہوگی۔

مستحقِ زکوٰۃ قیدیوں کے زرِ ضمانت یا جرمانے کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ کا استعمال

سوال:

کچھ ایسے خاندان یا افراد جو جیلوں میں طویل عرصہ سے قید ہیں اور عدالت نے ان کی ضمانت بھی منظور کی ہوئی ہے لیکن ضمانت کی رقم نہ ہونے کے باعث وہ رہا نہیں ہو سکتے۔

اُن کی قید کے سبب اُن کے گھرانے اب اس قابل بھی نہیں ہیں کہ گھریلو اخراجات چلا سکیں، تو کیا ایسے خاندان یا افراد کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے تاکہ وہ اسے استعمال کرکے قید سے رہائی حاصل کرسکیں ،اِسی طرح بعض قیدیوں پر عدالت کی طرف سے جرمانہ عائد ہوتا ہے اور وہ جرمانے کی رقم ادا کرنے کی استطاعت نہ ہونے کے سبب جیل میں پڑے رہتے ہیں، سوکیا زکوٰۃ کی رقم سے اُن کا جرمانہ ادا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ رہائی حاصل کرسکیں، (عبداللہ، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو اور سید نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ شخص ہے، جس کے پاس کم از کم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو، نصابِ شرعی کی مقدار ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مخلوط مال (سونا، چاندی اور نقدی) یا مالِ تجارت ہے، جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ اگر مذکورہ شخص یا اُس کے خاندان کا کوئی فرد یا افراد زکوٰۃ کے مستحق ہوں، تو زکوٰۃ کی رقم اُنہیں دے کر اُس کا مالک بنادیا جائے، جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کرسکیں۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(هِيَ) لُغَةً اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعًا: (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْاِبَاحَةُ، فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيْمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَايُجْزِيْهِ اِلَّا اِذَا دَفَعَ اِلَيْهِ الْمَطْعُوْمَ، كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَّعْقِلَ الْقَبْضَ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں: ''(مال کا) پاک ہونا اور (مال کا) بڑھنا''۔ زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا ہے''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے یتیم (فقیر) کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلادیا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی

کھانا یتیم (فقیر) کے حوالے کردیا جائے، توزکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لیے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (توزکوٰۃ ادا ہوجائے گی)"۔۔۔چنانچہ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ"۔

ترجمہ:"اور زکوٰۃ ادا ہونے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنادیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، (جلد:3،ص:161، 264، 263،بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں اگر وہ قیدی مستحقِ زکوٰۃ ہیں تو اُنہیں یا اُن کے خاندان کے کسی بالغ فرد کو جو مستحقِ زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کی رقم کا مالک بنادیا جائے۔ پھر وہ اپنی صوابدید سے اُس رقم کو بطور زَرِ ضمانت جمع کرا کے یا بطور جرمانہ ادا کر کے رہائی حاصل کرسکتے ہیں۔ اُنہیں پھر صدقِ دل سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد بھی کرنا چاہیے کہ وہ جرائم کی دنیا سے ہمیشہ کنارہ کش رہیں گے اور اپنی بشری استطاعت کے مطابق ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی گزاریں گے۔

ضرورت مندوں پر صدقہ کرنا اسلام میں ایک پسندیدہ قدر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا"۔

ترجمہ:"اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں:) ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکر گزاری نہیں چاہتے، (الدھر:9-8)"۔لیکن اگر کچھ لوگ اس طرح کے عادی مجرم ہوں کہ جیل سے آزادی کے بعد بار بار جرائم کا ارتکاب کریں اور بار بار جیل جائیں، تو اُن کی رہائی میں مدد جرم کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوگی، دین خیر خواہی کا نام ہے اور خیر قبول کرنے والوں کے ساتھ خیر

خواہی بار آور ہوتی ہے اور عادی جرائم پیشہ افراد کی معاونت از روئے قرآن "تَعَاوُنٌ عَلَى الْاِثْمِ "، یعنی گناہ پر تعاون کے مصداق ہوگی۔ ہماری تحریر کے ان کلمات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جیل میں قید ہر شخص واقعی اور حقیقی مجرم ہے، بہت سے بے قصور بھی بدقسمتی سے پھنس جاتے ہیں، حال ہی میں پاکستان کی سپریم کورٹ نے قتل کے الزام میں قید کاٹنے والے ایک مریض شخص کو جیل میں اس کی طبعی موت کے بعد بے قصور قرار دیا اور اور بعض کو کئی سالوں کی قید کے بعد بے قصور قرار دے کر رہائی عطا کی، تاہم توبہ ہم سب کا شعار ہونا چاہیے تاکہ آخرت کی سزا سے بھی بچ سکیں اور دنیا میں بھی اپنی اصلاح کر سکیں۔

مکان کے لیے پس انداز رقم پر زکوٰۃ

سوال:

ہمارا اپنا ذاتی مکان نہیں ہے، مکان خریدنے کے لیے رقم جمع کی ہے، کیا اُس پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟، (عبدالرؤف، کراچی)۔

جواب:

حاجاتِ اصلیہ کا تعین زمانے، علاقے، ماحول اور کسی شخص کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے، کسی کا مکان پانچ لاکھ کا اور کسی کا پانچ کروڑ کا ہوسکتا ہے، لیکن دونوں اشخاص کے اعتبار سے اُن کا مکان حاجتِ اصلیہ میں شامل ہے۔ اسی طرح سواری کا بھی اپنا اپنا معیار ہوتا ہے، کسی کی سواری موٹر سائیکل ہے اور کسی کی کار، مگر یہ دونوں اُن افراد کی حاجتِ اصلیہ میں شامل ہیں، یعنی حاجتِ اصلیہ میں قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ الغرض معیارِ زندگی کے اعتبار سے لوگوں کی حاجات وضروریات جدا جدا ہوتی ہیں، اس سلسلے میں کوئی لگا بندھا اصول اور ضابطہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی حیثیت کے مطابق لوگوں کی اولاد کے تعلیمی اخراجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

اگر کسی نے اپنی حاجتِ اصلیہ (جیسے مکان کی خریداری) کے لیے رقم جمع رکھی ہوئی ہے، مگر ابھی اس مصرف پر صرف نہیں ہوئی، تو ایسی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟، اس

ضمن میں فقہائے کرام کی آراء حسبِ ذیل ہیں:

علامہ شیخ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

"وَشَرَطَ فَرَاغَهُ عَنِ الْحَاجَةِ الْأَصْلِيَّةِ، لِأَنَّ الْمَالَ الْمَشْغُولَ بِهَا كَالْمَعْدُومِ وَفَسَّرَهَا فِي شَرْحِ الْمَجْمَعِ لِابْنِ الْمَلِكِ بِمَا يَدْفَعُ الْهَلَاكَ عَنِ الْإِنْسَانِ تَحْقِيقًا أَوْ تَقْدِيرًا فَالثَّانِي كَالدَّيْنِ وَالْأَوَّلُ كَالنَّفَقَةِ وَدُورِ السُّكْنَى وَآلَاتِ الْحَرْبِ وَالثِّيَابِ الْمُحْتَاجِ إِلَيْهَا لِدَفْعِ الْحَرِّ أَوِ الْبَرْدِ وَكَآلَاتِ الْحِرْفَةِ وَأَثَاثِ الْمَنْزِلِ وَدَوَابِّ الرُّكُوبِ وَكُتُبِ الْعِلْمِ لِأَهْلِهَا فَإِذَا كَانَ لَهُ دَرَاهِمُ مُسْتَحَقَّةٌ لِيَصْرِفَهَا إِلَى تِلْكَ الْحَوَائِجِ صَارَتْ كَالْمَعْدُومَةِ كَمَا أَنَّ الْمَاءَ الْمُسْتَحَقَّ لِصَرْفِهِ إِلَى الْعَطَشِ كَانَ كَالْمَعْدُومِ وَجَازَ عِنْدَهُ التَّيَمُّمُ۔ فَقَدْ صَرَّحَ بِأَنَّ مَنْ مَعَهُ دَرَاهِمُ وَأَمْسَكَهَا بِنِيَّةِ صَرْفِهَا إِلَى حَاجَتِهِ الْأَصْلِيَّةِ لَا تَجِبُ الزَّكَاةُ إِذَا حَالَ الْحَوْلُ وَهِيَ عِنْدَهُ وَيُخَالِفُهُ مَا فِي مِعْرَاجِ الدِّرَايَةِ فِي فَصْلِ زَكَاةِ الْعُرُوضِ أَنَّ الزَّكَاةَ تَجِبُ فِي النَّقْدِ كَيْفَ مَا أَمْسَكَهُ لِلنَّمَاءِ أَوْ لِلنَّفَقَةِ، وَكَذَا فِي الْبَدَائِعِ فِي بَحْثِ النَّمَاءِ التَّقْدِيرِيِّ"۔

ترجمہ: "اور مال کا حاجتِ اصلیہ سے خالی ہونا شرط ہے، کیونکہ جو مال حاجتِ اصلیہ میں مشغول ہو وہ بمنزلہ معدوم کے ہے۔ ابن ملک کی شرح المجمع میں اس قول کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے: "مالِ مشغول سے مراد وہ مال ہے جو انسان کو ہلاکت سے بچائے خواہ یہ بچانا حقیقۃً ہو یا حکماً ہو۔ حکمی بچاؤ کی مثال: جیسے قرض ہے اور حقیقی بچاؤ کی مثال: جیسے روزمرہ کے اخراجات، رہائشی مکانات، جنگی ہتھیار، سردی اور گرمی کے موسمی کپڑے، اہلِ حرفت کے پیشہ ورانہ آلات، گھریلو سامان، سواری کے جانور (یا موجودہ دور میں موٹر سائیکل کار وغیرہ) اور اہلِ علم کے لیے ان کی کتابیں ہیں۔ اگر کسی کے پاس پیسہ ہے، لیکن بیان کی گئی اِن مذکورہ حاجات پر خرچ کرنے کی ضرورت ہے، تو وہ پیسہ نہ ہونے کی مانند متصور ہوگا، جیسا کہ پینے کی ضرورت کے لیے پانی ہے (مگر وضو کے لیے دستیاب نہیں ہے) تو ایسے شخص کے لیے تیمم جائز ہے، کیونکہ (وضو کے مقصد کے لیے) وہ پانی نہ ہونے کی طرح ہے۔۔۔

اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ کسی شخص کے پاس پیسے ہیں اور اُس نے اپنی حاجتِ اصلیہ پر خرچ کرنے کے لیے انہیں جمع کر رکھا ہے، تو اگر وہ پیسے اُس کے پاس موجود ہیں اور سال پورا ہوگیا ہے، تب بھی اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور ''معراج الدرایہ'' کی فصل زکوٰۃ العروض میں جو بیان کیا گیا ہے، وہ اس کے خلاف ہے کہ نقد رقم خواہ تجارت کی نیت سے رکھی گئی ہو یا خرچ کرنے کی نیت سے، اختتامِ سال پر بہر حال اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور ''بَدَائع الصنائع'' میں نَمَاءِ تقدیری (Potentioal Growth) کی بحث میں یہی کہا گیا ہے، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 361، مکتبۂ رشیدیہ)''۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ان دونوں اقوال میں اس طرح تطبیق کی ہے:

ترجمہ: ''پس بہتر یہ ہے کہ ''بدائع الصنائع'' وغیرہ میں جو کہا گیا ہے، اُس کی تطبیق اس طرح کی جائے: اگر اُس نے پیسہ اس لیے جمع کیا کہ اپنی حاجات پر خرچ کرے گا، اس دوران سال پورا ہوگیا اور اُس میں سے کچھ پیسہ بچ رہا جو (یعنی یہ رقم یا اُس کے پاس موجود دیگر مال کے ساتھ مل کر) مقدارِ نصاب کے برابر ہے، تو اس باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا، خواہ اُس کا ارادہ اِسے مستقبل میں (اپنی حاجات پر) خرچ کرنے کا ہو، کیونکہ سال پورا ہونے پر (یا سال کے دوران) یہ رقم حاجاتِ اصلیہ پر خرچ نہیں ہوئی، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3، ص: 167)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

''حاجتِ اصلیہ میں خرچ کرنے کے لیے روپے رکھے ہیں، تو سال میں جو کچھ خرچ کر دیا (اُس پر زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور جو باقی رہے، اگر (وہ) بقدر نصاب ہیں تو ان کی زکوٰۃ واجب ہے، اگرچہ اس نیت سے رکھے ہیں کہ آئندہ حاجتِ اصلیہ ہی میں صرف ہوں گے اور اگر سال پورا ہونے کے وقت حاجتِ اصلیہ میں خرچ کرنے کی ضرورت ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں، (بہارِ شریعت، جلد 1، حصہ پنجم، ص: 362، مطبوعہ: مکتبہ رضویہ، آرام باغ)''۔

جب وہ رقم اپنے مصرف پر صرف ہوجائے تو پھر حاجاتِ اصلیہ کی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، خواہ ان کی مالیت کم ہو یا زیادہ، جیسے ذاتی استعمال کا مکان پانچ لاکھ کا بھی ہوسکتا ہے اور ایک کروڑ کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس بحث سے واضح یہ ہوتا ہے کہ متعین طور پر مکان جیسی حقیقی ضرورتوں کے لیے جمع کی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے۔ بشرطیکہ سال مکمل ہونے پر اسے خرچ کرلیا گیا ہو یا خرچ کیا جارہا ہو، تاہم اس مسئلے پر اہلِ علم حضرات کی باہمی مشاورت سے مضبوط اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

مفتی وقار الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا:

''اگر کوئی مسلمان مالک نصاب ہے، لیکن اس کے پاس رہنے کے لیے اپنا گھر نہیں ہے، یعنی رہائش جیسی بنیادی ضرورت سے محروم ہے، تو کیا ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہے یا اس کی بنیادی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا؟، اسی طرح سواری بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے، آیا ایک شخص جو صاحبِ نصاب ہے، اپنے کل مال سے سواری کے لیے رقم منہا کرکے باقی رقم سے زکوٰۃ ادا کرے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟، (سائل: احمد رضا فاروقی، کراچی)''۔

آپ نے جواب میں لکھا:

''زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ ہے، جس کی فرضیت قرآن وحدیث سے ثابت ہے، قرآن میں اِسے سائل اور محروم کا حق بتایا گیا ہے۔ زکوٰۃ غریب کا ایسا حق ہے، جو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ نصاب کے مال میں شامل کیا ہوا ہے۔ لہٰذا جو شخص نصاب کا مالک ہوگا، تو سال کے اختتام پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا فرض ہے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مکان بنانے، بچوں کی شادی، سواری خریدنے اور حج کرنے کے لیے اُس کی آئندہ ضروریات کیا ہیں۔ جو رقم اس کے پاس رکھی ہے اگر وہ نصاب کو پہنچتی ہے، تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ سال پورا ہونے سے پہلے جو خرچ کرلیا، اس کی زکوٰۃ نہیں، (وقار الفتاویٰ، جلد دوئم، ص: 392-93)''۔

پس ہماری رائے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کسی نے اپنی حاجاتِ اصلیہ کے لیے رقم پس انداز کر رکھی ہے، مگر ابھی اُس کے خرچ کرنے کی نوبت نہیں آئی، تو اختتامِ سال پر اُس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے گا اور اُس کی جائز حاجات پورا کرنے کے لیے رزق میں کشادگی فرمائے گا۔

بک کیے ہوئے پلاٹ کی زکوٰۃ

سوال:

افواجِ پاکستان کے ملازمین کو مدتِ ملازمت مکمل کرنے کی بنیاد پر پلاٹ الاٹ کیا جاتا ہے، جس کے لیے ابتدا میں معمولی رقم ہم ادا کرتے ہیں اور بقیہ رقم آئندہ دس برسوں میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ پلاٹ پر قبضہ نہیں ہوتا، مارکیٹ میں کاغذات کی کچھ قیمت ہوتی ہے۔ ہم پوری قیمت ادا کرنے کے بعد پلاٹ کے مالک بنتے ہیں، اس کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔ نیز زمین کا کچھ حصہ پلازہ یا اسپتال بنانے کے لیے خریدا ہے اور نیت یہی ہے کہ وہاں کاروبار کروں۔ اس کے علاوہ کچھ زمین اس نیت سے خریدی ہے کہ اسے فروخت کر کے کاروبار میں لگاؤں یا مکان بناؤں گا، فی الحال اس زمین کو بیچنے کا ارادہ نہیں ہے، اگر کوئی شخص پلاٹ یا مکان اولاد کو ہبہ کرنے کی نیت سے رکھے تو اس پر زکوٰہ واجب ہوگی یا نہیں؟، (محمد منظور، سی۔ ایم۔ ایچ لاہور)۔

جواب:

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لیے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مکانات، پلاٹ، دکانیں اور فلیٹس جو کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں، مصارف وضع کرنے کے بعد ان کی آمدنی جائیداد کے مالک کی مجموعی سالانہ بچت میں جمع ہوگی اور آمدنی کے تمام ذرائع سے سال کے اختتام پر جو رقم پس انداز ہوگی، اُس پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹس، دکانیں یا فلیٹس جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لیے ہیں، یعنی اُنہیں فروخت کر کے نفع حاصل کرنا مقصود ہے، تو اُن

سب کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ بازاری قیمتِ فروخت (Market Value) کا اعتبار ہوگا۔

زمین کا جو حصہ پلازہ بنا کر کرائے پر چڑھانے کی نیت سے یا تجارتی بنیادوں پر اسکول یا اسپتال بنانے کی نیت سے خریدا گیا ہے، اُس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ وہ مالِ تجارت نہیں ہے، لیکن اس منصوبے کی تکمیل پر جب آمدنی شروع ہوگی تو اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ وہ پلاٹ یا مکانات جو اولاد کو ہبہ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے ہیں، ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ مالِ تجارت نہیں ہے۔ نیت کا معاملہ بندے اور رب کے درمیان ہے، البتہ مستقبل میں اگر نیت بدل گئی یعنی ان میں تجارت کی نیت کرلی تو محض تجارت کی نیت کرنے پر اُس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن جب اسے فروخت کردے گا، تو اس وقت وصول شدہ قیمت پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ زمینوں کے بیعانے کا بھی یہی حکم ہے کہ بطور بیعانہ پیشگی وصول کی ہوئی رقم کی زکوٰۃ زمین بیچنے والے کے ذمے ہے۔ اسی طرح تعمیراتی کمپنیاں، پلازوں کی دکانوں یا مکانات کے عوض میں بطور ایڈوانس رقوم وصول کرتی ہیں جبکہ دکان یا مکان کا قبضہ دو چار سال بعد دیا جاتا ہے، اس ایڈوانس رقم کے چونکہ وہ قانونی مالک ہوتے ہیں اور اس پر ان کا قبضہ بھی ہوتا ہے اور تصرُّف (یعنی استعمال میں لانا) بھی کرسکتے ہیں، لہٰذا اس کی زکوٰۃ بلڈر یا ڈیولپر پر ہوگی۔

بچوں کی تعلیم کے لیے جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ

سوال:

میرے بچے میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، سالانہ فیس دس لاکھ روپے ہے، پانچ سال کی فیس کا حساب لگا کر میں نے رقم بینک میں محفوظ کردی ہے، کیا اس رقم پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی، (محمد منظور، سی۔ ایم۔ اایچ، لاہور)۔

جواب:

مذکورہ رقم جب تک آپ کی مِلک میں ہے، اُس پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ وہ رقم بینک

اکاؤنٹ میں جمع ہو یا گھر پر رکھی ہو، البتہ ہر سال زکوٰۃ کا حساب لگانے سے پہلے بچوں کی جو فیسیں آپ نے ادا کردی ہیں، وہ رقوم آپ کی مجموعی مالیت سے ازخود منہا ہوجائیں گی، باقی جتنی رقم اکاؤنٹ میں موجود ہے، اُس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

استعمال کی گاڑیوں پر زکوٰۃ

سوال:

میری دو گاڑیاں ہیں، ایک میرے استعمال میں ہے اور دوسری بیٹے کے استعمال میں ہے، کیا دوسری گاڑی پر زکوٰۃ واجب ہے؟۔

جواب:

ذاتی استعمال کی گاڑیوں پر، اگرچہ ایک سے زائد ہوں، زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ جو گاڑیاں کرائے پر چلائی جاتی ہیں، مصارفِ جاریہ وضع کرنے کے بعد سال کے اختتام پر جو بچت ہوگی، اُن کی آمدنی آپ کی مجموعی پس انداز رقم میں شامل ہوجائے گی اور اس تمام پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اپنے زیرِ استعمال گاڑی کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور کرائے پر چلائی جانے والی گاڑیوں کی مالیت پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ اُس کا ذریعۂ روزگار ہے، البتہ سالانہ بچت پر زکوٰۃ ہے۔

متفرق طور پر زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال:

میں سال کے دوران تھوڑا تھوڑا کرکے حسبِ ضرورت مستحقین کو زکوٰۃ دیتا رہتا ہوں اور سال کے آخر میں اپنی زکوٰۃ کا حساب کرتا ہوں، تو سال کے دوران زکوٰۃ کی جو رقم میں پیشگی ادا کرتا ہوں، کیا اسے میں اپنی سالانہ زکوٰۃ میں ایڈجسٹ کرسکتا ہوں۔ اسی طرح سال کے اختتام پر جو زکوٰۃ مجھ پر واجب ہوتی ہے، میں اسے آئندہ سال کے دوران ماہانہ بنیادوں پر مستحقین کو دیتا رہتا ہوں، اس میں سے اگر کچھ رقم بچ جائے، تو آئندہ سال اسے ضرورت مندوں کو دیتا رہتا ہوں، کیا میرا یہ عمل درست ہے؟۔

جواب:

مسلمان جب پہلی بارکم ازکم نصابِ زکوٰۃ یا اُس سے زیادہ رقم کا مالک بنا،تو آئندہ قمری سال کی اُسی تاریخ پر اُس پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔اگر صاحبِ نصاب دورانِ سال تھوڑی تھوڑی رقم زکوٰۃ کی نیت سے مستحقین کو دیتا رہتا ہے،تو سال کے دوران ادا کی ہوئی مُتفرق رقم کو سال کے اختتام پر اپنے اوپر واجب کل زکوٰۃ میں ایڈ جسٹ کرسکتا ہے۔لیکن اگر مستحق کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہیں کی اور وہ مال فقیر کی ملک میں باقی نہیں ہے،تو اب نیت کا اعتبار نہیں ہے، یہ نفلی صدقہ شمار ہوگا اور اسے زکوٰۃ میں ایڈ جسٹ نہیں کر سکتا۔سال کے اختتام پر اپنی زکوٰۃ کا حساب لگا کر اُس رقم کو الگ رکھ سکتا ہے تاکہ دورانِ سال مستحقین کو ماہانہ بنیادوں پر دے سکے اور آئندہ سال کے اختتام پر مستحقین میں تقسیم ہونے کے بعد زکوٰۃ کی جو رقم بچ گئی ہے، وہ آپ کے مال میں جمع ہوگی اور اُس پر زکوٰۃ بھی عائد ہوگی اور اگر کسی ایسے شخص کا انتقال ہوجائے،تو یہ رقم اُس کے ترکے میں شامل ہوگی۔الغرض زکوٰۃ کی نیت سے محض اپنے پاس رقم الگ کرکے رکھنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی،تاوقتیکہ اُسے مستحقین تک پہنچا دیا جائے۔اسی طرح اگر کسی کو اپنی زکوٰۃ کا وکیل بنایا ہے،تو جب تک وہ وکیل زکوٰۃ کی رقم مستحقین تک نہ پہنچائے،عنداللہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا:ایک شخص کے پاس مال زکوٰۃ کے قابل ہے،اس نے سال گزرنے کے بعد یکمشت وہ روپیہ مسلمان محتاج کو دے دیا، لیکن اس نے دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہیں کی،نہ اُس کے دل میں خیال آیا کہ زکوٰۃ ادا کرتا ہوں،بعد کو خیال آیا کہ زکوٰۃ میں محسوب ہوجائے تو یہ دیا ہوا روپیہ زکوٰۃ میں ادا ہوا یا نہیں۔

آپ جواب میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ مال کہ محتاج کو دیا،خاص زکوٰۃ کی نیت سے الگ کررکھا تھا،یعنی اس نیت سے جدا کرکے رکھ دیا تھا کہ اسے زکوٰۃ میں دیں گے،تو جس وقت اس میں سے محتاج کو دیا گیا، زکوٰۃ ادا ہوگئی،اگرچہ دیتے وقت زکوٰۃ کا خیال نہ آیا۔اور اگر ایسا نہ تھا(یعنی وہ مال زکوٰۃ

کی نیت سے الگ رکھا ہوا نہیں تھا) تو وہ مال جب تک محتاج کے پاس موجود ہے، اب اس میں زکوٰۃ کی نیت کرلے، صحیح ہوجائے گی اور اگر اس کے پاس نہ رہا تو اب نیت نہیں کرسکتا، یہ مال نفلی صدقہ ہوگا، زکوٰۃ الگ ادا کرے، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَشَرْطُ صِحَّةِ أَدَائِهَا نِيَّةٌ مُقَارِنَةٌ لَهُ) أَيْ لِلْأَدَاءِ (وَلَوْ كَانَتِ الْمُقَارَنَةُ (حُكْمًا) كَمَا لَوْ دَفَعَ بِلَا نِيَّةٍ ثُمَّ نَوَى وَالْمَالُ قَائِمٌ فِي يَدِ الْفَقِيرِ، أَوْ نَوَى عِنْدَ الدَّفْعِ لِلْوَكِيلِ ثُمَّ دَفَعَ الْوَكِيلُ بِلَا نِيَّةٍ

ترجمہ: "زکوٰۃ صحیح ادا ہونے کے لیے ایسی نیت شرط ہے جو ادا سے متصل اگرچہ یہ اتصال حکماً ہو، جیسے مال دیتے وقت تو زکوٰۃ کی نیت نہیں کی، لیکن مال ابھی فقیر کی ملک میں موجود ہے یا زکوٰۃ کا مال زکوٰۃ دینے کے لیے وکیل کو دیا، پھر وکیل نے فقیر کو دے دیا، لیکن دیتے وقت نیت نہیں کی (تو بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)"، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:3، ص: 174)"، (فتاویٰ رضویہ، ج:10، ص:161)"۔

یعنی فقیر کو مال دیتے وقت تو زکوٰۃ کی نیت نہیں کی، لیکن وہ مال بدستور فقیر کی مِلک میں موجود ہے، تو اب بھی زکوٰۃ کی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، لیکن اگر وہ مال خرچ ہوگیا اور اب فقیر کے مِلک میں موجود نہیں ہے، تو یہ نفلی صدقہ قرار پائے گا اور اس مرحلے پر نیت کرنے کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لیکن اگر صاحبِ نصاب نے زکوٰۃ کی نیت سے مال وکیل کو دے دیا اور وکیل نے مستحق کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہیں کی، تب بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، کیونکہ وہ مال وکیل کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت موجود تھی۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"دیتے وقت نیت نہیں کی تھی، بعد کو کی، تو اگر وہ مال فقیر کے پاس موجود ہے، یعنی اس کی ملک میں ہے تو یہ نیت کافی ہے، ورنہ نہیں، (بہارِ شریعت، ج:1، حصہ پنجم، ص:886، مکتبۃ المدینہ، کراچی)"۔

گاڑیوں کے کاروبار پر زکوٰۃ

سوال:

میرا گاڑیوں کا شوروم ہے، میں گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہوں اور گاہکوں پر بیچتا ہوں ،اس کے علاوہ میری بسیں، کاریں اورنقل وحمل کے لیے کنٹینروغیرہ کرائے پر چلتے ہیں، میں اپنی زکوٰۃ کا حساب کس طرح نکالوں؟۔(ش۔پشاور)۔

جواب:

جوگاڑیاں آپ نے شوروم یا ویئرہاؤس میں فروخت کرنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں،وہ مالِ تجارت ہیں اوراُن کی موجودہ بازاری قیمت پر آپ کوزکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔لیکن جو گاڑیاں (کاریں،بسیں یاٹرک یاکنٹینر یا آئل ٹینکروغیرہ) آپ کرائے پر چلارہے ہیں،یہ آپ کی کمائی کا ذریعہ ہیں،اس لیے ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، بلکہ سال کے دوران اس شعبے میں کیے گئے مصارفِ جاریہ وضع کرنے کے بعد سال کے اختتام پراس شعبے میں جوبچت ہوگی،وہ آپ کی مجموعی آمدنی میں جمع ہوجائے گی اوراس پرزکوٰۃ عائد ہوگی۔

صنعتوں پر زکوٰۃ

سوال:

میرا کارخانہ ہے اور میں اُس میں کپڑا بنا کر مارکیٹ میں فروخت کرتا ہوں ، کارخانے کی عمارت اور صنعتی مشینری میری اپنی ملکیت ہے،باقی خام مال اور تیار مال بھی کارخانے میں موجود رہتا ہے اور کچھ تیار مال مارکیٹ میں پھیلا ہوتا ہے،جس کی بعض رقم دکانداروں پر قرض ہوتی ہے اور وہ وقفے وقفے سے بالاقساط ادا کرتے ہیں، میں اپنی زکوٰۃ کا حساب کیسے لگاؤں؟۔(عبداللہ،فیصل آباد)۔

جواب:

ہم ایک سے زائد باراس کی وضاحت کرچکے ہیں کہ کسی شخص کی مِلک میں جتنا بھی سونا چاندی یانقدرقوم ہیں اور جو مال کاروبار میں لگا ہوا ہے،سال کے آخر میں تمام ذرائع سے

اُس کی جمع شدہ مالیت پر زکوٰۃ عائد ہوگی، بار بار ہر شعبے کے بارے میں الگ الگ سوال کرنا محض تکرار ہے۔

کارخانے کی زمین، عمارت اور اُس کی وہ مشینری جو صنعتی پیداوار میں استعمال ہو رہی ہے، ان تمام چیزوں کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ کارخانے میں جو خام مال (Raw Material) اور تیار مال (Finished Goods) ہے اور اسی طرح اُس کے مارکیٹ میں ادھار دیئے ہوئے مال کی جو رقوم قابلِ وصول (Recoverable) ہیں، اُن سب کی مالیت پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ ہاں! اگر اس کاروبار سے متعلق اسے لوگوں کے واجبات دینے ہیں، تو اُنہیں منہا کیا جائے گا۔

زکوٰۃ کی رقم سے ایمبولینس کی خریداری

سوال:

میں اپنی فیکٹری کے ورکرز اور علاقے کے لوگوں کی ویلفیئر اور ایمرجنسی استعمال کے لیے ایمبولینس خریدنا چاہتا ہوں تاکہ فری سروس مہیا کی جاسکے۔ کیا زکوٰۃ کی رقم سے ایمبولینس خریدی جاسکتی ہے؟، (شیخ جہانگیر اقبال، سلور اسٹار انٹر پرائز لمیٹڈ، سیالکوٹ)۔

جواب:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک (یعنی مالک بنانا) شرط ہے۔ چاروں ائمہ کے نزدیک تملیک یعنی مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنانا اور مالِ زکوٰۃ پر اُس کا قبضہ شرط ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''شَرْعًا (تَمْلِيكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ، فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَا يُجْزِيهِ، إلَّا إذَا دَفَعَ إلَيْهِ الْمَطْعُومَ، كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ''۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کر دینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلایا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہو

گی۔مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کر دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، جیسے: اگر ادائے زکوٰۃ کے لیے یتیم کو کپڑا پہنایا، بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہے (تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)"۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"وَيُشْتَرِطُ أَنْ يَّكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ (لَا) يُصْرَفُ (إِلٰى بِنَاءِ) نَحْوِ (مَسْجِدٍ وَ) لَا إِلٰى كَفَنِ مَيِّتٍ وَقَضَاءِ دَيْنِهِ"۔

ترجمہ: "اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنا دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، (اسی تملیک کی شرط کی وجہ سے) زکوٰۃ کی رقم کسی عمارت کے بنانے پر جیسے مسجد یا مدرسے کی تعمیر یا میت کو کفن پہنانے پر اور اُس کا قرض ادا کرنے پر صرف نہیں کی جاسکتی (کیوں کہ اِن صورتوں میں مالک بنانا متحقق نہیں ہوتا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3،ص:161، 263-264)"۔

آپ کی بیان کردہ صورت میں تملیک (مالک بنانا) نہیں پایا جاتا، لہٰذا زکوٰۃ کی رقم سے ایمبولینس نہیں خریدی جاسکتی اور اس ایمبولینس کا استعمال نادار اور علاقے کے مالدار یکساں کریں گے، تاہم اگر ایمبولینس آپ اپنے مال سے خرید لیں اور اس کا کرایہ مقرر کر دیں، تو جب کوئی مستحقِ زکوٰۃ آئے، اسے زکوٰۃ کی رقم سے کرائے کے برابر رقم دے دیں اور وہ اسے جمع کر کے ایمبولینس استعمال کرے تو یہ درست ہے، یہ رقم زکوٰۃ میں ایڈجسٹ ہوتی رہے گی۔

آلِ بنی ہاشم کا مصداق کون ہیں

سوال:

سادات کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، اِس سے مراد کن اصحاب کی اولاد ہے؟۔ ہماری ایک "آل پاکستان عباسی الفتح ویلفیئر ٹرسٹ" ہے، جو عباسی کہلاتے ہیں۔کیا یہ سید ہیں، آپ کے فتوے کی روشنی میں ہم اپنے خاندان کے ہر شخص کے نام کے آگے سید لکھنا چاہتے ہیں، (غلام رسول، سیکٹر 1 سرجانی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ذیل میں چند احادیثِ مبارکہ درج ہیں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''أَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا تَمْرَةً مِّنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ، فَجَعَلَهَا فِيْ فِيْهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كِخْ، كِخْ، لِيَطْرَحَهَا، ثُمَّ قَالَ: أَمَا شَعَرْتَ أَنَّا لَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ''۔

ترجمہ: ''حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لے لی اور اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: چھی، چھی، تاکہ وہ اس کھجور کو پھینک دیں، پھر فرمایا: تمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے!، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1491)''۔

(۲) ''عَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ''۔

ترجمہ: ''عبدالمطلب بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ صدقات لوگوں (کے مال) کا مَیل ہیں اور یہ محمد اور آلِ محمد ﷺ کے لیے جائز نہیں ہیں''۔ (صحیح مسلم:2371)

(۳) ''عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ، إِذَا أُتِيَ بِطَعَامٍ سَأَلَ عَنْهُ، فَإِنْ قِيْلَ هَدِيَّةٌ أَكَلَ مِنْهَا، وَإِنْ قِيْلَ صَدَقَةٌ لَمْ يَأْكُلْ مِنْهَا''۔

ترجمہ: ''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی کھانا لایا جاتا، تو آپ اس کے بارے میں پوچھتے (یہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟)، اگر آپ کو بتایا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے، تو آپ اس میں سے تناول فرماتے اور اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ اس میں سے کچھ بھی نہ کھاتے، (صحیح مسلم:2380)''۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

(وَمِنْهَا) أَنْ لَا يَكُوْنَ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ، لِمَا رُوِيَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: يَا مَعْشَرَ بَنِيْ هَاشِمٍ! إِنَّ اللهَ كَرِهَ لَكُمْ غُسَالَةَ النَّاسِ وَعَوَّضَكُمْ مِنْهَا بِخُمُسِ

الْخُمُسِ مِنَ الْغَنِيمَةِ وَرُوِیَ عَنْهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ:إِنَّ الصَّدَقَةَ مُحَرَّمَةٌ عَلٰى بَنِي هَاشِمٍ، وَرُوِیَ أَنَّهُ رَأٰى فِي الطَّرِيقِ تَمْرَةً فَقَالَ:لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَأَكَلْتُهَا ثُمَّ قَالَ إِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ يَا بَنِي هَاشِمٍ غُسَالَةَ أَيْدِي النَّاسِ وَالْمَعْنٰى مَا أَشَارَ إِلَيْهِ أَنَّهَا مِنْ غُسَالَةِ النَّاسِ فَيَتَمَكَّنُ فِيهَا الْخَبَثُ فَصَانَ اللهُ تَعَالٰى بَنِي هَاشِمٍ عَنْ ذٰلِكَ تَشْرِيفًا لَهُمْ وَإِكْرَامًا وَتَعْظِيمًا لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔

ترجمہ:"جس کوزکوٰۃ دی جارہی ہے وہ بنو ہاشم میں سے نہ ہو کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اے قومِ بنی ہاشم! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لوگوں (کے مال کا) دھوون پسند نہیں فرمایا اور اس کے عوض تمہیں مالِ غنیمت کے خُمس کا پانچواں حصہ دیا ہے" اور آپ ﷺ نے فرمایا:"بنو ہاشم پر صدقہ حرام ہے" اور ایک روایت میں ہے آپ نے راستے میں ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی تو فرمایا:"اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقے کی ہوسکتی ہے، تو میں اِسے کھالیتا، پھر فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے بنو ہاشم پر لوگوں کے ہاتھوں کا دھوون حرام قرار دیا ہے"، اس کی بھی وہی مراد ہے جسے اوپر والی حدیث میں"غسالۃ الناس" کہا گیا ہے، کیوں کہ اِس میں ناپاکی ہوسکتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے عزت واکرام دینے کے لیے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے لیے بنو ہاشم کو اِس سے محفوظ رکھا"۔(بدائع الصنائع، جلد:02،ص:74)۔

سید اور ہاشمی کوزکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔تنویر الابصار میں ہے:

"وَلَا اِلٰى بَنِیْ هَاشِمٍ اِلَّا مَنْ اَبْطَلَ النَّصُّ قَرَابَتَهٗ وَهُمْ بَنُوْلَهَبٍ، فَتَحِلُّ لِمَنْ اَسْلَمَ مِنْهُمْ كَمَا تَحِلُّ لِبَنِی الْمُطَّلِبِ، ثُمَّ ظَاهِرُ الْمَذْهَبِ اِطْلَاقُ الْمَنْعِ، وَقَوْلُ الْعَيْنِيِّ:"وَالْهَاشِمِیُّ يَجُوْزُ لَهٗ دَفْعُ زَكٰوتِهٖ لِمِثْلِهٖ"، صَوَابُهٗ لَا يَجُوْزُ"نَهَرٌ"۔

ترجمہ:"اور بنو ہاشم کوزکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی،سوائے اُن کے جن کی قرابت کو نصِ قرآنی نے باطل کردیا اور وہ بنولہب ہیں۔لہٰذا ان میں سے جو کوئی ایمان لے آیا ان کوزکوٰۃ دینا جائز ہے جیسا کہ بنو مطلب کو دینا جائز ہے۔پھر ظاہرِ مذہب (حنفیہ) یہ ہے کہ بنو ہاشم

کے لیے زکوٰۃ کی ممانعت مطلقاً ہے اور عینی نے کہا: ''ہاشمی اپنی زکوٰۃ دوسرے ہاشمی کو دے سکتا ہے''، (مگر) صحیح یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، النہر الفائق۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(قَوْلُهُ وَبَنِي هَاشِمٍ إلَخْ) اِعْلَمْ أَنَّ عَبْدَ مَنَافٍ وَهُوَ الْأَبُ الرَّابِعُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْقَبَ أَرْبَعَةً وَهُمْ هَاشِمٌ وَالْمُطَّلِبُ وَنَوْفَلٌ وَعَبْدُ شَمْسٍ، ثُمَّ هَاشِمٌ أَعْقَبَ أَرْبَعَةً انْقَطَعَ نَسْلُ الْكُلِّ إلَّا عَبْدُ الْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ أَعْقَبَ اثْنَيْ عَشَرَ تُصْرَفُ الزَّكَاةُ إلَى أَوْلَادِ كُلٍّ إذَا كَانُوا مُسْلِمِينَ فُقَرَاءَ إلَّا أَوْلَادَ عَبَّاسٍ وَحَارِثٍ وَأَوْلَادَ أَبِي طَالِبٍ مِنْ عَلِيٍّ وَجَعْفَرٍ وَعُقَيْلٍ قُهُسْتَانِيٌّ، وَبِهِ عُلِمَ أَنَّ إطْلَاقَ بَنِي هَاشِمٍ مِمَّا لَا يَنْبَغِي إذْ لَا تَحْرُمُ عَلَيْهِمْ كُلِّهِمْ بَلْ عَلَى بَعْضِهِمْ، وَلِهَذَا قَالَ فِي الْحَوَاشِي السَّعْدِيَّةِ إنَّ آلَ أَبِي لَهَبٍ يُنْسَبُونَ أَيْضًا إلَى هَاشِمٍ وَتَحِلُّ لَهُمْ الصَّدَقَةُ۔

وَأَجَابَ فِي النَّهْرِ بِقَوْلِهِ وَأَقُولُ: قَالَ فِي النَّافِعِ بَعْدَ ذِكْرِ بَنِي هَاشِمٍ: إلَّا مَنْ أَبْطَلَ النَّصُّ قَرَابَتَهُ يَعْنِي بِهِ قَوْلَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا قَرَابَةَ بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي لَهَبٍ فَإِنَّهُ آثَرَ عَلَيْنَا الْأَفْجَرِينَ وَهَذَا صَرِيحٌ فِي انْقِطَاعِ نِسْبَتِهِ عَنْ هَاشِمٍ، وَبِهِ ظَهَرَ أَنَّ فِي اقْتِصَارِ الْمُصَنِّفِ عَلَى بَنِي هَاشِمٍ كِفَايَةً، فَإِنَّ مَنْ أَسْلَمَ مِنْ أَوْلَادِ أَبِي لَهَبٍ غَيْرُ دَاخِلٍ لِعَدَمِ قَرَابَتِهِ وَهَذَا حَسَنٌ جِدًّا لَمْ أَرَ مَنْ نَحَا نَحْوَهُ فَتَدَبَّرْهُ (قَوْلُهُ بَنُو لَهَبٍ) فِي بَعْضِ النُّسَخِ بَنُو أَبِي لَهَبٍ وَهِيَ أَصْوَبُ''۔

ترجمہ: ''عبدمناف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں چوتھے نمبر پر ہیں، ان کے اَخلاف (Successors) چار ہیں۔ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبدشمس۔ پھر ہاشم کے اَخلاف چار ہیں، عبدالمطلب کے سوا سب کی نسل منقطع ہوگئی، ان کے اخلاف بارہ ہیں، ان میں سے جو فقیر اور مسلم ہو ان سب کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، سوائے حضرت عباس، حضرت حارث اور خواجہ ابوطالب کی اولاد یعنی حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہم کے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کو مطلق رکھنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ تمام بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کی

ممانعت نہیں ہے، بلکہ بعض کو (استحقاق کی بنیاد پر) دی جاسکتی ہے۔ اسی لیے ''السعدیہ'' کے حاشیہ میں لکھا ہے: ''آلِ ابولہب بنو ہاشم کی طرف منسوب ہیں اور ان کے لیے صدقہ حلال ہے''۔ النہرالفائق میں ''النافع'' کے حوالے سے بنو ہاشم کے ذکر کے بعد کہا: ''مگر جس کی قرابت کو نص نے باطل کر دیا ہو''، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس قول سے استدلال کیا ہے: ''میرے اور ابولہب کے درمیان قرابت نہیں، کیونکہ اس نے ہم پر دو بڑے فاجروں (یعنی ابوجہل اور ولید بن مغیرہ) کو ترجیح دی''، (مُحشّی نے لکھا ہے: ''یہ حدیث ہمیں کہیں نہیں ملی'')، یہ اس مسئلے میں صراحت ہے کہ بنولہب کی نسبت بنو ہاشم سے منقطع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علامہ علاؤ الدین حصکفی نے بنو ہاشم کے ذکر پر کفایت کی اور کہا کہ اولادِ ابولہب سے جو اسلام لے آئے، وہ بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کی ممانعت میں داخل نہیں ہیں، اس لئے کہ اسے حضور سے قرابت ہی نہیں ہے۔ اور یہ انہوں نے نہایت عمدہ وضاحت کی، کیوں کہ کسی اور نے اس طرح وضاحت نہیں کی، پس غور کا مقام ہے۔ بنولہب کو بعض نسخوں میں ''بنو ابی لہب'' کہا گیا ہے اور یہی صحیح ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 3، ص: 270)''۔

اب چونکہ مکمل اسلامی نظام نہ ہونے کی وجہ سے مالِ غنیمت، مالِ فے اور خُمس وغیرہ مدات عملاً موجود نہیں ہیں، اس لیے اہلِ ثروت کو چاہیے کہ ضرورت مند ساداتِ کرام اور بنو ہاشم کو اپنے طیب وطاہر مال میں سے دیں اور حسبِ حیثیت وتوفیق ہدایا کے ذریعے ان کی مالی اعانت اور کفالت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبتِ قرابت کا اکرام ہوگا اور بہت بڑی سعادت کی بات ہوگی۔

جن لوگوں کا شجرۂ نسب حضرت عباس تک نہیں پہنچتا یا ویسے ہی وہ عباسی مشہور ہو گئے ہیں، یہ مسئلہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے بلکہ نسباً عباسی افراد کے لیے ہے۔ حرم شریف میں سقایا (حجاج کو پانی پلانے) کی ذمے دار آلِ عباس رضی اللہ عنھم کو دی گئی تھی، برصغیر پاک وہند میں جو لوگ ماشکی کہلاتے تھے، اب وہ خود کو عباسی کہتے ہیں، ان کا حضرت عباس کی اولاد سے تعلق اور نسب ثابت نہیں ہے۔ ہمارے خطے میں اپنے نام کے آگے سید لکھنے کا

مطلب یہ ہے کہ آلِ رسول یعنی آلِ علی، آلِ عباس، آلِ عقیل، آلِ جعفر ہونے کا دعویٰ کرنا، اگر یہ واقعہ کے مطابق ہے تو درست ہے، ورنہ حرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ سَعد رَضِیَ اللہ عَنہُ قَالَ: سَمِعتُ رَسُولَ اللہِ ﷺ یَقُولُ: مَنِ ادَّعیٰ اِلٰی غَیرِ أَبِیهِ وَهُوَ یَعلَمُ اَنَّهُ غَیرُ أَبِیهِ فَالجَنَّةُ عَلَیهِ حَرَامٌ"۔

ترجمہ: "حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے (اپنا نسب) اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا (حقیقی) باپ نہیں ہے، تو اس پر جنت حرام ہے" (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6766)۔

فلیٹس کی قسط وار بیع اور زکوٰۃ و عُشر کے مسائل

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید تین چار کروڑ کی زمین خریدتا ہے، اس کی نیت یہ ہے کہ اس زمین پر ایک پروجیکٹ بنائے گا، جس میں دوکانیں، دفاتر، فلیٹ وغیرہ ہوں۔ بکنگ کے وقت لوگوں سے ایک یا دس فیصد وصول کیا جائے گا، بقایا رقم 2 سے 5 سال کی مدت میں قسطوں میں وصول کی جائے گی۔ پروجیکٹ کی تمام تر تعمیر لوگوں کی جمع کردہ رقم سے ہوگی، مکمل ادائیگی کے بعد قبضہ دے دیا جائے گا۔ زید زمین فروخت نہیں کرسکتا، مقررہ وقت پر پروجیکٹ خریداروں کے حوالے کرنے کا پابند ہے۔ زید کا تین چار کروڑ روپیہ تین سال تک منجمد رہے گا، رقم بڑھ بھی سکتی ہے اور نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ رقم کی زکوٰۃ ہر سال دینا ہوگی یا آخر میں رقم ملنے کے بعد، صرف اُسی سال کی دینی ہوگی یا جتنے عرصے تک رقم منجمد رہی، اُس کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی؟۔

(۲) لوگوں سے حاصل ہونے والی رقم پروجیکٹ کی تعمیر کے لیے ہے، خریدار اپنی رقم پر سال بسال زکوٰۃ دیں گے یا زید ادا کرے گا یا کوئی نہیں ادا کرے گا؟۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عشری زمین پر تجارت کی نیت درست نہیں، لہٰذا اس میں زکوٰۃ

لازم نہیں ہوگی اور حوالہ یہ دیتے ہیں: لَوِاشْتَرَى أَرْضَ الْخَرَاجِ أَوِ الْعُشْرِ لِلتِّجَارَةِ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ زَكٰوةٌ (البحرالرائق، جلد2، ص:366)۔ دوسری دلیل: کفایہ علی الہدایہ میں ہے:
وَإِنِ اشْتَرٰى شَيْئًا وَنَوَاهُ لِلتِّجَارَةِ، هٰذَا فِي الشَّيْءِ الَّذِي تَصِحُّ فِيهِ نِيَّةُ التِّجَارَةِ، وَأَمَّا إِذَا اشْتَرٰى شَيْئًا لَمْ تَصِحُّ فِيهِ نِيَّةُ التِّجَارَةِ، لَا يَصِيرُ لِلتِّجَارَةِ، براہِ کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (محمد عثمان غنی، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

عُشر پیداوار پر واجب ہوتا ہے، زمین پر نہیں۔

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

''اَلْعُشْرُ يَجِبُ فِي الْخَارِجِ لَا فِي الْأَرْضِ فَكَانَ مِلْكُ الْأَرْضِ وَعَدَمُهُ بِمَنْزِلَةٍ وَّاحِدَةٍ''۔

ترجمہ: ''عُشر زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے، زمین پر نہیں، لہٰذا زمین کی ملکیت اور عدمِ ملکیت ایک ہی درجہ میں ہے، (بدائع الصنائع، جلد2، ص:84)''۔

یہی سبب ہے کہ اگر کسی شخص نے زراعت پر قادر ہونے کے باوجود فصل کاشت نہیں کی، تو اُس پر عُشر کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، کیونکہ عُشر زمین پر نہیں، اُس کی پیداوار پر ہوتا ہے۔

علامہ علاؤالدین کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمِنْهَا: أَيْ مِنْ شَرَائِطِ الْمَحَلِّيَّةِ وُجُوْدُ الْخَارِجِ حَتّٰى أَنَّ الْأَرْضَ لَوْلَمْ تُخْرِجْ شَيْئًا لَمْ يَجِبِ الْعُشْرُ، لِأَنَّ الْوَاجِبَ جُزْءٌ مِّنَ الْخَارِجِ وَإِيْجَابُ جُزْءٍ مِّنَ الْخَارِجِ وَلَا خَارِجَ مُحَالٌ''۔

ترجمہ: ''کسی چیز پر عشر لاگو ہونے کی شرائط میں سے (ایک شرط): پیداوار کا موجود ہونا ہے، چنانچہ اگر کسی زمین میں کوئی پیداوار نہیں ہوئی، تو اُس میں عُشر واجب نہیں ہوگا، اس لیے کہ واجب پیداوار کا ایک جُزء ہوتا ہے اور پیداوار کے بغیر اس کا ایک جُزء واجب کرنا محال ہے، (بدائع الصنائع، جلد2، ص:88)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَھُوَ فَرْضٌ وَسَبَبُهُ الْأَرْضُ النَّامِيَةُ بِالْخَارِجِ حَقِيْقَةً بِخِلَافِ الْخَرَاجِ فَإِنَّ سَبَبَهُ الْأَرْضُ النَّامِيَةُ حَقِيْقَةً أَوْ تَقْدِيْرًا بِالتَّمَكُّنِ فَلَوْ تَمَكَّنَ وَلَمْ يَزْرَعْ وَجَبَ الْخَرَاجُ دُوْنَ الْعُشْرِ، وَلَوْ أَصَابَ الزَّرْعَ اٰفَةٌ لَمْ يَجِبْ''۔

ترجمہ: ''عُشر فرض ہے اور اُس کا سبب پیداوار والی زمین سے حقیقتاً پیداوار کا ہونا ہے، جبکہ خراج کا سبب زمین کا پیداواری صلاحیت کا حامل ہونا (potential Productivity) ہے، چاہے پیداوار حقیقتاً حاصل کی جائے یا نہ کی جائے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص زمین سے پیداوار لینے پر قادر ہو اور وہ زمین کاشت نہ کرے تو خراج کی ادائیگی لازم ہوگی، لیکن عُشر لازم نہ ہوگا۔ اور اگر پیداوار کو کوئی ایسی آفت پہنچے (جو مکمل کاشت کو تباہ کر دے) تو عُشر و خراج کچھ بھی لازم نہیں ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:185)''۔

عُشری زمین اگر تجارت کی نیت سے بھی خریدی ہے، لیکن ابھی اس کا تجارتی استعمال شروع نہیں ہوا اور بدستور اس میں کاشت کاری ہو رہی ہے، تو محض تجارت کی نیت سے اُس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثُمَّ نِيَّةُ التِّجَارَةِ قَدْ تَكُوْنُ صَرِيْحًا وَقَدْ تَكُوْنُ دَلَالَةً فَالصَّرِيْحُ أَنْ يَّنْوِيَ عِنْدَ عَقْدِ التِّجَارَةِ''۔

ترجمہ: ''پھر (مال میں) تجارت کی نیت کبھی صراحۃً ہوتی ہے اور کبھی دلالۃً، پس صریح یہ ہے کہ معاہدۂ تجارت کے وقت (عاقدین) نے تجارت کی نیت کی ہو''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وَأَمَّا الدَّلَالَةُ فَهِيَ أَنْ يَّشْتَرِيَ عَيْنًا مِنَ الْأَعْيَانِ بِعُرُوْضِ التِّجَارَةِ أَوْ يُؤَاجِرُ دَارَهُ الَّتِي لِلتِّجَارَةِ بِعَرَضٍ مِنَ الْعُرُوْضِ فَتَصِيْرُ لِلتِّجَارَةِ وَإِنْ لَّمْ يَنْوِ التِّجَارَةَ صَرِيْحًا''۔

ترجمہ: ''اور دلالۃً نیت کا ہونا یہ ہے کہ مالِ تجارت کے بدلے کوئی چیز خریدی یا مکان جو تجارت کے لیے ہے، اُس کو کسی اسباب کے بدلے کرایہ پر دیا، تو یہ اسباب اور وہ خریدی

ہوئی چیز تجارت کے لیے ہیں، اگرچہ صراحۃً تجارت کی نیت نہ کی ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:174)''۔

علامہ عبدالرحمٰن الجریری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمِنْهَا أَنْ تَكُوْنَ الْعَيْنُ الْمُتَّجَرُ فِيْهَا صَالِحَةً لِنِيَّةِ التِّجَارَةِ، فَلَوِاشْتَرٰى أَرْضَ عُشْرٍ وَزَرَعَهَا، أَوْبَذْرًا وَزَرَعَهٗ وَجَبَ فِي الزَّرْعِ الْخَارِجِ الْعُشْرُ دُوْنَ الزَّكَاةِ، أَمَّا إِذَا لَمْ يَزْرَعِ الْأَرْضَ الْعُشْرِيَّةَ، فَإِنَّ الزَّكَاةَ تَجِبُ فِي قِيْمَتِهَا، بِخِلَافِ الْأَرْضِ الْخَرَاجِيَّةِ، فَإِنَّ الزَّكَاةَ لَاتَجِبُ فِيْهَا وَإِنْ لَّمْ يَزْرَعْهَا''۔

ترجمہ: ''(احناف کے نزدیک مالِ تجارت کی شرائط میں سے) ایک شرط یہ ہے کہ وہ مال تجارت کی نیت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، پس اگر کسی نے عشری زمین خریدی اور اُس میں کاشت کاری کی یا بیج خرید کر اُس کی کاشت کی، تو اس سے حاصل شدہ پیداوار پر عُشر واجب ہوگا، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن اگر (تجارت کی نیت سے خریدی گئی) عشری زمین میں کاشت نہیں کی، تو اُس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بخلاف خراجی زمین کے کہ اگر اُس میں کاشت نہ کی ہو، تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (کتاب الفقه علی المذاهب الأربعه، جلد 1،ص:608)''۔

فقہائے کرام کی اِن عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی نے عشری زمین تجارت کی نیت سے خریدی اور اُس میں کاشت نہ کی، تو نیتِ تجارت درست ہے اور یہ زمین عروضِ تجارت میں سے بن گئی۔ مذکورہ صورت میں بھی پروجیکٹ بنانے کی نیت سے خریدی گئی عُشری زمین پر زکوٰۃ دینا واجب ہے، کیونکہ بعض بلڈرز یا ڈویلپرز زمین خرید کر چھوڑ دیتے ہیں اور ہاؤسنگ یا پروجیکٹ کی تعمیر وفروخت کا منصوبہ کافی دیر سے شروع ہوتا ہے، تو فروخت سے پہلے عرصے کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔ فروخت شروع ہونے کے بعد بھی ہاؤسنگ اسکیم یا تعمیر منصوبے کا وہ حصہ جو ابھی فروخت نہیں ہوا، اس کی سالانہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زمین اگر تجارت کی نیت سے خریدی ہے، تو یہ مالِ تجارت ہے، سال پورا ہونے کی

صورت میں یا صاحبِ نصاب شخص پر تشخیصِ زکوٰۃ کی مُقررہ تاریخ پر موجودہ تمام مال کی زکوٰۃ واجب ہے۔

صورتِ مسئولہ میں پہلے گاہک (Client) کا بلڈر کے ساتھ معاملہ بلاشبہ ''بَیعِ اِستِصنَاع'' ہے اور بَیعِ اِستِصنَاع کا جواز اُمّت کے تعامل اور عملی اجماع سے ثابت ہے۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''وَاِنِ اسْتَصْنَعَ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ بِغَيْرِ اَجَلٍ جَازَ اِسْتِحْسَانًا، لِلْاِجْمَاعِ الثَّابِتِ بِالتَّعَامُلِ وَفِي الْقِيَاسِ لَايَجُوْزُ، لِأَنَّهٗ بَيْعُ الْمَعْدُوْمِ، وَالصَّحِيْحُ أَنَّهٗ يَجُوْزُ بَيْعًا لَاعِدَةً''۔

ترجمہ:''اور اگر ان میں سے کوئی چیز مدت کے تعین کے بغیر بنوائی، تو استحساناً جائز ہے کیونکہ اُمّت کے تعامُل (Practice) کے وجہ سے اس پر اجماع عملی ثابت ہے اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جائز نہ ہو، اِس لئے کہ یہ معدوم (Not Existent) کی بیع ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس کی بیع جائز ہے (اور یہ بیع ہے) نہ کہ وعدۂ بیع، (ہدایہ، جلد 5، ص:240)''۔

قیاس کے تحت عدمِ جواز کا سبب یہ ہے کہ یہ معدوم (Not Existent) کی بیع ہے اور معدوم کی بیع از روئے حدیث جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''لَاتَبِعْ مَالَيْسَ عندَك''، ترجمہ:''جو چیز تمہارے پاس یعنی تمہارے قبضے میں نہ ہو، اُس کی بیع نہ کرو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3497)''۔ کیونکہ تم اس کے سپردگی (Delivery) پر قادر نہیں ہو۔

کفایہ میں ہے:

''وَجْهُ الْاِسْتِحْسَانِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِسْتَصْنَعَ خَاتِمًا وَمِنْبَرًا وَلِاَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ تَعَامَلُوْهُ مِنْ لَّدُنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا مِنْ غَيْرِ نَكِيْرٍ فَنَزَلَ مَنْزِلَةَ الْاِجْمَاعِ''۔

ترجمہ:''اور استحسان کی بنا پر جواز کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آرڈر پر مہر بنوائی اور منبر بھی بنوایا، لہٰذا اِس (استصناع) پر عہدِ رسالت مآب ﷺ سے آج تک اُمّت کا

تَعَامُل چلا آرہا ہے اور اس پر کسی کا انکار یا ناپسندیدگی ثابت نہیں ہے تو یہ بمنزلۂ اجماع ہے، (جلد 6،ص:242)''۔

قیاس اُسے کہتے ہیں جو واضح دلیل (جلی) پر مبنی ہو اور استحسان کا جواز دلیلِ خفی سے ثابت ہوتا ہے۔ یعنی یہ انسانی تمدُّن کی ضرورت ہے اور ''اَلضَّرُوْرَۃُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ'' (یعنی ضرورت ممنوع چیزوں کو بھی مباح کر دیتی ہے)۔ آج قومی وبین الاقوامی تجارت میں ضرورت کی بنا پر یہ تَعَامُل جاری ہے۔ نقل وحمل کے بحری جہاز (Corgoships)، جنگی بحری جہاز، اسی طرح جنگی ہوائی جہاز دیگر سامانِ حرب، مسافر ہوائی جہاز اور متعدد اشیاء ضرورتاً آرڈر پر بنوائی جاتی ہیں۔ اسی میں ہے:

''وَالْاَصْلُ فِیْہِ قَوْلُہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ: مَارَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَھُوَعِنْدَاللہِ حَسَنٌ وَقَدْ رَاَوُا الْاِسْتِصْنَاعَ حَسَنًا فَکَانَ حَسَنًا''۔

ترجمہ: ''یعنی اس کی اصل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مومن جس چیز کو اچھا سمجھیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور مومنوں نے صدیوں سے استصناع کو اچھا سمجھا ہوا ہے، تو یہ شریعت کی نظر میں بھی اچھی قرار پائے گی، (جلد 6،ص:242)''۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز اپنی اصل کے اعتبار سے شریعت کی رُو سے ممنوع وحرام نہ ہو بلکہ مباح ہو۔

اگرچہ زمانۂ سلف میں عمارات کا اِسْتِصنَاع نہیں ہوتا تھا مگر چونکہ بَیعِ اِسْتِصْنَاع کا جواز تعامل پر مبنی ہے اور موجودہ دور میں عمارات کے اِسْتِصْنَاع کے تعامل کا حال یہ ہے کہ یہ کاروبار اس وقت دنیا میں انتہائی عروج پر پہنچ چکا ہے۔

ردالمحتار میں بدائع سے ہے:

''وَمِنْ شُرُوْطِہٖ بَیَانُ جِنْسِ الْمَصْنُوْعِ وَنَوْعِہٖ وَقَدْرِہٖ وَصِفَتِہٖ وَاَنْ یَّکُوْنَ مِمَّافِیْہِ تَعَامُلٌ''۔

ترجمہ: ''اور استصناع کی شرائط میں سے یہ ہے کہ آرڈر پر بنوائی جانے والی چیز کی جنس،

نوع، مقدار (Quantity) اور صفت (Quality) واضح طور پر آرڈر میں بیان کردی گئی ہو، (جلد 15، ص:403، مطبوعہ: شام)۔

''البحرالرائق'' کی مندرجہ ذیل عبارت کی طرف محترم سائل نے متوجہ کیا ہے:

''لَوِاشْتَرٰی أَرْضَ الْخَرَاجِ أَوِالْعُشْرِ لِلتِّجَارَةِ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ زَكٰوةٌ''۔

ترجمہ: ''یعنی اگر کسی نے عُشری یا خراجی زمین تجارت کی غرض سے خریدی، تو اُس پر زکوٰۃ نہیں ہے، (جلد 2، ص:366)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم کا یہ قول اِس پر محمول ہے کہ اگر اس زمین میں کاشت کی گئی ہو، تو اس کی پیداوار پر عُشر ہوگا، کیونکہ عُشر بھی زمین پر شریعت کا عائد کیا ہوا مالی حق ہے، اسے ہم ''زکوٰۃ الارض'' سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ اور ایک چیز پر بیک وقت ایک ہی نوع کے دو مالی واجبات عائد نہیں کئے جاسکتے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''لَازَكٰوةَ فِيْمَانَوَاهُ لِلتِّجَارَةِ مِنْ نَحْوِأَرْضٍ عُشْرِيَّةٍ أَوْخَرَاجِيَّةٍ لِئَلَّا يُؤَدِّیَ اِلٰی تَكْرَارِ الزَّكٰوةِ، لِأَنَّ الْعُشْرَ أَوِالْخَرَاجَ زَكٰوةٌ أَيْضًا وَالثِّنٰی، وَهُوَأَخْذُ الصَّدَقَةِ مَرَّتَيْنِ فِيْ عَامٍ كَمَا فِيْ ''الْقَامُوْسِ'' وَمِنْهُ كَمَا فِي الْمَغْرِبِ قَوْلُهٗ ﷺ: لَاثِنَیَّ فِي الصَّدَقَةِ''۔

ترجمہ: ''عُشری اور خراجی زمین میں تجارت کی نیت کرلی ہو (لیکن اگر اُس میں بدستور کاشت کاری ہورہی ہے)، تو اُس پر زکوٰۃ نہیں ہے تاکہ زکوٰۃ کی تکرار لازم نہ آئے، کیونکہ عُشر اور خراج بھی ''زکوٰۃ'' ہی ہے (مالی صدقہ ہونے کی بنا پر معنیً) اور ''ثِنٰی'' سے مراد ایک سال میں دوبار صدقۂ واجبہ (یعنی زکوٰۃ) لینا ہے، جیساکہ ''القاموس'' میں ہے اور ''المغرب'' میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ: ''صدقۂ واجبہ میں تکرار نہیں ہے''، اسی معنیٰ میں ہے (یعنی یہ کہ کسی چیز کی زکوٰۃ ایک سال میں دوبار نہیں لی جائے گی، (ردالمحتار، جلد 3، ص:181)''۔

''کفایہ'' کی مندرجہ ذیل عبارت کا بھی حوالہ محترم سائل نے دیا ہے:

"وَاِنِ اشْتَرٰی شَیْئًا وَنَوَاہُ لِلتِّجَارَۃِ، ھٰذَا فِی الشَّیْئِ الَّذِی تَصِحُّ فِیْہِ نِیَّۃُ التِّجَارَۃِ، وَاَمَّا اِذَا اشْتَرٰی شَیْئًا لَمْ تَصِحَّ فِیْہِ نِیَّۃُ التِّجَارَۃِ، لَایَصِیْرُ لِلتِّجَارَۃِ"۔

ترجمہ: "اور اگر کسی نے کوئی چیز خریدی اور اُس میں تجارت کی نیت کی، یہ اُس چیز کے بارے میں صحیح ہے، جس میں (شرعاً) تجارت کی نیت صحیح ہو، لیکن اگر ایسی چیز خریدی، جس میں تجارت کی نیت شرعاً صحیح نہیں ہے، تو وہ تجارت کے لیے نہیں ہوگی، (کفایہ علی الہدایہ)"۔

اِس سے مراد یہ ہے کہ عُشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی، تو اُس میں اصولی اعتبار سے تجارت کی نیت صحیح ہے، لیکن اگر اُس زمین کو کاروبار کے طور پر فروخت کرنے کے بجائے یا کاروبار کے لیے روکے رکھنے کے بجائے اس میں فصل کی کاشت شروع کردی اور یہ نیت کی کہ میں فصل یا غلے کو فروخت کر کے سالانہ زکوٰۃ ادا کردوں گا، تو یہ نیت صحیح نہیں ہوگی، کیونکہ زمین میں کاشت کی صورت میں اس کی پیداوار پر عُشر ہی ادا کرنا ہوگا، یعنی ایسی عُشری زمین جس پر بدستور کاشت کی جارہی ہے، محض تجارت کی نیت سے اُس پر زکوٰۃ کا حکم عائد نہیں ہوگا، البتہ جب (اسی زمین کا) تجارتی مقاصد کے لیے استعمال شروع ہوجائے گا تو اب وہ مالِ تجارت کے حکم میں ہے، مثلاً عُشری زمین پر ہاؤسنگ اسکیم بنائی اور اس کے رہائشی یا صنعتی یا کمرشل پلاٹ بنا کر ان کی فروخت شروع کردی، تو اب یہ مال تجارت ہے اور اس پر عُشری زمین کے احکام عائد نہیں ہوں گے، کیونکہ اس کی اب وہ حیثیت نہیں رہی۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

زمین سے پیداوار ہوئی، اُس میں نیتِ تجارت سے زکوٰۃ واجب نہیں، زمین عُشری ہو یا خراجی، اس کی مِلک میں ہو یا عاریت یا کرایہ پر لی ہو، ہاں! اگر زمین خراجی ہو اور عاریت یا کرایہ پر لی ہو اور بیج وہ ڈالے، جو تجارت کے لیے تھے، تو پیداوار میں تجارت کی نیت صحیح ہے، (بہارِ شریعت، جلد 1، ص: 884-883، بحوالہ: ردالمحتار، جلد 3، ص: 222)"۔

الغرض جب اُس زمین پر ہاؤسنگ اسکیم بن جائے گی، تو وہ مالِ تجارت قرار پائے گی اوراس کی موجودہ بازاری قیمت پر زکوٰۃ ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اُس کی رقم کچھ عرصے منجمد رہے گی، تو اگر کوئی شخص سونا یا چاندی یا نقد رقم گھر پر منجمد رکھے تو اُس پر بھی شریعت کی رُو سے زکوٰۃ عائد ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مالِ تجارت کا ''مالِ نامی'' ہونا اس معنیٰ میں شرط ہے کہ اُس میں نمو کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ جس پلاٹ کا سودا ہوگیا، تو اُس کی قیمت اُس کی مجموعی مالیت میں شامل ہوتی رہے گی۔ مکان یا پلاٹ جس کی بیع استصناع کی ہے، جو رقم تعمیر پر خرچ ہوتی رہے گی اوراس کی مالیت سے منہا ہوتی رہے گی، آخر میں جو نفع حاصل ہوگا، اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

مقروض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:

میرے ایک دوست کے سیب کے باغات ہیں، جو دس لاکھ روپے میں فروخت کیے ہیں، لیکن وہ پندرہ لاکھ روپے کا مقروض ہے، کیا اس پر زکوٰۃ فرض ہے، (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن)

جواب:

زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس شخص سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ ہے، وہ اس قدر مقروض نہ ہو کہ اگر اس کے پاس موجود مال قرض خواہ کو دے دیا جائے تو بقیہ مال نصاب سے کم ہوجائے۔ اگر اتنا مقروض ہے کہ قرض ادا کرنے کے بعد وہ صاحبِ نصاب نہیں رہتا تو گویا اُس کا سارا مال قرض میں گھرا ہوا ہے اور اُس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔ حضرت سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ رمضان المبارک میں اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''فَمَنْ كَانَ لَهُ مَالٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَلْيَحْسِبْ مَالَهُ بِمَا عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُزَكِّ بَقِيَّةَ مَالِهِ، وَكَانَ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ، وَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ أَحَدٌ مِّنْهُمْ، فَكَانَ ذٰلِكَ اِجْمَاعًا مِّنْهُمْ عَلٰى أَنَّهُ لَاتَجِبُ الزَّكَاةُ فِي الْقَدْرِ الْمَشْغُوْلِ بِالدَّيْنِ''۔

ترجمہ: ''جس شخص کے پاس مال ہے اور اُس شخص پر قرض بھی ہے، تو اُسے، چاہئے کہ قرض کے برابر مال کا حساب کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اُس وقت صحابۂ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی، اُن میں سے کسی ایک نے بھی اعتراض نہیں کیا، لہٰذا اس پر صحابۂ کرام کا اجماع ہوا کہ قرض کے برابر مال پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 9)''۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ آپ کے دوست کے پاس باغات کی اس آمدنی کے علاوہ بنک اکاؤنٹ، نقد، سونا چاندی، مختلف قسم کے مالی تمسّکات اور مالِ تجارت کی صورت میں کوئی مال نہیں ہے، تو اس کا قرض اس کی مالیت سے زیادہ ہے، لہٰذا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، بلکہ وہ خود مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر وہ دس لاکھ روپے اپنے پاس جمع رکھتا ہے اور قرض ادا نہیں کرتا یا اس پر جو قرض ہے، وہ میعادی ہے، جیسے لوگ مکان بنانے یا گاڑی خریدنے یا دیگر مقاصد کے لیے طویل المدۃ قرض لیتے ہیں، جس کی ادائیگی ماہانہ یا سالانہ اقساط کی صورت میں ہوتی ہے، تو اس صورت میں اس سال کی قسط منہا کرنے کے بعد باقی مال پر اُسے زکوٰۃ دینی چاہیے، کیونکہ ایسے قرض کے مقابل کوئی نہ کوئی اثاثہ ہوتا ہے، لیکن اگر خالص ذاتی ضروریات پر مبنی قرض ہے، طویل المدتی یا میعادی قرض نہیں ہے، تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

قرض کی رقم سے زیادہ دینے کا حکم

سوال:

میں پہلے آٹھ ہزار روپے ماہانہ پر کرائے کے مکان میں رہتا تھا، میں نے اپنی سالی سے چار لاکھ روپے ادھار لیے، جس میں ایک لاکھ روپے ملا کر زمین کا کام شروع کیا، آج اللہ کے فضل سے اپنا مکان ہے، میری سالی نے مجھے چار لاکھ روپے ادھار دیے تھے، اب میں چاہتا ہوں کہ ماہانہ کچھ رقم اسے دے دیا کروں تاکہ اس کی مدد ہو جائے، یہ سود تو نہیں ہوگا، (راشد یعقوب)۔

جواب:

جو رقم آپ کو ادھار دی گئی ہے، اُس رقم کی اتنی ہی مقدار میں واپسی آپ پر لازم ہے، البتہ اگر پیشگی طے کیے بغیر اپنی خوشی سے کچھ اضافی رقم دیتے ہیں تو شرعاً اُس میں کوئی حرج نہیں اور نہ وہ سود میں شمار ہوگا۔قرض ادا کرتے وقت اصل سے زیادہ دینا مستحب ہے بشرطیکہ اس زیادتی کو نہ عقد میں طے کیا جائے اور نہ قرض دینے والے کی طرف سے مطالبہ ہو، اس کو حُسنِ قضاء کہتے ہیں۔حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا تَقَاضٰى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَغْلَظَ لَهُ فَهَمَّ بِهِ أَصْحَابُهُ، فَقَالَ دَعُوهُ، فَإِنَّ لِصَاحِبِ الحَقِّ مَقَالًا، وَاشْتَرُوا لَهُ بَعِيرًا فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ وَقَالُوا: لَا نَجِدُ إِلَّا أَفْضَلَ مِنْ سِنِّهِ، قَالَ: اشْتَرُوهُ، فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ، فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً"۔

ترجمہ:" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے (قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا اور (مطالبے میں) سختی کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب نے (اس کو ڈانٹنے یا مارنے کا) ارادہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو کیونکہ حق دار کو مطالبہ کرنے کا حق ہے، ایک اونٹ خرید کر اس کو دے دو، صحابہ نے عرض کی: ہمیں اس کے اونٹ سے زیادہ عمر کا اونٹ مل رہا ہے (یعنی اس کے اونٹ سے بہتر ہے)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہی خرید کر اس کو دے دو، کیونکہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض اچھی طرح ادا کرے، (صحیح بخاری:2390)"۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"اس باب کی احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرض ادا کرتے وقت اصل سے زیادہ دینا مستحب ہے بشرطیکہ اس زیادتی کو نہ عقد میں طے کیا جائے اور نہ قرض دینے والے کی طرف سے مطالبہ ہو، اسی کو حُسنِ قضاء کہتے ہیں، جس کا حدیث میں ذکر ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد4، ص:429)"۔

لیکن ماہانہ نفع کی بنیاد پر آپ اسے اضافی رقم دیں گے تو یہ سود شمار ہوگا کیونکہ فقہی اصول

ہے:''جس قرض کی وجہ سے کوئی نفع اٹھایا جائے، وہ سود ہے''۔حدیث پاک میں ہے:''کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَۃً فَھُوَ رِبٰوا، اَلْحَارِثُ عَنْ عَلِیٍّ''۔ترجمہ:''یعنی ہر وہ قرض جو حصولِ منفعت کا باعث بنے، وہ سود ہے، (اس کی تخریج حارث نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے کی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کو نبی کریم ﷺ سے روایت کیا)، (کنز العمال:15516)''۔

پلاٹ پر زکوٰۃ یا عشر

سوال:

میں نے پانچ سال قبل ایک تین مرلے کا پلاٹ اقساط میں خریدا تھا، پلاٹ سرمایہ کاری کی نیت سے خریدا تھا۔ مجھے سالانہ کتنا عشر ادا کرنا ہوگا اور کس مہینے میں ادائیگی کرنا ہوگی، کیا میں سرکاری خزانے میں جمع کراسکتا ہوں۔اب اُس زمین سے کوئی آمدنی نہیں ہورہی، کاشتکاری بھی نہیں ہورہی، جب فروخت کریں گے تو فائدہ ہوگا، زمین پر عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟، (مدیحہ نسیم)۔

جواب:

آپ نے یہ پلاٹ سرمایہ کاری یعنی تجارت کی نیت سے خریدا تھا، اس لیے اس پر ہر سال بازاری قیمت کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ بازاری قیمت سے مراد یہ ہے کہ ریل اسٹیٹ مارکیٹ میں جس قیمت پر وہ پلاٹ فروخت ہوسکتا ہے۔اس پر عُشر نہیں ہے، یہ مالِ تجارت کی طرح ہے۔

قربانی کے مسائل

مہر بند حلال گوشت کا شرعی حکم

سوال:

حلال جانور کو شریعت کے احکام کے مطابق ذبح کیا جاتا ہے، پھر اُسے طبی اصولوں کے مطابق صاف اور منجمد کر کے پیکٹوں میں مہر بند (Ceal Pack) کیا جاتا ہے اور اُس پر حلال سرٹیفکیشن کی مہر لگائی جاتی ہے، پھر برّی یا بحری یا فضائی ذرائع سے مارکیٹ تک پہنچایا جاتا ہے۔ بعض مفتیانِ کرام فرماتے ہیں کہ اُس کا کھانا اس لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مہر بند ہونے سے مارکیٹ تک پہنچنے کے تمام مراحل میں مسلمان کی نظروں کے سامنے نہیں رہتا۔ آپ کے نزدیک اس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ اُن مفتیانِ کرام کا منشا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے راستے میں اسے کھول کر اس میں حرام گوشت کی آمیزش کر دی جاتی ہو، (مولانا محمد عقیل جامی، ہانگ کانگ)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں گوشت کی ترسیل کرنے والی کمپنی خواہ بری یا بحری یا فضائی ذرائع سے ترسیل کرے، حلال گوشت درآمد کنندہ کی اجیر ہوتی ہے اگرچہ وہ غیر مسلم ہوں، اس کے ذریعے گوشت منگوانا جائز ہے اور اس کمپنی کا یہ کہنا کہ یہ وہی گوشت ہے جو درآمد کیا گیا ہے، یہ معاملات کی خبر ہے اور معاملات میں کافر کی خبر بھی جائز ہے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر حنفی لکھتے ہیں:

''قَالَ: وَمَنْ أَرْسَلَ أَجِيْرًا لَهُ مَجُوسِيًا أَوْ خَادِمًا فَاشْتَرَى لَحْمًا، فَقَالَ: اِشْتَرَيْتُهُ مِنْ يَهُوْدِيٍّ أَوْنَصْرَانِيٍّ أَوْ مُسْلِمٍ وَسِعَهُ أَكْلُهُ، لِأَنَّ قَوْلَ الْكَافِرِ مَقْبُوْلٌ فِي الْمُعَامِلَاتِ، لِأَنَّهُ خَبَرٌ صَحِيْحٌ لِصُدُوْرِهِ عَنْ عَقْلٍ وَدِيْنٍ يُعْتَمَدُ فِيْهِ حُرْمَةُ الْكَذِبِ وَالْحَاجَةُ مَاسَّةٌ إِلٰى قبولهٖ لِكَثْرَةِ وُقُوْعِ الْمُعَامَلَاتِ''۔

ترجمہ: ''امام محمد نے فرمایا: جس نے اپنے کسی مجوسی نوکر یا خادم کو گوشت خریدنے کے لیے

بھیجا، پس اس نے گوشت خریدااور کہا: میں نے یہودی یا عیسائی یا مسلمان سے گوشت خریدا ہے، تو مسلمان کے لیے اس گوشت کا کھانا جائز ہے، اس لیے کہ معاملات میں کافر کی خبر معتبر ہے، کیونکہ یہ خبر صحیح ہے، یہ ایسے شخص نے دی ہے، جو عاقل ہے اور ایسے دین کا حامل ہے، جس میں جھوٹ کو حرام جانا جاتا ہے، ایسے معاملات کی کثرت کے سبب اُس کی خبر قبول کرنے کی ضرورت بھی ہے، (ہدایہ، جلد 7،ص:183)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مَنْ أَرْسَلَ أَجِيْرًا لَهُ مَجُوْسِيًّا أَوْ خَادِمًا فَاشْتَرٰى لَحْمًا، فَقَالَ: اِشْتَرَيْتُهُ مِنْ يَهُوْدِيٍّ أَوْ نَصْرَانِيٍّ أَوْ مُسْلِمٍ وَسِعَهُ أَكْلُهُ، وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ لَمْ يَسَعْهُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهُ''۔

ترجمہ:''جس نے اپنے کسی مجوسی نوکر یا خادم کو گوشت خریدنے کے لیے بھیجا، پس اس نے گوشت خریدااور کہا: میں نے یہودی یا عیسائی یا مسلمان سے گوشت خریدا ہے، تو مسلمان کے لیے اس گوشت کا کھانا جائز ہے اور اگر کسی غیر کتابی غیر مسلم سے خریدا تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے''۔۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''رَجُلٌ اِشْتَرٰى لَحْمًا فَلَمَّا قَبَضَهُ فَأَخْبَرَهُ مُسْلِمٌ ثِقَةٌ أَنَّهُ قَدْ خَالَطَهُ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ لَمْ يَسَعْهُ أَنْ يَأْكُلَهُ، كَذَا فِي ''التَّتَارْخَانِيَّة''.

ترجمہ:''کسی شخص نے گوشت خریدا، جب اس گوشت پر قبضہ کر چکا تو کسی معتبر مسلمان شخص نے بتایا کہ دکاندار نے اس کے ساتھ خنزیر کا گوشت ملایا ہے، تو اب اس گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے، ''تتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5،ص:309-308)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں:

''اگر وقت ذبح سے وقت خریداری تک وہ گوشت مسلمان کی نگرانی میں رہے، بیچ میں کسی وقت مسلمان کی نگاہ سے غائب نہ ہو اور یوں اطمینان کافی حاصل ہو کہ یہ مسلمان کا ذبیحہ ہے تو اس کا خریدنا جائز اور کھانا حلال ہوگا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20،ص:282)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز کے اس حکم کا تعلق غیر کتابی کافر سے گوشت کی

خریداری سے متعلق ہے بشرطیکہ ذابح مسلم ہو،اس صورت میں آپ کی بیان کردہ تمام قیود کا موجود ہونا ضروری ہے۔لیکن اگر مسلمان سے گوشت خریدا ہو اور درمیان میں غیر مسلم ملازم کے ذریعے اسے حاصل کیا جائے تو اس کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں واضح جزئیات موجود ہیں کہ اس کا یہ کہنا کہ میں نے مسلمان یا کتابی سے یہ گوشت خریدا ہے،اس گوشت کے حلال ہونے اور جائز ہونے کے لیے یہ کافی ہے،کیونکہ اس کا تعلق معاملات سے ہے اور معاملات میں غیر مسلم کی خبر بھی معتبر ہے اگرچہ وہ غیر کتابی ہو۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وَلَایُقْبَلُ قَوْلُ الْکَافِرِ فِی الدِّیَانَات إِلَّا إِذا کَانَ قُبُولَ قَولِ الْکَافِرِ فِی الْمَعَامَلَاتِ یَتَضَمّنُ قَولَہٗ فِی الدِّیَانَاتِ،فَحِینَئِذٍتَدخُل الدِّیَانَاتُ فِی ضِمْن الْمعامَلَات،فَیُقبَل قَولُہٗ فِیھَا ضَرُورَۃً،ھٰکَذا فِی”التّبیین“.

ترجمہ:”دیانات میں کافر کا قول مقبول نہیں،ماسوا اس کے کہ جب کافر کا قول معاملات میں مقبول ہونے پر دیانات میں مقبول ہونے کو متضمن ہو،تو ایسی صورت میں دیانات،معاملات میں داخل قرار پاتے ہیں،پس بربنائے ضرورت کافر کا قول قبول کیا جائے گا، جیسا کہ”تبیین الحقائق“میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد5،ص:308)“۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”دیانات سے مراد وہ اُمور ہیں،جن کا تعلق بندہ اور رب کے مابین ہے،مثلاً حِلّت، حُرمت،نجاست،طہارت،(بہارِ شریعت،جلد سوم،ص:400)“۔

ہمارے نزدیک حلال طریقے سے ذبح کیے ہوئے حلال جانور کے گوشت کو جب طبی لحاظ سے محفوظ بنا کر مہر بند کر دیا گیا ہو اور اس پر کسی حلال سرٹیفکیشن ادارے کی سند بھی ثبت ہو،پھر اس کی بری،بحری یا فضائی راستے سے ترسیل کی گئی ہو اور اس دوران وہ مسلمان کی نظروں کے سامنے نہ بھی رہا ہو،تو بھی اُسے استعمال کیا جاسکتا ہے تاوقتیکہ اس کے برعکس شواہد موجود نہ ہوں۔آج کل مسلم ممالک سمیت عالمی سطح پر دواؤں،اشیائے خوراک اور

دیگر مصنوعات کا کاروبار ہورہا ہے اور اعتماد پر چل رہا ہے۔ دواؤں یا مصنوعات کے پیکٹ پر درج فارمولے اور انتہائی تاریخ استعمال پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے۔ کسی ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک شہر سے دوسرے شہر تک بری، فضائی یا بحری راستوں سے ترسیل کا ایسا انتظام عملاً ممکن نہیں ہے کہ پروڈکٹ ہر وقت کسی مسلمان کی نظر میں رہے۔ دین نے معاملات کا مدار یُسر اور عدمِ حرج پر رکھا ہے، عرف اور عادت بھی یہی ہے۔

بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاں ذبیحہ ہورہا ہے، ذبح کرنے والا مسلمان ہو، جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے، کم از کم تین رگیں کٹ گئی ہوں اور مہر بند ہونے تک سارا عمل مسلمان کی نگرانی میں ہو۔ اسی طرح وہ مذبح جہاں یہودی اپنے مذہب کے مطابق اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، جسے Kosher کہا جاتا ہے، وہ بھی جائز ہے، کیونکہ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور انڈیا کے زیر اہتمام مجلس شرعی نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے، (مجلس شرعی کے فیصلے، ج:1 ص: 347)۔ کسی ملک (مثلاً ہانگ کانگ) کے مسلمان تاجر کسی دوسرے ملک (مثلاً آسٹریلیا) کے جس مذبح سے گوشت منگواتے ہیں، بہتر ہے کہ ان کے علماء کا ایک وفد ایک بار ذبح سے مہر بند ہونے تک وہاں کا نظام دیکھ کر اطمینان کرلے یا اس ملک میں موجود ثقہ علماء کی اس سلسلے میں دینی معاونت حاصل کرلیں۔ مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد لا مذہب، ملحد اور Atheist ہوچکی ہے، اس لیے ہمارے عہد کے علماء ان کے ذبیحے کو جائز نہیں سمجھتے، لیکن ان میں سے جو اپنے باطل عقائد کے باوجود تحریف شدہ مسیحیت پر قائم ہیں، اگر وہ اللہ کے نام پر ضروری شرائط کے مطابق ذبح کریں تو ان کے ذبیحے کا حکم بھی یہودیوں کے کوشر والا ہوگا۔

نوٹ: ہمارا یہ فتویٰ مشینی ذبیحے سے حاصل شدہ گوشت کے لیے نہیں ہے، جسے جھٹکے سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

قربانی کے جانور نے بچہ دیا

سوال:

ایک صاحبِ حیثیت شخص نے قربانی کی گائے خریدی اور اس جانور نے قربانی کے ایام سے دو ماہ قبل ایک بچہ دیا جو آئندہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک سال سے زائد عمر کا ہو جائے گا، کیا وہ شخص آئندہ سال اس جانور کی قربانی دے سکتا ہے؟، (شیخ عبدالقادر، کراچی)

جواب:

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''فَإِنْ خَرَجَ مِنْ بَطْنِهَا حَيًّا، فَالْعَامَّةُ أَنَّهُ يَفْعَلُ بِهِ مَا يَفْعَلُ بِالْأُمِّ، فَإِنْ لَمْ يَذْبَحْهُ حَتّٰى مَضَتْ أَيَّامُ النَّحْرِ يَتَصَدَّقُ بِهِ حَيًّا، فَإِنْ ضَاعَ أَوْ ذَبَحَهُ وَأَكَلَهُ يَتَصَدَّقُ بِقِيمَتِهِ، فَإِنْ بَقِيَ عِنْدَهُ وَذَبَحَهُ لِلْعَامِ الْقَابِلِ أُضْحِيَّةً لَا يَجُوزُ، وَعَلَيْهِ أُخْرٰى لِعَامَّةِ الَّذِي ضَحّٰى وَيَتَصَدَّقُ بِهِ مَذْبُوحًا مَعَ قِيمَةِ مَا نَقَصَ بِالذَّبْحِ، وَالْفَتْوٰى عَلٰى هٰذَا ''خَانِيَّةٌ''۔

ترجمہ: ''پس اگر قربانی کے جانور کے بطن سے زندہ بچہ نکلا تو اکثر مشائخ کے نزدیک اس کے ساتھ وہی کرے جو اس کی ماں کے ساتھ کیا ہے (یعنی اُسے بھی ذبح کرے)، پس اگر اُسے ذبح نہ کیا حتیٰ کہ قربانی کے ایام گزر گئے تو اُسے زندہ صدقہ کرے، پس اگر وہ ضائع ہو گیا یا اُسے (گوشت حاصل کرنے کے لیے) ذبح کر دیا اور کھا لیا تو اس کی قیمت صدقہ کرے۔ لیکن اگر وہ اس کے پاس باقی رہا اور اُسے اگلے سال کی قربانی میں ذبح کر دیا، تو یہ جائز نہیں (یعنی اس سے واجب قربانی ادا نہیں ہوگی) اور اس پر اُس سال کے لیے دوسرے جانور کی قربانی لازم ہوگی اور اس ذبح شدہ جانور کو صدقہ کرے اور ذبح کی وجہ سے قیمت میں جو کمی آئی ہے، وہ بھی ادا کرے، فتویٰ اسی پر ہے، ''خانیہ''، (ردالمحتار، ج:6،ص:322)''۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قربانی کے لیے جانور خریدا تھا، قربانی کرنے سے پہلے اُس کا بچہ پیدا ہوا، تو بچے کو بھی ذبح

کرڈالے اور اگر بچے کو بیچ ڈالا، تو اُس کا ثمن صدقہ کرے اور اگر نہ ذبح کیا، نہ بیچا اور قربانی کے ایام گزر گئے، تو اُس کو زندہ صدقہ کرے اور اگر کچھ نہ کیا اور بچہ اُس کے یہاں رہا اور (آئندہ سال) قربانی کا وقت آگیا، اب یہ چاہتا ہے کہ اس سال کی قربانی میں اُسی کو ذبح کرے، یہ نہیں کرسکتا اور اگر اُسی کی قربانی کردی تو دوسری قربانی پھر کرے کہ وہ قربانی نہیں ہوئی اور وہ ذبح کیے ہوئے بچے کا گوشت صدقہ کرے، بلکہ ذبح سے اُس کی قیمت میں جو کمی واقع ہوئی ہے، اُتنی رقم بھی صدقہ کرے، (بہارِ شریعت، ج:3،ص:347)"۔

آپ کی بیان کردہ صورت میں تو گائے کا وہ بچہ ایک سال دو ماہ کا ہوا، اتنی عمر کی گائے یا بیل کی قربانی ویسے بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ قربانی کے لیے گائے کا دو سال کا ہونا ضروری ہے۔

اگر قربانی کے جانور کا پیدائشی طور پر ایک خصیہ نہ ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے

سوال:

جس جانور کا پیدائشی طور پر ایک خصیہ نہ ہو، کیا اُس کی قربانی جائز ہے؟، یہ سوال گوجرانوالہ سے متعدد حضرات نے فون پر بھی کیا ہے۔

جواب:

اُصولی طور پر قربانی کے جانور کو تمام ظاہری عیوب سے سلامت ہونا چاہیے، عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس کے تھن کٹے ہوئے ہوں، سینگ جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں، کان تہائی سے زائد کٹا ہوا ہو، لنگڑا ہو، کانا ہو وغیرہ۔ عیب سے مراد وہ عیب ہے جو تاجروں کے نزدیک عیب شمار ہوتا ہو اور قیمت میں کمی کا باعث ہو۔ خصی ہونا، تاجروں کے نزدیک عیب نہیں ہے بلکہ خصی جانور کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور سنت سے بھی خصی جانور کی قربانی ثابت ہے۔ البتہ جو شخص افزائشِ نسل کے لیے حلال نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک اس کا خصی ہونا ضرور عیب ہوگا۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"مشائخ نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت یا جمال کو بالکل ضائع کر دے، اُس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے، البتہ جو عیب اس سے کم درجے کا ہو اس کی وجہ سے قربانی ممنوع نہیں ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 6، ص:152)"۔

خصیے مکروہ ہیں، کھائے نہیں جاسکتے ہیں، حدیث پاک میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ مِنَ الشَّاةِ سَبْعًا: الْمَرَارَةَ، وَالْمَثَانَةَ، وَالْمَحْيَاةَ، وَالذَّكَرَ، وَالْأُنْثَيَيْنِ، وَالْغُدَّةَ، وَالدَّمَ، وَكَانَ أَحَبَّ الشَّاةِ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقَدَّمُهَا"۔

ترجمہ:"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ذبیحہ جانور کے جن سات اعضاء کو مکروہ فرماتے، وہ یہ ہیں: مَرارہ (پِتّا)، مثانہ، محیاۃ (شرم گاہ)، ذَکَر (عضوِ تناسل)، خُصیے، غدود اور ذبح کے وقت بہنے والا خون اور آپ ﷺ کو بکری کے گوشت کا اگلا حصہ (یعنی دستی اور گردن) پسند تھا، (سُنن الکبریٰ للبیہقی:19702)"۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَيَجُوْزُ الْمَجْبُوْبُ الْعَاجِزُ عَنِ الْجِمَاعِ"۔

ترجمہ:"اور مجبوب یعنی جس کے خصیے اور آلہ تناسل کاٹ دیے گئے ہوں، کی قربانی جائز ہے، (عالمگیری، ج:5، ص:297)"۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وَتَجُوْزُ التَّضْحِيَةُ بِالْمَجْبُوْبِ الْعَاجِزِ عَنِ الْجِمَاعِ، (رد المحتار علی الدر المختار، ج:9، ص:394، بیروت)"۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایک خصیہ پیدائشی طور پر نہ ہو تو قربانی جائز ہے، کیونکہ نہ وہ مقصود ہے، اُس سے نہ منفعت زائل ہوتی ہے اور نہ جمال۔ اور کپورے کھانا چونکہ مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا گوشت کا نقصان بھی نہیں ہوا اور ہم خَصی جانور کے بارے میں بیان کر چکے ہیں کہ

خُصیے سالم ہونا صرف اس جانور کے لیے مفید ہے، جسے افزائشِ نسل کے لیے پالا گیا ہو۔
ڈاکٹر وہبہ الزحیلی فقہ شافعی کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''اور خصی جانور کی قربانی جائز ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے دو خصی مینڈھوں کی قربانی کی ہے، لیکن خصی نر کی قربانی افضل ہے، اگر اس سے نسل کشی مقصود نہ ہو، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:4،ص:2722)''۔

قربانی کی بابت ایک سوال

سوال:

ایک ضعیف خاتون کوئٹہ میں رہتی ہیں، انہیں پشاور جانا ہے، دس ہزار روپے پینشن آتی ہے، اس میں مزید رقم جمع کر کے قربانی کرتی ہیں، وہ پشاور میں ہوں تو ان کی طرف سے بچے کوئٹہ میں ان کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں؟، (شرمین زیدی)۔

جواب:

اگر قربانی کرنے والا ایک مقام پر ہو اور قربانی کا جانور کسی دوسرے مقام پر تو وہ اپنے کسی عزیز (جیسے اولاد) یا رفاہی ادارے کو قربانی کے لیے وکیل بنا سکتا ہے کہ وہ شریعت کے احکام کی پاس داری کرتے ہوئے اُن کی طرف سے قربانی کرے۔ قربانی صاحبِ نصاب پر واجب ہے، لیکن نفلی قربانی کسی کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔

مصنوعی طریقے سے سینگ کے نظر نہ آنے یا انتہائی چھوٹا کیے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم

سوال:

آج کل کاروباری حضرات قربانی کے جانوروں (گائے اور بیل) کے سینگوں کو جڑ تک یا نہایت چھوٹے سائز تک اِس طرح بنا دیتے ہیں کہ یا تو سینگ بالکل نظر نہیں آتے یا انتہائی معمولی سائز کے ہوتے ہیں۔ اس سے جانور کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے، قیمت زیادہ ملتی ہے اور اِس سے جانور کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیا ایسے جانوروں کی

قربانی جائز ہے؟، (محمد وسیم، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

"نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُصْفَرَّةِ، وَالْمُسْتَأْصَلَةِ، وَالْبَخْقَاءِ وَالْمُشَيَّعَةِ، وَالْكَسْرَاءِ، وَالْمُصْفَرَّةُ الَّتِي تُسْتَأْصَلُ أُذُنُهَا حَتّٰى يَبْدُوَ سِمَاخُهَا وَالْمُسْتَأْصَلَةُ الَّتِي اسْتُؤْصِلَ قَرْنُهَا مِنْ أَصْلِهِ، وَالْبَخْقَاءُ الَّتِي تُبْخَقُ عَيْنُهَا، وَالْمُشَيَّعَةُ: الَّتِي لَا تَتْبَعُ الْغَنَمَ عَجَفًا وَضَعْفًا، وَالْكَسْرَاءُ"۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے چند جانوروں کی قربانی کرنے سے منع فرمایا: اُن میں سے ایک وہ جس کا کان اس حد تک اُکھاڑا گیا ہو کہ اُس کا سوراخ ظاہر ہو گیا ہو اور جس کے سینگ جڑ سے اُکھاڑ دیئے گئے ہوں اور جس کی آنکھ میں بینائی نہ رہے اور جو اس قدر دبلا ہو کہ ریوڑ کے ساتھ نہ چل سکے اور جس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو، (سُنن ابوداؤد: 2803)"۔

اُصولی طور پر قربانی کے جانور کو تمام ظاہری عیوب سے سلامت ہونا چاہیے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"مشائخ نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت یا جمال کو بالکل ضائع کر دے، اُس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے، البتہ جو عیب اس سے کم درجے کا ہو اس کی وجہ سے قربانی ممنوع نہیں ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 6، ص: 152)"۔

جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا سینگ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے، اُس کی قربانی جائز ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وَيُضَحّٰى بِالْجَمَّاءِ، هِيَ الَّتِي لَا قَرْنَ لَهَا خِلْقَةً، وَكَذَا الْعَظْمَاءُ، اَلَّتِي ذَهَبَ بَعْضُ قَرْنِهَا بِالْكَسْرِ أَوْغَيْرِهِ فَإِنْ بَلَغَ الْكَسْرُ إِلَى الْمُخِّ لَمْ يَجُزْ، قُهُسْتَانِي، وَفِي "الْبَدَائِعِ" إِنْ بَلَغَ الْكَسْرُ الْمُشَاشَ لَا يُجْزِئُ وَالْمُشَاشُ رُؤُسُ الْعِظَامِ مِثْلُ الرُّكْبَتَيْنِ وَالْمِرْفَقَيْنِ"۔

ترجمہ:''جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا اُس کے سینگ کا کچھ حصہ کسی وجہ سے ٹوٹا ہوا ہو، پس اگر ٹوٹ مغز تک پہنچ جائے، تو قربانی جائز نہیں ہے، بحوالہ ''قُہستانی'' اور ''البدائع الصنائع'' میں ہے: اگر سینگ کی ٹوٹ جڑ تک پہنچ جائے تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے اور جڑ ہڈیوں کے سرے کو کہتے ہیں، جیسے گھٹنے اور کہنیاں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:9،ص:391، بیروت)''۔

علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی لکھتے ہیں:

''وَیُضَحّٰی بِالْجَمَّاءِ، وَهِیَ الَّتِی لَا قَرْنَ لَهَا؛ لِأَنَّ الْقَرْنَ لَا یَتَعَلَّقُ بِهِ مَقْصُودٌ، وَکَذَا مَکْسُورَةُ الْقَرْنِ بَلْ أَوْلٰی لِمَا قُلْنَا''۔

ترجمہ:''اور جس کے پیدائشی سینگ نہ ہوں، اُس کی قربانی کی جاسکتی ہے، کیونکہ سینگ کے ساتھ مقصود متعلق نہیں ہے اور اسی طرح ٹوٹے ہوئے سینگ والے کی قربانی بھی بہ طریقِ اَولیٰ کی جاسکتی ہے اور وجہ وہی ہے جو ہم نے بتائی، (تبیین الحقائق، جلد6،ص:5)''۔

علامہ احمد بن محمد طحطاوی لکھتے ہیں:

''وَالْعَظْمَاءُ مِنهُ بَلْ هُوَ اَوْلٰی مِنهُ''۔

ترجمہ:'' جب بے سینگ والے کی قربانی جائز ہے، تو شکستہ سینگ والے کی بہ طریقِ اَولیٰ جائز ہے، (کیونکہ اصل، مقصود گوشت کا تعلق سینگ سے نہیں ہوتا)، (طحطاوی علی الدرالمختار، جلد4،ص:164)''۔

علامہ محمد شہاب الدین بزّ ارکُردری لکھتے ہیں:

''وَالَّتِی لَا قَرْنَ لَهَا مِنَ الْاَوَّلِ یَجُوزُ، فَاِنِ انْقَطَعَ أَوِ انْکَسَرَ یَجُوزُ اِلَّا اِذَا بَلَغَ الدِّمَاغَ''۔

ترجمہ:''جس جانور کے سرے سے سینگ نہیں ہیں، جب اُس کی قربانی جائز ہے، تو جس جانور کے سینگ کاٹ دیئے ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں، اُس کی قربانی جائز ہے، البتہ اگر سینگ کی ٹوٹ کا اثر دماغ تک پہنچ گیا ہو تو اُس جانور کی قربانی جائز نہیں ہے، (فتاویٰ بزّ ازیہ علی ہامش الہندیہ، جلد6،ص:293)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیز سے سوال ہوا: ''ایک بکری عقیقے کے لیے خریدی، اُس کا سینگ ٹوٹ گیا، اب دوبارہ پھر نکل آیا، یہ بکری قابلِ قربانی ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: ''سینگ ٹوٹنا اُس وقت قربانی سے مانع ہوتا ہے جبکہ سر کے اندر جڑ تک ٹوٹے، اگر صرف اوپر کا حصہ ٹوٹ جائے، تو مانع نہیں، پھر اگر اس قدر ٹوٹا تھا کہ مانع ہوتا، مگر بعد میں زخم بھر گیا اور عیب جاتا رہا، تو اب اُس کی قربانی میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ مانع زائل ہو چکا ہے۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''قرن اوپر ہی کے حصے کو کہتے ہیں، جو ظاہر ہوتا ہے، وہ اگر کُل ٹوٹ گیا، حرج نہیں ولہٰذا ''ہدایہ'' میں مکسورۃ القرن کو جائز فرمایا، ہاں! اگر اندر سے اس کی جڑ نکل گئی کہ سر میں جگہ خالی ہوگئی، تو ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد20، ص:460، 488)''۔

علامہ نور اللہ بصیر پوری لکھتے ہیں:

''روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ قرنِ داخل نصف سے زائد بھی کٹ جائے، تب بھی کٹاؤ دماغ تک نہیں پہنچتا، البتہ اگر جڑ سے اُکھڑ جائے، چونکہ جڑ اور کھوپڑی کی اوپر کی ہڈی کا پیدائشی طور پر اِتصال ہے، لہٰذا وہ کٹاؤ دماغ تک پہنچ سکتا ہے، جو حقیقۃً اِنقِلاعُ القرن یا اِستِیصَالُ القرن ہے اور ایسے جانور کو مُستأصلہ کہا جاتا ہے، جس کی ممانعت حدیث مرفوع ومسند میں آئی ہے، جس کی تصحیح حاکم نے فرمائی ہے، قَرَّرَہُ الذَّھبِیُّ نَصّاً وَسَکَتَ عَلَیہِ أَبُودَاؤدُ، مزید لکھتے ہیں:

''روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ جب قرنِ داخل کا ٹوٹ جانا قربانی کے جواز کے لیے مانع نہیں ہے، تو صرف اُس کے بالائی حصے کا ٹوٹ جانا کیسے مانع ہو سکتا ہے اور وہ کہنیوں، شانوں اور گھٹنوں کی ہڈیوں کی طرح بھی نہیں ہے اور ایسا نرم بھی نہیں ہے کہ چبانے اور کھانے کے قابل ہو، لہٰذا وہ مراد نہیں۔ البتہ قرنِ داخل کا زیریں حصہ جو اس کی جڑ ہے اور کھوپڑی میں پیوست ہے، مراد ہو سکتا ہے کہ وہ بھی رأس بمعنی طرف کے ہے اور وہی جڑ کھوپڑی کے لیے بمنزلہ رأس ہے، کیونکہ کھوپڑی کا وہ حصہ جو قرن کے ساتھ مشترک ہے،

دائرہ نما خلا ہوتا ہے، کھوپڑی کی ہڈی ہر طرف سے وہیں آکر ختم ہوجاتی ہے اور اس کا ٹوٹنا سَر کی ہڈی کا ٹوٹنا ہے، جس سے ٹوٹ دماغ تک پہنچ جاتی ہے اور وہی صورت پیدا ہوجاتی ہے جس کا ذکر ''عون المعبود'' میں گزرا اور اس کا مانع ہونا بھی اس لئے نہیں کہ وہ سینگ کا ٹوٹ جانا ہے، بلکہ اس لئے کہ یہ سینگ کا جڑ سے اُکھڑ جانا اور سر کا زخمی ہونا ہے، جو ایسا مرض ہے کہ مہلک بن سکتا ہے اور دردِ شدید کے باعث مقصود کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پس فقہائے کرام کی وہ عبارات جن میں مغز یا دماغ یا جڑ تک ٹوٹ کے پہنچنے کا ذکر ہے، سب کے معنیٰ ایک ہوگئے'' ۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''البتہ اس میں شک نہیں کہ سینگ کا ٹوٹنا معمولی عیب ہے، تو جس طرح جانور کا اس قسم کے دوسرے چھوٹے عیبوں سے خالی ہونا مستحب ہے، اِسی طرح اس سے خالی ہونا بھی مستحب ہے، شامی جلد ۵، ص: ۲۸۲ میں ہے: ''وَاعْلَمْ اَنَّ الْكُلَّ لَايَخْلُوْ عَنْ عَيْبٍ وَالْمُسْتَحَبُّ أَنْ يَّكُونَ سَلِيْمًا عَنِ الْعُيُوبِ الظَّاهِرَةِ فَمَا جُوِّزَ هٰهُنَا، جُوِّزَ مَعَ الْكَرَاهَةِ، (فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 371 تا 380)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آج کل نہایت صفائی سے سینگ کی افزائش کو روک دیا جاتا ہے یا اتنے چھوٹے سائز تک محدود رکھا جاتا ہے، کہ وہ جانور تاجروں اور خریداروں کے نزدیک جمال والا اور بے عیب سمجھا جاتا ہے، اُس کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے اور اُس سے کوئی منفعت بھی زائل نہیں ہوتی، نہ یہ مقصود میں حارج ہے، لہٰذا ایسے جانور کی قربانی کسی کراہت کے بغیر جائز ہے اور قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے افضل ہے۔ حدیث پاک میں جو ''الْمُسْتَأْصَلَه'' جانور کی قربانی کے عدمِ جواز کی بابت فرمایا گیا، اس سے وہ جانور مراد ہے، جس کے سینگوں کو کھوپڑی اور دماغ کے ساتھ مقامِ اِتّصال سے اُکھیڑ دیا گیا ہو، اِس کا اثر یقیناً دماغ تک پہنچ سکتا ہے اور ظاہری جمال متأثر ہو یا نہ ہو، جانور کی جسمانی اور دماغی صحت متأثر ہوسکتی ہے اور یہ مقصود میں حرج کا باعث ہے۔ لیکن جس جانور کی بابت پوچھا گیا ہے، اُس پر ''اَلْمُسْتَأْصَلَه'' کا اِطلاق نہیں ہوتا۔ یہ خَصّی جانور کی مانند ہے، جس کے کپورے اگرچہ نکال دیئے جاتے ہیں، لیکن نہ اُس کا جمال متأثر ہوتا ہے اور نہ ہی وہ

عیب دار شمار ہوتا ہے، بلکہ خریدار اُسے زیادہ پسند کرتے ہیں اور قیمت بھی نسبۃً زیادہ لگائی جاتی ہے، کیونکہ بعض صورتوں میں اَنڈوے جانوروں میں کراہت کے کچھ اور اسباب پیدا ہوجاتے ہیں۔نَر جانور کا خَصّی ہونا گوشت خوری کے لیے اور قربانی کے لیے عیب نہیں ہے بلکہ بوجوہ ایک درجہ فضیلت کا سبب بنتا ہے۔نَر جانور کا اَنڈوا ہونا صرف اُن لوگوں کے لیے قابلِ ترجیح ہے، جو اسے اپنے ریوڑ میں جانوروں کی افزائشِ نسل کے لیے خریدتے یا پالتے ہیں۔

خُنثیٰ جانور کی قربانی کا حکم

سوال:

قربانی کے جانور میں نر اور مادہ دونوں علامتیں پائی جائیں تو ایسے جانور کی قربانی کرنا کیسا ہے؟، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن کراچی)۔

جواب:

ایسا جانور جس میں نر و مادہ دونوں علامتیں پائی جائیں، اُسے ''خُنثیٰ'' کہتے ہیں، ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَا بِالخُنثٰی لِأَنَّ لَحمَهَا لَا یَنضَجُ''۔

ترجمہ: ''خُنثیٰ جانور کی قربانی جائز نہیں، اس لیے کہ اُس کا گوشت پختہ نہیں ہوتا، (جلد 9، ص:394)''۔

گائے کی قربانی میں زیادہ سے زیادہ سات شراکت دار ہوسکتے ہیں، کم پر کوئی پابندی نہیں

سوال:

چار افراد قربانی کے لیے گائے خرید رہے ہیں، گائے میں 7 حصے ہوتے ہیں، حصوں کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جن چار افراد نے مل کر گائے خریدی ہے، ان کی قربانیوں کے مجموعی حصے اگر سات بنتے ہیں تو اس جانور کی قیمت، چارہ، نگہداشت اور ذبح کا مجموعی خرچ بھی سات حصوں میں تقسیم ہوگا اور جس کے جتنے حصے ہوں گے، اس حساب سے وہ رقم ادا کرے گا، لیکن اگر یہ قربانی اُن چار شرکاء کی طرف سے برابر کی حصہ داری پر ہے تو پھر یہ قربانی چار افراد کی طرف سے ہوگی اور چاروں جملہ مصارف میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اونٹ، بھینس، گائے وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ سات حصوں کی گنجائش ہوتی ہے، کم پر پابندی نہیں ہے، ایک گائے چھ یا پانچ یا چار یا تین یا دو حتیٰ کہ ایک آدمی کی طرف سے بھی ہوسکتی ہے۔

گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کی رات میں قربانی مکروہ ہے، کی تو ادا ہوجائے گی

سوال:

قربانی کا جانور 10 تا 12 ذوالحجہ بعد مغرب یا عشاء ذبح کیا جاسکتا ہے؟، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

دسویں ذوالحجہ کے بعد کی دونوں راتیں ایامِ نحر میں شامل ہیں، ان میں بھی قربانی ہوسکتی ہے، مگر رات میں ذبح کرنا مکروہ ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وَقْتُ الأضْحِيَّةِ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ اَلْعَاشِرُ وَالْحَادِيْ عَشَرَ وَالثَّانِي عَشَرَ، أَوَّلُهَا أَفْضَلُهَا وَآخِرُهَا أَدْوَنُهَا، وَيَجُوزُ فِي نَهَارِهَا وَلَيلِهَا بَعدَ طُلُوعِ الفَجرِ مِنْ يَوْمِ النَّحْرِ إِلَى غُرُوْبِ الشَّمْسِ مِنَ الْيَوْمِ الثَّانِي عَشَرَ، إِلَّا أَنَّهُ يُكْرَهُ الذَّبْحُ فِي اللَّيلِ۔ وَالْمُسْتَحَبُّ ذَبْحُهَا بِالنَّهَارِ دُونَ اللَّيلِ؛ لِأَنَّهُ أَمْكَنُ لِاسْتِيفَاءِ الْعُرُوقِ، كَذَا فِي "الْجَوهَرَةِ النَّيِّرَةِ"۔

ترجمہ:''قربانی کا وقت تین دن ہیں: دس ذوالحجہ، گیارہ ذوالحجہ اور بارہ ذوالحجہ۔اجر کے اعتبار سے دس اور گیارہ ذوالحجہ (بالترتیب) افضل ہیں اور بارہ ذوالحجہ سب سے کم درجہ میں ہے، دسویں ذوالحجہ کے طلوعِ فجر سے بارہ ذوالحجہ کے غروبِ آفتاب تک (یعنی ایامِ نحر میں) دن اور رات میں قربانی جائز ہے، لیکن رات میں ذبح کرنا مکروہ ہے''۔آگے چل کر لکھتے ہیں:''دن میں ذبح کرنا مستحب ہے نہ کہ رات میں، تاکہ (جانور کی) تمام رگیں کٹ جائیں، (یعنی دن کی روشنی میں ذبح کی احتیاط پر عمل کرنا آسان ہے)، جیسا کہ ''الجوہرۃ النیرہ''میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد5،ص:296)''۔

قربانی کے عیب دار جانور کا مسئلہ

سوال:

قربانی کے جانور میں عیب پایا گیا، قربانی کرنے والا دوسرا جانور خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو کیا وہی جانور ذبح کیا جاسکتا ہے؟، (قاضی احمد رحمت، خطیب جامع مسجد اکبر، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

قربانی کے جانور کو عیب سے خالی ہونا چاہیے، معمولی عیب ہو تو کراہت کے ساتھ قربانی ہوجائے گی اور زیادہ عیب ہو تو نہیں ہوگی۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَوِ اشْتَرَاهَا سَلِيمَةً ثُمَّ تَعَيَّبَتْ بِعَيْبٍ مَانِعٍ كَمَا مَرَّ، فَعَلَيْهِ إقَامَةُ غَيْرِهَا مَقَامَهَا إنْ كَانَ غَنِيًّا، وَإِنْ كَانَ فَقِيرًا أَجْزَأَهُ ذٰلِكَ، وَكَذَا لَوْ كَانَتْ مَعِيبَةً وَقْتَ الشِّرَاءِ لِعَدَمِ وُجُوبِهَا عَلَيْهِ، بِخِلَافِ الْغَنِيِّ، وَلَا يَضُرُّ تَعَيُّبُهَا مِنْ اضْطِرَابِهَا عِنْدَ الذَّبْحِ وَكَذَا لَوْ مَاتَتْ فَعَلَى الْغَنِيِّ غَيْرُهَا لَا الْفَقِيرِ''۔

ترجمہ:''اگر کسی نے قربانی کا بے عیب جانور خریدا، پھر اس میں ایسا عیب پیدا ہوگیا، جس کی بنا پر قربانی صحیح نہیں ہوسکتی، پس اگر وہ شخص مال دار ہے تو اس کی جگہ (قربانی کی شرائط کے

مطابق) دوسرے جانور کی قربانی کرے اور اگر وہ شخص فقیر ہے، تو اسی عیب دار جانور کی قربانی اس کے لیے کافی ہے۔اسی طرح اگر فقیر نے قربانی کی نیت سے (ابتدا ہی میں) عیب دار جانور خریدا، تو وہ اس کی قربانی کرسکتا ہے، کیونکہ اس پر (عنداللہ) قربانی واجب نہیں ہے۔اس کے برعکس اگر مال دار شخص نے قربانی کی نیت سے عیب دار جانور خریدا، تو اُس کی قربانی اس کے لیے جائز نہیں ہے (یعنی وہ اس کی جگہ بے عیب جانور خرید کر قربانی کرے)۔البتہ مال دار شخص نے قربانی کے لیے بے عیب جانور خریدا تھا اور ذبح کے وقت اچھل کود کی وجہ سے اس جانور میں عیب پیدا ہوگیا، تو وہ اُسی جانور کو ذبح کرے (اس کی قربانی درست ہے)۔اسی طرح ایک شخص نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا اور قضائے الٰہی سے وہ جانور مر گیا، تو اگر وہ شخص فقیر ہے تو اس پر دوسرا جانور خرید کر قربانی دینا لازم نہیں ہے اور اگر وہ شخص مال دار ہے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا جانور خرید کر ذبح کرے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9،ص:394)''۔

عقیقے کے جانور کی عمر

سوال:

کیا عقیقے کے جانور کی بھی وہی شرائط ہیں جو قربانی کی ہیں یعنی جانور دو دانت کا ہونا ضروری ہے؟، (نجیب الدین شیخ، پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

عقیقے کے جانور کے لیے بھی وہی تمام شرائط ہیں، جو قربانی کے جانور کی ہیں، اونٹ پانچ سال، گائے، بیل کی عمر دو سال، بکرا، بکری ایک سال عمر کا ہونا چاہیے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''وَحُکْمُهَا کَأَحْکَامِ الْأُضْحِیَةِ''۔ترجمہ:'' عقیقہ کے احکام وہی ہیں جو قربانی کے ہیں' (اَلْعقودُ الدرّیّةِ فِی تَنقِیحِ الفَتَاوٰی الْحَامِدِیَةِ، جلد 2،ص:213)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں:

"وَقَدْ صَرَّحَ الْعُلَمَاءُ کَالشَّیْخِ فِی "اَللَّمْعَاتِ" وَغَیْرِہٖ فِی غَیْرِھَا اَنَّ الْعَقِیْقَۃَ کَالْاُضْحِیَۃِ فِی جَمِیْعِ الشَّرَائِطِ وَالْاَحْکَامِ"۔

ترجمہ: "علمائے کرام نے صراحت فرمائی جیسا کہ شیخ محقق نے "لمعات" میں اور دیگر ائمہ نے دیگر کتب میں فرمایا کہ بیشک عقیقہ تمام شرائط واحکام میں قربانی کی مثل ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد20، ص:592)"۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عقیقہ کا جانور اُنہی شرائط کے ساتھ ہونا چاہیے، جیسا قربانی کے لیے ہوتا ہے، (بہار شریعت، جلد سوم، ص:357)"۔ البتہ عام صدقے کے جانور کا ان شرائط کے مطابق ہونا لازم نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اپنے فوت شدہ والدین کے نام پر قربانی کرنے کا شرعی حکم

سوال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اپنے فوت شدہ والدین کی طرف سے قربانی کا عمل جائز اور پسندیدہ ہے یا غلط، جبکہ قربانی کرنے والا اپنی طرف سے بھی قربانی کر رہا ہو، (جسٹس شوکت عزیز صدیقی، اسلام آباد)۔

جواب:

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ صاحب نصاب پر پہلے اپنے اوپر عائد واجب قربانی کو ادا کرنا ضروری ہے، دوسروں کے ایصالِ ثواب کے لیے قربانی کرنا نفلی عبادت ہے اور اپنے ذمے عائد واجبات کو ترک کر کے نفلی عبادات بجالانا ایسا ہی ہے کہ انسان فرض نماز ادا نہ کرے اور نوافل پڑھتا رہے، یہ نوافل کارِ خیر تو ہیں، لیکن فرض کا بدل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اپنی واجب قربانی ادا کرنے کے بعد اگر وسعت ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اپنے فوت شدہ مرحومین کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ مستحسن عمل ہے، کیونکہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنّتِ مبارکہ ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَلِیٍّ، أَنَّهُ كَانَ يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالآخَرُ عَنْ نَفْسِهِ، فَقِيلَ لَهُ: فَقَالَ: أَمَرَنِي بِهِ، يَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَا أَدَعُهُ أَبَدًا''۔

ترجمہ:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: وہ ہر سال دو مینڈھے قربانی کرتے تھے، اُن میں سے ایک نبی ﷺ کی طرف سے اور دوسرا اپنی جانب سے، ان سے اس شِعار کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو فرمایا: مجھے نبی ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے، لہٰذا میں اس شِعار کو کبھی ترک نہیں کروں گا، (سنن ترمذی:1495)''۔ حضرت علی کو نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان استحباب کے طور پر تھا۔

''عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الأَضْحَى بِالمُصَلَّى، فَلَمَّا قَضَى خُطْبَتَهُ نَزَلَ عَنْ مِنْبَرِهِ، فَأُتِيَ بِكَبْشٍ، فَذَبَحَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ، وَقَالَ بِسْمِ اللهِ، وَاللهُ أَكْبَرُ، هَذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي''۔

ترجمہ:'' حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں نے عیدگاہ میں نبی ﷺ کے ساتھ عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھی، پس جب آپ خطبۂ عید پڑھ چکے (یعنی نمازِ عید سے فارغ ہوگئے) تو آپ ﷺ منبر سے اترے، پھر (قربانی کے لیے) ایک مینڈھا لایا گیا جسے آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' پڑھ کر ذبح کیا اور فرمایا: یہ قربانی میری جانب سے اور میری اُمّت کے اُن افراد کی جانب سے ہے، جو (استطاعت نہ ہونے کے سبب) قربانی نہیں کر پاتے، (سنن ترمذی:1521)''۔

علامہ علی القاری لکھتے ہیں:

''وَهُوَ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ شَارَكَهُ آلَهُ وَأُمَّتَهُ فِي قَبُوْلِ أُضْحِيَاتِهِم''۔

ترجمہ:'' وہ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ہیں، انہوں نے اپنی آل اور پوری امت کو ان کی قربانیوں کے قبول کرنے میں شریک فرمایا ہے (مِرْقَاةُ الْمَفَاتِيح ج:3، ص:507)''۔

اس حدیث کی شرح میں شیخ عبید اللہ مبارک پوری ''مرعاۃ المفاتیح'' میں لکھتے ہیں:

''وَالْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ التَّضْحِيَةَ تَجُوْزُ عَمَّنْ مَاتَ''۔

ترجمہ: ''یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ فوت شدہ شخص کی طرف سے قربانی جائز ہے''۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''قَالَ عَبْدُ اللهِ ابْنُ الْمُبَارَكِ: أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ يُّتَصَدَّقَ عَنْهُ وَلَا يُضَحّٰى، وَإِنْ ضَحّٰى فَلَا يَأْكُلُ مِنْهَا شَيْئًا وَيُتَصَدَّقُ بِهَا كُلِّهَا، اِنْتَهٰى قَالَ فِي ''غُنْيَةُ الْأَلْمَعِيْ'' مَا مُحَصَّلُهُ: إِنَّ قَوْلَ مَنْ رَخَّصَ فِي التَّضْحِيَةِ عَنِ الْمَيِّتِ مُطَابِقٌ لِلْأَدِلَّةِ، وَلَا دَلِيْلَ لِمَنْ مَنَعَهَا، وَقَدْ ثَبَتَ أَنَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنْ نَّفْسِهِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ وَالْآخَرُ عَنْ أُمَّتِهِ مِمَّنْ شَهِدَ لَهُ بِالتَّوْحِيْدِ وَشَهِدَ لَهُ الْبَلَاغَ، وَمَعْلُوْمٌ أَنَّ كَثِيْرًا مِنْ أُمَّتِهِ قَدْ كَانُوْا مَاتُوْا فِيْ عَهْدِهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَدَخَلَ فِيْ أُضْحِيَّتِهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَحْيَاءُ وَالْأَمْوَاتُ كُلُّهُمْ، وَالْكَبْشُ الْوَاحِدُ الَّذِيْ يُضَحِّيْ بِهٖ عَنْ أُمَّتِهٖ كَمَا كَانَ لِلْأَحْيَاءِ مِنْ أُمَّتِهٖ كَذٰلِكَ كَانَ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أُمَّتِهٖ بِلَا تَفْرِقَةٍ، وَلَمْ يَثْبُتْ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَصَدَّقُ بِذٰلِكَ الْكَبْشِ كُلِّهٖ وَلَا يَأْكُلُ مِنْهُ شَيْئًا أَوْ كَانَ يَتَصَدَّقُ بِجُزْءٍ مُعَيَّنٍ بِقَدْرِ حِصَّةِ الْأَمْوَاتِ، بَلْ قَالَ أَبُوْرَافِعٍ: إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطْعِمُهُمَا جَمِيْعًا الْمَسَاكِيْنَ، وَيَأْكُلُ هُوَ وَأَهْلُهُ مِنْهُمَا، رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَكَانَ دَأْبُهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ يَأْكُلُ مِنَ الْأُضْحِيَّةِ هُوَ وَأَهْلُهُ، وَيُطْعِمُ مِنْهَا الْمَسَاكِيْنَ، وَأَمَرَ بِذٰلِكَ أُمَّتَهُ، وَلَمْ يُحْفَظْ عَنْهُ خِلَافُهُ، فَإِذَا ضَحَّى الرَّجُلُ عَنْ نَفْسِهٖ وَعَنْ بَعْضِ أَمْوَاتِهٖ، أَوْ عَنْ نَفْسِهٖ وَعَنْ أَهْلِهٖ وَعَنْ بَعْضِ أَمْوَاتِهٖ فَيَجُوْزُ أَنْ يَّأْكُلَ هُوَ وَأَهْلُهُ مِنْ تِلْكَ الْأُضْحِيَّةِ، وَلَيْسَ عَلَيْهِ أَنْ يَّتَصَدَّقَ بِهَا كُلِّهَا''۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن مبارک نے کہا: میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی طرف سے صدقہ کیا جائے، قربانی نہ کی جائے اور اگر کوئی قربانی کرتا ہے، تو وہ اس میں سے خود نہ کھائے، سارا گوشت صدقہ کردے، عبداللہ بن مبارک کی بات ختم ہوئی، اس کے رد

میں ''غُنْیَۃُ الْاَلْمَعِیْ'' میں کہا: جنہوں نے وفات پانے والوں کی طرف سے قربانی کے جواز کی رخصت دی ہے، ان کا قول شرعی دلائل کے مطابق ہے اور منع کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو مینڈھے ذبح فرماتے تھے، ایک اپنی اور اپنے اہلبیت کی جانب سے اور دوسرا اصحابِ ایمان اُمّتیوں کی جانب سے۔ یہ بات معلوم ہے کہ آپ کے بہت سے امتی آپ کے عہدِ مبارک میں وفات پاچکے تھے، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تمام زندوں اور وفات پانے والوں کو بلاتفریق اپنی قربانی میں شامل فرمایا اور وہ ایک مینڈھا جسے آپ اپنی امت کی طرف سے قربان فرماتے تھے، جس طرح وہ آپ کی امت کے زندہ لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا، اسی طرح وہ بلاتفریق آپ کی امت کے فوت شدہ لوگوں کی جانب سے بھی ہوتا تھا اور یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس مینڈھے کے پورے گوشت کو صدقہ کیا ہو اور اس میں سے خود کچھ بھی نہ کھایا ہو یا وفات پانے والوں کے حصے کے اعتبار سے کچھ گوشت صدقہ کردیا ہو، بلکہ ابورافع رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس قربانی کا گوشت مساکین کو بھی کھلاتے، خود بھی تناول فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلاتے، اسے امام احمد نے روایت کیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ قربانی سے خود بھی کھاتے، گھر والوں اور مساکین کو بھی کھلاتے اور آپ نے امت کو بھی اس کا حکم فرمایا اور اس کا خلاف آپ سے ثابت نہیں ہے، سو جب کوئی شخص اپنی طرف سے اور اپنے وفات پانے والوں کی طرف سے یا اپنے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربانی کرے، تو خود بھی کھاسکتا ہے، گھر والوں کو بھی کھلاسکتا ہے اور اس پر پورے گوشت کا صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، (مرعاۃ المفاتیح، ج:5، ص:93)''۔

یعنی صاحبِ ''مُنْیَۃُ الْاَلْمَعِیْ'' نے عبداللہ بن مبارک کے قول سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے مالی صدقہ دینے کی بجائے قربانی کرنے کو جائز اور افضل قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ نفلی قربانی کے گوشت کا بھی وہی حکم ہوگا، جو واجب قربانی کا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ فِي "الْبَدَائِعِ": لِأَنَّ الْمَوْتَ لَا يَمْنَعُ التَّقَرُّبَ عَنِ الْمَيِّتِ بِدَلِيلِ أَنَّهُ يَجُوزُ أَنْ يَتَصَدَّقَ عَنْهُ وَيَحُجَّ عَنْهُ، وَقَدْ صَحَّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحّٰى بِكَبْشَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنْ نَفْسِهِ وَالْآخَرُ عَمَّنْ لَمْ يَذْبَحْ مِنْ أُمَّتِهِ وَإِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ قَدْ مَاتَ قَبْلَ أَنْ يَذْبَحَ، لِأَنَّ لَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِلَايَةً عَلَيْهِمْ"۔

ترجمہ: "بدائع الصنائع" میں ہے: کیونکہ موت میّت کی طرف سے تقرُّب الٰہی (یعنی کسی مالی یا بدنی عبادت کے ایصالِ ثواب) میں مانع نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا اور نفلی حج کرنا جائز ہے اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے دو مینڈھے ذبح کیے، ایک اپنی جانب سے اور دوسرا اپنی اُمّت کے اُن لوگوں کی جانب سے جنھوں نے قربانی نہیں کی، حالانکہ اُن میں سے بعض اس قربانی سے پہلے وفات پاچکے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُن پر ولایت حاصل تھی، (ردالمحتار، جلد 9، ص: 395)"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تمام اُمّت کے لیے ایک مینڈھا ذبح کرنا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خصائص میں سے ہے، اس کے دو معنیٰ ہوسکتے ہیں: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قربانی کی استطاعت نہ رکھنے والے اپنے تمام اُمتیوں کو اس اجر میں شریک فرمایا۔ (۲) ہر ایک کو پوری قربانی کا اجر ملے گا اور اس معنیٰ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خصوصیت ہے۔

علامہ محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قُلْتُ: هٰذَا لَا يَدُلُّ عَلٰى وُقُوعِهٖ مِنِ اثْنَيْنِ بَلْ هٰذَا هِبَةُ ثَوَابِهٖ"۔

ترجمہ: "میں کہتا ہوں: یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ ایک مینڈھے کی قربانی دو افراد کی طرف سے ادا ہوجاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کا ثواب اس شخص کو ہبہ کیا گیا، (البنایہ، ج: 11، ص: 16)"۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "احادیث سے ثابت ہے کہ سید عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس امت مرحومہ کی طرف سے قربانی کی، یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بے شمار الطاف میں سے ایک خاص کرم ہے کہ اس موقع پر بھی اُمّت کا خیال فرمایا اور

جولوگ قربانی نہ کر سکے، اُن کی طرف سے خود ہی قربانی ادا فرمائی۔ یہ شبہ کہ ایک مینڈھا اِن سب کی طرف سے کیونکر ہوسکتا ہے یا جولوگ ابھی پیدا ہی نہ ہوئے، اُن کی قربانی کیونکر ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خصائص سے ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چھ مہینے کے بکری کے بچے کی قربانی ابوبردہ رضی اللہ عنہ کے لیے جائز فرما دی اور دوسروں کے لیے اس کی ممانعت کردی، اسی طرح اس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خصوصیت ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمّت کی طرف سے قربانی کی تو جو مسلمان صاحبِ استطاعت ہو، اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام کی ایک قربانی کرے تو زہے نصیب اور بہتر سینگ والا مینڈھا ہے، جس کی سیاہی میں سفیدی کی بھی آمیزش ہو، جیسے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مینڈھے کی قربانی فرمائی، (بہارِ شریعت، جلد سوم، ص:353)"۔

ولی کا سب کی طرف سے قربانی کرنا

سوال:

گھر میں ایک سے زائد افراد صاحبِ نصاب ہیں، تو کیا کسی ایک فرد کی جانب سے قربانی کرنے پر سب کی جانب سے قربانی ہوجائے گی؟۔ (محمد ابدال، سرجانی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

قربانی ہر صاحبِ نصاب شخص پر واجب ہے، کسی ایک فرد کی جانب سے قربانی کرنے پر صرف اُسی کا واجب ادا ہوگا اور خاندان کے بقیہ افراد کے ذمے سے قربانی ساقط نہیں ہوگی۔ یہاں صاحبِ نصاب سے مراد ایسا شخص ہے جو دوسو درہم یعنی 612.4 گرام چاندی یا اس کی قیمت کے برابر مال نقد یا مالِ تجارت کا مالک ہو، وہ غنی ہے، اُس پر قربانی واجب ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالْمُوْسِرُ فِیْ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ مَنْ لَهٗ مِائَتَا دِرْهَمٍ أَوْ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا أَوْ شَیْءٌ يَبْلُغُ ذٰلِكَ سِوَى مَسْكَنِهٖ وَمَتَاعِ مَسْكَنِهٖ وَمَرْكُوْبِهٖ وَخَادِمِهٖ فِیْ حَاجَتِهِ الَّتِیْ لَا يَسْتَغْنِیْ عَنْهَا"۔

ترجمہ: "ظاہر الروایہ کے مطابق ایسا شخص غنی ہے، جس کے پاس دوسو درہم یا بیس دینار

ہوں یا کوئی ایسی چیز (جس کی مالیت 612،4 گرام چاندی یا اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو)، ماسوا رہائش کا مکان، خانہ داری کا سامان اور سواری یا خادم جو اس کی اپنی حاجت کے لیے ہے کہ جس کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَلَیْسَ عَلَی الرَّجُلِ أَنْ یُّضَحِّیَ عَنْ أَوْلَادِهِ الْکِبَارِ وَامْرَأَتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهِمْ، وَفِی الْوَلَدِ الصَّغِیْرِ عَنْ أَبِی حَنِیفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی رِوَایَتَانِ: فِی ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ تُسْتَحَبُّ وَلَا تَجِبُ بِخِلَافِ صَدَقَةِ الْفِطْرِ، وَفِی رِوَایَةِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِی حَنِیفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی: أَنَّهٗ یَجِبُ أَنْ یُّضَحِّیَ عَنْ وَلَدِهِ الصَّغِیْرِ وَوَلَدِ وَلَدِهِ الَّذِی لَا أَبَ لَهٗ وَالْفَتْوٰی عَلٰی ''ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ''، وَإِنْ کَانَ لِلصَّغِیْرِ مَالٌ، قَالَ بَعْضُ مَشَایِخِنَا تَجِبُ عَلَی الْأَبِ، کَذَا فِی ''فَتَاوٰی قَاضِی خَانْ''۔

ترجمہ: ''آدمی پر اپنی بالغ اولاد اور بیوی کی طرف سے ان کی اجازت کے بغیر قربانی کرنا واجب نہیں ہے، البتہ نابالغ اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ نابالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنے کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں ہیں: ''ظاہر الروایہ'' میں ہے کہ یہ مُستحب ہے، واجب نہیں ہے، امام حسن سے امام اعظم کا ایک قول یہ منقول ہے: نابالغ اولاد اور یتیم پوتے پوتیوں کی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے اور فتویٰ ''ظاہر الروایہ'' پر ہے اور اگر نابالغ بیٹے بیٹیاں مالدار ہیں (یعنی ان کو وراثت میں یا ہبہ کے ذریعے مال ملا ہے) تو ہمارے بعض مشائخ نے کہا ہے کہ ان کی طرف سے بھی قربانی واجب ہے، ''فتاویٰ قاضی خان'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:293)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ''قربانی ولی کرے، تو سب گھر والوں کی طرف سے ہوجائے گی کیونکہ سب اولاد شامل ہے، مثلاً: بیٹے اور بیٹوں کی اولاد، نواسے وغیرہ اور دادا چونکہ ولی ہے، اس لیے سب مال واسباب کا مالک ہے اور دوسروں کو اختیارات بالکل نہیں ہیں اور ولی اپنے دل میں خیال کر کے قربانی یا دیگر صدقات یا زکوٰۃ یا میلاد شریف کرتا ہے، اس صورت میں سب کی طرف سے قبول ہوگی یا ولی کی

طرف سے؟، بیّنوا توجروا‘‘۔

آپ جواب میں لکھتے ہیں: ’’ایک قربانی نہ سب کی طرف سے ہوسکتی ہے، نہ سوا مالک نصاب کے کسی اور پر واجب ہے۔ اگر اس کی بالغ اولاد میں کوئی خود صاحب نصاب ہوتو وہ اپنی قربانی جدا کرے، یونہی زکوٰۃ جس جس پر واجب ہے، یہ الگ الگ دیں، ایک کی زکوٰۃ سب کی طرف سے نہیں ہوسکتی، جو چیز واجب شرعی نہیں، مثلاً: صدقہ نفل ومیلاد مبارک وہ بھی ایک کے کرنے سے سب کی طرف سے قرار نہ پائے گا، ہاں کرنے والا ہر ایک فعل، خواہ فرض ہو اپنی اولاد اور گھر والوں سے جن کو چاہے، (ثواب) پہنچا سکتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص:369)‘‘۔

مزید سوال ہوا: ’’آدمی پر اولادِ صغار کی طرف سے قربانی مثل صدقۂ فطر واجب ہے۔ اپنے مال سے کرے یا ہر شخص اپنی علیحدہ کرے اور جس قدر چاہے، اس قدر کرے، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ’’اولادِ صغار کی طرف سے قربانی اپنے مال سے کرنا واجب نہیں، ہاں مستحب ہے اور قربانی جس پر واجب ہے اس پر ایک ہی واجب ہے زیادہ نفل ہے۔ چاہے ہزار جانور قربانی کرے گا ثواب ہے، نہ کرے گا کچھ مؤاخذہ نہیں۔ ’’فِی الدُّرِّ الْمُخْتَارِ تَجِبُ التَّضْحِیَۃُ عَنْ نَفْسِہٖ لَاعَنْ طِفْلِہٖ عَلَی الظَّاھِرِبِخِلَافِ الْفِطْرَۃِ شَاۃٌ أَوْ سُبُعُ بَدَنَۃٍ، مُلْتَقِطًا‘‘، ترجمہ: ’’درمختار میں ہے: ظاہر مذہب حنفی کے مطابق ہر شخص پر قربانی خود اس کی اپنی طرف سے واجب ہے، نابالغ اولاد کی طرف سے اس پر واجب نہیں، البتہ نابالغ اولاد کا فطرانہ واجب ہے۔ قربانی کے لیے بکری یا اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ واجب ہے‘‘۔

’’وَفِی الْخَانِیَۃِ:فِی ’’ظَاھِرِالرِّوَایَۃِ‘‘ یُسْتَحَبُّ وَلَا یَجِبُ بِخِلَافِ صَدَقَۃِ الْفِطْرِ، وَالْفَتْوٰی عَلٰی ظَاھِرِالرِّوَایَۃِ مُلَخَّصًا‘‘، ترجمہ: ’’اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے: ظاہر الروایہ یہی ہے کہ نابالغ کی طرف سے قربانی مستحب ہے، واجب نہیں ہے اور فتویٰ ’’ظاہر الروایہ‘‘ پر ہے، البتہ نابالغ اولاد کا صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے، ملخصا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص:454)‘‘۔

مسلمان عورت اور اہلِ کتاب کے ذبیحے کا حکم

سوال:

کیا عورت کا ذبیحہ جائز ہے، اگر وہ ایامِ حیض سے ہو، تو کیا حکم ہے؟، نیز غیر مسلم اہلِ کتاب کے ذبیحے کا کیا حکم ہے؟، (خاور بیگ، نیویارک)۔

جواب:

ذبح سے جانور حلال ہونے کے لیے چند شرطیں ہیں:

(۱) ذبح کرنے والا مرد یا عورت ہو، ذبح کے لیے بلوغت شرط نہیں، عاقل بچہ بھی اگر ذبح کرنا جانتا ہو، تو اس کا ذبیحہ جائز ہے، اسی طرح اگر کسی کی عقل میں نقص ہے، لیکن ذبح کرنا جانتا ہے، تو اس کا ذبیحہ بھی جائز ہے۔

(۲) ذبح کرنے والا مُسلمان ہو یا اہلِ کتاب۔

(۳) ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے۔

(۴) ذبح کے وقت جانور زندہ ہو۔

(۵) خود ذبح کرنے والا تکبیر (بِسْمِ اللهِ اَللهُ اَکْبَرْ) کہے۔

(۶) ذبح کا آلہ تیز اور دھاردار ہو، جو خون بہادے۔

(۷) اَحناف کے نزدیک چار رگوں میں سے کم از کم تین رگوں کا کاٹنا ضروری ہے۔

خود ذبح کرنے والے کو بسم اللہ کہنا ضروری ہے، دوسرے کا کہنا اس کے کہنے کے قائم مقام نہیں ہوسکتا، یعنی اگر ذابح نے جان بوجھ کر بسم اللہ ترک کی ہو، تو دوسرے کے بسم اللہ پڑھنے سے جانور حلال نہیں ہوگا، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”وَشَمِلَ مَا إِذَا كَانَ الذَّابِحُ اثْنَيْنِ، فَلَوْ سَمّٰى أَحَدُهُمَا وَتَرَكَ الثَّانِيْ عَمْدًا، حُرِّمَ أَكْلُهُ، كَمَا فِي ”التَّتَارْخَانِيَّة“۔

ترجمہ: ”اگر ذبح کرنے والے دو فرد ہوں (یعنی چھری پر دونوں کا ہاتھ ہو، تو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کا وجوب) دونوں کو شامل ہے، اگر اُن دونوں میں سے کسی ایک نے تسمیہ

(بسم اللہ) پڑھی اور دوسرے نے جان بوجھ کر ترک کردی، تو اس ذبیحے کا کھانا حرام ہے، جیسا کہ ''فتاویٰ تتارخانیہ'' میں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:365)''۔

مُعینِ ذابح سے مراد یہی ہے کہ ذبح کرنے میں وہ مُعین ہو یعنی دونوں نے مل کر ذبح کیا ہو اور دونوں نے چھری پھیری ہو مثلاً ذابح کمزور ہے کہ تنہا اس کی قوت کافی نہیں ہوگی، دوسرے نے مدد کی اور دونوں نے مل کر چھری چلائی۔ اگر دوسرا شخص فقط جانور کو پکڑے ہوئے تھا تو یہ مُعینِ ذابح نہیں، اس پر بسم اللہ پڑھنا لازم نہیں ہے، نہ اس کا پڑھنا ذابح کے پڑھنے کے قائم مقام ہوگا۔

عورت کا ذبیحہ جائز ہے اور ذبح کرنے والی عورت کے لیے بھی وہی اَحکام ہیں، جو مرد ذابح کے لیے ہیں، اِسی طرح اگر عورت ایامِ حیض میں ہے، تو بھی ذبیحہ جائز ہے، کیونکہ فعلِ ذبح کے لیے طہارت شرط نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

''وَعَنْ کَعْبِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، أَنَّہُ کَانَتْ لَہُ غَنَمٌ تَرْعٰی بِسَلْعٍ، فَأَبْصَرَتْ جَارِیَۃٌ لَنَا بِشَاۃٍ مِنْ غَنَمِنَا مَوْتًا فَکَسَرَتْ حَجَرًا فَذَبَحَتْھَا بِہٖ، فَسَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَأَمَرَہٗ بِأَکْلِھَا''۔

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ان کے پاس بکریوں کا ریوڑ تھا، جو سَلع پہاڑ پر چرتا تھا، ہماری باندی نے بکریوں کے ریوڑ سے ایک بکری کو مرتے ہوئے دیکھا، اس نے ایک دھار والے پتھر کو توڑ کر اس بکری کو ذبح کردیا۔ پھر حضرت کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس کے (حلال ہونے کے) بارے میں سوال کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بکری کو کھانے کا حکم دیا، (مشکوٰۃ المصابیح:4072)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْمَرْأَۃُ الْمُسْلِمَۃُ وَالْکِتَابِیَّۃُ فِی الذَّبْحِ کَالرَّجُلِ''۔

ترجمہ: ''مسلمہ یا کتابیہ عورت کے ذبیحے کا حکم مرد کے مثل ہے''۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَمِنْھَا أَنْ یَّکُوْنَ مُسْلِمًا أَوْ کِتَابِیًّا فَلَا تُؤْکَلُ ذَبِیْحَۃُ أَھْلِ الشِّرْکِ وَالْمُرْتَدِّ''۔

ترجمہ: ''ذبح کے شرائط میں سے یہ ہے: ذبح کرنے والا مسلم ہو یا کتابی ہو، لہٰذا مشرک اور مرتد کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا (کہ حرام ومردار ہے)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 286)''۔

ہمارے بعض معاصر فقیہ ''اہلِ کتاب'' سے متعلق احکام (جن میں اہلِ کتاب کا ذبیحہ اور کتابیہ سے نکاح کا حکم بھی شامل ہے) بیان کرتے یا لکھتے وقت عصر حاضر کے یہود ونصاریٰ کو اِس جواز یا رخصت کا مصداق بننے سے خارج قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ موجودہ یہود ونصاریٰ مشرک ہیں یا سیکولر (لا مذہب) ہیں۔ ہماری نظر میں اہلِ کتاب کے بارے میں یہ احکام آج بھی قائم ہیں۔ اگر موجودہ یہود ونصاریٰ خدا کے وجود کو مانتے ہوں اور خدا کے نام پر ذبح کریں، تو اُن کا ذبیحہ حلال ہوگا اور اگر پوری طرح دین سے بیزار ہیں کہ خدا کے وجود پر بھی یقین نہیں ہے، تو ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج کل یہود ونصاریٰ کی ایک بڑی تعداد مُلحد (Atheist) ہے، یعنی الہامی وسماوی مذہب سے اُن کی عملی وابستگی تو دور کی بات ہے، کوئی کمزور سا نظریاتی اور اعتقادی تعلق بھی باقی نہیں رہا۔ ایسے لوگوں کو اہلِ کتاب کے زمرے میں شمار کرنا اور اُن پر اہل کتاب کے حکم کا اطلاق کرنا درست نہیں ہے اور امریکہ کے دورے کے دوران ہمیں بعض ڈاکٹر صاحبان نے بتایا کہ ایسے کئی لوگ آتے ہیں کہ اگر اُن سے اُن کا مذہب پوچھا جائے، تو کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے بغیر کہتے ہیں: ''ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے''، پس اُن پر اہل کتاب کا اطلاق درست نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''وَفِی الْمَبْسُوطِ: وَیَجِبُ أَنْ لَا یَأْکُلُوا ذَبَائِحَ أَهْلِ الْکِتَابِ إِنْ اعْتَقَدُوا أَنَّ الْمَسِیحَ إِلٰهٌ وَأَنَّ عُزَیْرًا إِلٰهٌ، وَلَا یَتَزَوَّجُوا نِسَاءَهُمْ، لٰکِنْ فِی مَبْسُوطِ شَمْسِ الْأَئِمَّةِ وَتَحِلُّ ذَبِیحَةُ النَّصَارٰی مُطْلَقًا سَوَاءٌ قَالَ: ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ أَوْ لَا، وَمُقْتَضَی الدَّلَائِلِ الْجَوَازُ، کَمَا ذَکَرَهُ التُّمُرْتَاشِیُّ فِی فَتَاوَاهُ، وَالْأَوْلٰی أَنْ لَا یَأْکُلَ ذَبِیحَتَهُمْ وَلَا یَتَزَوَّجَ مِنْهُمْ إِلَّا لِلضَّرُورَةِ

كَمَا حَقَّقَهُ الْكَمَالُ بْنُ الْهُمَامِ وَفِي "الْمِعْرَاجِ" أَنَّ اشْتِرَاطَ مَا ذُكِرَ فِي النَّصَارَى مُخَالِفٌ لِعَامَّةِ الرِّوَايَاتِ (قَوْلُهُ إِلَّا إِذَا سُمِعَ مِنْهُ عِنْدَ الذَّبْحِ ذِكْرُ الْمَسِيحِ) فَلَوْ سُمِعَ مِنْهُ ذِكْرُ اللهِ تَعَالَى لٰكِنَّهُ عَنٰى بِهِ الْمَسِيحَ قَالُوا يُؤْكَلُ إِلَّا إِذَا نَصَّ، فَقَالَ بِاسْمِ اللهِ الَّذِي هُوَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ هِنْدِيَّةٌ، وَأَفَادَ أَنَّهُ يُؤْكَلُ إِذَا جَاءَ بِهِ مَذْبُوحًا "عِنَايَةٌ"، كَمَا إِذَا ذَبَحَ بِالْحُضُورِ وَذَكَرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى وَحْدَهٗ"۔

ترجمہ: "اور امام محمد بن حسن شیبانی کی "مبسوط" یعنی اصل میں ہے: اگر اہلِ کتاب کا عقیدہ یہ ہو کہ مسیح علیہ السلام "اِلٰہ" ہیں یا عُزیر علیہ السلام "اِلٰہ" ہیں، تو واجب ہے کہ اُن کا ذبیحہ نہ کھائیں اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کریں، لیکن شمس الائمہ سرخسی کی "مبسوط" میں ہے: نصاریٰ کا ذبیحہ مطلقاً حلال ہے، خواہ وہ تثلیث (Trinity) کا قائل ہو یا نہ ہو اور دلائل کا تقاضا جواز ہے، جیسا کہ "تمر تاشی" نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر نہ ان کا ذبیحہ کھائے اور نہ اُن سے نکاح کرے، جیسا کہ علامہ کمال الدین ابن ہمام نے تحقیق کی ہے۔ اور "معراج الدرایہ" میں ہے: نصاریٰ کے ذبیحے کے (حلال ہونے کے) بارے میں جو شرط ذکر کی ہے، یہ عام روایات کے خلاف ہے، علامہ علاؤ الدین حصکفی کا یہ قول کہ سوائے اس کے کہ اس سے ذبح کے وقت مسیح کا نام سنا جائے (یعنی ذابح نے بِاسْمِ الْمَسِيْحِ کہا ہو)، لیکن اگر (ذبح کے وقت) اس سے اللہ تعالیٰ کا نام سنے، لیکن وہ اُس سے مسیح علیہ السلام مراد لے رہا ہو تو بعض فقہاء نے کہا: اُس ذبیحے کو کھایا جائے، سوائے اُس صورت کے کہ وہ صراحت سے کہے: "بِسْمِ اللهِ الَّذِي هُوَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ"، (یعنی اس اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کر رہا ہوں جو تین میں کا تیسرا ہے)، (بحوالہ: عالمگیری)، "عنایہ" میں ہے: "اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ اگر اہلِ کتاب کا ذبیحہ آجائے، تو اسے کھا سکتے ہیں"، جیسے کہ کسی کے سامنے کوئی کتابی شخص اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرے، تو اُسے کھانا جائز ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 359)"۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّهُ العزیز سے سوال کیا گیا: "عورت کا ذبح کیا ہوا حلال اور

درست ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا:''عورت کا ذبیحہ جائز ہے جبکہ ذبح کرنا جانتی ہو اور(دیگر) شرائطِ حِلّت (بھی) پائی جائیں، درمختار میں ہے:'' وَشَرْطُ کَوْنُ الذَّابِحِ مُسْلِمًا أَوْ کِتَابِیاً، وَلَوِ امْرَأَۃً ''(باختصار)۔ترجمہ:''ذبح کرنے والے کا مسلمان یا کتابی ہونا شرط ہے اگرچہ عورت ہو،(فتاویٰ رضویہ، جلد20،ص:251)''۔کتابیہ سے نکاح کے جواز یا اہلِ کتاب کے ذبیحے کے حلال ہونے کا حکم بیان کرنے کا مقصد اُس کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں ہے اور نہ یہ پسندیدہ ہے، ہم بھی اس سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن یہاں محض شرعی حکم بیان کرنا مقصود ہے۔

نکاح کے مسائل

محرم الحرام اور صفر المظفر میں نکاح کا حکم

سوال:

عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ محرم الحرام اور صفر المظفر میں شادی بیاہ نہیں کرنا چاہیے، اس بارے میں شرعی رہنمائی فرمائیں، (ڈاکٹر چوہدری عبدالرزاق، کالا گوجراں، جہلم)۔

جواب:

شریعت کی رُو سے نکاح کی حقیقت یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں بالغ لڑکا اور لڑکی براہِ راست یا وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کرلیں۔ نکاح کی تقریب سادگی سے منعقد ہو اور اِس کے بعد باوقار انداز میں رخصتی۔ موجودہ دور میں شادی کی تقریبات میں جو کچھ لہو ولعب اور غیر شرعی رسوم انجام دی جاتی ہیں، شریعتِ مُطہرہ میں اُن کی ہر سطح پر مذمت کی گئی ہے۔ رسوم کی بنا عُرف پر ہے، جب تک کسی رسم کی ممانعت شریعت سے ثابت نہ ہو، اُسے حرام یا ناجائز نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ لازم ہے کہ ایسی رسوم کو ادا کرنے کے لیے کسی فعلِ حرام کا ارتکاب نہ ہو۔ ماہِ محرم الحرام کے فضائل ابتدائے آفرینش سے مُسلّم ہیں، حضرت آدم علیہ السّلام کی تخلیق کے وقت سے ہی یہ ماہ فضیلتوں والا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہی دین مستقیم ہے، سو ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، (التوبہ:36)''۔ ان کی تفصیل اس حدیث مبارک میں ہے:

''السَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثٌ مُتَوَالِيَاتٌ ذُو الْقَعْدَةِ، وَذُو

الحِجَّةِ، وَالمُحَرَّمُ، وَرَجَبُ، مُضَرَ الَّذِي بَيْنَ جُمَادَى، وَشَعْبَانَ"۔

ترجمہ: ''سال بارہ مہینے کا ہے، اُن میں سے چار حُرمت والے ہیں، تین متواتر ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور (قبیلۂ) مُضر کا رجب جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے، (صحیح بخاری:4662)''۔

اِن حُرمت والے مہینوں میں ایک مہینہ مُحرم الحرام کا ہے، جو ابتدائے آفرینش سے ہی حُرمت والا ہے، اِس ماہ کا ایک دِن جسے یومِ عاشور (دس محرم) کہا جاتا ہے، عشر سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ دس کے ہیں۔ عاشورہ سے مراد ماہِ مُحرم کا دسواں دن ہے۔ بعض اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ اس دن کو عاشورہ اِس لئے کہتے ہیں کہ اِس دن میں اللہ تعالیٰ نے دس نبیوں پر دس کرامتوں کا انعام فرمایا:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ (۲) حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر رُکی۔ (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو فرعون سے نجات ملی، فرعون غرق ہوا۔ (۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اِسی دن آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ (۵) حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے خلاصی ملی اور اِسی دن اُن کی اُمّت کا قصور معاف ہوا۔ (۶) حضرت یوسف علیہ السلام کنویں سے نکالے گئے۔ (۷) حضرت ایوب علیہ السلام کو مشہور بیماری سے شفا ملی۔ (۸) حضرت ادریس علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے۔ (۹) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اِسی دن اُن پر نارِ نمرود گلزار ہوئی۔ (۱۰) حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک عطا ہوا۔ پھر ۶۱ھ میں سانحۂ کربلا رونما ہوا، نواسۂ رسول امام عالی مقام حضرت حسین اور آپ کے اہلبیت اطہار و اعوان و انصار رضی اللہ عنہم کو ظلماً شہید کیا گیا۔ ان نفوسِ قدسیہ نے راہِ حق میں عزیمت و استقامت، تحملِ مصائب اور ایثار و شہادت کی لازوال مثالیں قائم کیں، جنہیں تا قیامت فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

مسئلہ یہ نہیں کہ نکاح کی تقریب کس ماہ میں منعقد کی جائے اور کس ماہ میں نہیں، اگر سادگی سے شرعی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے تقریبِ نکاح منعقد کی جائے تو سال کے کسی بھی حصے

میں اس کی کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اور قرآن وسنت سے ایسی کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔

صدرالشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ماہِ صفر کو لوگ منحوس جانتے ہیں، اس میں شادی بیاہ نہیں کرتے ،لڑکیوں کو رخصت نہیں کرتے اور بھی اس قسم کے کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں، خصوصاً ماہ صفر کی ابتدائی تیرہ تاریخیں بہت زیادہ نحس مانی جاتی ہیں اور ان کو تیرہ تیزی کہتے ہیں، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں، (بہارِ شریعت ،جلد سوم ،حصہ،16 ،ص:659)"۔یعنی شریعت کی رُو سے بے اصل باتیں ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بالعموم محرم میں شادی نہیں کی جاتی ،لیکن اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے، ہر جائز کام کو کسی خاص موقع پر کرنا ضروری نہیں ہے ۔محرم الحرام میں شادی کی شرعی ممانعت کے بارے میں ائمۂ اہلبیت سے بھی کوئی روایت نہیں ہے۔ پس اگر کوئی کسی منفی جذبے کے تحت نہیں بلکہ اتفاقاً یا سہولت کے پیشِ نظر محرم الحرام میں شادی کر لے تو اس پر ملامت نہ کی جائے اور اگر کوئی محض سانحۂ کربلا کے احترام میں شادی نہیں کرتا جبکہ جواز کا قائل ہے،تو یہ شِعار بھی قابلِ ملامت نہیں ہے، ہر انسان کے اپنے اپنے جذبات ہوتے ہیں ۔اسی سبب لوگ ہمارے خطے میں بالعموم محرم میں شادی نہیں کرتے ،اس طرح کے سوالات اٹھانے میں کوئی دینی حکمت کارفرما نہیں ہے،البتہ کوئی شرعی ممانعت کا قول کرے تو اس کی تردید اور وضاحت لازمی ہے۔

نکاح سے متعلق جاہلیت پر مبنی غیر شرعی رسوم
(غَگ ،قرآن سے نکاح ، عام مطلّقہ اور متبنّیٰ کی مطلّقہ سے نکاح)

سوال:

بعض قبائلی علاقوں میں یہ رسم ہے کہ جب کسی کے گھر نکاح کا پیغام دینے کے لیے جائیں اور اہلِ خانہ انکار کر دیں تو وہ لوگ اُن کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر فائرنگ کر دیتے ہیں یا بلند آواز سے کہتے ہیں کہ ہم نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا ہے، اس لیے ہماری

مرضی کے بغیر کوئی اور اس کا رشتہ نہیں مانگ سکتا۔ اس قبیح رسم کو قبائلی روایات میں غگ کہتے ہیں۔ غگ کے معنی ہیں: ''اونچی آواز''۔ اس رسم کی وجہ سے اہل خانہ کے پاس دو آپشن رہ جاتے ہیں: (۱) یہ کہ اُن کی عورتیں اپنی پوری زندگی شادی کے بغیر گزاریں۔ (۲) اپنی مرضی کے برعکس انہی کے ساتھ مجبور ہو کر شادی کریں، کیونکہ کوئی دوسرا شخص اُن طاقت ور لوگوں سے دشمنی مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس لیے اُس گھر میں کوئی رشتہ مانگنے آتا ہی نہیں ہے اور ایسی لڑکیاں گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں اور اُن کی زندگی برباد ہو جاتی ہیں، ایسی رسوم کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟، (مولانا مفتی مراد احمد، ڈسٹرکٹ خطیب اوقاف، ضلع صوابی)۔

جواب:

غگ کی جو تعریف آپ نے کی ہے، یہ سراسر غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے اور ''حَمِیَّتِ جَاھِلِیَّۃ'' پر مبنی ہے۔ کسی بھی گھر میں نکاح کا پیغام دینا شریعت کی رُو سے ایک جائز امر ہے، جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں رشتے آتے ہیں۔ لڑکی کے گھر والوں کو نکاح کے پیغام کو قبول یا رد کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ پیغامِ نکاح رد کیے جانے کے بعد اس طرح کی کارروائی مکمل طور پر خلاف شرع ہے۔ اگر کوئی اس کو غیرت کا نام دیتا ہے تو قرآن نے ایسی غیرت کو ''حَمِیَّتِ جَاھِلِیَّۃ'' سے تعبیر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ''۔

ترجمہ: ''جب کافروں نے اپنے دلوں میں تعصب کو جگہ دی جو جاہلانہ تعصب تھا، (الفتح:26)''۔

جب کوئی شخص کسی جائز شرعی بات کو اپنی توہین سمجھ کر غیرت کھائے اور اُسے اپنی عار سمجھے، تو یہی حمیت جاہلیہ ہے، اسے ''غگ'' کہیں یا کوئی اور نام دیں۔ یہ رسم قبیلے یا معاشرے کے طاقتور لوگوں کی طرف سے کمزوروں کے حقوق کو سلب کرتا ہے، کیونکہ کوئی کمزور فرد قبیلے کے سردار یا اپنے سے زیادہ طاقت ور یا داداگیر بدمعاش کے گھر کے سامنے جا کر ''غگ'' نہیں کر سکتا، یہ کام صرف طاقت کے نشے میں بدمست لوگ کرتے ہیں۔

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں یہ جاہلانہ رسمیں کمزوروں کے حقوق کو سلب کرنے کیلئے اختیار کی گئی ہیں اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسی جاہلانہ رسوم کے خلاف باقاعدہ قانون سازی کرے اور کمزوروں کے حقوق سلب کرنے والوں کو تعزیری سزا دے، کیونکہ یہ رسم بنیادی انسانی حقوق کے بھی خلاف ہے۔

کسی شخص کے پیغامِ نکاح پر دوسرے شخص کا پیغام دینا حدیثِ مبارک کی رُو سے اُس وقت منع ہے، جب فریقین کی رضامندی واضح ہوجائے، جس کو ہمارے عرف میں منگنی ہونا کہتے ہیں۔ اگر لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے انکار ہوجائے یا نہ اقرار ہو اور نہ انکار، تو دوسرے شخص کے لیے پیغام بھیجنے میں شرعاً کوئی مضایقہ نہیں ہے، حدیث مبارک میں ہے:

''عَنِ ابْنِ عُمَرَ کَانَ یَقُوْلُ :نَھَی النَّبِیُّ ﷺ اَنْ یَّبِیْعَ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَلَا یَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَتْرُکَ الْخَاطِبُ قَبْلَهٗ اَوْ یَأْذَنَ لَهُ الْخَاطِبُ ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے (مندرجہ ذیل دو باتوں سے) منع فرمایا: (1) یہ کہ آپ نے ''بیع علی البیع'' سے منع فرمایا۔ (2) اور (حکم دیا کہ) کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح کے اوپر پیغام نہ دے، یہاں تک کہ اُس سے پہلے پیغام دینے والا اپنا ارادہ ترک کردے یا اُسے اجازت دے دے''۔

اس کی شرح میں علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَقِیْلَ اِنَّ النَّھْیَ فِیْ حَالِ رِضَاءِ الْمَرْأَةِ بِهٖ وَرُکُوْنِهَا اِلَیْهِ وَبِهٖ فَسَّرَ فِی الْمُوَطَّا، دُوْنَ مَا اِذَا لَمْ یَرْکَنْ، وَلَمْ یَتَّفِقَا عَلٰی صَدَاقٍ''۔

ترجمہ: ''اور کہا گیا ہے کہ یہ ممانعت صرف اُس صورت میں ہے جب عورت نکاح کا پیغام دینے والے کے ساتھ نکاح پر راضی ہو اور اُس کی طرف مائل ہو اور ''موطّا'' میں یہی وضاحت کی گئی ہے، اور اگر عورت کا اُس شخص کی طرف میلان نہ ہو اور مہر کی کسی مقدار پر اُن کا اتفاق نہ ہو تو (تو دوسرا شخص نکاح کا پیغام دے سکتا ہے)''۔

مزید لکھتے ہیں:

''وَقَالَتِ الشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَابِلَةُ مَحَلُّ التَّحْرِيْمِ مَا اِذَا صَرَحَتِ الْمَخْطُوْبَةُ اَوْ وَلِيُّهَا الَّذِيْ اَذِنَتْ لَهُ حَيْثُ يَكُوْنُ اِذْنُهَا مُعْتَبَرًا بِالْاِجَابَةِ فَلَوْ وَقَعَ التَّصْرِيْحُ بِالرَّدِّ فَلَا تَحْرِيْمَ، وَلَمْ يَعْلَمِ الثَّانِيْ بِالْحَالِ فَيَجُوْزُ الْهُجُوْمُ عَلَى الْخِطْبَةِ ،لِاَنَّ الْاَصْلَ الْاِبَاحَةُ، وَعِنْدَ الْحَنَابِلَةِ فِيْ ذٰلِكَ رِوَايَتَانِ،وَاِنْ وَقَعَتِ الْاِجَابَةُ بِالتَّعْرِيْضِ كَقَوْلِهَا لَا رَغْبَةَ عَنْكَ،فَقَوْلَانِ عِنْدَ الشَّافِعِيَّةِ،اَلْاَصَحُّ وَهُوَ قَوْلُ الْمَالِكِيَّةِ وَالْحَنَفِيَّةِ لَا يَحْرُمُ اَيْضًا، وَاِذَا لَمْ تَرُدَّ وَلَمْ تَقْبَلْ، فَيَجُوْزُ''۔

ترجمہ:''اور شافعی اور حنبلی فقہاء نے کہا: کسی کے پیغامِ نکاح پر دوسرے شخص کا پیغام دینا اُس صورت میں حرام ہے، جب کہ عورت یا اُس کے ولیِ مُجاز نے پیغام قبول کرنے کی صراحت کردی ہو، کیونکہ پیغام قبول کرنے میں اُس کا اذن معتبر ہے اور اگر صراحۃً کسی شخص کے پیغامِ نکاح کو رد کردیا گیا ہو،تو اب دوسرے شخص کا پیغام دینا منع نہیں ہے۔اسی طرح اگر دوسرے شخص کو پہلے شخص کے پیغامِ نکاح کے قبول یا رد کی بابت کچھ پتا نہیں ہے،تب بھی وہ پیغام دے سکتا ہے، کیونکہ نکاح کا پیغام دینے میں اصل اباحت ہے۔حنبلی فقہاء کی اس سلسلے میں دو آراء ہیں: اگر اجازت تعریض کے ساتھ ہو یعنی صراحۃً نہ ہو، جیسے کوئی کہے: ''ہم آپ سے دور نہیں ہیں''،تو اِس صورت میں شافعی فقہاء کے دو قول ہیں اور ان کا صحیح ترین قول وہی ہے جو مالکی اور حنفی فقہاء کا ہے،یعنی (صراحت نہ ہونے کی صورت میں) دوسرے شخص کا پیغام دینا منع نہیں ہے،اسی طرح جب پیغام کو جب نہ رد کیا گیا ہو اور نہ قبول،تب بھی دوسرے شخص کا پیغام دینا جائز ہے،(عمدۃ القاری،ج:20،ص:187)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی ''خِطْبَة'' کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''اَلْخِطْبَةُ هِيَ اِظْهَارُ الرَّغْبَةِ فِي الزَّوَاجِ بِامْرَاَةٍ مُعَيَّنَةٍ وَاِعْلَامُ الْمَرْاَةِ وَلِيِّهَا بِذٰلِكَ، وَقَدْ يَتِمُّ هٰذَا الْاِعْلَامُ مُبَاشَرَةً مِنَ الْخَاطِبِ اَوْ بِوَاسِطَةِ اَهْلِهِ، فَاِنْ وَافَقَتِ الْمَخْطُوْبَةُ اَوْ اَهْلُهَا، فَقَدْ تَمَّتِ الْخِطْبَةُ بَيْنَهُمَا وَتَرَتَّبَتْ عَلَيْهَا اَحْكَامُهَا وَاٰثَارُهَا الشَّرْعِيَّةُ--- اَلْخِطْبَةُ مُجَرَّدُ وَعْدٍ بِالزَّوَاجِ وَلَيْسَتْ زِوَاجًا، فَاِنَّ الزَّوَاجَ لَا يَتِمُّ اِلَّا بِانْعِقَادِ الْعَقْدِ

الْمَعْرُوْفِ فَيَظَلُّ كُلٌّ مِنَ الْخَاطِبَيْنِ اَجْنَبِيًّا عَنِ الْآخَرِ''۔

ترجمہ:''خِطبہ کے معنی ہیں:''مرد کا کسی خاص عورت کے ساتھ نکاح میں رغبت ظاہر کرنا اور عورت کا اپنے ولی کو اس کی بابت بتادینا ہے''۔اور کبھی یہ بتانا پیغام دینے والے کی جانب سے براہِ راست (بالمشافہ) ہوتا ہے یا اُس کے گھر والوں کے واسطے سے ہوتا ہے، سو اگر پیغام دی جانے والی عورت یا اُس کے گھر والے اتفاق کرلیں، تو دونوں کے درمیان پیغامِ نکاح (جسے ہمارے عرف میں منگنی کہا جاتا ہے) مکمل ہوجاتا ہے اور اُس پر اُس کے احکام اور شرعی نتائج مرتّب ہوتے ہیں''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:''منگنی محض وعدۂ نکاح ہے، (حقیقی) نکاح نہیں ہے، کیونکہ (حقیقی) نکاح (دو گواہوں کی موجودگی میں) معروف طریقے سے منعقد ہونے پر ہی مکمل ہوتا ہے، سو پیغامِ نکاح یا منگنی کے باوجود لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لیے (بدستور) اجنبی ہوتے ہیں (تاوقتیکہ باقاعدہ نکاح منعقد ہو)، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:9،ص:6492)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے ہاں محض نکاح کا پیغام بھیجنے پر حقیقی نکاح کے احکام عائد نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی پیغام بھیجنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اہل خانہ کو رشتہ دینے پر مجبور کریں اور اس پر دھمکی دیں کہ اب یہ لڑکی ہماری ہے اور کوئی اور نکاح کا خواہش مند اس گھر کا رُخ نہ کرے، اگر کرے گا تو اسے عداوت پر محمول کیا جائے گا، سو''غگ'' کی عملی صورت یہی ہے اور شریعت کی رُو سے یہ منع ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ محض ایک جاہلانہ اور قبیح رسم ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے علماء و مشائخ، عمائدینِ علاقہ اور حکومت سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیے۔

اسی طرح بعض علاقوں میں یہ رسم ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور عدت گزرنے کے بعد کوئی دوسرا شخص باہمی رضامندی سے مہر مقرر کرکے اُس مطلّقہ عورت سے باقاعدہ نکاح کرے، تو سابق شوہر اُسے اپنی بے عزتی سے تعبیر کرتا ہے اور اُس شخص کو اپنا دشمن قرار دیتا ہے، یہ سوچ بھی سراسر باطل ہے اور خلافِ شرع ہے۔اسلام نے ایسی

تمام جاہلانہ رسوم کو مٹایا ہے، جب آفتابِ اسلام طلوع ہوا تو عرب معاشرے میں یہ دستور تھا کہ مُتَبَنّٰی یعنی منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کے حکم میں لیا جاتا تھا، وہ وارث قرار پاتا تھا اور اس کی مطلّقہ کے ساتھ اُس کے مُرَبّی (Guardian) باپ کا نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت زید بن حارثہ کو ازراہِ محبت رسول اللہ ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا قرار دیا تھا، اُن کی شادی حضرت زینب بنت جحش سے ہوئی، لیکن طبائع کے فرق کی وجہ سے اُن میں نباہ نہ ہوسکا اور انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اُس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا نکاح حضرت زینب سے منعقد ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا''۔

ترجمہ: ''پھر جب زید نے اُن سے اپنی غرض پوری کرلی (یعنی طلاق دے دی)، تو ہم نے (عدت کے بعد) اُن سے آپ کا نکاح کردیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی (مطلّقہ) بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے، جب کہ وہ انہیں طلاق دے کر بے غرض ہوجائیں، (الاحزاب: 37)''۔

اسی طرح ہمیں بتایا گیا ہے کہ صوبہ سندھ کے جاگیردارانہ معاشرے میں بھی ایک جاہلانہ رسم ہے کہ اگر کسی خاندان میں جوان بیٹی ہے اور اُن کے ابنائے اَعمام (Cousins) یعنی قریبی رشتے داروں میں اُس لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ہے، تو وہ کہہ دیتے ہیں: ''اس نے قرآن سے شادی کرلی'' اور اس طرح اُس عورت کو ساری زندگی شادی کے بغیر گزارنی پڑتی ہے اور اس رسم کا مقصد یہ ہے کہ خاندان سے باہر شادی ہونے کی صورت میں اُس کے حصے میں آنے والی جاگیر یا دولت خاندان سے باہر چلی جائے گی۔ اس پر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان میں بھی بحث ہوچکی ہے اور اسے غیر شرعی قرار دیا گیا ہے۔ ایسی رسوم کی بابت این جی اوز کو خوش کرنے کے لیے دکھاوے کے طور پر قانون سازی تو کرلی جاتی ہے، لیکن جاگیردارانہ معاشرے میں عملاً اس کا نفاذ نہیں ہوتا۔ ایسی تمام جاہلانہ

رسوم کو مٹانے کے لیے مسلم معاشرے میں ایک جامع اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے اور علماء کی ذمے داری ہے کہ منبر ومحراب سے ان رسوم کے خلاف وقتاً فوقتاً آواز بلند کرتے رہیں، اِسی کو حدیثِ مبارک میں ''جہاد باللسان'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

جہیز کی شرعی حیثیت

سوال:

شادی کے وقت جو جہیز دیا جاتا ہے، لڑکی والے لڑکے کو جہیز دیں گے یا لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کو دیا جائے گا، اس بارے میں اسلام میں کیا ہے؟، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بی بی فاطمہ اور حضرت علی کی شادی کے وقت حضرت علی نے کچھ سامان حضرت عثمان کے ہاتھوں فروخت کیا تھا، (انس نظامی، جدہ)۔

جواب:

شریعت میں جہیز دینے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی ایک بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شادی کے وقت کچھ سامان مثلاً: چکی، پانی کا برتن اور تکیہ وغیرہ دیا تھا۔ حدیث پاک میں ہے:

''جَھَّزَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاطِمَۃَ فِی خَمِیْلٍ وَقِرْبَۃٍ وَوِسَادَۃٍ حَشْوُھَا إِذْخِرٌ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے شوہر (علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کے گھر بھیجنے کے لیے ایک چادر، مشک اور تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی، پر مشتمل جہیز دیا، (سنن نسائی:3382)''۔ یہ سامان اس دور کے مطابق گھر بسانے کے لیے بنیادی ضروریات تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باقی بیٹیوں کے متعلق ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کا گھر پہلے سے موجود تھا، اس لیے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسا کوئی انتظام نہ کیا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا الگ گھر بھی پہلے موجود تھا، اس لیے سیدہ رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے لیے حضور کو ایسے کسی انتظام کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زوجیت میں جو خواتین آئیں، اُن کے والدین کو بھی

ایسے کسی انتظام کی حاجت نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے کفیل اور سرپرست تھے۔اس لیے دونوں کے ازدواج کا اہتمام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو کرنا تھا۔ خانہ داری کے انتظام کے لیے جو کچھ مختصر سامان مثلاً چار پائی، اِذخر گھاس سے بھری توشک تکیہ، مشکیزے، گھڑے اور چکی کا اہتمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا۔ چاندی کا ہار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کا تھا، جو آپ کو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ترکے سے ملا تھا۔یہ سارا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لئے کرنا پڑا کہ آپ کو ایک الگ گھر بسانا تھا۔اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلے ہی سے کوئی الگ گھر ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاید اتنا کچھ بھی نہ کرتے۔حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی حیثیت ان سے مختلف تھی، اب تک وہ حضور کے ساتھ ہی رہتے تھے اور جب نکاح ہوا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا۔ایک انصاری حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بخوشی پیش کر دیا، جس میں یہ پاکیزہ نیا جوڑا منتقل ہو گیا اور خانہ داری کے مختصر اسباب وہاں بھیج دیے گئے۔ہمارے عرف کے مطابق آسائشوں اور تعیّشات پر مبنی جہیز نہ تھا، بلکہ اُس دور کے مطابق خانہ داری کی کم از کم بنیادی ضروریات کا انتظام تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حق مہر پہلے ہی لے لیا تھا، ایک زرہ تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ تقریباً پانچ سو درہم میں فروخت کی تھی۔ یہی رقم حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور اسی رقم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ داری کا سب سامان اور کچھ خوشبو وغیرہ منگوائی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”أَرَدْتُ أَنْ أَخْطُبَ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَتَهُ، ثُمَّ ذَكَرْتُ أَنَّهُ لَا شَيْئَ لِي فَذَكَرْتُ عَائِدَتَهُ وَفَضْلَهُ فَخَطَبْتُهَا، فَقَالَ لِي: هَلْ عِنْدَكَ شَيْءٌ تُعْطِيهَا إِيَّاهُ؟، قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَأَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ الَّتِي أَعْطَيْتُكَهَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا؟، قُلْتُ: هِيَ عِنْدِي،

قَالَ: فَأْتِ بِهَا، قَالَ: فَجِئْتُ بِهَا فَأَعْطَيْتُهُ إِيَّاهَا فَزَوَّجَنِيهَا، فَلَمَّا أَدْخَلَهَا عَلَيَّ قَالَ: لَا تُحْدِثَا شَيْئًا حَتَّى آتِيَكُمَا فَجَاءَنَا وَعَلَيْنَا كِسَاءٌ أَوْ قَطِيفَةٌ، فَلَمَّا رَأَيْنَاهُ تَخَشْخَشْنَا فَقَالَ: مَكَانَكُمَا فَدَعَا بِإِنَاءٍ فِيهِ مَاءٌ فَدَعَا فِيهِ ثُمَّ رَشَّهُ عَلَيْنَا فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَهِيَ أَحَبُّ إِلَيْكَ أَمْ أَنَا؟، قَالَ هِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْكَ، وَأَنْتَ أَعَزُّ عَلَيَّ مِنْهَا"۔

ترجمہ: ''میں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آپ کی صاحبزادی (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے نکاح کا پیغام دینے کا ارادہ کیا، تو مجھے یاد آیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، پھر مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادتِ مبارکہ اور آپ کا فضل واحسان یاد آیا، تو میں نے پیغام دے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس کچھ ہے جو تم اسے (سیدہ فاطمہ کو) مہر کے طور پر دو، میں نے عرض کی: کچھ نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہ حُطمی زرہ کہاں ہے، جو میں نے فلاں دن تمہیں دی تھی، میں نے عرض کی: وہ میرے پاس موجود ہے، فرمایا: اُسے لے آؤ، آپ بیان کرتے ہیں: میں نے وہ زرہ آپ کو دے دی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (فاطمہ سے) میرا نکاح کر دیا، جب آپ نے انہیں (فاطمہ کو) میرے گھر بھیجا تو فرمایا: میرے آنے تک تم کچھ نہ کرنا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آئے اور ہم چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہم نے دیکھا تو آپ نے ہمیں اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے آواز نکالی اور فرمایا: اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر آپ نے ایک برتن میں پانی منگوایا اور اس پر دعا فرما کر (یعنی دَم کر کے) ہم پر چھڑکا، پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ کو یہ (فاطمہ) زیادہ محبوب ہیں یا میں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مجھے فاطمہ زیادہ محبوب ہیں اور تم مجھے ان سے زیادہ عزیز ہو، (مسند حمیدی: 38)''۔

اگر لڑکا بہت زیادہ غریب ہو کہ گھر کا ضروری سامان خریدنے کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں لڑکی کے والدین اگر اس کے ساتھ مالی تعاون کرنا چاہیں، تو حرج نہیں بلکہ باعثِ ثواب ہے لیکن آجکل کے دور میں رائج جہیز کسی بھی صورت جائز نہیں۔ موجودہ دور

میں بصورت جہیز دیا جانے والا سامانِ تعیّشات ایک معاشرتی لعنت ہے۔
نکاح کے وقت کسی طرح کا مال دینا اور لینا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”لِأَنَّهَا جَعَلَتِ الْمَالَ عَلٰی نَفْسِهَا عِوَضًا عَنِ النِّكَاحِ، وَفِي النِّكَاحِ الْعِوَضُ لَا يَكُونُ عَلَى الْمَرْأَةِ“۔

ترجمہ: ”عورت اپنے نکاح کے عوض جو مال دے، وہ باطل ہے، اس لیے کہ نکاح میں عوض عورت پر نہیں ہے (بلکہ مہر کی شکل میں مرد پر ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص: 440، بیروت)“۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

”أَخَذَ أَهْلُ الْمَرْأَةِ شَيْئًا عِنْدَ التَّسْلِيمِ فَلِلزَّوْجِ أَنْ يَسْتَرِدَّهُ لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ“۔

ترجمہ: ”رخصتی کے وقت لڑکی والوں نے اگر کچھ لیا تو شوہر کو اسے واپس لینے کا حق ہے کیونکہ وہ رشوت ہے“۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”أَيْ بِأَنْ أَبَى أَنْ يُسَلِّمَهَا أَخُوهَا أَوْ نَحْوُهُ حَتّٰى يَأْخُذَ شَيْئًا، وَكَذَا لَوْ أَبٰى أَنْ يُزَوِّجَهَا فَلِلزَّوْجِ الِاسْتِرْدَادُ قَائِمًا أَوْ هَالِكًا لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ بَزَّازِيَّةٌ“۔

ترجمہ: ”یعنی اگر لڑکی کے بھائی یا کسی دوسرے ولی نے کچھ لیے بغیر رخصتی یا نکاح کرنے سے انکار کر دیا، تو شوہر کو حق حاصل ہے کہ اسے واپس لے لے، خواہ وہ مال موجود ہو یا ختم ہو گیا ہو، اس لیے کہ یہ (مال) رشوت ہے، ”بزازیہ“، (جلد 8، ص: 520، دمشق)“۔

اسی طرح لڑکی والوں کا لڑکے سے مہر کے سوا کسی اور شے کا مطالبہ رشوت اور باطل ہے،
علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”خَطَبَ امْرَأَةً فِي بَيْتِ أَخِيهَا فَأَبٰى أَنْ يَدْفَعَهَا حَتّٰى يَدْفَعَ إِلَيْهِ دَرَاهِمَ فَدَفَعَ وَتَزَوَّجَهَا يَرْجِعُ بِمَا دَفَعَ؛ لِأَنَّهَا رِشْوَةٌ، كَذَا فِي ”الْقُنْيَةِ““۔

ترجمہ: "کسی شخص کی بہن کو کسی نے نکاح کا پیغام دیا، بھائی نے انکار کردیا کہ جب تک کچھ روپے نہیں دو گے، رشتہ منظور نہیں، مرد نے وہ رقم دے دی اور نکاح کرلیا، سو مرد نے جو رقم دی، وہ اسے واپس لے سکتا ہے، اس لیے کہ یہ رشوت ہے، "قنیہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:403)"۔

شریعت کا اصل حکم یہ ہے کہ عورت کا ماں یا بیوی یا بیٹی یا بہن کی حیثیت سے وراثت میں جو حق بنتا ہو، وہ اُسے دیا جائے لیکن ہمارے ہاں خواتین کو وراثت کا حق دینے کا شعار بہت کم ہے اور اس کی بجائے جہیز کی رسم کو اپنے گلے کا طوق بنالیا ہے اور اس کی وجہ سے رشتے بنتے اور ٹوٹتے ہیں اور بعض لوگوں کو معاشرے میں اپنی عزت برقرار رکھنے یا اپنی بیٹی اور بہن کے لیے سسرال کے گھر میں گنجائش پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات قرض لے کر جہیز کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور بعض برادریوں اور حلقوں میں اس کی نمائش بھی کی جاتی ہے، جو مالی اعتبار سے کمزور طبقات میں احساسِ محرومی پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

بیوی کی بدمزاجی پر صبر کیجیے

سوال:

میری شادی کو 11 سال ہو چکے ہیں، پہلے روز سے بیوی کی بدزبانی اور بدمزاجی سے پریشان ہوں۔ بچوں اور پڑوسیوں کے سامنے باتیں سنانا، ذلیل کرنا اور بددعائیں کرنا اُس کی عادت بن چکا ہے۔ میں ان کے کھانے، پینے اور آسائش وآرام کی تمام ضروریات کا خیال کرتا ہوں۔ ازدواجی تعلقات کے معاملے میں کبھی تعاون نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ کیا شادی اسی کام کے لیے کی ہے، کیا شادی کا مقصد یہی ہے۔ اکثر طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، اس کے اس رویے پر میرے لیے شرعی حکم کیا ہے، (غلام رضا، عثمان آباد کراچی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک اور اتحاد واتفاق سے گزارنی چاہیے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف

نظر کرنا چاہیے۔خاص طور پر شوہروں کے لیے بیویوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا“۔

ترجمہ:”اور تم اُن کے ساتھ نیک سلوک کرو، پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں،تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو اور اللہ اس میں بھلائی رکھ دے،(النساء:19)“۔یعنی اگر تمہیں صورت یا سیرت کے اعتبار سے اپنی بیویاں پسند نہ آئیں،تو صبر سے کام لو،ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ان کلماتِ مبارکہ میں شوہروں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر بالفرض تمہاری بیوی تمہیں بدصورتی کی وجہ سے ناپسند ہو،تب بھی حتی الامکان اپنی طبیعت پر جبر کر کے اسے برداشت کرو اور طلاق نہ دو۔ہوسکتا ہے شکل وصورت کی کمی کو اللہ تعالیٰ اس کے حسنِ اخلاق سے پوری فرمادے اور اس کی اچھی سیرت و کردار کی بدولت تمہارا گھر امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔اور اگر وہ بداخلاق ہے اور تم اس کی اخلاقی کمزوری برداشت کرلو تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس صبر کی جزا و انعام کے طور پر تمہیں خوبصورت اور اعلیٰ ذہنی وجسمانی استعداد کی حامل اولاد سے نواز دے۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے مزاج میں پوری مطابقت ہو اور دونوں کی سوچ ایک ہوجائے۔اگر ایسا حسنِ اتفاق ہوجائے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بندے پر بے پایاں فضل وانعام اور کرم ہوگا۔شکل وصورت، رنگ روپ اور مزاج میں تنوّع اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ“۔

ترجمہ:”اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے (ایک) آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا (ایک دوسرے سے) مختلف ہونا ہے، بے شک اس میں دنیا

والوں کے لیے نشانیاں ہیں، (الروم:22)''۔ لہٰذا اگر شوہر اور بیوی کی سوچ میں فرق ہو بلکہ تضاد ہو، تو ایسے شوہروں کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

''عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَاِذَا شَهِدَ اَمْرًا فَلْيَتَكَلَّمْ بِخَيْرٍ اَوْ لِيَسْكُتْ وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْئٍ فِي الضِّلَعِ اَعْلَاهُ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَاِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ جب کسی چیز کو دیکھے تو یا تو اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا اوپر کا حصہ زیادہ ٹیڑھا ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے اور اگر تم نے اس کو (اُس کے حال پر) چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، عورتوں سے خیر خواہی کرو (یعنی حکمت وتدبیر اور صبر واستقامت کے ساتھ ان کی اصلاح کرو)، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3539)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

''اِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَّنْ تَسْتَقِيْمَ لَكَ عَلٰى طَرِيْقَةٍ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَّاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا''۔

ترجمہ: ''عورت ''پسلی'' سے پیدا کی گئی، وہ سیدھا کرنے سے سیدھی نہیں ہوگی، اگر تم اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کی کجی کے باوجود اس سے فائدہ اٹھاؤ، اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3536)''۔

عورت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دینے کا مقصد یہ نہیں کہ اُس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ شوہر کو تعلیم دی گئی ہے کہ پیار ومحبت اور نرمی سے اسے سمجھائے اور بعض صورتوں میں اس کی طبعی کمزوریوں کے باوجود اس سے نباہ کرے۔ جو عورت شوہر کے لیے تکلیف وایذا کا سبب بنتی ہو، اُس کے لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تُؤْذِي امْرَأَةٌ زَوْجَهَا إِلَّا قَالَتْ زَوْجَتُهُ مِنَ الْحُورِ الْعِينِ لَا تُؤْذِيهِ قَاتَلَكِ اللّٰهُ! فَإِنَّمَا هُوَ عِنْدَكِ دَخِيلٌ أَوْشَكَ أَنْ يُفَارِقَكِ إِلَيْنَا"۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی عورت اپنے شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے، تو حوروں میں اس کی بیوی کہتی ہے کہ اسے تکلیف نہ دو، اللہ! تجھے ہلاک کرے، یہ تو تیرے پاس چند روز کے لیے ہے۔ عنقریب یہ (وفات کے بعد) تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے گا، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1177، سنن ابن ماجہ: 2014، مسند احمد: 22162)''۔

الغرض حتی الامکان بیوی کو طلاق دینے سے گریز کریں اور نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو باہمی رضامندی سے خلع کا آپشن موجود ہے۔

شرعی خلع یہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ''۔

ترجمہ ''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں (زوجین) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو عورت نے جو بدلِ خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ اللہ کی حدود ہیں، سو تم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، تو وہی لوگ ظالم ہیں، (البقرۃ: 229)''۔ اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رو سے ''خلع'' یہ ہے کہ میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ ''حقوقِ زوجین'' کی بابت اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کو قائم نہ رکھ پائیں گے، باہمی اعتماد نہ رہا یا نفرت پیدا ہوگئی یا کوئی اور داخلی یا خارجی سبب بن گیا اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے، تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو ''حق مہر'' لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کردے اور شوہر اس کے عوض اسے خلع دیدے اور خلع ''طلاق بائن'' کے حکم میں ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی

یک طرفہ رجوع کا حق حاصل نہیں رہتا، البتہ باہمی رضامندی سے عدت کے اندر اور عدت ختم ہونے اور عورت کے نکاح سے نکلنے کے باوجود، دوبارہ مہر مقرر کر کے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں، البتہ آئندہ اُسے صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا اور یہ طلاقِ بائن آئندہ کسی بھی طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لیے موثر رہے گی۔ کسی شرعی جواز کے بغیر طلاق کا مطالبہ کرنے والی عورت کے لیے حدیث پاک میں وعید آئی ہے:

"عَنْ ثَوبَانَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقاً مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ"۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورت کسی وجہ کے بغیر شوہر سے طلاق کا سوال کرے، اُس پر جنّت کی خوشبو حرام ہے، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1187)''۔ ہمارے پاس کئی ایسے مسائل آتے ہیں کہ بیوی نے انتہائی ضد کر کے طلاق مانگی، جب شوہر نے مجبور ہو کر طلاق دے دی تو بعد میں پچھتانا پڑا۔ سو آپ کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ صبر سے کام لیں اور بیوی کی بداخلاقی کا جواب ان کے انداز میں نہ دیں بلکہ خاموشی اختیار کریں اور سورۃ الفیل کی تلاوت کرتے رہیں اور ''یَا وَدُوْدُ'' کثرت سے پڑھیں اور ان کی ذہنی کیفیت بدل جانے کی دعا کرتے رہا کریں۔ اگر نباہ کی کوئی حرارت باقی نہ رہے، تو آخری چارۂ کار ''تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَان'' ہے، لیکن یہ عنداللہ ناپسندیدہ ہے، مگر ناگزیر صورتِ حال میں اس کی اجازت ہے۔ ایک وظیفہ یہ ہے کہ 21 بار سورۂ قریش پڑھ کر بیوی کا تصور کر کے پھونک ماریں اور محبت ومودت کی دعا کریں۔

ماں شریک بھائی نامحرم نہیں ہے

سوال:

میری بیوی کا پہلے شوہر سے ایک بیٹا 17 سال کا ہے، جبکہ میری تین بیٹیاں ہیں۔ کیا اس لڑکے کی کفالت میری ذمے داری ہے؟، میری والدہ کو اعتراض ہے کہ اس بچے کو اس کے ننھیال بھیج دیا جائے۔ گھر میں آزادانہ ماحول ہے، بیٹیوں کا اس لڑکے کے ساتھ

آزادانہ اٹھنا، بیٹھنا معمول ہے۔ درمیانی راہ کے لیے لڑکے کو ننھیال بھیج دیا جائے اور وہاں کفالت کے لیے رقم بھیج دی جائے تاکہ میری لڑکیاں اس کھلی غیر شرعی صورتِ حال سے نکل جائیں کہ وہ لڑکا ان کے لیے نامحرم ہے، (ذیشان انعام، گلستانِ جوہر کراچی)۔

جواب:

پہلے شوہر سے اولاد کا نان نفقہ اور کفالت ونگہداشت دوسرے شوہر کے ذمے نہیں ہے۔ آپ اس لڑکے کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن بیوی کو اپنی اولاد سے ملنے جلنے اور حسن سلوک سے منع کرنا قطعِ رحمی ہے اور قاطع رحم کے لیے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔

”عَنْ اَبِی مُوسٰی قَالَ :لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الْوَالِدَةِ وَوَلَدِهَا، وَبَیْنَ الأَخِ وَبَیْنَ اَخِیهِ“۔

ترجمہ: ”ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی کہ جو ماں اور اس کے بچے میں جدائی پیدا کرے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے جدا کرے، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث :2250)“۔ وہ بچہ آپ کی بیٹیوں کے لیے نامحرم نہیں ہے، کیونکہ وہ آپ کی بیٹیوں کا ماں شریک بھائی ہے کہ آپ کی تین بیٹیاں بھی اسی خاتون سے ہیں۔

اسلام نے اَخلاقی تربیت کے زریں اصول بیان فرمائے ہیں، اِسی اَخلاقی تربیت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بچوں کی عمر دس سال ہو جائے، تو اُن کے بستر بھی علیحدہ کردو۔ اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ کہیں ایک بستر پر موجود ہونے کے سبب بیداری یا نیند کی حالت میں ایک دوسرے کے جسم کے مستور حصوں پر نظر پڑنے یا جسم کے لمس سے اُن میں اشتعال پیدا ہوسکتا ہے اور ایسی صورت حال میں بعض اوقات انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ، وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ"۔

ترجمہ: "تمہارے بچے جب سات سال کے ہوجائیں، تو اُنہیں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو اُنہیں (ادب سکھانے کے لیے معمولی طور پر) مارو اور اُن کے بستر علیحدہ کردو، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:496)"۔

سیدہ کا غیر سید سے نکاح

سوال:

کیا کوئی غیر سید لڑکا اگر شریعت کے مطابق سیدہ کے گھر رشتہ بھیجے اور گھر والے راضی ہوں، تو یہ نکاح جائز ہے؟۔ بعض لوگ اِسے ناجائز کہتے ہیں، کیونکہ اِس سے سیدہ کی بے ادبی ہوتی ہے، (عاقب ذیشان)۔

جواب:

جمہور فقہاء نے نکاح میں کفو کا اعتبار کیا ہے، یعنی لڑکا حسب نسب اور موجودہ دور میں تعلیم اور حیثیت کے اعتبار سے لڑکی کا ہم پلہ ہو، تو وہ اپنی آزادانہ مرضی سے اُس کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے اور اگر لڑکا مندرجہ بالا اعتبار سے لڑکی کا ہم پلہ نہ ہو، تب بھی ولی کی رضامندی سے نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ولی کی رضامندی نہ ہو تو لڑکی کا آزادانہ طور پر غیر کفو میں نکاح جائز نہیں ہے۔ سیدہ لڑکی کا نکاح ولی کی رضامندی کے ساتھ غیر سید لڑکے کے ساتھ جائز ہے، ورنہ نہیں۔ آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ بعض سادات علمائے کرام ومشائخ عظام سیدہ خاتون کے غیر سید مرد کے ساتھ نکاح کو کسی صورت میں جائز نہیں سمجھتے۔ ہم نے جمہور فقہائے احناف کا مسلک بیان کیا ہے۔

اگر لڑکی نے ولی کی اجازت سے غیر کفوٴ میں نکاح کیا ہے، تو یہ نکاح درست ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(وَيُفْتٰى) فِي غَيْرِ الْكُفْءِ (بِعَدَمِ جَوَازِهٖ أَصلاً) وَهُوَالْمُخْتَارُ لِلْفَتْوٰى (لِفَسَادِ

الزَّمانِ) فَلَاتَحِلُّ مُطَلَّقَةٌ ثَلَاثًا نَكَحَتْ غَيْرَ كُفْءٍ بِلَا رِضَا وَلِيٍّ بَعْدَ مَعْرِفَتِهِ إِيَّاهُ"۔

ترجمہ: ''فسادِ زمانہ کے سبب غیر کفؤ میں نکاح کے اصلاً عدمِ جواز کا فتویٰ دیا جائے گا، فتویٰ کے لیے یہی قول مختار ہے، پس جس عورت کو اس کے شوہر نے تین طلاقیں دی ہوں اور اُس نے (عدت گزرنے کے بعد) ولی کی رضامندی کے بغیر غیر کفؤ میں نکاح کیا ہو، تو (اس عقدِ ثانی سے طلاق پانے اور عدت گزرنے کے بعد بھی) وہ سابق شوہر کے لیے حلال نہیں ہے، جبکہ ولی نے لڑکے کے غیر کفؤ کے بارے میں جاننے کے بعد اُسے رَد کیا ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوا)، (جلد 8، ص: 191-190، دمشق)''۔

آپ کو ایسی درجنوں مثالیں مل جائیں گی کہ سادات علمائے کرام نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح غیر سادات علمائے کرام اور دیگر لوگوں سے کیا۔ جن سادات کرام کو اپنی بیٹیوں کے لیے سادات کے مناسب رشتے ملیں تو انہیں ترجیح دینا ان کا حق ہے اور اچھی بات ہے، لیکن آج کل بیٹیوں کے رشتے کے حوالے سے سب کو مسائل دَرپیش ہیں اور تعلیم کے تفاوت کی وجہ سے اور زیادہ مشکلات ہیں، اس لیے ہر شخص اپنے حسبِ حال فیصلہ کرسکتا ہے اور اختلافی مسائل میں، میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ جس فقیہہ، مفتی یا عالم پر آپ کو اعتماد ہو، اس کے فتوے پر عمل کریں۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں اس مسئلے پر بہت تفصیلی بحث فرمائی ہے اور آخر میں اپنا موقف تحریر فرمایا:

''کسی امام کے نزدیک بھی غیر کفو میں نکاح حرام نہیں ہے، البتہ امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاء احناف کے نزدیک غیر کفو میں کیے ہوئے نکاح میں ولی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوتا ہے، جبکہ امام مالک اور فقہاء احناف میں سے امام ابوبکر جصاص اور امام کرخی کے نزدیک نکاح میں ''کفاءۃ فی الدین'' (دین میں مساوات یا ہم پلہ ہونے) کے سوا اور کوئی شرط نہیں ہے اور کتاب وسنت کے مطابق یہی نظریہ صحیح ہے اور اصولِ اَحناف کے بھی مطابق ہے، کیونکہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں ایسی کسی شرط کا ذکر نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم،

خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ سے غیر کفو میں نکاح کرنا ثابت ہے،فقہاء تابعین میں سے عمر بن عبدالعزیز ،ابن سیرین اور سفیان ثوری کا یہی مسلک ہے ، اس لیے ہم نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔تاہم اگر کوئی عالمِ دین ان تمام دلائل کو پڑھنے کے بعد بھی جمہور فقہاء کی رائے کو درست قرار دے کر ایسی صورت میں ولی کو فسخِ نکاح کا اختیار دیتا ہے تو وہ معذور ہے اور اس کی بھی ایک وجہ ہے لیکن اس نکاح کو حرام کہنے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے، یہ محض اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حرام کرنا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت کو تبدیل کرنا ہے،(جلد ثالث،ص:1182)''۔امام المدرسین واستاذ الاساتذہ علامہ عطا محمد بندیالوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے پر''سَیْفُ الْعَطَا عَلٰی اعناق من طغٰی'' کے نام سے ایک مُفصّل ومُدلّل کتاب لکھی ہے۔

یہ نکاح منعقد نہیں ہوا

سوال:

دلہن سے پوچھا گیا کہ تم غلام حسن ولد نور حسن کو قبول کرتی ہو،اس نے جواب دیا: میں اشرف خان ولد لال خان کو قبول کرتی ہوں۔کہا: دستخط کرو،اس نے کر دیئے ،مگر نکاح نامہ پہ نام غلام حسن کا ہے،لڑکی نے دوسرے نام پہ قبول کیا،لڑکی کو معلوم ہے کہ نکاح نامہ پہ نام کس کا ہے، پھر بھی دستخط کر دیئے ،معلوم کرنا ہے،نکاح واقع ہوا ہے کہ نہیں، (حافظ عبدالغفور، برمنگھم یوکے)۔

جواب:

نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں فریقین کے ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے، ایک فریق ایجاب کرے اور دوسرا قبول۔بالغہ لڑکی خود یا وکیل کے ذریعے ایجاب یا قبول کرے گی،تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَمِنْ شَرَائِطِ الْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ اِتِّحَادُ الْمَجْلِسِ لَوْحَاضِرَیْنِ وَاِنْ طَالَ''۔

ترجمہ:''(نکاح کے لیے) ایجاب وقبول کے شرائط یہ ہیں کہ مجلس (نکاح) ایک ہو،اگرچہ

دونوں حاضر ہوں خواہ مجلس طویل ہو''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''قَالَ فِي ''الْبَحْرِ'': فَلَوِ اخْتَلَفَ الْمَجْلِسُ لَمْ يَنْعَقِدْ، فَلَوْأَوْجَبَ أَحَدُهُمَا فَقَامَ الْآخَرُ أَوِاشْتَغَلَ بِعَمَلٍ آخَرَ بَطَلَ الْإِيْجَابُ۔

ترجمہ: '''' البحرالرائق'' میں فرمایا: پس اگر مجلس بدل گئی تو (نکاح) منعقد نہیں ہوگا، پس اگر دونوں میں سے کسی ایک نے ایجاب کیا اور دوسرا کھڑا ہوگیا یا کسی کام میں مشغول ہوگیا، تو ایجاب باطل ہوجائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:65)''۔

اگر آپ کا بیان درست ہے، تو اس کی رُو سے لڑکی نے نکاح تقریب نکاح میں موجود دولہا کے حق میں نہیں بلکہ اس کے غیر کے حق میں قبول کیا ہے، نکاح منعقد نہیں ہوا۔ آپ نے سوال میں لکھا: ''دلہن سے پوچھا گیا: تم غلام حسن ولد نور حسن کو قبول کرتی ہو'' دلہن کا یہ کہنا: ''میں اشرف خان ولد لال خان کو قبول کرتی ہوں''، غلام حسن کے ایجاب کا رد ہے اور اشرف ولد لال خان کے حق میں ایجاب یا قبول قرار پائے گا، جو کہ غائب ہے اور ایجاب قبولِ غائب پر موقوف نہیں رہ سکتا بلکہ باطل ہوجائے گا۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''(وَلَا يَتَوَقَّفُ الْإِيجَابُ عَلٰى قَبُولِ غَائِبٍ عَنِ الْمَجْلِسِ فِي سَائِرِ الْعُقُودِ) مِنْ نِكَاحٍ وَبَيْعٍ وَغَيْرِهِمَا بَلْ يَبْطُلُ الْإِيجَابُ وَلَا تَلْحَقُهُ الْإِجَازَةُ اتِّفَاقًا''۔

ترجمہ: ''ایجاب مجلسِ نکاح سے غائب کسی شخص کے قبول کرنے پر موقوف نہیں ہوگا، تمام عقود نکاح، بیع وغیرہ کا یہی حکم ہے کہ ایجاب بالاتفاق باطل ہوجاتا ہے اور اس کو اجازت لاحق نہیں ہوتی، (جلد 4، ص:162، بیروت)''۔ محض نکاح نامے پر دستخط کرنے سے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

مسائل نکاح سے ناواقفیت کی بنا پر اکثر نکاح کے وکیل اور گواہان دلہن سے بھی قبول کراتے ہیں اور مجلسِ نکاح میں نکاح خواں دولہا سے قبول کراتا ہے، دونوں جانب سے

قبول کرایا جاتا ہے، اگرچہ یہ صورت درست نہیں، لیکن نکاح منعقد ہو جائے گا۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں:

''نکاح میں ضروری الفاظ ایجاب وقبول ہیں، جن سے عقد سمجھا جائے نہ وعدہ، مثلاً: مرد عورت سے کہے: ''میں نے تجھے اپنے نکاح میں لیا''، عورت کہے: ''میں نے قبول کیا''۔ یا عورت کا وکیل کہے: ''میں نے فلاں عورت بنت فلان ابن فلاں کو (دادا تک نام لے اگر صرف باپ کے نام سے پوری تمیز نہ ہو جائے یا عورت سامنے بیٹھی ہے تو کسی کے نام لینے کی حاجت نہیں اشارہ کر کے کہے اس عورت کو) تیرے نکاح میں دیا''، مرد کہے: ''میں نے قبول کیا اور دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں مسلمان عاقل بالغ آزاد ان دونوں کی گفتگو کو معاً سنیں اور سمجھیں کہ یہ نکاح ہو رہا ہے، بس اسی قدر ضروری ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص: 236)''۔

ولیمہ کی شرعی حیثیت اور براولیمہ

سوال:

ولیمہ کرنا تو سنت ہے مگر جو ولیمے ہم کرتے ہیں کیا اسے بھی سنت کہیں گے؟، امراء لاکھوں روپے اس پر خرچ کرتے ہیں اور غربا قرض لے کر احساس کم تری ختم کرنے کے لیے دھوم دھام سے ولیمہ کرتے ہیں۔ پھر کیا نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم لوگوں سے کھانا کھلانے کی رقم بھی وصول کرتے تھے؟، اگر ایسا نہیں تو علمائے کرام کو بتانا چاہیے کہ یہ وہ ولیمہ نہیں ہے جو نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کرتے تھے۔ ولیمے اور جہیز کی رقم اکٹھے کرتے کرتے نوجوانوں کے بالوں میں چاندی بھی آنے لگی ہے۔ مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں، (امجد عادل، چکوال)۔

جواب:

''شبِ زفاف'' کی صبح اپنے دوست، احباب، عزیز واقارب اور محلے کے لوگوں کی اپنی استطاعت کے مطابق ضیافت کرنا ''ولیمہ'' کہلاتا ہے۔ ولیمہ سنت ہے اور اگر اِس دعوت سے مقصود ادائے سنّت ہو تو یہ اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۱) ''أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ''۔ ترجمہ:''ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری سے ہو، (صحیح بخاری: 5167)''۔

(۲)''عَنْ أُمِّهِ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ أَوْلَمَ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى بَعْضِ نِسَائِهِ بِمُدَّيْنِ مِنْ شَعِيْرٍ''۔

ترجمہ:''حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی کریم ﷺ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کا ولیمہ دو مُد (غلّے کو ماپنے کا ایک پیمانہ) جو کے ساتھ کیا تھا، (صحیح بخاری: 5172)''۔

ولیمہ مسنونہ کا ایک شرعی معیار یہ بھی ہے کہ اس میں اپنے قرابت داروں اور رشتہ داروں کے علاوہ فقراء اور ناداروں کو بھی شریک کیا جائے، حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ:شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ،يُدْعٰى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ،وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللهَ تَعَالٰى وَرَسُوْلَهٗ ﷺ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بُرا کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے، جس میں (صرف) مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس نے دعوتِ ولیمہ کو ترک کیا، تو اُس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری: 5177)''۔ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ نصف شب مہمانوں کو نمٹانے کے بعد جو کھانا بچ گیا تو کسی مدرسے یا یتیم خانے میں بھیج دیا، بلکہ حدیث پاک کا منشا یہ ہے کہ ناداروں کو اکرام کے ساتھ اپنے برابر بٹھا کر کھلاؤ۔

''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: طَعَامُ اَوَّلِ يَوْمٍ حَقٌّ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِیْ سُنَّةٌ، وطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ، وَمَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهٖ''۔

ترجمہ:''حضرت ابن مسعود بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (شب عروسی کے بعد) پہلے دن کا کھانا ثابت ہے، دوسرے دن کا کھانا سنّت ہے اور تیسرے دن کا کھانا نام ونمود کے لیے ہے، جو شخص (اِن دعوتوں کو) نام ونمود اور تفاخر کے لیے استعمال

کرے گا، تو اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اسے رسوا کرے گا، (سُنن ترمذی: 1097)''۔

شریعت میں شادی کے بعد پہلے یا دوسرے دن کی جانے والی ضیافت کو ولیمہ کہا جاتا ہے، اُس کے بعد کی جانے والی دعوت پر ولیمہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

علامہ نظام الدین حنفی لکھتے ہیں:

''وَلِیْمَةُ الْعُرْسِ سُنَّةٌ وَفِیْهَا مَثُوْبَةٌ عَظِیْمَةٌ وَهِیَ اِذَا بَنَی الرَّجُلُ بِأَمْرَأَتِهٖ یَنْبَغِیْ أَنْ یَدْعُوَالْجِیْرَانَ وَالْاَقْرِبَاءَ وَالْاَصْدِقَاءَ وَیَذْبَحَ لَهُمْ وَیَصْنَعَ لَهُمْ طَعَامًا''۔

ترجمہ: ''دعوتِ ولیمہ سنّت ہے اور اس میں ثوابِ عظیم ہے اور دعوتِ ولیمہ یہ ہے کہ جب یہ شخص اپنی عورت (بیوی) سے زفاف کرے، تو اس کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں، عزیز واقارب اور دوست احباب کے لیے دعوت کرے اور مہمانوں کے لیے جانور ذبح کرکے اُن کے لیے کھانا تیار کرے''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''وَلَابَأْسَ بِأَنْ یَدْعُوَ یَوْمَئِذٍ مِّنَ الْغَدِ وَبَعْدَ الْغَدِ ثُمَّ یَنْقَطِعُ الْعُرْسُ وَالْوَلِیْمَةُ کَذَافِی الظَّهِیْرِیَّةِ''۔

ترجمہ: ''اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ ولیمہ شادی کے اگلے دن کرے یا اُس کے بعد والے دن میں کرے، اس کے بعد کی جانے والی دعوت کو ولیمہ نہیں کہا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 343، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

دعوت کی قبولیت کے حوالے سے شرعی حکم یہ ہے:

''قَالَ الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا أَمَرَنَا النَّبِیُّ ﷺ بِسَبْعٍ وَّنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ أَمَرَنَا بِعِیَادَةِ الْمَرِیْضِ، وَاتِّبَاعِ الْجَنَازَةِ، وَتَشْمِیْتِ الْعَاطِسِ، وَاِبْرَارِ الْقَسَمِ وَنَصْرِ الْمَظْلُوْمِ، وَاِفْشَاءِ السَّلَامِ، وَاِجَابَةِ الدَّاعِیْ''۔

ترجمہ: ''براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم فرمایا اور سات باتوں سے منع فرمایا: آپ ﷺ نے ہمیں مریض کی عیادت، جنازے کے ساتھ چلنے، چھینک (آنے پر جو شخص ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کہے، ''یَرْحَمُكَ اللهُ'' کہہ کر اُس) کا

جواب دینا، کسی نے قسم کھائی ہوتو اُس سے عہدہ برآں ہونے کے لیے اُس کی مدد کرنا، مظلوم کی مدد کرنا، سلام کو عام کرنا، دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرنا، (صحیح بخاری: 5175)''۔

''عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلَی الْوَلِیْمَۃِ فَلْیَاْتِہَا''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو اُسے چاہیے کہ اُس میں شریک ہو، (صحیح بخاری: 5173)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''بعض فقہاء کے نزدیک ولیمہ کی دعوت قبول کرنا واجب ہے، اس میں ترک کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور جمہور علماء کے نزدیک سنّت ہے اور افضل یہ ہے کہ ولیمہ کی دعوت ہوتو قبول کرے اور عام دعوت ہوتو اُسے اختیار ہے''۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:

''البنایہ شرح ہدایہ'' میں ہے: دعوت ولیمہ کی ہو یا کوئی اور اُس کا قبول کرنا سنّت ہے، لیکن ایسی دعوت جس سے دولت کی نمائش اور نام ونمود مقصود ہو، تو اُسے خاص طور پر اہلِ علم کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''الاختیار'' میں ہے: ولیمہ کی دعوت سنّتِ قدیمہ ہے اور جو اسے قبول نہیں کرے گا وہ گنہگار ہوگا، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ سنّتِ مؤکدہ ہے جبکہ عام دعوتوں کا یہ حکم نہیں ہے۔ ''ہدایہ'' و''تاتارخانیہ'' میں اِسے واجب قرار دیا ہے''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''جس دعوت میں گانا بجانا اور دیگر مُنکرات ہوں، تو اُن میں شریک نہیں ہونا چاہیے، اگر مُنکرات کو روک سکے تو روکے ورنہ صبر کرے اور روک نہیں سکتا تو ایسی دعوتوں سے نکل آئے، خاص طور پر علماء ومشائخ ایسی دعوتوں میں شریک نہ ہوں، (خلاصہ بحث ردالمحتار، جلد9، ص: 422-423)''۔

آج کل خاص طور پر شہروں میں مکانات اور آبادیاں تنگ (Con|usted) ہیں، اس لیے ہال یالان بک کرنا یا کسی پارک میں اہتمام کرنا ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ بعض لوگ بہت بڑے پیمانے پر اہتمام کرتے ہیں، دسیوں ڈشیں (انواعِ طعام) ہوتی ہیں، یہ ایک طرح طبقاتی برتری کا اظہار ہوتا ہے اور اسے اعلیٰ طبقات سے روابط استوار کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جسے آج کل پی آر او کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی دعوتیں ولیمۂ مسنونہ کی روح اور مقصدیت کے منافی ہیں۔ نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اگر شادی کے دوسرے روز محض چند افراد کی ضیافت بطورِ ولیمہ کردی جائے تو سنّت ادا ہو جاتی ہے، بعد کے دنوں میں کی جانے والی ضیافت محض دعوت ہوگی، اُس پر ولیمہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

مہر لازم ہے

سوال:

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شادی میں مہر مقرر کرنا ضروری نہیں ہے، یہ بات کہاں تک درست ہے؟، اگر یہ صحیح ہے تو قرآن پاک کی کس سورت میں لکھی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سورۂ بقرہ آیت: 237 کے تحت اگر شوہر بیوی کو ہاتھ لگائے بغیر طلاق دے دے تو نصف مہر ادا کرے گا، سوال یہ ہے کہ اگر مہر مقرر نہ کیا ہو تو نصف مہر کا تعین کیسے ہوگا ؟، (ظفر الحق میمن، کلفٹن کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّاوَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ؕ''

ترجمہ: ''اور ان (بیان کردہ محرمات) کے سوا دیگر عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں کہ اپنے مال (مہر) کے عوض ان کو طلب کرو، (مگر) نکاح کی حفاظت میں لانے کے لیے نہ کہ شہوت رانی کے لیے، سو جن سے تم (ازدواج کا) فائدہ اٹھاؤ، ان کا مقررہ مہر ادا کردو، (النساء:24)''۔

(۲) ''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــٴًـا مَّرِیْٓــٴًـا○''۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کو اُن کے مہر خوش دلی سے ادا کرو تو پھر اگر وہ خوشی سے اس (مہر) میں سے تم کو کچھ دے دیں تو اس کو شوق سے کھاؤ، (النساء:4)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

''وَإِنْ لَمْ یُسَمِّهٖ أَوْ نَفَاهُ فَلَهَا مَهْرُ مِثْلِهَا إِنْ وَطِئَ أَوْ مَاتَ عَنْهُ''۔

ترجمہ: ''اگر نکاح میں مہر مقرر نہ ہوا یا مہر کی نفی کردی گئی (تو نکاح ہوجائے گا) اور میاں بیوی میں ازدواجی تعلق قائم ہوگیا یا شوہر وفات پاگیا تو عورت مہر مثل کی حق دار ہوگی، (البحر الرائق، جلد 3، ص:256)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

'' وَالْحُرَّةُ مَهْرُ مِثْلِهَا الشَّرْعِیُّ مَهْرُ مِثْلِهَا اللُّغَوِیُّ أَیْ مَهْرُ امْرَأَةٍ تُمَاثِلُهَا مِنْ قَوْمِ أَبِیهَا، لَا أُمِّهَا، إِنْ لَمْ تَكُنْ مِنْ قَوْمِهٖ كَبِنْتِ عَمِّهٖ وَفِی ''الْخُلَاصَةِ'': تُعْتَبَرُ بِأَخَوَاتِهَا وَعَمَّاتِهَا، فَإِنْ لَمْ یَكُنْ فَبِنْتُ الشَّقِیقَةِ وَبِنْتُ الْعَمِّ، اِنْتَهَى وَمَفَادُهٗ اعْتِبَارُ التَّرْتِیبِ فَلْیُحْفَظْ وَتُعْتَبَرُ الْمُمَاثَلَةُ فِی الْأَوْصَافِ وَقْتَ الْعَقْدِ سِنًّا وَجَمَالًا وَمَالًا وَبَلَدًا وَعَصْرًا وَعَقْلًا وَدِینًا وَبَكَارَةً وَثُیُوبَةً وَعِفَّةً وَعِلْمًا وَأَدَبًا وَكَمَالَ خُلُقٍ''۔

ترجمہ: ''اور آزاد عورت جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو، مہرِ مثل کی حق دار ہوگی، مہر مثل وہ ہے جو اُس کے باپ کے خاندان کی اسی جیسی عورتوں کا ہے، نہ کہ ماں (کے خاندان کی)، اگر ماں اُس کے باپ کی قوم سے نہ ہو، جیسے چچا کی بیٹی، (ورنہ خاندان ایک ہونے کی بنا پر اس کا بھی اعتبار ہوگا)۔ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے: مہر مثل میں عورت کی بہنوں اور پھوپھیوں کا اعتبار ہوگا، پھر اگر وہ نہ ہوں تو سگی بھانجی اور چچا کی بیٹی کا اعتبار ہوگا، مطلب یہ ہے کہ باپ کی قوم میں بھی ترتیب کا اعتبار ہوگا، اس ضابطے کو یاد رکھو، اور عمر، جمال، مال، شہر (یا علاقہ)، زمانے، عقل، دین، باکرہ اور ثیّبہ (شوہر دیدہ) ہونے، عفت، علم، ادب اور اعلیٰ

اخلاق (یعنی ان معیارات) کے اعتبار سے نکاح کے وقت مماثلت کا اعتبار ہوگا، (جلد 8، ص:458، دمشق)''۔

ہمارے عرف کے مطابق نکاح کے بعد جس عورت کی رخصتی نہ ہوئی ہو، یعنی اس کے ساتھ نہ تو شوہر کا ازدواجی تعلق قائم ہوا ہو اور نہ ہی ایسی خلوت ہوئی ہو، جس میں مباشرت سے کوئی شرعی یا طبعی مانع نہ ہو، اُسے فقہ میں ''خلوتِ صحیحہ'' کہتے ہیں، تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ''

ترجمہ:''اور اگر تم نے (اپنی منکوحہ) عورتوں کو چھونے (یعنی مباشرت) سے پہلے طلاق دے دی ہو حالانکہ تم اُن کا مہر مقرر کر چکے تھے، تو اُنہیں مقررہ مہر کا نصف ادا کردو، سوائے اس کے کہ وہ عورتیں (ازخود) کچھ چھوڑ دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (یعنی شوہر) وہ ازخود کچھ زیادہ دے دے، (البقرۃ:237)''۔

جہیز کی شرعی حیثیت کے بارے میں حکومتِ سندھ کا استفسار اور سزا کے نفاذ کی سفارشات

سوال:

معاشرہ میں جہیز دینے اور اس کے نام پر بے جا اسراف اور رسومات کے خاتمے کے لیے ترقیِ نسواں حکومتِ سندھ ایک قانون مرتب کر رہی ہے، جس کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں آپ کی قیمتی سفارشات درکار ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل سوال نامہ پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) کیا قرآن وسنت اور شریعت کے تحت جہیز کی مالیت کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟، اگر حد مقرر کی جاسکتی ہے تو بصورت سونا روپیہ مقرر کر سکتے ہیں، مثلاً سونا یا پچاس ہزار روپے مالیت تک۔ کیا اس حد پر معاشرتی اقدار اور عُرف کا لحاظ رکھا جائے گا؟۔

(۲) کیا مقررہ حد سے زیادہ کا جہیز دینے کے خلاف قانون بنایا جائے؟۔

(۳) کیا نکاح نامہ کے ساتھ جہیز کی تفصیل، تحائف، رقم یا کوئی بھی فہرست منسلک کی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔

(۴) خلع یا طلاق کی صورت میں خاتون کو دیئے گئے جہیز اور حق مہر کے لیے کیا احکامات ہیں اور کیا ان سب پر خاتون کا حق ہوگا؟۔

(۵) شادی اور اس کے متعلق دیگر رسومات (مایوں، مہندی) کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کے اخراجات پر تجاویز دیں۔

آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ مندرجہ بالا سوالنامہ کے ساتھ مفصّل اور جامع سفارشات صادر فرمائیں تاکہ ایسا جامع قانون مرتب کیا جاسکے جو تمام مکتبۂ فکر کے لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو، (مدثر اقبال، سیکریٹری محکمہ ترقی نسواں، حکومتِ سندھ)۔

جواب:

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے جہیز کی بابت کوئی حکم منقول ہی نہیں ہے، اس لیے اس کی حد یا مقدار مقرر کرنے کا سوال ہی غیر متعلق ہے، البتہ آپ ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شادی کے وقت کچھ سامانِ ضرورت مثلاً: چکی، پانی کا برتن اور تکیہ وغیرہ دیا تھا، حدیث پاک میں ہے:

”جَهَّزَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاطِمَةَ فِي خَمِيلٍ وَقِرْبَةٍ وَوِسَادَةٍ حَشْوُهَا إِذْخِرٌ“۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ کو ان کے شوہر علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر بھیجنے کے لیے ایک چادر، مشک اور تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی، پر مشتمل جہیز دیا، (سنن نسائی: 3382)“۔

یہ سامان اس دور کے مطابق گھر بسانے کے لیے بنیادی ضروریات میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی باقی بیٹیوں کے متعلق ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ حضرت ابوالعاص کا گھر پہلے سے موجود تھا، اس لئے سیدہ زینب کے نکاح کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایسا کوئی انتظام نہ کیا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بھی اپنا گھر پہلے سے موجود تھا، اس لیے سیدہ رُقَیّہ

ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے لیے حضور کو ایسے کسی انتظام کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں جو ازواجِ مُطہرات آئیں، اُن کے والدین کو بھی ایسے کسی انتظام کی حاجت نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدہ فاطمۃ الزہرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کے کفیل اور سرپرست تھے۔ اس لیے دونوں کے ازدواج کا اہتمام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو کرنا تھا، چنانچہ خانہ داری کے لیے مختصر سامان مثلاً چارپائی، اِذخر گھاس سے بھری توشک تکیہ، مشکیزے، گھڑے اور چکی کا اہتمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا۔ چاندی کا ہار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کا تھا، جو آپ کو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ترکے سے ملا تھا۔ یہ سارا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لیے کرنا پڑا کہ آپ کو ایک الگ گھر بسانا تھا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلے ہی سے کوئی الگ گھر ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاید اتنا کچھ بھی نہ کرتے۔ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی حیثیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے ایک فرد کی تھی، کیونکہ اب تک وہ حضور کے ساتھ ہی رہتے تھے، پس جب نکاح ہوا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا، ایک انصاری حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بخوشی پیش کر دیا، جس میں یہ پاکیزہ جوڑا منتقل ہوگیا اور خانہ داری کے مختصر اسباب فراہم کر دیے گئے۔ ہمارے عرف کے معیار کا جہیز نہ تھا بلکہ خانہ داری کی کم از کم بنیادی ضروریات کا انتظام تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حق مہر پہلے ہی لے لیا تھا، ایک زرہ تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ تقریباً پانچ سو درہم میں فروخت کی تھی۔ یہی رقم حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور اسی رقم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہر ادا کیا اور خانہ داری کا سب سامان اور کچھ خوشبو وغیرہ منگوائی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أَرَدْتُ أَنْ أَخْطُبَ إِلٰى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَتَهُ ثُمَّ ذَكَرْتُ أَنَّهُ لَا شَيْءَ لِي، فَذَكَرْتُ عَائِدَتَهُ وَفَضْلَهُ فَخَطَبْتُهَا، فَقَالَ لِي هَلْ عِنْدَكَ شَيْءٌ تُعْطِيهَا إِيَّاهُ؟

قُلْتُ لَا، قَالَ فَأَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ الَّتِي أَعْطَيْتُكَهَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا؟، قُلْتُ هِيَ عِنْدِي، قَالَ فَأْتِ بِهَا قَالَ فَجِئْتُ بِهَا فَأَعْطَيْتُهُ إِيَّاهَا فَزَوَّجَنِيهَا، فَلَمَّا أَدْخَلَهَا عَلَيَّ قَالَ لَا تُحْدِثَا شَيْئًا حَتَّى آتِيَكُمَا، فَجَاءَنَا وَعَلَيْنَا كِسَاءٌ أَوْ قَطِيفَةٌ، فَلَمَّا رَأَيْنَاهُ تَخَشْخَشْنَا، فَقَالَ: مَكَانَكُمَا، فَدَعَا بِإِنَاءٍ فِيهِ مَاءٌ، فَدَعَا فِيهِ، ثُمَّ رَشَّهُ عَلَيْنَا، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَهِيَ أَحَبُّ إِلَيْكَ أَمْ أَنَا؟، قَالَ هِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْكَ، وَأَنْتَ أَعَزُّ عَلَيَّ مِنْهَا"۔

ترجمہ: ''میں نے جب رسول اللہ ﷺ کو آپ کی صاحبزادی (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے نکاح کا پیغام دینے کا ارادہ کیا، تو مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، پھر مجھے آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ اور آپ کا فضل واحسان یاد آیا، تو میں نے پیغام دے دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس کچھ ہے جو تم اسے (سیدہ فاطمہ کو) مہر کے طور پر دو، میں نے عرض کی: کچھ نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حُطَمی زرہ کہاں ہے، جو میں نے فلاں دن تمہیں دی تھی، میں نے عرض کی: وہ میرے پاس موجود ہے، فرمایا: اُسے لے آؤ، آپ بیان کرتے ہیں: میں نے وہ زرہ آپ کو دے دی اور آپ ﷺ نے (فاطمہ سے) میرا نکاح کر دیا، جب آپ نے انہیں (فاطمہ کو) میرے گھر بھیجا تو فرمایا: میرے آنے تک تم کچھ نہ کرنا، پس آپ ﷺ آئے اور ہم چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ کو ہم نے دیکھا، تو آپ نے ہمیں اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے کھنکارا اور فرمایا: اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر آپ نے ایک برتن میں پانی منگوایا اور اس پر دعا فرما کر (یعنی دَم کرکے) ہم پر چھڑکا، پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! آپ کو یہ (فاطمہ) زیادہ محبوب ہیں یا میں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے فاطمہ زیادہ محبوب ہیں اور تم مجھے ان سے زیادہ عزیز ہو، (مسند حمیدی: 38)''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ممکن ہے ایک شخص افضل بھی ہو اور اَحبّ (محبوب ترین) بھی، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک افضل ہو اور دوسرا اَحبّ (محبوب ترین) ہو، جیسا کہ اس حدیث مبارک سے ظاہر ہے۔

اس تفصیل سے ہمیں جہیز کے حوالے سے اس قدر گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ اگر لڑکا بہت زیادہ غریب ہو کہ گھر کا ضروری سامان خریدنے کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں لڑکی کے والدین اگر اس کے ساتھ مالی تعاون کریں تو حرج نہیں ہے، بلکہ باعثِ ثواب ہے۔ لیکن موجودہ رسمِ جہیز کا ہمیں سیرتِ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور قرونِ اُولیٰ میں کوئی شعار نہیں ملتا۔

نکاح کے وقت عورت کی طرف سے کسی طرح کا مال دینا جائز نہیں ہے، علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لِأَنَّهَا جَعَلَتِ الْمَالَ عَلَى نَفْسِهَا عِوَضًا عَنِ النِّكَاحِ، وَفِي النِّكَاحِ الْعِوَضُ لَا يَكُونُ عَلَى الْمَرْأَةِ"۔

ترجمہ: "کیونکہ وہ نکاح کے وقت جو مال دے گی، وہ نکاح کا بدل ہوگا اور نکاح میں عورت پر کوئی مالی بدل نہیں ہوتا (بلکہ مالی بدل مہر کی صورت میں مرد پر ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص: 440، بیروت)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"أَخَذَ أَهْلُ الْمَرْأَةِ شَيْئًا عِنْدَ التَّسْلِيمِ، فَلِلزَّوْجِ أَنْ يَسْتَرِدَّهُ، لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ"۔

ترجمہ: "رخصتی کے وقت لڑکی والوں نے اگر کچھ لیا تو شوہر والے اس کے لینے کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ رشوت ہے"۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"أَيْ بِأَنْ أَبَى أَنْ يُسَلِّمَهَا أَخُوهَا أَوْ نَحْوُهُ حَتَّى يَأْخُذَ شَيْئًا، وَكَذَا لَوْ أَبَى أَنْ يُزَوِّجَهَا فَلِلزَّوْجِ الْاِسْتِرْدَادُ قَائِمًا أَوْ هَالِكًا، لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ" بَزَّازِيَّةٌ"

ترجمہ: "یعنی اگر لڑکی کے بھائی (یا کسی دوسرے ولی) نے رخصتی یا نکاح سے انکار کر دیا (اور شوہر نے ان کے مطالبے پر کچھ مال دے دیا) تو شوہر کو حق حاصل ہے کہ اسے واپس لے لے، خواہ وہ مال موجود ہو یا ختم ہو گیا ہو، اس لیے کہ یہ (مال) رشوت ہے، بحوالہ "بزازیہ"، (جلد 8، ص: 520، دمشق)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ لڑکی والوں کا لڑکے سے مہر کے سوا کسی اور شے کا مطالبہ رشوت ہے اور باطل ہے، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''خَطَبَ اِمرَأَۃً فِی بَیتِ اَخِیھَا، فَاَبٰی اَنْ یَّدْفَعَھَا حَتّٰی یَدْفَعَ اِلَیْہِ دَرَاھِمَ، فَدَفَعَ وَتَزَوَّجَھَا، یَرجِعُ بِمَا دَفَعَ، لِاَنَّھَا رِشْوَۃٌ، کَذَا فِی ''الْقُنْیة''.

ترجمہ: ''کسی شخص کی بہن کو ایک شخص نے اس کے بھائی کے گھر میں نکاح کا پیغام دیا، اس کے بھائی نے کہا: جب تک تم مجھے (مہر کے علاوہ) اتنی رقم نہیں دو گے، میں رشتہ نہیں دوں گا، چنانچہ اس شخص نے رقم دے کر اس عورت سے نکاح کرلیا، پس وہ شوہر اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے، کیونکہ یہ رشوت ہے، ''قنیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:403)''۔ البتہ عورت کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق نفقہ اور جائے رہائش فراہم کرنا شوہر کی ذمے داری ہے۔

شریعت کا اصل حکم یہ ہے کہ عورت کا ماں یا بیوی یا بیٹی یا بہن کی حیثیت سے وراثت میں جو حق بنتا ہے، وہ اُسے دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں خواتین کو وراثت میں شرعی حصہ دینے کا شِعار بہت کم ہے اور اُس کی بجائے جہیز کی رسم کو اپنے گلے کا طوق بنالیا ہے۔ اب اس کی بنا پر رشتے بنتے اور ٹوٹتے ہیں اور بعض لوگ معاشرے میں اپنی عزت برقرار رکھنے یا اپنی بیٹی اور بہن کے لیے سسرال کے گھر میں گنجائش پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات قرض لے کر جہیز کا انتظام کرتے ہیں اور بعض برادریوں اور علاقوں میں اس کی نمائش بھی کی جاتی ہے، جو مالی اعتبار سے کمزور طبقات میں احساسِ محرومی پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

اب آپ کے سوالات کے ترتیب وار جوابات حسبِ ذیل ہیں:

(۱۔ ۲) جب شریعت میں جہیز کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، تو اُس کی کم از کم مقدار مقرر کرنے اور اس کی خلاف ورزی پر تعزیری سزا مقرر کرنے کا سوال بالکل غیر متعلق ہے۔

(۳) اس کا شرعی حکم تو ہم نے بیان کردیا ہے، تاہم اپنے رسم ورواج کے مطابق والدین اپنی بیٹی کو کچھ دیں تو نکاح نامے میں اُس کے اندراج میں کوئی حرج نہیں ہے اور الگ فہرست بھی

بنائی جاسکتی ہے، اِسی طرح شادی کے موقع پر سسرال کی طرف سے عورت کو جو زیورات اور تحائف دیئے جاتے ہیں، اُن کی حیثیت کی بھی تصریح مناسب ہے کہ آیا یہ چیزیں عورت کی مِلکیت میں دے دی گئی ہیں یا عاریۃً دی گئی ہیں، کیونکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا خلع کی نوبت آجائے، تو یہ چیزیں خاندانوں میں نزاع کا باعث بنتی ہیں۔

(۴) مہر تو یقینی طور پر عورت کا حق ہے، اگر اُس کے ماں باپ نے رخصتی کے وقت یا بعد میں اُسے کچھ مال یا سامان دیا ہے، تو یہ بھی اُسی کا حق ہے، اس کے علاوہ شوہر یا اُس کے خاندان کی طرف سے دیئے گئے تحائف کا حکم سوال نمبر 3 کے جواب میں بیان کردیا گیا ہے۔

(۵) مایوں اور مہندی کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، اس لیے ان خرافات پر پیسہ خرچ کرنے کی مقدار مقرر کرنے کا سوال بالکل غیر متعلق ہے۔

الغرض جب شریعت میں جہیز کا حکم ہی نہیں ہے تو حد مقرر کرنے اور حد سے تجاوز کرنے کی صورت میں قید یا جرمانے کی بحث بھی بالکل غیر متعلق ہے۔ ہمارے وطنِ عزیز میں بہت سے کام یا قانون سازی محض نمائشی طور پر کی جاتی ہے اور خواتین اراکینِ اسمبلی یا حقوقِ نسواں کے اداروں سے وابستہ خواتین کی طرف سے نمبر گیم مقصود ہوتی ہے، اس طرح کے قانون بنانے کی تحریک برپا کرنے والوں، قانون ساز اداروں اور پھر قانون نافذ کرنے والوں کا اپنا طرزِ عمل اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک اس طرح کے کام محض کمپنی کی مشہوری کے لیے ہوتے ہیں۔

جہاں تک جہیز کی نمائش پر پابندی کا تعلق ہے، یہ بھی دکھاوے کا کام ہے، جب کسی گھر میں شادی کے موقع پر نیا ساز وسامان آتا ہے تو پوری برادری اور اس گاؤں یا محلے میں رہنے والے سب دیکھ لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی محض ''بے کار مباش، کچھ کیا کر'' کے طرز کی مشق ہے اور کچھ پولیس اور متعلقہ اداروں کے لیے آمدنی کا ذریعہ نکل آتا ہے۔ جس ملک میں قانون کی بے توقیری اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے بسی کا عالم یہ ہو کہ سرِ شام مقررہ وقت پر دکانیں اور مارکیٹیں بند نہ کرائی جاسکتی ہوں، وہاں جہیز کے مجوزہ قانون پر

عمل کون کرائے گا، صرف قانون کی کتاب میں ایک نئے قانون کا اندراج ہوجائے گا اور چندلوگوں کواس شعبے میں نوکریاں مل جائیں گی اور بس!۔

جہاں تک مجوزہ قانون کی خلاف ورزی کرنے پر عوام سے شکایت درج کرنے کی توقع قائم کرنے کا سوال ہے، یہ بھی صرف ہوائی باتیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں لوگ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے گواہی دینے سے اجتناب کرتے ہیں اور ہمارے Procedural Laws اتنے فرسودہ اور پیچیدہ ہیں کہ جو شخص رپورٹ کرے یا گواہی دے، ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق برسوں اسے بھگتنا پڑے گا اور اپنی اولاد کو وصیت کر کے جائے گا کہ ''آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا''۔

جنات سے نکاح کرنا

سوال:

کیا جنات سے نکاح کرنا جائز ہے، (محمد احسن جاوید، احسان پور)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ''۔

ترجمہ: ''اور اللہ نے تمہارے لیے تم میں سے بیویاں پیدا فرمائیں اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے اور نواسے پیدا فرمائے اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا فرمایا، کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں، (النحل: 72)''۔

علامہ قرطبی مالکی متوفّٰی 668ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قَوْلُهُ تَعَالٰى(وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً) جَعَلَ بِمَعْنٰى خَلَقَ وَقَدْ تَقَدَّمَ ''مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً'' يَعْنِيْ آدَمَ خَلَقَ مِنْهُ حَوَّاءَ، وَقِيْلَ: اَلْمَعْنٰى جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ، أَيْ مِنْ جِنْسِكُمْ وَنَوْعِكُمْ وَعَلٰى خِلْقَتِكُمْ، كَمَا قَالَ: ''لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ

أَنۡفُسِكُمْ " أَيْ مِنَ الْآدَمِيِّيْنَ، وَفِيْ هٰذَا رَدٌّ عَلَى الْعَرَبِ الَّتِيْ كَانَتْ تَعْتَقِدُ أَنَّهَا كَانَتْ تَزَوَّجَ الْجِنَّ وَتُبَاضِعُهَا"۔

ترجمہ: " آیت میں " جَعَلَ " خَلَقَ کے معنی میں ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے: اور اس نے تمہاری جانوں سے بیویاں پیدا فرمائیں، یعنی اللہ نے حوا کو آدم سے پیدا کیا، یعنی آیت میں نفس سے آدم علیہ السلام مراد ہیں اور ازواج سے بی بی حوا مراد ہیں اور اس آیت کا ایک معنی یہ ہے: " انسانوں کے لیے انہی کی جنس، انہی کی نوع اور انہی کی ساخت اور جبلّت پر اُن کی بیویاں پیدا فرمائیں"، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " تحقیق تمہارے پاس تم ہی میں سے (یعنی انسانوں میں سے) رسولِ عظیم آیا، (التوبہ: 128)"۔ نیز اس میں اُن عرب لوگوں کا رد ہے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انہوں نے جنّات کے ساتھ شادی کی ہے اور جماع کیا ہے، (تفسیر قرطبی، ج: 12، ص: 376)"۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفّٰی 1370ھ، " وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً " کے تحت لکھتے ہیں:

" مِّنْ أَنْفُسِكُمْ " سے مراد یہ ہے کہ تمہاری جنس اور تمہاری نوع سے ہوں اور یہ اس معنی میں مجاز ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اس سے بعض نے استدلال کیا ہے: " انسان کے لیے جنّ سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے" مزید لکھتے ہیں: " انسان کے باہم نکاح مشروع ہونے کی حکمت یہ ہے کہ زوجین میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اُنس پیدا ہوگا اور اُن کی مصلحتیں قائم ہوں گی اور اولاد بھی اُن جیسی ہوگی، (روح المعانی، جز: 14، ص: 80)"۔

علامہ الماوردی متوفی 450ھ لکھتے ہیں:

" وَهٰذَا الْقَوْلُ بِأَنَّ أُمَّهَا جِنِّيَّةٌ مُسْتَنْكَرٌ مِنَ الْعُقُوْلِ لِتَبَايُنِ الْجِنْسَيْنِ وَاخْتِلَافُ الطَّبْعَيْنِ وَتَفَاوُتِ الْجِسْمَيْنِ، لِأَنَّ الْآدَمِيَّ جِسْمَانِيٌّ، وَالْجِنِّيَّ رُوْحَانِيٌّ، وَخَلَقَ اللّٰهُ الْآدَمِيَّ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجِنِّيَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ، وَيَمْتَنِعُ الْاِمْتِزَاجُ مِنْ هٰذَا التَّبَايُنِ وَيَسْتَحِيْلُ التَّنَاسُلُ مَعَ هٰذَا الْاِخْتِلَافِ"۔

ترجمہ: ''اور یہ قول عقل سے بعید ہے کہ بلقیس (ملکۂ سبا) کی ماں جنیہ تھی، کیونکہ دونوں (انس وجنّ) کی جنس اور طبیعتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں اور دونوں کی جسمانی ساخت میں بھی فرق ہے، کیونکہ انسان کا جسم خاکی ہے اور جنّ ناری ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہوئی سوکھی مٹی سے پیدا کیا ہے اور جنّ کو خالص آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے اور دونوں کی حقیقتوں میں اس فرق کی وجہ سے دونوں کا آپس میں ملاپ ناممکن ہے اور دونوں کی حقیقتیں مختلف ہونے کے باعث اُن کا آپس میں توالد وتناسل کا سلسلہ قائم ہونا محال ہے، (اَلنُّکَتُ وَالْعُیُوْن، زیرِ تفسیر سورۃ النمل، آیت: 44)''۔

علامہ ابن حجر ہیتمی لکھتے ہیں:

''وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِیْ جَوَازِ نِکَاحِھِمْ شَرْعًا، وَجَاءَ عَنْ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهٗ أَجَازَهٗ وَلٰكِنَّهٗ كَرِهَهٗ لِئَلَّا یَدَّعِیَ الْحُبَالٰی مِنَ الزِّنَا أَنَّهٗ مِنَ الْجِنِّ، وَكَذَا كَرِهَهُ الْحَكَمُ بْنُ عُیَیْنَةَ وَقَتَادَةُ وَالْحَسَنُ وَعَقَبَةُ الْأَصَمُّ وَالْحَجَّاجُ بْنُ أَرْطَاةَ، وَأَخْرَجَ جَرِیْرٌ عَنْ أَحْمَدَ وَإِسْحٰقَ أَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْهُ، وَمِنْ ثَمَّ كَرِهَهٗ إِسْحٰقُ لٰكِنْ فِیْ ''الْفَتَاوٰی السِّرَاجِیَّةِ'' لِلْحَنَفِیَّةِ أَنَّهٗ لَا تَجُوْزُ الْمُنَاكَحَةُ بَیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَإِنْسَانِ الْمَاءِ لِاخْتِلَافِ الْجِنْسِ وَبِهٖ أَفْتٰی شَیْخُ الْاِسْلَامِ الْبَارِزِیِّ مِنْ أَئِمَّتِنَا، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اِمْتَنَّ عَلَیْنَا بِأَنْ خَلَقَ لَنَا مِنْ أَنْفُسِنَا أَزْوَاجًا فَلَوْ جَازَ نِكَاحُ الْجِنِّ مَا حَصَلَ الْاِمْتِنَانُ بِذٰلِكَ، قَالَ الْمُفَسِّرُوْنَ مَعْنَی الْآیَةِ: أَیْ آیَةِ النَّحْلِ وَالرُّوْمِ (جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ) (النَّحْل: 72) أَیْ مِنْ جِنْسِكُمْ وَنَوْعِكُمْ وَعَلٰی خَلْقِكُمْ، وَصَوَّبَ اِبْنُ الْعِمَادِ قَوْلَ ابْنِ یُوْنُسَ فِیْ ''شَرْحِ الْوَجِیْزِ'' بِحِلِّ نِكَاحِھِمْ''۔

ترجمہ: اور علماء کے درمیان جنّات سے نکاح کے شرعاً جائز ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے کراہت کے ساتھ اِسے جائز قرار دیا ہے اور کراہت کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ زنا سے حاملہ کوئی بھی عورت یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ اُس کا (جنّ سے نکاح ہوا ہے) اور یہ حمل اُس کا ہے اور اِسی طرح حکم بن عیینہ، قتادہ، حسن، عقبۃ الاصم اور حجاج بن ارطاۃ نے

اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔اور جریر نے امام احمد اور اسحاق سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنّات سے نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے، اور اسی وجہ سے امام اسحاق نے بھی کراہت کا قول کیا ہے۔لیکن ''فتاویٰ سراجیہ'' میں ہے: احناف کے نزدیک انسانوں اور جنّوں اور پانی میں رہنے والی انسان نما مخلوق (جل پری) کا جنس میں اختلاف کے سبب آپس میں نکاح جائز نہیں ہے اور ہمارے ائمہ میں سے شیخ الاسلام البارزی نے اِسی پر فتویٰ دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان جتایا کہ اُس نے ہمارے لیے ہم میں سے جوڑے بنائے۔پس اگر جنّات کے ساتھ انسان کا نکاح جائز ہوتا تو یہ بات احسان جتانے کا سبب نہ بن پاتی اور مفسرین نے سورۃ النحل اور سورۃ الروم کے کلمات ''جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ'' کے معنی کے متعلق فرمایا: ''مِّنْ أَنْفُسِكُم'' سے مراد یہ ہے کہ تمہاری جنس، تمہاری نوع اور تمہاری ہیئت پر تمہارے جوڑے پیدا کیے۔اور ابنِ عماد نے ''جنّات کے ساتھ نکاح کے جائز ہونے کے حوالے سے''ابن یونس کے قول کو ''شرح الوجیز'' میں درست قرار دیا ہے، (فتاویٰ حدیثیہ، ج:1،ص:50، دارالفکر، بیروت)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

''وَفِي الْقُنْيَةِ لَا يَجُوْزُ التَّزْوِيْجُ بِجِنِّيَّةٍ وَأَجَازَهُ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ بِشُهُوْدٍ''۔

ترجمہ: ''اور ''قُنیہ'' میں لکھا ہے: جِنّیہ کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح جائز نہیں ہے اور حسن بصری نے گواہوں کی موجودگی میں جِنّیہ کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے، (البحرالرائق، ج:3،ص:138)''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فِي الْأَشْبَاهِ عَنِ السِّرَاجِيَّةِ: لَا تَجُوْزُ الْمُنَاكَحَةُ بَيْنَ بَنِي آدَمَ وَالْجِنِّ، وَإِنْسَانِ الْمَاءِ، لِاخْتِلَافِ الْجِنْسِ، وَمَفَادُ الْمُفَاعَلَةِ أَنَّهُ لَا يَجُوْزُ لِلْجِنِّيِّ أَنْ يَتَزَوَّجَ إِنْسِيَّةً أَيْضًا، وَهُوَ مَفَادُ التَّعْلِيْلِ أَيْضًا، (قَوْلُهُ وَأَجَازَ الْحَسَنُ) أَيِ الْبَصْرِيُّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَمَا فِي الْبَحْرِ وَالْأَوْلَى التَّقْيِيْدُ بِهِ لِإِخْرَاجِ الْحَسَنِ بْنِ زِيَادٍ تِلْمِيْذِ الْإِمَامِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، لِأَنَّهُ يُتَوَهَّمُ

مِنْ إِطْلَاقِهِ هُنَا أَنَّهُ رِوَايَةٌ فِي الْمَذْهَبِ، وَلَيْسَ كَذٰلِكَ، لٰكِنَّهُ نَقَلَ بَعْدَهُ عَنْ شَرْحِ الْمُنْتَقٰى عَنْ "زَوَاهِرِ الْجَوَاهِرِ" الْأَصَحُّ أَنَّهُ لَا يَصِحُّ نِكَاحُ آدَمِيٍّ جِنِّيَّةً كَعَكْسِهِ لِاخْتِلَافِ الْجِنْسِ فَكَانُوْا كَبَقِيَّةِ الْحَيَوَانَات، وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ مُقَابِلَ الْأَصَحِّ قَوْلُ الْحَسَنِ الْمَذْكُوْرِ، تَأَمَّلْ"۔

ترجمہ: "اَشباہ میں "سراجیہ" کے حوالے سے لکھا ہے: انسانوں جنّات اور پانی کے اندر رہنے والی انسان نما مخلوق کا آپس میں نکاح اختلافِ جنس کی وجہ سے جائز نہیں ہے اور مُنَاکَحَہ کے مُفَاعَلَہ کے وزن پر ہونے کا مفاد یہ ہے کہ نَر جنّ کا بھی انسان عورت سے نکاح جائز نہیں ہے کیونکہ مرد آدمی کا جنّیہ عورت سے نکاح ہو یا انسان عورت کا جنّ نَر سے، اختلافِ جنس کی علّت دونوں جگہ مشترک ہے۔اور (علامہ حصکفی کا کہنا کہ حسن نے جائز قرار دیا ہے) یعنی حسن بصری نے جیسا کہ "البحرالرائق" میں ہے، علامہ حصکفی کو حسن کے ساتھ بصری کہنا مناسب تھا تاکہ امام اعظم کے شاگرد حسن بن زیاد کی طرف ذہن نہ جائے، کیونکہ قید لگائے بغیر کوئی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مذہب حنفی میں بھی جواز کی ایک روایت موجود ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔لیکن اس کے بعد "شرح المنتقی" میں "زواھرالجواھر" کے حوالے سے نقل کیا ہے: صحیح ترین قول یہ ہے کہ آدمی کا جِنیہ سے اور عورت کا نَر جنّ سے نکاح اختلافِ جنس کی وجہ سے جائز نہیں ہے، گویا نکاح کے عدمِ جواز کے حوالے سے انسان کے لیے جنّات بھی دوسرے حیوانات کی طرح ہیں اور اس جزئیہ میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اصح کے مقابل حسن بصری رضی اللہ عنہ کا مذکورہ قول ہی ہو، پس مقامِ غور ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:4،ص:54)"۔علامہ ابن عابدین شامی کا "تَاَمَّلْ" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ اَصَحّ قول کے مقابل حضرت حسن بصری کا قول ہو، جس کے التزامی معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک یہ نکاح صحیح ہے، وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔اس صورت میں یہ تقابل صحیح اور غلط میں ہوگا، یعنی احناف کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "آیا جنّ اور انسان کا نکاح شرعاً جائز ہے یا

نہیں؟''۔علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی 543ھ لکھتے ہیں:

''ہمارے علماء نے کہا ہے: بلقیس بنت شرحبیل (ملکہ سبا) کی ماں جنیہ تھی، اس چیز کا ملحدین نے انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جنّ کھاتے ہیں نہ ان کی اولاد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب پر لعنت کرے انہوں نے جھوٹ کہا، یہ چیز صحیح ہے، جنات کا انسانوں سے نکاح عقلاً صحیح ہے اور اگر یہ شرعاً بھی صحیح ہو تو بہت اچھا ہے۔(احکام القرآن، ج:3،ص:481، دارالکتب العلمیہ بیروت، 1408ھ)''۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ، لکھتے ہیں:

''جنات کے نکاح کے متعلق ''وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ، (بنی اسرائیل:64)'' میں اشارہ گزر چکا ہے اور عنقریب اس کی تفصیل آئے گی۔(الجامع لاحکام القرآن، جز:13، ص:171، دارالفکر بیروت، 1415ھ)''۔

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ، لکھتے ہیں:

''امام ابن عساکر نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ ملکۂ سبا کے ماں باپ میں سے ایک جنّی تھا، تو انہوں نے کہا: جنات اور انسانوں کے درمیان توالد وتناسل نہیں ہوتا، یعنی انسان عورت کا جنّ سے اور جنّیہ کا انسان مرد سے توالد نہیں ہوتا، ہاں امام مالک سے ایک روایت میں اس کا جواز منقول ہے، (روح المعانی، سورۃ النمل، آیت:22)''۔

علامہ ابن نجیم نے ''الْاَشْبَاہ وَالنَّظَائِر'' میں لکھا ہے: ابوعثمان سعید بن داؤد زبیدی نے روایت کیا ہے کہ اہل یمن سے کچھ لوگوں نے امام مالک سے سوال کیا: آیا جنات سے نکاح جائز ہے؟، انہوں نے کہا: میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن میں اس کو مکروہ قرار دیتا ہوں کہ کوئی عورت حاملہ پائی جائے اور اس عورت سے اس کے شوہر کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ کہے کہ میرا شوہر جنّ ہے اور اس سے اسلام میں بہت فساد پھیل جائے گا (یعنی جو عورت بھی زنا سے حاملہ ہوگی وہ کہہ سکے گی کہ میرا جنّ سے نکاح ہوا ہے اور ظاہر ہے جنّ دکھائی تو نہیں دیتے کہ ان سے تفتیش اور تحقیق کی جاسکے)، امام مالک سے اس

نکاح کی کراہت کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں ہے، اس پر یہ اشکال ہے کہ جب جنیہ انسان سے حاملہ ہوگی تو جن کی لطافت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دکھائی نہ دے اور حمل کی کثافت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دکھائی دے اور جب وضع حمل کا وقت ہوگا تو وہ دکھائی دے گی یا جب تک اس کے پیٹ میں حمل رہے گا وہ انسان کی شکل میں رہے گی اور پیٹ میں اس کو غذا اور نشوونما حاصل ہوگی اور یہ تمام صورتیں استبعاد سے خالی نہیں ہیں، (یعنی یہ عقل سے بعید ہیں، (روح المعانی، ج:19، ص:282، دارالفکر بیروت، 1417ھ)"۔

قاضی بدرالدین شبلی حنفی متوفی 769ھ لکھتے ہیں:

"جہاں تک انسان اور جن کے درمیان نکاح کے مشروع ہونے کا تعلق ہے، تو نبی ﷺ سے اس کی ممانعت منقول ہے۔ زہری سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے جن کے ساتھ نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور حکم، قتادہ، حسن بصری، ابوسعید، الحکم بن عتیبہ وغیرہم سے اس کی ممانعت میں بہ کثرت آثار ہیں اور فقہاءِ احناف میں سے شیخ سجستانی اور شیخ زاہدی نے اس نکاح سے منع کیا ہے اور فقہاءِ شافعیہ میں سے شیخ جمال الدین نے اس نکاح سے منع کیا ہے اور قرآن مجید کی ان آیتوں سے اس ممانعت پر استدلال ہے:

(1) "وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً"۔

ترجمہ: "اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے بیویاں بنائی ہیں، (النحل:72)"۔

(2) "خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً"۔

ترجمہ: "(اللہ نے) تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے بیویاں پیدا کی ہیں، (الروم: 21)"۔ ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے لیے انسانوں کی نوع سے بیویاں بنائی ہیں اور جنات انسانوں کی نوع سے نہیں ہیں۔ اعمش سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے ایک انسان کی جنیہ سے شادی میں شرکت کی تھی، امام مالک سے بھی اس کا کراہت کے ساتھ جواز منقول ہے، (آکام المرجان، ص:74-71، مطبوعہ کراچی)۔

(تبیان القرآن، ج:8،ص:662،فرید بک اسٹال، لاہور)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"اور جنّی کی امامت میں نماز صحیح ہے"۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"کیونکہ وہ مکلّف ہے، جبکہ فرشتہ مکلّف نہیں ہوتا اور اُس کی نماز نفل ہوگی (اور متنفّل کے پیچھے مُفترض کی اقتدا جائز نہیں ہے اور جبریلِ امین کا امامت کرنا تعلیم کے لیے تھا اور ہوسکتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کا اعادہ فرماتے ہوں، (بحوالہ طیبی)"، نیز جنّات کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھنا ثابت ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:2،ص:193،ملخصاً)"۔

جنّ اگر صاحبِ ایمان ہے تو اپنی اصل صورت میں بھی اقتدا میں نماز پڑھ سکتا ہے اور بشری شکل میں متشکل ہوکر وقتی طور پر امامت بھی کرسکتا ہے، لیکن یہ کوئی دائمی معمول بہا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا حوالہ ملا ہے کہ کسی جنّ نے کسی مقام پر برسوں بشری شکل میں امامت کی ہو، پس نوادر کو فقہی ضابطے کی بنیاد نہیں بنا سکتے، نیز امامت اور نکاح میں بیّن فرق ہے، نکاح پر اور بہت سے احکام مرتّب ہوتے ہیں، حقوقِ زوجیت کے مسائل ہیں، توالد وتناسل اور صحتِ نسب کے مسائل ہیں۔علامہ سید محمود آلوسی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تبصرہ گزرچکا ہے کہ اگر اس کو بطورِ ضابطہ مان لیا جائے تو زنا کا راستہ کھل جائے گا اور فاحشات کو ایک عذر میسر آجائے گا اور یہ محض فرضی باتیں نہیں ہیں، میڈیا سے معلوم ہوا قصور کے عادی بدکار مجرم نے بھی اپنے اوپر جنّ چڑھنے کا عذر پیش کیا تھا۔ ہمارے دارالافتاء میں ایسے لوگ آئے ہیں کہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور کہا: میں نے طلاق ارادتاً نہیں دی، مجھ پر جنّ مسلّط ہوگیا تھا۔اس لیے ہم کہتے ہیں: دینی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مفاسد سے بچنے کے لیے سدِّ ذرائع کو ترجیح دی جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''وَاسْتَدَلَّ مَنْ قَالَ بِأَنَّهُمْ يَتَنَاكَحُونَ بِقَوْلِهِ تَعَالٰى:''لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ'' وَبِقَوْلِهِ تَعَالٰى:''أَفَتَتَّخِذُونَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ''، وَالدَّلَالَةُ مِنْ ذٰلِكَ

ظَاهِرَةٌ ،وَاعْتَلَّ مَنْ أَنْكَرَ ذٰلِكَ:بِأَنَّ اللهَ تَعَالٰى أَخْبَرَ أَنَّ الْجَانَّ خُلِقَ مِنْ نَارٍ وَفِي النَّارِ مِنَ الْيُبُوسَةِ وَالْخِفَّةِ مَا يَمْنَعُ مَعَهُ التَّوَالُدَ ،وَالْجَوَابُ أَنَّ أَصْلَهُمْ مِنَ النَّارِ كَمَا أَنَّ أَصْلَ الْآدَمِيِّ مِنَ التُّرَابِ وَكَمَا أَنَّ الْآدَمِيَّ لَيْسَ طِينًا حَقِيقَةً كَذٰلِكَ الْجِنِّيُّ لَيْسَ نَارًا حَقِيقَةً ،وَقَدْ وَقَعَ فِي الصَّحِيحِ فِي قِصَّةِ تَعَرُّضِ الشَّيْطَانِ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: فَأَخَذْتُهُ فَخَنَقْتُهُ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ رِيقِهِ عَلٰى يَدَيَّ قُلْتُ:وَبِهٰذَا الْجَوَابِ يَنْدَفِعُ إِيرَادُ مَنِ اسْتَشْكَلَ قَوْلَهُ تَعَالٰى :إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ. فَقَالَ: كَيْفَ تُحْرِقُ النَّارُ النَّارَ''۔

ترجمہ:''جولوگ انسانوں اور جنّوں میں باہم نکاح کے قائل ہیں،انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:''(جنت کی حوروں کو)اس سے پہلے نہ انسانوں نے چھوا اور نہ جنّوں نے (الرحمٰن:56)''،اورانہوں نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:''کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اُس کی ذرّیت کو دوست بناتے ہو(الکہف:50)''،اس سے دلالت ظاہر ہے کہ جنّات مَس کر سکتے ہیں اور اُن سے دوستی کی جا سکتی ہے۔اور جنہوں نے جنّات سے نکاح کا انکار کیا ہے،انہوں نے اس کی علّت یہ بیان کی ہے:''اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جنّ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور آگ میں خشکی ہے اور ہلکا (لطافت) پن ہے، جو توالد سے مانع ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی اصل (یعنی جوہرِ تخلیق) آگ ہے،جیسا کہ آدمی کی اصل مٹی ہے اور جس طرح آدمی حقیقتاً مٹی نہیں ہوتا ،اسی طرح جنّ بھی حقیقتاً آگ نہیں ہوتا اور حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آیا،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اُسے پکڑا اور اُس کا گلا گھونٹا یہاں تک کہ اُس کے لعاب کی ٹھنڈک مجھے اپنے ہاتھ پر محسوس ہوئی''، میں کہتا ہوں:''اس جواب سے اس اشکال کا جواب بھی آ گیا جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر وارد ہوا کہ جو(عالَمِ بالا کی باتوں کو) اچکتا ہے،تو آگ کے شعلے اس کا تعاقب کرتے ہیں، اشکال وارد ہوا کہ آگ آگ کو کیسے جلاتی ہے، (فتح الباری، ج:6،ص:345)''۔یعنی جنّات اگرچہ آگ سے بنے ہیں،لیکن وہ حقیقتاً آگ

نہیں ہیں، اس لیے اُن کا آگ میں جلنا متصور ہوسکتا ہے۔ اگرچہ حدیث میں آگ کے آگ کو جلانے کا ثبوت موجود ہے:

''وَاشْتَكَتِ النَّارُ إِلَى رَبِّهَا، فَقَالَتْ يَا رَبِّ أَكَلَ بَعْضِي بَعْضًا، فَأَذِنَ لَهَا بِنَفَسَيْنِ، نَفَسٍ فِي الشِّتَاءِ وَنَفَسٍ فِي الصَّيْفِ، فَهُوَ أَشَدُّ مَا تَجِدُونَ مِنَ الحَرِّ، وَأَشَدُّ مَا تَجِدُونَ مِنَ الزَّمْهَرِيرِ''۔

ترجمہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کی: اے پروردگار! میرے بعض حصے نے بعض کو کھالیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے دو سانسیں لینے کا اِذن عطا کیا، ایک سانس سردی کے موسم میں اور ایک سانس گرمی کے موسم میں، یہی سبب ہے کہ تم (بعض اوقات) شدید گرمی محسوس کرتے ہو اور (بعض اوقات) شدید سردی محسوس کرتے ہو، (صحیح البخاری: 537)''۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں شدید سردی کا عذاب بھی ہوگا۔

علامہ احمد علی سعیدی نے لکھا ہے:

''جب انسانی صورت میں جنّ کا انسان عورت کے ساتھ جماع معتبر ہے، اسی پر قیاس کر کے اگر نکاح کے بارے جواز کا قول کیا جائے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہونا چاہیے''۔

جواباً عرض ہے کہ جنّ کے بشری صورت میں نظر نہ آنے کے باوجود عورت کے ساتھ مباشرت کے حوالے تو ملتے ہیں اور بشکلِ انسانی بھی ملتے ہیں، لیکن یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ جنّ نے مستقل طور پر انسانی شکل اختیار کرلی ہو اور انسان عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری ہو، تو ہم فقہی اصولوں کی روشنی میں نکاح کے جواز کا قول کیسے کرسکتے ہیں، جبکہ یہ بھی ثابت نہیں کہ اولاد قطعی طور پر بشکلِ انسان ہوگی، نیز اگر وہ انسانی شکل میں رہتے ہوئے انسان عورت کے ساتھ مستقل ازدواجی زندگی نہیں گزار رہا تو اس صورت میں آیا اس عورت کے ساتھ کسی مرد کا نکاح جائز ہوگا یا نہیں ہوگا، سو اِس طرح کے کئی سوالات پیدا ہوں گے۔

الغرض انسانوں اور جنوں کے درمیان مناکحت علمائے کرام کے نزدیک مختلف فیہ مسئلہ

ہے، جنہوں نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، وہ قرآن کریم کی مذکورہ آیات سے استدلال کرتے ہیں، مسلّمہ ائمۂ احناف میں سے کسی نے اس کے جواز کا قول نہیں کیا اور امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا تصوف اور ورع وتقویٰ میں اعلیٰ مقام ہے، لیکن وہ فقہائے احناف میں سے نہیں ہیں۔

بیوی کی وفات کے بعد اُس کی بہن سے شادی کرنا

سوال:

اگر کسی مرد کی بیوی وفات پاجائے اور وہ اس متوفیہ کی بہن سے شادی کرنا چاہے تو کتنے عرصے تک انتظار کے بعد شادی کرسکتا ہے؟ (قاری محمد اسحاق، محمود آباد، کراچی)۔

جواب:

اگر کسی شخص کی بیوی وفات پاجائے اور وہ اپنی بیوی کی وفات کے بعد متوفیہ کی بہن یعنی اپنی سالی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی مدت کے انتظار کیے جب چاہے نکاح کرسکتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کے ذہن میں جو تصور ہے کہ عورت کی طرح شاید مرد کو بھی عدت کے ایام میں نکاح کرنا جائز نہیں ہے، یعنی جس شخص کی بیوی فوت ہوجائے تو اس پر کسی قسم کی عدت ہے، یہ غلط تصور ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

''مَاتَتْ اِمْرَأَتُہُ لَہُ التَّزَوُّجُ بِاُخْتِھَا بَعْدَ یَوْمٍ مِنْ مَوْتِھَا کَمَا فِی الْخُلَاصَۃِ''۔

ترجمہ: ''کسی شخص کی بیوی مرگئی تو اس (متوفیہ) کی بہن سے اس شخص کا وفات کے دوسرے دن نکاح جائز ہے، ''خلاصہ'' میں اسی طرح ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج8، ص:129، دمشق)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''اِتَّفَقَ الْفُقَھَاءُ عَلٰی أَنَّہُ یَجُوْزُ الْجَمْعُ بَیْنَ الْمَرْأَۃِ وَمَحَارِمِھَا بَعْدَ الْفُرْقَۃِ بِسَبَبِ وَفَاۃِ إِحْدَاھُمَا، فَلَوْ مَاتَتْ زَوْجَۃُ رَجُلٍ، جَازَ لَہُ أَنْ یَتَزَوَّجَ بِاُخْتِھَا أَوْعَمَّتِھَا مَثَلاً مِنْ غَیْرِ

اِنْتِظَارِ مُدَّۃٍ بَعْدَ الْوَفَاۃِ''۔

ترجمہ: ''فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زوجین میں سے کسی ایک کی وفات کے سبب علیحدگی ہونے کے بعد عورت اور اس کے محارم کا نکاح میں جمع کرنا جائز ہے، تو اگر کسی آدمی کی بیوی مرگئی تو اس کے لیے اپنی بیوی کی بہن یا پھوپھی وغیرہ سے اُس کی وفات کے بعد کسی مدت کے انتظار کے بغیر شادی کرنا جائز ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج: 9،ص: 6665)''۔

ہاں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور اس کی بہن کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنی بیوی کی عدت ختم ہونے کا انتظار کرے۔

طلاق کے مسائل

شوہر کے حقِ طلاق پر جرمانہ عائد کرنا

سوال:

زید کا نکاح زینب سے ہوا،تقریباً 4 سال بعد دلہن کی بیماری اور گھریلو ناچاقی (بار بار لڑکی والوں کا لڑکی کو اپنے پاس زیادہ دن رکھنا) کی وجہ سے زید نے زینب کو اکتوبر 2016ء میں طلاق دے دی۔اب برادری کی پنچایت میں جبراً یک طرفہ فیصلہ ہے کہ زید طلاق دینے کا کوڑا یعنی (3 لاکھ روپے جرمانہ) مع جہیز کے لڑکی والوں کو ادا کرے، جب کہ نکاح کے وقت ایسی کوئی شرط نکاح نامہ میں درج نہیں کروائی گئی تھی ، یہ فیصلہ کیونکہ جبراً عائد کیا گیا ہے۔یہ جرمانہ جائز ہے یا ناجائز ہے، گناہ گار لڑکے والے ہیں یا پنچائیت ہے؟،(محمد حنیف،کراچی)۔

جواب:

مذکورہ پنچایت کا فیصلہ شرعاً ناجائز وحرام ہے،اس لیے آپ پر کسی قسم کا کوئی جرمانہ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔جہیز اور حق مہر کی ادائیگی کرنا ضرور لڑکے پر لازم ہے۔اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ ثالث یا پنچایت وہی فیصلہ کر سکتے ہیں، جو شریعت کے مطابق جائز ہو، جرمانے کا فیصلہ کرنا درجِ ذیل وجوہات کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے:

(۱) طلاق دینا شوہر کا حق ہے اور اُس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ جب اُس نے اپنا حق استعمال کیا ہے،تو یہ کوئی جرم نہیں، جس کی اُس کو سزا دی جائے۔

(۲) مالی جرمانہ شرعاً ناجائز ومنسوخ ہے ،اس لیے اگر اُس نے کوئی جرم کیا بھی ہوتا، تو پنچایت کا یہ فیصلہ ناجائز قرار پاتا۔شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

’’مَعْنَی التَّعْزِیْرِ بِاَخْذِ الْمَالِ عَلَی الْقَوْلِ بِهِ اِمْسَاكُ شَیْءٍ مِّنْ مَّالِهٖ عِنْدَ مُدَّةٍ لِّیَنْزَجِرَ ثُمَّ یُعِیْدُهُ الْحَاكِمُ اِلَیْهِ ،لَا أَنْ یَّأْخُذَهُ الْحَاكِمُ لِنَفْسِهٖ أَوْ لِبَیْتِ الْمَالِ كَمَا یَتَوَهَّمُهُ

الظَّلَمَةُ، اِذْلَا یَجُوْزُ لِاَحَدِ الْمُسْلِمِیْنَ أَخْذُ مَالِ اَحَدٍ بِغَیْرِ سَبَبٍ شَرْعِیٍّ۔ وَفِیْ "شَرْحِ الْاٰثَارِ": اَلتَّعْزِیْرُ بِالْمَالِ کَانَ فِیْ اِبْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ"۔

ترجمہ: "تعزیر بالمال کا جہاں قول ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لیے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لئے یا بیت المال کے لیے وصول کرے جیسا کہ ظالم لوگوں نے خیال کررکھا ہے کیونکہ کسی مسلمان کو شرعی وجہ کے بغیر کسی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ تعزیر بالمال ابتداءِ اسلام میں جائز تھی پھر منسوخ ہوگئی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 77 بیروت)"۔ پنچایت کا یہ فیصلہ غیر شرعی اور ظلم ہے اور اس فیصلہ کی بنا پر یہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

اخرس (گونگے) کی گواہی کا شرعی حکم

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین اور مفتیانِ شرع کہ فقہاء نے اخرس کی گواہی کو رد کیا ہے، اس دور کے حساب سے یہ صحیح بھی تھا، لیکن آجکل گونگوں کے لیے تعلیمی ادارے موجود ہیں، جہاں وہ لکھتے پڑھتے ہیں اور اشاروں کی ایک قابل اعتماد زبان بھی موجود ہے اور اس زبان کو سمجھنے والے اساتذہ اور تربیت کرنے والے بھی موجود ہیں، اس صورت میں گونگے کی گواہی کا حکم کیا ہوگا، وضاحت فرما کر شکریہ کا موقع دیں، (قاری محمد نوید اختر، کوٹ سلطان)۔

جواب:

فقہائے کرام نے اپنے دور کے حساب سے گونگے شخص کی گواہی کو قبول نہ کرنے کا قول کیا ہے اور امام مالک نے اشارے سے گونگے افراد کی ایسی گواہی، جو کہ سمجھ آجائے اور اس سے کوئی مطلب نکلتا ہو، کی اجازت دی ہے۔ دیگر فقہائے کرام نے گونگے کی شہادت کو قبول نہ کرنے کا قول کیا ہے۔

شمس الائمہ امام سرخسی رحمہ اللہ متوفی 483ھ فرماتے ہیں:

"وَلَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ الْأَخْرَسِ، لِأَنَّ أَدَاءَ الشَّهَادَةِ يَخْتَصُّ بِلَفْظِ الشَّهَادَةِ حَتّٰى إِذَا قَالَ

الشَّاهِدُ أُخْبِرُ وَأَعْلَمُ لَا يُقْبَلُ ذٰلِكَ مِنْهُ وَلَفْظُ الشَّهَادَةِ لَا يَتَحَقَّقُ مِنَ الْأَخْرَسِ، ثُمَّ شَهَادَةُ الْأَخْرَسِ مُشْتَبَهٌ فَإِنَّهُ يُسْتَدَلُّ بِإِشَارَتِهِ عَلٰى مُرَادِهِ بِطَرِيقٍ غَيْرِ مُوجِبٍ لِلْعِلْمِ فَتَتَمَكَّنُ فِي شَهَادَتِهِ تُهْمَةٌ يُمْكِنُ التَّحَرُّزُ عَنْهَا بِجِنْسِ الشُّهُودِ وَلَا تَكُونُ إِشَارَتُهُ أَقْوٰى مِنْ عِبَارَةِ النَّاطِقِ لَوْ قَالَ أُخْبِرُ"۔

ترجمہ: "اور گونگے کی شہادت جائز نہیں ہے، کیونکہ ادائے شہادت لفظِ شہادت (میں گواہی دیتا ہوں) کے ساتھ خاص ہے، یہاں تک کہ جب شاہد کہے: میں خبر دیتا ہوں یا میں جانتا ہوں، تو اُس کی یہ شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور لفظِ شہادت گونگے سے متحقق نہیں ہوتا۔ پھر گونگے کی شہادت مشتبہ ہے، کیونکہ وہ اپنی مراد پر اشارے سے دلالت کرتا ہے اور اشارہ ایسا ذریعہ علم ہے جو موجبِ یقین نہیں ہے، سو اُس کی شہادت باعثِ تہمت بن سکتی ہے، لہٰذا اس سے بچنا بہتر ہے، (المبسوط، ج16ص130)"۔

علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ المتوفّٰی 587ھ، لکھتے ہیں:

"وَمِنْهَا النُّطْقُ فَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْأَخْرَسِ لِأَنَّ مُرَاعَاةَ لَفْظَةِ الشَّهَادَةِ شَرْطُ صِحَّةِ أَدَائِهَا، وَلَا عِبَارَةَ لِلْأَخْرَسِ أَصْلًا فَلَا شَهَادَةَ لَهٗ"۔

ترجمہ: "اور شہادت کی شرائط میں سے (ایک) نُطق (یعنی بولنے کی صلاحیت) ہے، پس گونگے کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، کیوں کہ گواہی کی ادائیگی کے درست ہونے کے لیے لفظِ اَشْهَدُ (میں گواہی دیتا ہوں) کی رعایت کرنا شرط ہے اور گونگے کی مراد پر دلالت کرنے کے لیے الفاظ بالکل نہیں ہیں، اس لئے اس کی کوئی شہادت نہیں ہے، (بدائع الصنائع، ج:6،ص:407)"۔

علامہ ابوالفضل عبداللہ بن محمود الموصلی الحنفی المتوفی 683ھ لکھتے ہیں:

"وَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْأَخْرَسِ؛ لِأَنَّ الشَّهَادَةَ بِالنُّطْقِ وَهُوَ عَاجِزٌ عَنْهُ"۔

ترجمہ: "اور گونگے کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ شہادت بولنے سے ادا کی جاتی ہے اور وہ بولنے سے عاجز ہے، (الاختیار لتعلیل المختار، ج2ص147)"۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ متوفی 681ھ، لکھتے ہیں:

''فَمَا يَمْنَعُ الْاَدَاءَ يَمْنَعُ الْقَضَاءَ، وَالْعَمٰى وَالْخَرَسُ وَالْجُنُوْنُ وَالْفِسْقُ يَمْنَعُ الْاَدَاءَ ۔۔ وَفِي الْمَبْسُوْطِ اَنَّهُ لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ الْاَخْرَسِ بِاِجْمَاعِ الْفُقَهَاءِ لِاَنَّ لَفْظَةَ الشَّهَادَةِ لَا تَتَحَقَّقُ مِنْهُ، وَنُقِضَ بِاَنَّ الْاَصَحَّ مِن قَولِ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تُقْبَلُ اِذَا كَانَتْ فِيْهِ اِشَارَةٌ مَفْهُوْمَةٌ''۔

ترجمہ: ''تو جو چیز ادائے (شہادت میں) مانع ہے وہ قضا میں بھی مانع ہے اور اندھا پن، گونگا پن، پاگل پن اور فسق اداء میں مانع ہیں۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''اور ''اَلْمَبْسُوط'' میں ہے: فقہاء کا اجماع ہے کہ گونگے کی شہادت جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے شہادت کا لفظ (اَشْهَدُ) متحقق نہیں ہوتا، لیکن اس اجماع کی نفی اِس سے ہورہی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح قول کے مطابق اگر گونگے کا اشارہ قابلِ فہم ہے، تو اُس کی شہادت قبول کی جائے گی، (فتح القدیر، ج:7،372)''۔لیکن خود شوافع نے امام شافعی کے اس قول کو مختار قرار نہیں دیا، چنانچہ علامہ ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد بن عبدالکریم الرافعی القزوینی متوفی 623ھ لکھتے ہیں:

''وَاعْلَمْ أَنَّ شَهَادَةَ الْاَخْرَسِ الَّذِىْ لَا يَعْقِلُ الْإِشَارَةَ لَا اِعْتِبَارَ بِهَا، وَإِنْ كَانَ يَعْقِلُ الْإِشَارَةَ فَقَوْلَانِ عَنْ تَخْرِيْجِ ابْنِ سُرَيْجٍ: أَحَدُهُمَا أَنَّهَا مَقْبُوْلَةٌ اِعْتِمَادًا عَلَى الْإِشَارَةِ كَمَا فِيْ عُقُوْدِهٖ وَيُحْكٰى هٰذَا عَنْ مَالِكٍ وَاخْتِيَارُ الْحَنَاطِيْ وَالْقَاضِيْ أَبِي الطَّيِّبِ رَحِمَهُمُ اللهُ، وَالثَّانِي الْمَنْعُ، لِاَنَّ الْإِشَارَةَ لَا تَصْرَحُ وَإِنَّمَا تُفِيْدُ ظَنًّا، وَنَحْنُ فِيْ غُنْيَةٍ عَنْ شَهَادَتِهٖ بِشَهَادَةِ غَيْرِهٖ، وَيَخْرُجُ عَلَيْهِ عُقُوْدُهٗ وَهٰذَا أَظْهَرُ عِنْدَ الْاَكْثَرِيْنَ مِنْهُمْ ابْنُ الْقَاصِّ وَالشَّيْخُ أَبُوْ حَامِدٍ وَبِهٖ قَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ وَاَحْمَدُ رَحِمَهُمُ اللهُ وَاِيَّانَا وَعَلٰى هٰذَا فَيُعْتَبَرُ فِي الشَّاهِدِ وَرَاءَ الصِّفَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ فِيْ اَوَّلِ الْبَابِ اَنْ يَّكُوْنَ نَاطِقًا''۔

ترجمہ: ''اور جان لو کہ جو گونگا اشارے کو نہیں سمجھتا، اس کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور اگر وہ اشارے کو سمجھتا ہے تو ابن سریج کی تخریج کے مطابق اس کے بارے میں دو اقوال ہیں:

(1) اگر وہ اشارے کو سمجھتا ہے تو اس کی شہادت قبول ہے، جیسا کہ معاملات میں اس کی

شہادت معتبر ہے اور امام مالک سے یہی منقول ہے اور حناطی اور قاضی ابوالطیب رحمہم اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(2) اشارے کو سمجھنے کے باوجود گونگے کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ اشارے میں صراحت نہیں ہوتی، وہ صرف ظن کا فائدہ دیتا ہے اور ہمیں عینی شہادت دستیاب ہے تو گونگے کی شہادت کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے عُقود کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر عینی شہادت دستیاب ہے تو ہم اشارے پر انحصار نہیں کریں گے اور یہ رائے اکثر کے نزدیک واضح ہے، جیسے ابن القاص، شیخ ابوحامد اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے، پس اس بنا پر باب کے شروع میں شاہد کی جو صفات مذکور ہیں، اُن میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ناطق ہو، (العزیز بشرح الوجیز، ج13ص38)"۔

امام نووی شافعی لکھتے ہیں:

"شَهَادَةُ الْأَخْرَسِ إِنْ لَمْ يَعْقِلِ الْإِشَارَةَ مَرْدُودَةٌ، وَكَذَا إِنْ عَقَلَهَا عَلَى الْأَصَحِّ عِنْدَ الْأَكْثَرِينَ، فَعَلٰى هٰذَا يُعْتَبَرُ فِي الشَّاهِدِ سِوَى الشُّرُوطِ السِّتَّةِ كَوْنُهُ نَاطِقًا"۔

ترجمہ: "گونگا اگر اشارہ نہیں سمجھتا، تو اس کی شہادت مردود ہے اور اگر اشارہ سمجھتا ہے، تب بھی اکثر فقہاء کے نزدیک صحیح ترین روایت کے مطابق اس کی شہادت مردود ہے، پس اس بنا پر گواہ کے بارے میں چھ مذکورہ شرائط کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ بولنے پر قدرت رکھتا ہو، (روضۃ الطالبین، ج11ص245)"۔

علامہ زین الدین ابن نجیم المصری الحنفی رحمۃ اللہ علیہ المتوفّٰی 970ھ، لکھتے ہیں:

"وَأَشَارَ الْمُؤَلِّفُ إِلٰى عَدَمِ قَبُولِ شَهَادَةِ الْأَخْرَسِ بِالْأَوْلٰى، سَوَاءٌ كَانَتْ بِالْإِشَارَةِ أَوْ بِالْكِتَابَةِ"۔

ترجمہ: "اور مؤلف (علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی) نے اندھے کی گواہی کو رد کر کے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ گونگے کی گواہی اِس سے بھی بڑھ کر قابلِ قبول نہیں ہے، خواہ یہ (گواہی) اشارے سے ہو یا تحریر کی صورت میں ہو، (البحر الرائق، ج:7، ص:131)"۔

تنویر الابصار مع الدُّرالمختار میں ہے:

''وَاَفَادَعَدَمَ قَبُوْلِ الْاَخْرَسِ مُطْلَقًا بِالْاَوْلٰی''۔

ترجمہ:''اور (اندھے کی گواہی کا رد کرنا) گونگے کی گواہی کو بہ طریقِ اَولیٰ رد کرنے کا فائدہ دیتی ہے''۔علامہ شامی اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''وَلَا تُقْبَلُ شَهَادَتُهٗ سَوَاءٌ كَانَتْ بِالْاِشَارَةِ اَوْبِالْكِتَابَةِ''۔

ترجمہ:''اور گونگے کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی چاہے اشارے سے ہو یا کتابت سے ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار،ج:11،ص:138)''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''تَنْبِيْهٌ: نَصُّوْا عَلٰى اَنَّ نِعْمَةَ السَّمْعِ اَفْضَلُ مِنْ نِّعْمَةِ الْبَصَرِ لِعُمُوْمِ مَنْفَعَتِهَا، فَاِنَّهٗ يُدْرِكُ مِنْ كُلِّ الْجِهَاتِ بِخِلَافِ الْبَصَرِ وَلِاَنَّهٗ لَا اُنْسَ فِى مُجَالَسَةِ اَخْرَسَ''۔

ترجمہ:''تنبیہ: علماء نے صراحت کی ہے کہ سننے کی نعمت منفعت کے عموم کے سبب دیکھنے کی نعمت سے افضل ہے، کیونکہ سماعت تمام جہات سے ادراک کرتی ہے، جب کہ بصارت صرف سامنے کی جہت سے ادراک کرتی ہے اور اس لئے کہ گونگے کی مجلس میں اُنسیت نہیں ہوتی، (ردالمحتار علی الدرالمختار،ج:11،ص:138)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی متوفّٰی 1436ھ، لکھتے ہیں:

''اَلنُّطْقُ اِشْتَرَطَ الْحَنَفِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَابِلَةُ اَنْ يَّكُوْنَ الشَّاهِدُ نَاطِقاً، فَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْاَخْرَسِ، وَاِنْ فُهِمَتْ اِشَارَتُهٗ، لِاَنَّ الْاِشَارَةَ لَا تُعْتَبَرُ فِى الشَّهَادَاتِ، لِاَنَّهَا تَتَطَلَّبُ الْيَقِيْنَ، وَاِنَّمَا الْمَطْلُوْبُ التَّلَفُّظُ بِالشَّهَادَةِ''۔

ترجمہ:''اور حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے گواہ کا بولنے پر قادر ہونا شرط قرار دیا ہے۔ پس گونگے کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، خواہ اُس کا اشارہ قابلِ فہم ہو، تب بھی گواہیوں میں اشارے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ گواہی یقین کا تقاضا کرتی ہے اور یقین زبانی گواہی سے حاصل ہوتا ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:8،ص:6037)''۔

فقہاء نے نکاح، طلاق اور ظِہار میں اشارے کو نُطق اور الفاظ کے قائم مقام قرار دیا

ہے اور فرمایا: اشارے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے اور اگر کوئی شخص لکھنا جانتا ہے اور عمدہ لکھتا ہے تو وہ لکھ کر طلاق دے اور بولنے کی صلاحیت رکھنے والا بھی جب لکھ کر طلاق دیتا ہے، تو اُس کی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

امام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 593ھ، لکھتے ہیں:

''(وَطَلَاقُ الْأَخْرَسِ وَاقِعٌ بِالْإِشَارَةِ)، لِأَنَّهَا صَارَتْ مَعْهُودَةً، فَأُقِيمَتْ مَقَامَ الْعِبَارَةِ دَفْعًا لِلْحَاجَةِ''۔

ترجمہ: ''اور گونگے کی طلاق اشارے سے واقع ہوجاتی ہے کیونکہ اشارہ جب مشہور ومعروف ہوتو حاجت پوری کرنے کے لیے وہ عبارت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، (ہدایہ، ج:3، ص:141)''۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 681ھ، لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ: وَطَلَاقُ الْأَخْرَسِ وَاقِعٌ بِالْإِشَارَةِ، لِأَنَّهَا صَارَتْ مَفْهُومَةً فَكَانَتْ كَالْعِبَارَةِ۔۔ وَقَالَ بَعْضُ الشَّافِعِيَّةِ: إِنْ كَانَ يُحْسِنُ الْكِتَابَةَ لَا يَقَعُ طَلَاقُهٗ بِالْإِشَارَةِ، لِانْدِفَاعِ الضَّرُورَةِ بِمَا هُوَ أَدَلُّ عَلَى الْمُرَادِ مِنَ الْإِشَارَةِ وَهُوَ قَوْلٌ حَسَنٌ، وَبِهٖ قَالَ بَعْضُ مَشَايِخِنَا: وَلَا يَخْفَى أَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الْإِشَارَةِ الَّتِيْ يَقَعُ بِهَا طَلَاقُهٗ: ''الْإِشَارَةُ الْمَقْرُونَةُ بِتَصْوِيتٍ مِنْهُ، لِأَنَّ الْعَادَةَ مِنْهُ ذٰلِكَ''، فَكَانَتِ الْإِشَارَةُ بَيَانًا لِمَا أَجْمَلَهُ الْأَخْرَسُ، وَيَتَّصِلُ بِمَا ذَكَرْنَا كِتَابَةُ الطَّلَاقِ، وَالْأَخْرَسُ فِيهَا كَالصَّحِيحِ، فَإِذَا طَلَّقَ الْأَخْرَسُ امْرَأَتَهٗ بِالْكِتَابَةِ وَهُوَ يَكْتُبُ جَازَ عَلَيْهِ مِنْ ذٰلِكَ مَا يَجُوزُ عَلَى الصَّحِيحِ، لِأَنَّهٗ عَاجِزٌ عَنِ الْكَلَامِ قَادِرٌ عَلَى الْكِتَابِ، فَهُوَ وَالصَّحِيحُ فِي الْكِتَابِ سَوَاءٌ''۔

ترجمہ: ''اور (ماتن کا یہ قول:) گونگے کی طلاق اشارے سے واقع ہوجاتی ہے، اس لیے ہے کہ اشارہ قابلِ فہم ہوتو وہ زبانی بیان کی طرح ہے۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: اور بعض شافعیہ نے کہا: اگر گونگا عمدہ طریقے سے لکھ سکتا ہے تو اس کی طلاق اشارے سے واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اشارے کو جس ضرورت کے تحت مؤثر مانا گیا تھا، وہ ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ

اشارے کے مقابلے میں مراد پر زیادہ دلالت کرنے والی صلاحیت (تحریر میں) موجود ہے اور یہ قول بہتر ہے اور ہمارے بعض مشائخ نے بھی یہی قول کیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جس اشارے سے طلاق واقع ہوتی ہے، اس سے مراد وہ اشارہ ہے جو اس کی آواز کے ساتھ ملا ہوا ہے، کیونکہ گونگے کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اشارے کے وقت آواز نکالتا ہے، تو گویا اشارہ اُس آواز کی وضاحت ہے جس کا گونگے نے (خاص آواز کی صورت میں) اجمالاً اظہار کیا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی صورت تحریری طلاق ہے اور طلاق لکھنے میں گونگا اُس شخص کی طرح ہے جو بولنے پر قادر ہے۔ پس جب تحریر پر قدرت رکھنے والے گونگے نے اپنی بیوی کو لکھ کر طلاق دی، تو اس کے لیے اُسی طرح جائز ہے، جیسے بولنے والے شخص کے لیے تحریری طلاق جائز ہے، کیونکہ گونگا اگرچہ بولنے سے عاجز ہے، مگر لکھنے پر قادر ہے۔ پس لکھنے میں بولنے پر قدرت رکھنے والے اور گونگے کا حکم یکساں ہے، (فتح القدیر، ج:3، ص:474)"۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 855ھ، لکھتے ہیں:

"هٰذَا بَابٌ فِي بَيَانِ حُكْمِ الْإِشَارَةِ فِي الطَّلَاقِ، وَقَالَ ابْنُ التِّيْنِ: أَرَادَ الْاِشَارَةَ الَّتِي يُفْهَمُ مِنْهَا الطَّلَاقُ مِنَ الصَّحِيْحِ وَالْأَخْرَسِ، وَقَالَ الْمُهَلَّبُ: الْإِشَارَةُ إِذَا فُهِمَتْ يُحْكَمُ بِهَا وَأَوْكَدُ مَا أَتَى بِهَا مِنَ الْإِشَارَةِ مَا حَكَمَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَمْرِ السَّوْدَاءِ، حِيْنَ قَالَ لَهَا: أَيْنَ اللّٰهُ؟، فَأَشَارَتْ إِلَى السَّمَاءِ، فَقَالَ: اَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ، فَأَجَازَ الْإِسْلَامَ بِالْإِشَارَةِ الَّذِيْ هُوَ أَصْلُ الدِّيَانَةِ وَحَكَمَ بِإِيْمَانِهَا كَمَا يُحْكَمُ بِنُطْقِ مَن يَّقُوْلُ ذٰلِكَ، فَيَجِبُ أَنْ تَكُوْنَ الْإِشَارَةُ عَامَّةً فِيْ سَائِرِ الدِّيَانَاتِ، وَهُوَ قَوْلُ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ، وَقَالَ مَالِكٌ: اَلْأَخْرَسُ إِذَا أَشَارَ بِالطَّلَاقِ يَلْزَمُهُ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ فِي الرَّجُلِ يَمْرَضُ فَيَخْتَلُّ لِسَانُهُ، فَهُوَ كَالْأَخْرَسِ فِي الطَّلَاقِ وَالرَّجْعَةِ، وَقَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ وَأَصْحَابُهُ: إِنْ كَانَتْ إِشَارَتُهُ تُعْرَفُ فِيْ طَلَاقِهِ وَنِكَاحِهِ وَبَيْعِهِ فَهُوَ جَائِزٌ عَلَيْهِ، وَإِنْ كَانَ يُشَكُّ فِيْهِ فَهُوَ بَاطِلٌ، وَقَالَ: وَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقِيَاسٍ، وَإِنَّمَا هُوَ اِسْتِحْسَانٌ، وَالْقِيَاسُ فِيْ هٰذَا كُلِّهِ بَاطِلٌ، لِأَنَّهُ لَا يَتَكَلَّمُ وَلَا تُعْقَلُ إِشَارَتُهُ"۔

ترجمہ: ''یہ باب اشارے سے طلاق کا حکم بیان کرنے کے بارے میں ہے، علامہ ابن التین نے کہا: امام بخاری کی مراد ایسا اشارہ ہے جس سے واضح طور پر طلاق سمجھ میں آتی ہو، خواہ تندرست اشارہ کرے یا گونگا''۔

علامہ مُہلَّب مالکی نے کہا:

''جب اشارہ قابلِ فہم ہو تو اُس پر حکم لگا دیا جائے گا اور اس کی مزید تاکید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک سیاہ فام باندی سے نبی ﷺ نے سوال کیا: اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟، تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پس نبی ﷺ نے فرمایا: اس باندی کو آزاد کردو، کیونکہ یہ مؤمنہ ہے (یعنی آپ ﷺ نے اشارے کو ثبوت ایمان کے لیے کافی سمجھا)، (موطا امام مالک، ج:۲،ص:۲۰۳)''۔

پس نبی ﷺ نے اُس باندی کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ سے اُس کے اسلام کو درست قرار دیا جو کہ دیانت میں اصل ہے اور اُس کے ایمان کا حکم دیا جیسا کہ توحید کا زبانی اقرار کرنے والے پر ایمان کا حکم لگایا جاتا ہے، پس لازم ہے کہ تمام دیانات میں اشارہ معتبر ہو اور عام فقہاء کا یہی قول ہے اور امام مالک نے کہا: گونگا جب اشارے سے طلاق دے تو اس کی طلاق لازم ہوگی اور امام محمد بن ادریس شافعی نے کہا: بیماری کے سبب جس شخص کی زبان میں خلل واقع ہو، تو وہ طلاق اور رجعت میں گونگے کی مانند ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب گونگے کا اشارہ طلاق، نکاح اور بیع میں معروف ہے، تو پھر اُس کے اشارہ پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر اُس کے اشارہ کے سمجھنے میں شک کیا جارہا ہے، تو پھر وہ باطل ہے۔ اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا: یہ قیاس نہیں ہے، بلکہ یہ استحسان ہے اور ایسے تمام امور میں قیاس باطل ہے، کیونکہ وہ بول بھی نہیں سکتا اور اس کا اشارہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا، (عمدۃ القاری، ج:20،ص:405)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم المصری الحنفی رحمۃ اللہ علیہ المتوفّٰی 970ھ، لکھتے ہیں:

''قَوْلُهُ: وَلَوْ كَانَ الزَّوْجُ أَخْرَسَ فَإِنَّ الطَّلَاقَ يَقَعُ بِإِشَارَتِهِ لِأَنَّهَا صَارَتْ مَفْهُومَةً

فَكَانَتْ كَالْعِبَارَةِ فِي الدَّلَالَةِ اسْتِحْسَانًا ، فَيَصِحُّ بِهَا نِكَاحُهُ وَطَلَاقُهُ وَعِتَاقُهُ وَبَيْعُهُ وَشِرَاؤُهُ، سَوَاءٌ قَدَرَ عَلَى الْكِتَابَةِ أَوْ لَا ، وَقَالَ بَعْضُ الْمَشَايِخِ: إِنْ كَانَ يُحْسِنُ الْكِتَابَةَ لَا يَقَعُ طَلَاقُهُ بِالْإِشَارَةِ لِانْدِفَاعِ الضَّرُورَةِ بِمَا هُوَ أَدَلُّ عَلَى الْمُرَادِ مِنَ الْإِشَارَةِ ـ ـ ـ وَإِنْ كَانَ لَا عَلَى وَجْهِ الرَّسْمِ نَحْوُ أَنْ يَكْتُبَ، إِنْ جَاءَ كِتَابِي هٰذَا فَأَنْتِ طَالِقٌ فَهٰذَا يَنْوِي وَيُبَيِّنُ الْأَخْرَسُ نِيَّتَهُ بِكِتَابَتِهِ ''۔

ترجمہ: ''اگر شوہر گونگا ہو تو اُس کے اشارے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ (جب) اشارہ قابلِ فہم ہے تو استحساناً وہ اشارہ اپنی مراد پر دلالت کرنے میں الفاظ کے قائم مقام ہے، تو ایسے اشارے سے گونگے کے نکاح، طلاق، عتاق اور خرید و فروخت (سب تصرفات) صحیح ہوں گے، چاہے وہ لکھنے پر قدرت رکھتا ہو یا نہیں۔ اور بعض مشائخ نے کہا: اگر گونگا عمدہ طریقے سے لکھ سکتا ہے تو اُس کی طلاق اشارے سے واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اشارے کو معتبر ماننے کی ضرورت باقی نہ رہی، اس لیے کہ اپنی مراد پر تحریر کی دلالت اشارے سے زیادہ واضح ہے۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''اگر کوئی (قادرالکلام یا گونگا) شخص مروّجہ طلاق نامے کے برخلاف (اپنی بیوی کو صرف) اتنا لکھے: جب میرا یہ خط آئے تو تجھے طلاق ہے، تو یہ الفاظ بجائے خود نیت کو ظاہر کرتے ہیں (لٰہذا نیت نہیں پوچھی جائے گی) اور گونگا اپنی نیت کا اظہار تحریر ہی سے کرے گا، (البحر الرائق، ج:3، ص:434)''۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی رحمہ اللہ علیہ متوفّٰی 1252ھ، لکھتے ہیں:

''وَفِي التَّتَارْخَانِيَّةِ عَنِ الْيَنَابِيعِ: وَيَقَعُ طَلَاقُ الْأَخْرَسِ بِالْإِشَارَةِ، وَيُرِيدُ بِهِ الَّذِي وُلِدَ وَهُوَ أَخْرَسُ أَوْ طَرَأَ عَلَيْهِ ذٰلِكَ وَدَامَ حَتّٰى صَارَتْ إِشَارَتُهُ مَفْهُومَةً وَإِلَّا لَمْ يُعْتَبَرْ. قَوْلُهُ (وَاسْتَحْسَنَ الْكَمَالُ إِلَخْ) حَيْثُ قَالَ وَقَالَ بَعْضُ الشَّافِعِيَّةِ: إِنْ كَانَ يُحْسِنُ الْكِتَابَةَ لَا يَقَعُ طَلَاقُهُ بِالْإِشَارَةِ لِانْدِفَاعِ الضَّرُورَةِ بِمَا هُوَ أَدَلُّ عَلَى الْمُرَادِ مِنَ الْإِشَارَةِ ـ ـ ـ فَقَدْ رَتَّبَ جَوَازَ الْإِشَارَةِ عَلَى عَجْزِهِ عَنِ الْكِتَابَةِ، فَيُفِيدُ أَنَّهُ إِنْ كَانَ يُحْسِنُ الْكِتَابَةَ لَا تَجُوزُ إِشَارَتُهُ''۔

ترجمہ:''اور''تتارخانیہ''میں''یَنَابِیْع''کے حوالے سے لکھا ہے: گونگے کی طلاق اشارے سے واقع ہوجاتی ہے، اس سے وہ شخص مراد ہے جو پیدائشی گونگا ہے یا اُسے بعد میں یہ مرض لاحق ہوا اور دائمی ہوگیا، یہاں تک کہ اس کا اشارہ سمجھا جانے لگا۔ اور اگر اس کا اشارہ سمجھ میں نہیں آتا تو پھر طلاق معتبر نہیں ہوگی۔ اور ماتن کا یہ قول: علامہ کمال نے اسے عمدہ قرار دیا ہے الخ، جیسا کہ انہوں نے فرمایا: اور بعض شافعیہ نے کہا: اگر گونگا عمدہ طریقے سے لکھ سکتا ہو تو اس کی طلاق اشارے سے واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اشارے کو مؤثر ماننے کی ضرورت باقی نہ رہی، اس لیے کہ اشارے سے زیادہ اپنی مراد پر دلالت کرنے والی چیز یعنی تحریر کی صلاحیت موجود ہے۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:''پس اشارے کے مؤثر ہونے کا جواز لکھنے سے عاجز ہونے پر مرتّب کیا گیا ہے، تو یہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اگر گونگا عمدہ طریقے سے لکھ سکتا ہے، تو اس کے اشارے کو ماننا جائز نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:4، ص:330)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی متوفّٰی 1436ھ، لکھتے ہیں:

''وَاَجَازَ الْمَالِكِيَّةُ قَبُوْلَ شَهَادَةِ الْاَخْرَسِ اِذَا فُهِمَتْ اِشَارَتُهٗ ،لِاَنَّهَا تَقُوْمُ مَقَامَ نُطْقِهٖ فِيْ طَلَاقِهٖ وَنِكَاحِهٖ وَظِهَارِهٖ، فَكَذٰلِكَ فِيْ شَهَادَتِهٖ''۔

ترجمہ:''اور جب گونگے کا اشارہ قابلِ فہم ہو، تو مالکیہ نے اُس کی شہادت قبول کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ طلاق، نکاح اور ظِہار میں اشارہ بولنے کے قائم مقام ہے، تو اسی طرح اِسے شہادت میں بھی بولنے کے قائم مقام مانا جائے گا، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:8، ص:6037)''۔

چنانچہ قاضی ابومحمد عبدالوہاب بن علی بن نصر البغدادی المالکی متوفی 422ھ لکھتے ہیں:

''تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْاَخْرَسِ إِذَا فُهِمَتْ إِشَارَتُهٗ، خِلَافًا لِاَبِيْ حَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيِّ، لِاَنَّ الشَّهَادَةَ عِلْمٌ يُؤَدِّيْهِ الشَّاهِدُ إِلَى الْحَاكِمِ، فَإِذَا فُهِمَ مِنْهُ بِطَرِيْقٍ يُفْهَمُ مِنْ مِّثْلِهٖ، قُبِلَتْ كَالنَّاطِقِ إِذَا أَدَّاهَا بِالصَّوْتِ، وَلِاَنَّهٗ مَعْنًى يَحْتَاجُ إِلَى النُّطْقِ فَيَقَعُ الْفَهْمُ، فَإِذَا تَعَذَّرَ

النُّطْقُ جَازَ أَنْ تَقُوْمَ الْإِشَارَةُ مَقَامَهٗ إِذَا وَقَعَ الْفَهْمُ بِهَا''۔

ترجمہ:''گونگے کا اشارہ اگر سمجھ میں آئے، تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی، اس میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا اختلاف ہے، (اشارے کے ساتھ گونگے کی شہادت کی قبولیت کی دلیل یہ ہے کہ) گواہی ایسا علم ہے جو گواہ حاکم تک پہنچاتا ہے، تو اگر وہ ایسے طریقے سے پہنچائے کہ اس کے ذریعے اس طرح کی گواہی سمجھ میں آتی ہے، تو قبول کی جائے گی، جیسے بولنے والا جب آواز سے گواہی کے کلمات ادا کرے اور اس لیے بھی کہ معنی نطق کا محتاج ہوتا ہے اور اُس سے معنی سمجھ میں آتا ہے، پس جب نُطق متعذر ہو جائے، تو جائز ہے کہ اشارہ اس کے قائم مقام ہو، جبکہ اُسے سمجھا جا سکتا ہو، (الاشراف علی نکت مسائل الخلاف، ج:2، ص:972)''۔

بعض علماء کہتے ہیں: چونکہ فقہائے کرام نے لفظِ ''اَشْھَدُ'' (میں گواہی دیتا ہوں) کی زبان سے ادائیگی کو لازم قرار دیا ہے اور گونگا شخص زبان سے لفظِ ''اَشْھَدُ'' ادا نہیں کر سکتا، اس لیے اُس کی گواہی ناقابلِ قبول ہے۔لفظِ اَشْھَدُ کے ساتھ گواہی دینے کی شرط کو فقہائے کرام نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

علامہ ابوبکر المرغینانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفّٰی 593ھ، لکھتے ہیں:

''وَلَا بُدَّ فِی ذٰلِکَ کُلِّهٖ مِنَ الْعَدَالَةِ وَلَفْظَةِ الشَّهَادَةِ، فَإِنْ لَمْ یَذْکُرِ الشَّاهِدُ لَفْظَةَ الشَّهَادَةِ وَقَالَ أَعْلَمُ أَوْ أَتَیَقَّنُ لَمْ تُقْبَلْ شَهَادَتُهٗ''۔

ترجمہ:''اور اِن سب امور میں عدالت اور گواہی کا لفظ ''اَشْھَدُ'' کے ساتھ ادا کرنا ناگزیر ہے، پس اگر گواہ لفظ اَشْھَدُ کا ذکر نہ کرے بلکہ یہ کہے: میں جانتا ہوں یا مجھے یقین ہے، تو اُس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، (ہدایہ، ج:5، ص:405)''۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 681ھ، لکھتے ہیں:

''حَتّٰی لَوْ قَالَ الشَّاهِدُ أَعْلَمُ أَوْ أَتَیَقَّنُ لَا تُقْبَلُ، وَثَالِثٌ وَهُوَ التَّفْسِیْرُ حَتّٰی لَوْ قَالَ أَشْهَدُ عَلٰی شَهَادَتِهٖ أَوْ مِثْلَ شَهَادَتِهٖ لَا تُقْبَلُ''۔

ترجمہ:''یہاں تک کہ اگر گواہ کہے: میں جانتا ہوں یا مجھے یقین ہے، تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ تیسری بات جو ان دونوں کی تفسیر ہے کہ اگر گواہ یہ کہے: میں اُس کی گواہی پر گواہی دیتا ہوں یا اس کی گواہی کی مثل گواہی دیتا ہوں، تو اُس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، (فتح القدیر، ج:7،ص:349)''۔

تنویر الابصار مع الدُّرِ المختار میں ہے:

''(وَلَزِمَ فِي الْكُلِّ) مِنَ الْمَرَاتِبِ الْأَرْبَعِ (لَفْظُ أَشْهَدُ) بِلَفْظِ الْمُضَارِعِ بِالْإِجْمَاعِ''۔

ترجمہ:''اور شہادت کے چاروں مراتب (یعنی صرف دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی جس میں عورتوں کی گواہی قبول ہے اور صرف عورتوں کی گواہی یا صرف چار مردوں کی گواہی) میں اجماعِ فقہاء کی رُو سے مضارع کے صیغے کے ساتھ یعنی لفظِ اَشْهَدُ کے ساتھ گواہی دینا لازم ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:7، 87)''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی متوفّٰی 1436ھ، لکھتے ہیں:

''لَفْظُ الشَّهَادَةِ يَنْبَغِي أَنْ يَذْكُرَ الشَّاهِدُ لَفْظَةَ الشَّهَادَةِ، فَإِنْ قَالَ الشَّاهِدُ أَعْلَمُ أَوْ أَتَيَقَّنُ، لَمْ تُقْبَلْ شَهَادَتُهُ فِي تِلْكَ الْحَادِثَةِ''۔

ترجمہ:''نفسِ شہادت کے شرائط میں سے لفظِ شہادت (یعنی اَشْهَدُ) ہے، گواہ کو چاہیے کہ وہ لفظِ اَشْهَدُ کے ساتھ گواہی دے، پس اگر گواہ اَعْلَمُ یا اَتَيَقَّنُ (یعنی میں جانتا ہوں یا مجھے یقین ہے) کے الفاظ کے ساتھ گواہی دیتا ہے، تو اس کی گواہی اس واقعے میں قبول نہیں کی جائے گی، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:8،ص:6048)''۔

ان سب حوالہ جات میں فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ''اَشْهَدُ'' کے لفظ سے واقعے یا حادثے کی بلاواسطہ رپورٹ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ اَشْهَدُ کا لفظ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ میں واقعہ کا عینی شاہد ہوں اور میں واقعے کے وقت جائے حادثہ یا موقع پر بذاتِ خود موجود تھا، جب کہ اَعْرِفُ اور اَتَيَقَّنُ اور اَعْلَمُ میں ایسی صریح دلالت نہیں ہے، واقعے کا علم، یقین اور معرفت کسی اور ذریعے سے بھی گواہ کو حاصل ہوسکتی ہے۔ پس جو شخص

بول سکتا ہے، اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ زبان سے ''اَشْھَدُ'' کا لفظ ادا کرے اوراس کے بعد گواہی دے۔ لیکن جو شخص لفظ ادا نہیں کرسکتا، بول نہیں سکتا (یعنی گونگا ہے) تو لفظ کی ادائیگی سے معذوری کی صورت میں اس کی حکمی صورت کی طرف آئیں گے اور لفظ کا معنی ہے: ''مَا یَتَلَفَّظُ بِهِ الْاِنْسَانُ اَوْ حُکْمُهٗ مُهْمَلاً کَانَ اَوْ مُسْتَعْمَلاً''، لفظ اُسے کہتے ہیں جو انسان بولے، خواہ مہمل (بے معنی) ہو یا مستعمل یا جو اس (تلفظ) کے حکم میں ہے (اور ظاہر ہے اشارہ یا تحریر گونگے کے لیے تلفظ کے حکم میں ہے)، (التعریفات، ص:169)''۔ اور زبان سے الفاظ کی ادائیگی سے معذوری کی صورت میں اگر کوئی شخص لکھنا جانتا ہے تو تحریر اُس کے لیے زبان سے ادائیگی کے حکم میں ہوگی، اس لئے لفظ اَشْھَدُ پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی، کیونکہ وہ تحریر میں لکھے گا: ''میں گواہی دیتا ہوں''۔

فقہائے کرام نے جو گونگے کی شہادت کے رد کا حکم فرمایا ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب گونگے افراد کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے موجود نہیں تھے، ورنہ فقہائے کرام اس معاملے میں ان کی شہادت کو ماننے کا قول کرتے۔ جب کہ آج پوری دنیا میں گونگے افراد کے لیے اشاروں کی زبان سکھانے اور تعلیم وتربیت اور لکھنے پڑھنے کی سہولت موجود ہے اور گونگے افراد کے اشارات کو سمجھنے کے لیے ماہرین موجود ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ لکھ بھی سکتے ہیں۔ پس دورِ حاضر کے فقہائے کرام کو اس مسئلے میں ایک نئے انداز سے اجتہاد کی ضرورت ہے تاکہ گونگے افراد سے حرج دفع ہو اور زندگی کے مختلف معاملات میں اُن کے لیے آسانی پیدا ہو۔ خاص طور پر اُن مواقع پر جہاں صرف ان ہی کی شہادت پر کسی کے حق کے ثابت ہونے کا مدار ہو یا ان کے ذریعے دوسرے گواہوں کی گواہی کی تائید وتوثیق ہو رہی ہو اور جب فقہائے کرام نے بولنے والوں اور گونگے افراد دونوں کی تحریری طلاق کو نافذ مانا ہے، تو گواہی میں بھی یہ وسعت ہونی چاہیے کہ اگر کوئی گونگا شخص لکھنا پڑھنا جانتا ہے اور عمدہ لکھ سکتا ہے تو کسی واقعہ کے بارے میں اُس کی تحریری شہادت (Written Evidence) کو قبول کرنا چاہیے۔

حنبلی فقہاء کے نزدیک اگرچہ اشاروں کی مدد سے اخرس کی گواہی مردود ہے، چنانچہ علامہ ابومحمد عبداللہ بن احمد مقدسی حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

(1) ''وَالرَّابِعُ النُّطْقُ: فَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْاَخْرَسِ بِالْإِشَارَةِ، لِاَنَّهَا مُحْتَمَلَةٌ، فَلَمْ تُقْبَلْ، كَإِشَارَةِ النَّاطِقِ، وَإِنَّمَا قُبِلَتْ فِي اَحْكَامِهِ الْمُخْتَصَّةِ بِهِ لِلضَّرُوْرَةِ، وَهِيَ هَاهُنَا مَعْدُوْمَةٌ''۔

ترجمہ: ''اور (شہادت قبول کرنے کی) چوتھی شرط بولنا ہے، پس گونگے کی اشارے سے شہادت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ یہ (متعدد معانی کا) احتمال رکھتا ہے، سو قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ناطق کا اشارہ قبول نہیں ہے، البتہ گونگے کا اشارہ اُن احکام میں جو اُس کے ساتھ خاص ہیں، بربنائے ضرورت قبول کیا جائے گا اور یہاں ضرورت معدوم ہے، (الکافی فی فقہ الامام احمد، ج4ص 271)''۔

(2) علامہ علاء الدین مرداوی حنبلی متوفی 885ھ لکھتے ہیں:

''الثَّالِثُ الْكَلَامُ، فَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الْاَخْرَسِ، هٰذَا الْمَذْهَبُ بِلَا رَيْبٍ، نَصَّ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''(گواہی کی) تیسری شرط کلام ہے، پس گونگے کی گواہی مقبول نہیں ہوگی، یہ مذہب ہے جس میں کوئی شک نہیں، اس پر نص ہے، (الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف، ج:12،ص:38)''۔

لیکن حنابلہ کے نزدیک اگر گونگا لکھ کر گواہی دے، تو وہ قبول ہے، چنانچہ علامہ موسیٰ بن احمد الصالحی متوفی 968ھ اور علامہ مرعی بن یوسف مقدسی متوفی 1033ھ لکھتے ہیں:

''اَلثَّالِثُ: اَلنُّطْقُ، فَلَا شَهَادَةَ لِاَخْرَسٍ، إِلَّا إِذَا اَدَّاهَا بِخَطِّهٖ''۔

ترجمہ: ''(گواہی قبول کرنے کی) تیسری شرط بولنا ہے، پس گونگے کی شہادت قبول نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اپنے مدّعا کو اپنی تحریر کے ذریعے ادا کرے، (الاقناع، ج4ص 436۔ دلیل الطالب لنیل المطالب، ج1ص 354)''۔

گونگے کی گواہی کو قرائن کی شہادت (Curcumstancial evidance)

کے طور پر بھی لیا جاسکتا ہے یا جہاں کوئی اور نہ ہو اور صرف گونگا فرد ہو یا گونگے افراد ہوں اور حدود میں اُس کی گواہی کی ضرورت ہوتا کہ مسلمان کی جان، مال اور عزت کی حرمت برقرار رہے، وہاں پر گونگے افراد کی گواہی سے استفادہ کرنا چاہیے۔

ہم نے گونگے کی شہادت کے رد کے بارے میں تمام دستیاب فقہی سرمایہ آپ کے سامنے پوری دیانت کے ساتھ رکھ دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گونگے کی شہادت کے رد پر مذاہبِ اربعہ کا اجماع نہیں ہے۔ مالکیہ نے ظہار، نکاح اور طلاق پر قیاس کرتے ہوئے اخرس کی شہادت کو اس شرط کے ساتھ قبول کیا ہے کہ اس کا اشارہ تشکیک کے بغیر قابلِ فہم ہو۔ ہمارے ائمہ احناف سمیت دیگر ائمہ نے بھی اشارے کے ذریعے اس بنا پر طلاق، نکاح اور ظہار میں اخرس کی گواہی کو قبول کیا ہے کہ اس کا اشارہ الفاظ کے قائم مقام ہے اور بعض شافعیہ نے تو کہا ہے کہ اگر وہ اچھی طرح لکھ سکتا ہے تو اس کا اشارہ کافی نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کتابت اظہار کا ایک مسلّمہ اور معتمد ذریعہ ہے اور اشارے کے مقابلے میں اسے اصل کا مرتبہ حاصل ہے۔ امام کمال الدین ابن ہمام نے کہا ہے کہ کتابت کے معاملے میں اخرس اور تکلُّم پر قدرت رکھنے والے کا حکم یکساں ہے۔

آج کل نظامِ عدل اور نظامِ حکومت میں مختلف امور میں تحریری حلف نامے (Affidavit) طلب کیے جاتے ہیں اور قبول کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بعض فقہائے کرام کا مشاہدے پر سماع کو اس وجہ سے ترجیح دینا کہ حِسِّ سماع تمام اطراف سے مفید ہے، جب کہ مشاہدہ صرف سامنے کی جانب سے مفید ہوتا ہے، باعثِ حیرت ہے، کیونکہ حدود وقصاص اور بہت سے دیگر امور میں اقرار واعتراف نہ ہونے کی صورت میں صرف عینی شہادت معتبر ہوتی ہے۔ پس صرف لفظِ ''اَشْھَدُ'' کے تکلم پر قدرت نہ ہونے کے سبب عینی شہادت کو رد کرنا موجودہ دور میں حیرت کا باعث ہے اور ہمارے اَکابر فقہائے کرام کے بارے میں منفی تاثر قائم ہوگا۔ حالانکہ تعلیم یافتہ اخرس، جو تحریری صورت میں اظہار مافی الضمیر پر قادر ہے، لکھ کر اپنا بیان اور موقف دے سکتا ہے کہ میں حلفیہ یہ شہادت دیتا

ہوں۔ اور اگر اس پر تحریری صورت میں جرح کی جائے تو وہ اس کے جوابات بھی مجلس یا عدالت کے سامنے تحریری طور پر دے سکتا ہے۔ بہت سے مواقع پر عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان مدّعی اور مدّعیٰ علیہ کے وکلا کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اپنا موقف اور دلائل تحریری طور پر لکھ کر دیں اور دنیا بھر میں عدالتوں اور حکومتوں کا سارا نظام تحریری احکام پر چلتا ہے۔ عدالت کے سارے فیصلے اور حکومتوں کے سارے حکم نامے، حتیٰ کہ آئین وقوانین سب تحریری صورت میں منضبط ہوتے ہیں۔ فقہائے کرام کی آراء، جن پر آج ہماری فقہ اسلامی کا مدار ہے، سب تحریری صورت میں موجود ہیں اور مسلّم ہیں، یہی صورت حال احادیث مبارکہ کی ہے۔ تحریر میں لغزش کے امکانات زبانی بیان یا شہادت کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔ زبانی بیان سے لوگ انحراف کر لیتے ہیں، لیکن مُصدَّقہ تحریر سے انحراف مشکل ہوتا ہے۔

عدالتوں میں جان و مال اور آبرو سے متعلق حقوق کے اِثبات کا مدار قابلِ قبول شہادتوں پر ہوتا ہے، اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا:

(1) ''وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ'' ترجمہ: ''اور اللہ کے لیے شہادت دو، (الطلاق:2)''۔

(2): ''وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ''، ترجمہ: ''اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اِسے چھپائے گا تو اُس کا دل گناہگار ہے، (البقرۃ:283)''۔

(3): ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ''، ترجمہ: ''اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ (یہ گواہی) تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہو، (ہر صورت میں سچی گواہی دو)، (النساء:135)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اِنَّ الشَّهَادَةَ فَرۡضُ كِفَايَةٍ، اِذَا قَامَ بِهَا الۡبَعۡضُ سَقَطَ عَنِ الۡبَاقِيۡنَ، وتَتَعَيَّنُ اِذَا لَمۡ

يَكُنْ اِلَّا شَاهِدَانِ سَوَآءٌ كَانَتْ لِلتَّحَمُّلِ اَوِ الْاَدَاءِ، فَعَلىٰ هٰذَا يُقَالُ اِنَّهَا تَلْزَمُ اَیْ تَفْتَرِضُ كِفَايَةً''۔

ترجمہ:''شہادت فرضِ کفایہ ہے، جب بعض افراد اس فریضے کو ادا کردیں تو دوسروں سے مسئولیت اُٹھ جاتی ہے۔لیکن جب دو گواہوں کے سوا کوئی اور دستیاب نہ ہو،خواہ گواہ بنانے کا موقع ہو یا گواہی دینے کا،تو اُن دو اشخاص پر تعیین کے ساتھ گواہی دینا لازم ہوگی، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شہادت فرض کفایہ ہے،(البحرالرائق، ج:7،ص:97،مکتبہ رشیدیہ)''۔اس بنا پر عصرِ حاضر میں ایسے اخرس کی شہادت کو بلا تردد قبول کرنا چاہیے جو اپنے مافی الضمیر کو تحریری طور پر بیان کرنے پر قادر ہو اور سوالات کا تحریری جواب دے سکتا ہے، کیونکہ اس میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔

تعلیقِ طلاق کی ایک صورت

سوال:

میرے شوہر نے 10 سال قبل پہلی طلاق دی تھی، رجوع کرلیا تھا۔ چھ سال قبل دوسری طلاق بھی دے دی اس کے بعد بھی رجوع کرلیا تھا۔ اب تیسری طلاق مشروط دی ہے کہ: ''اگر تم اپنی ماں کے گھر بغیر اجازت کے جاؤ گی تو تمہیں تیسری طلاق ہوجائے گی''۔ میں بغیر اجازت اپنی والدہ کے گھر چلی گئی ۔مگر میرے شوہر نے اپنے بھائی کے سامنے کہا: ''میں اجازت دیتا ہوں''، یعنی جو پابندی لگائی تھی، وہ انہوں نے بھائی کے سامنے ختم کر دی، مگر مجھے نہیں بتایا۔ انہوں نے شام ساڑھے سات بجے یہ بات اپنے بھائی کے سامنے کہی اور میں رات ساڑھے نو بجے اپنی ماں کے گھر پہنچ گئی، کیا یہ طلاق واقع ہوگئی ہے؟، (شیبا سلطانہ، بلاک ل، نارتھ ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے شوہر دو طلاقیں دے کر رجوع کر چکے ہیں اور تیسری طلاق آپ کے شوہر کی اجازت کے بغیر والدہ کے گھر جانے کی شرط پر معلق کر رکھی تھی۔ آپ

شوہر کی اجازت کے بغیر والدہ کے گھر چلی گئیں، جس سے تیسری طلاق واقع ہوگئی۔ اگرچہ آپ کے سابق شوہر اپنے بھائی کے سامنے اجازت دے چکے تھے، لیکن یہ اجازت آپ کے علم میں نہیں تھی۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''علامہ محقق زین بن نجیم در بحر الرائق فرماید: ''اَلْاِذْنُ یُطَّلَعُ عَلَیْهِ بِالْقَوْلِ بِخِلَافِ الْمَحَبَّةِ''۔ ترجمہ: ''علامہ محقق زین بن نجیم نے بحر الرائق میں فرمایا: اذن پر صرف قول کے ذریعہ اطلاع ہوسکتی ہے بخلاف محبت کے''۔ امام حافظ الدین محمد کردری در وجیز کتاب الایمان فصل تاسع فرماید: ''اِنْ اَذِنَ وَلَمْ تَسْمَعْ لَایُعْتَبَرُ عِنْدَ الْاِمَامِ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی، وَفِی الصُّغْریٰ، لَاتَخْرُجِی اِلَّا بِرِضَائِی أَوْبِغَیْرِ رِضَائِی فَاَذِنَهَا وَلَمْ تَسْمَعْ أَوْ سَمِعَتْ وَلَمْ تَفْهَمْ لَایَحْنَثُ بِالْخُرُوجِ، بِخِلَافِ اِلَّا بِاِذْنِی أَوْبِغَیْرِ اِذْنِی حَیْثُ یَحْنَثُ لِاَنَّ الرِّضَا یَتَحَقَّقُ بِلَاعِلْمِهَا وَالْاِذْنُ لَایَتَحَقَّقُ''۔

ترجمہ: ''امام حافظ الدین محمد کردری نے وجیز کتاب الایمان کی نویں فصل میں فرمایا: اگر اذن (اجازت) دیا اور دوسرے نے نہ سنا تو یہ اذن (اجازت) معتبر نہ ہوگا، یہ امام اعظم اور امام محمد رحمھما اللہ کا مسلک ہے، صغریٰ میں ہے: خاوند نے بیوی کو کہا: تو میری رضا کے بغیر باہر نہ جائیگی، تو اس کے بعد خاوند نے بیوی کو اجازت دی مگر بیوی نے نہ سنا، یا سنا ہے لیکن سمجھی نہیں تو بیوی نکل جانے سے حانث نہ ہوگی، اس کے برخلاف اگر اس نے بیوی کے نکلنے کو اذن پر موقوف کیا ہو تو مذکورہ صورت میں خلاف ورزی قرار پائے گی یعنی حانث ہوگی، کیونکہ رضا بیوی کے علم کے بغیر بھی ہوسکتی ہے جبکہ اذن اس کے علم کے بغیر متحقق نہیں ہوسکتا، (فتاوی بزازیة علیٰ هامش فتاوی هندیة، التاسع فی الیمین فی الاذن)''۔

ہمدراں ست: لَایَشْرَبُ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَنَاوَلَهُ الْقَدَحَ بِیَدِهٖ وَلَمْ یَقُلْ بِلِسَانِهٖ شَیْءٌ فَشَرِبَ یَحْنَثُ لِاَنَّهُ دَلِیْلُ الرِّضَا، لَاالْاِذْنِ، لَاتَخْرُجُ اِمْرَأَتُهٗ اِلَّا بِعِلْمِهٖ فَخَرَجَتْ وَهُوَ یَرَاهَا لَایَحْنَثُ، وَاِنْ اَذِنَ لَهَا بِالْخُرُوجِ فَخَرَجَتْ بَعْدَهٗ بِلَاعِلْمِهٖ لَایَحْنَثُ۔ ترجمہ: ''اسی میں

ہے: ایک نے دوسرے کو کہا: ''تو میرے اذن (اجازت) کے بغیر نہ پئے گا'' اس کے بعد اس نے خود پانی کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا دوسرے نے پانی لیا تو خلاف ورزی ہوجائیگی اور وہ حانث ہوجائے گا (کیونکہ ہاتھ میں دینا رضا کی دلیل تو ہوسکتی ہے مگر اذن نہیں ہوسکتا) یونہی بیوی کو کہا: ''میرے علم کے بغیر باہر نہ جائے گی''، پھر اس کے دیکھتے ہوئے اس کی عورت نکلی تو حانث نہ ہوگا اور اگر اس کے بعد نکلنے کی اجازت زبانی دے دی تو اب علم کے بغیر بھی نکل جائے تو حانث نہ ہوگا، (فتاویٰ رضویہ، ج:13،ص:252)''۔

وٹس ایپ پر طلاق دینا

سوال: (1)

کیا واٹس ایپ پر لکھ کر طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، میرے شوہر نے مجھے تین بار واٹس ایپ پر لکھ کر طلاق دی ہے: (میں تمہیں طلاق دیتا ہوں) اور ان کا کہنا ہے کہ زبان سے طلاق کہنا ضروری ہے، لکھ کر دینے سے طلاق نہیں ہوتی۔ کیا یہ درست ہے، (صائمہ صبا)۔

جواب:

تحریری طلاق نامہ جو شوہر نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا ہو، سے طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَاِنْ کَانَتْ مَرْسُومَۃً یَقَعُ الطَّلَاقُ نَوٰی أَوْلَمْ یَنْوِ''۔

ترجمہ: ''اور اگر مُروّجہ طریقے کے مطابق طلاق لکھی ہو تو طلاق واقع ہوجائے گی، خواہ اُس کی نیت ہو یا نہ ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:378)''۔

علامہ زین الدین بن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اِنْ کَتَبَ عَلٰی وَجْہِ الرِّسَالَۃِ مُصَدَّراً مُعَنْوناً وَثَبَتَ ذٰلِکَ بِاِقْرَارٍ أَوْ بِالْبَیِّنَۃِ فَکَالْخِطَابِ، وَاِنْ قَالَ: لَمْ أَنْوِبِہِ الْخِطَابَ لَمْ یُصَدَّقْ قَضاءً أَوْ دِیَانَۃً وَفِی ''الْمُنْتَقٰی'':

أَنَّهُ يُدَيَّنُ"۔

ترجمہ:"اگر شوہر نے بیوی کا نام لکھ کر اسے تحریری طلاق نامہ ارسال کیا(یعنی یوں کہ: میں نے اپنی بیوی فلانہ بنت فلاں کو طلاق دی یا یہ فلانہ بنت فلاں! میں نے تمہیں طلاق دی) اور یہ بات اُس کے اقرار سے یا گواہوں سے ثابت ہوگئی، تو یہ ایسا ہی ہے، جیسے اس نے براہِ راست بیوی کو مخاطب کر کے اسے طلاق دی ہو، اگر وہ کہے: میری نیت طلاق کی نہیں تھی، تو قضاءً اور دیانۃً اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور "المنتقیٰ" میں ہے: دیانۃً اس کی بات مانی جائے گی، (الاشباہ والنظائر، ص:334)"۔

سوال:(۲)

نکاح ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور طلاق ہوگئی تو کیا عدت ہوگی؟، (اسراء انصاری)۔

جواب:

اگر رخصتی نہیں ہوئی اور نکاح کے بعد ایسی خَلوت (Privacy) بھی نہیں ہوئی کہ جس میں دونوں کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم کرنے میں کوئی حسّی، طبعی یا شرعی رکاوٹ نہ ہو، تو ایسی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اس پر عدت لازم نہیں ہوگی اور طلاق دیتے ہی وہ نکاح سے خارج ہوجائے گی اور اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے، نکاح کرسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا"۔

ترجمہ:"اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب: 49)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالْخَلْوَةُ الصَّحِيْحَةُ أَنْ يَجْتَمِعَا فِي مَكَانٍ لَيْسَ هُنَاكَ مَانِعٌ يَمْنَعُهُ مِنَ الْوَطْئِ حِسًّا أَوْ

شَرْعًا أَوْ طَبْعًا كَذَا فِي "فَتَاوٰى قَاضِيخَان"۔

ترجمہ: "خلوتِ صحیحہ یہ ہے کہ زوجین ایک ایسے مکان میں یک جا ہوں اور جہاں ازدواجی عمل سے کوئی حسی، طبعی اور شرعی مانع نہ ہو، جیسا کہ "فتاویٰ قاضی خان" میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد1،ص:304)"۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(بِلَا مَانِعٍ حِسِّيٍّ) كَمَرَضٍ لِأَحَدِهِمَا يَمْنَعُ الْوَطْءَ (وَطَبْعِيٍّ) كَوُجُودِ ثَالِثٍ (وَشَرْعِيٍّ) كَإِحْرَامٍ لِفَرْضٍ أَوْ نَفْلٍ"۔

ترجمہ: "(خلوت) کے لیے مانع حسی نہ ہو جیسے زوجین میں سے کسی کو ایسا مرض ہونا جو مباشرت سے مانع ہو اور نہ طبعی مانع ہو، جیسے کسی تیسرے فرد کا اُس مقام پر ہونا اور نہ ہی شرعی مانع ہو جیسے کہ دونوں میں سے کوئی مُحرم ہو، احرام خواہ فرض کا ہو یا نفل کا، (جلد8، ص:387 تا389)"۔ عورت حیض ونفاس کی حالت میں ہو، اِسی طرح دونوں یا اُن میں سے کوئی ایک روزے کی حالت میں ہو یا فرض نماز میں مشغول ہو، ان سب صورتوں میں ان دونوں کا یک جا ہونا خلوتِ صحیحہ شمار نہیں ہوگا۔

دوطلاقوں کا حکم

سوال:

ایک بندے نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور کہا: میں تم کو طلاق دیتا ہوں، میں تم کو طلاق دیتا ہوں، کیا یہ طلاق ہوگئی ہے؟، اگر ہوگئی ہے تو کیا دوبارہ نکاح ضروری ہے، جناب اس کا جوب دے دیں، (حافظ اشفاق کامرہ)۔

جواب:

آپ نے سوال میں دوطلاقوں کا ذکر کیا ہے، ایک یا دوطلاق دینے کی صورت میں دورانِ عدت (تین حیض گزرنے سے پہلے) شوہر یک طرفہ طور پر رجوع کرسکتا ہے، دو طلاقیں دینے کی صورت میں آئندہ شوہر کو ایک طلاق کا اختیار رہے گا، مزید ایک طلاق

دینے کی صورت میں دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔

علامہ ابوبکر بن علی الزَّبِیدی الیمنی الحنفی متوفی: 800 لکھتے ہیں:

قَوْلُهُ: وَالرَّجْعَةُ أَنْ يَقُولَ رَاجَعْتُكِ أَوْ رَاجَعْتُ اِمْرَأَتِي: هٰذَا صَرِيحُ الرَّجْعَةِ وَلَا خِلَافَ فِيهِ، فَقَوْلُهُ: رَاجَعْتُكِ هٰذَا فِي الْحَضْرَةِ، وَقَوْلُهُ: رَاجَعْتُ اِمْرَأَتِي فِي الْحَضْرَةِ وَالْغَيْبَةِ ثُمَّ الرَّجْعَةُ عَلٰى ضَرْبَيْنِ: سُنِّيٍّ وَبِدْعِيٍّ، فَالسُّنِّيُّ أَنْ يُرَاجِعَهَا بِالْقَوْلِ وَيُشْهِدَ عَلٰى رَجْعَتِهَا شَاهِدَيْنِ وَيُعْلِمَهَا بِذٰلِكَ، فَإِنْ رَاجَعَهَا بِالْقَوْلِ نَحْوُ أَنْ يَقُولَ لَهَا رَاجَعْتُكِ أَوْ رَاجَعْتُ اِمْرَأَتِي وَلَمْ يُشْهِدْ عَلٰى ذٰلِكَ أَوْ أَشْهَدَ وَلَمْ يُعْلِمْهَا بِذٰلِكَ فَهُوَ مُخَالِفٌ لِلسُّنَّةِ وَالرَّجْعَةُ صَحِيحَةٌ، وَإِنْ رَاجَعَهَا بِالْفِعْلِ مِثْلُ أَنْ يَطَأَهَا أَوْ يُقَبِّلَهَا بِشَهْوَةٍ أَوْ يَنْظُرَ إِلٰى فَرْجِهَا بِشَهْوَةٍ فَإِنَّهُ يَصِيرُ مُرَاجِعًا عِنْدَنَا إِلَّا أَنَّهُ يُكْرَهُ لَهُ ذٰلِكَ وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يُرَاجِعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ بِالْإِشْهَادِ وَإِنْ نَظَرَ إِلٰى سَائِرِ أَعْضَائِهَا بِشَهْوَةٍ لَا يَكُونُ مُرَاجِعًا۔

ترجمہ: ''علامہ ابوالحسین احمد بن محمد بغدادی المعروف امام قدوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''طلاق میں رجوع یہ ہے کہ شوہر بیوی سے کہے: ''میں نے تجھ سے رجوع کیا'' یا ''میں نے اپنے بیوی سے رجوع کیا''۔ اس کی شرح میں علامہ ابوبکر بن علی الزبیدی لکھتے ہیں: ''یہ رجوع کے صریح کلمات ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، شوہر بیوی کی موجودگی میں کہے گا: ''میں نے تجھ سے رجوع کیا'' اور بیوی کی عدم موجودگی میں کہے گا: ''میں نے اپنی بیوی سے رجوع کیا''۔ پھر رجوع کی دو قسمیں ہیں: (1) سنت میں تعلیم کیے ہوئے طریقے کے مطابق (2) دوسری بدعی۔ سنت کے مطابق رجوع یہ ہے کہ شوہر زبانی کہے: ''میں نے اپنی بیوی سے رجوع کیا'' اور اپنے اس رجوع پر دو گواہ قائم کر لے اور بیوی کو اس کے بارے میں بتادے۔ پس اگر زبانی رجوع کیا اور یوں کہا: ''میں نے تجھ سے رجوع کیا'' یا ''میں نے اپنی بیوی سے رجوع کیا'' اور اس پر کسی کو گواہ نہیں بنایا یا گواہ تو بنایا مگر بیوی کو بتایا نہیں، تو یہ طریقہ سنت کے مخالف ہے اور رجوع صحیح ہے، اور اگر عملاً رجوع کیا، جیسے بیوی سے وطی کی یا شہوت سے اُسے بوسا دیا یا شہوت سے اس کی شرمگاہ کو دیکھا، تو ہمارے

نزدیک یہ رجوع صحیح ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے اور مستحب یہ ہے کہ اس کے بعد گواہ قائم کر کے رجوع کرے، (الجوہرۃ النیرۃ، ج:2،ص:65)"۔

رجوع کرنے پر گواہ قائم کرنے اور عورت کو بتانے کی حکمت یہ ہے کہ عدت پوری ہونے پر بے خبری میں وہ کسی سے نکاح نہ کرلے، اور اگر اس نے نکاح کرلیا ہو تو تفریق کردی جائے گی، اگرچہ انہوں نے مباشرت کرلی ہو۔ طلاقِ رجعی میں رجوع کے لیے بیوی کی رضامندی شرط نہیں ہے اور نہ اس میں تجدیدِ نکاح ہی کی ضرورت ہے، البتہ گواہ قائم کرنا مستحب ہے۔

بیوی کو بہن کہنے پر طلاق کا حکم

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیوی کے بارے میں کہا: یہ آج سے میری بہن ہے، میں نے اس کو طلاق دی، رہنمائی فرمائیں کہ یہ کون سی طلاق ہے؟، (مولانا امداد اللہ، بستی حافظ آباد، بہاولنگر)۔

جواب:

سوال میں بیان کردہ الفاظ" میں نے اس کو طلاق دی" سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی ہے، بشرطیکہ بیوی کا نام لے کر طلاق دی ہو یا آمنے سامنے اس کی طرف اشارہ کر کے طلاق دی ہو، کیونکہ طلاق کے موثر ہونے کے لیے بیوی کی طرف اضافت ضروری ہے۔ عدت کے دوران شوہر یک طرفہ طور پر رجوع کرسکتا ہے، مُطلقہ غیر حاملہ کی عدت تین حیض گزرنا ہے۔ شوہر کا یہ کہنا: "یہ آج سے میری بہن ہے"، لغو اور بے ہودہ کلام ہے۔

حاملہ عورت کی طلاق کا حکم

سوال:

کیا حاملہ عورت کو طلاق واقع ہوجاتی ہے، (شاہد، حیدرآباد)۔

جواب:

جی ہاں! حاملہ بیوی کو طلاق دینا اگرچہ انتہائی نامناسب، سنگدلی اور بے رحمی کی دلیل ہے، لیکن طلاق بہرحال واقع ہوجاتی ہے، حاملہ عورت کی عدت وضعِ حمل ہے، اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: ''وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ''۔
ترجمہ: ''اور (طلاق کے بعد) حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضع حمل ہے، (الطلاق:4)''۔

طلاق کا ایک مسئلہ

سوال:

میں نے ایک دفعہ اپنی بیوی کو زبانی طلاق دی اور پھر اپنے وکیل سے طلاق نامہ بنوایا، میں نے کہا: ''اگر بات بنی تو میں یہ پرچہ نہیں دوں گا اور اگر بات نہیں بنی تو پھر میں دو دفعہ طلاق دے کر طلاق نامہ اُن کو دے دوں گا''۔ میری بیوی کا نام زویا بنت ظفر شیخ ہے، میں نے وکیل کو بیوی کا نام ''ظھوہ'' لکھ کر دیا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ طلاق نامہ بنوانے کے بعد ہم لڑکی والوں کے گھر گئے، لیکن کوئی بات نہیں بنی اور طلاق نامہ دیئے بغیر واپس آ گئے۔ میں نے اُس طلاق نامے پر کوئی دستخط نہیں کیے ہیں، وکیل نے نشاندہی کے لیے اپنے ہاتھ سے میرا نام وہاں پر تحریر کیا کہ اس جگہ پر دستخط کرنے ہیں، میں نے یہ طلاق نامہ اب تک کسی کو نہیں دیا ہے نہ ہی دستخط کیے ہیں، اب میں اپنی بیوی سے رجوع کرنا چاہتا ہوں، آپ کی بارگاہ میں عرض ہے کہ اس تحریر کی وجہ سے میری بیوی پر کوئی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (نعمان خان لانڈھی 6، کراچی)۔

جواب:

ایک طلاق رجعی دینے کے بعد آپ کے پاس صرف دو طلاقوں کا اختیار تھا، جس کے بعد آپ نے طلاق نامہ بنوایا، جس میں تین طلاقیں لکھی ہوئی ہیں، لیکن اُس تحریر کو اپنے دستخط سے مؤثر کرنے پر معلق کیا اور یہ کہا: ''اگر بات بنی تو میں یہ پرچہ نہیں دوں گا اور اگر بات نہیں بنی تو پھر میں دو دفعہ طلاق دے کر طلاق نامہ اُن کو دے دوں گا''، اس صورت میں جب تک طلاق نامے پر دستخط نہیں ہوں گے، تب تک مزید طلاق واقع نہیں ہوں گی۔

علامہ حسن بن منصور اوز جندی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْکِتَابَۃُ عَلٰی نَوعَیْنِ: مَرْسُوْمَۃٌ وَغَیْرُ مَرْسُوْمَۃٍ، وَنَعْنِیْ بِالْمَرْسُوْمَۃِ اَنْ یَّکُوْنَ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، مِثْلَ مَایُکْتَبُ اِلَی الْغَائِبِ، وَغَیْرُ الْمَرْسُوْمَۃِ لَا یَکُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، وَھُوَ عَلٰی وَجْھَیْنِ مُسْتَبِیْنَۃٌ وَغَیْرُ مُسْتَبِیْنَۃٍ، فَالْمُسْتَبِیْنَۃُ مَایُکْتَبُ عَلَی الصَّحِیْفَۃِ وَالْحَائِطِ وَالْاَرْضِ عَلٰی وَجْہٍ یُمْکِنُ فَھْمُہٗ وَقِرَاءَتُہٗ وَغَیْرُ الْمُسْتَبِیْنَۃِ مَا یُکْتَبُ عَلَی الْھَوَاءِ وَالْمَآءِ وَشَیْءٍ لَا یُمْکِنُ فَھْمُہٗ وَقِرَاءَتُہٗ، فَفِیْ غَیْرِ الْمُسْتَبِیْنَۃِ لَا یَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰی، وَاِنْ کَانَتْ مُسْتَبِیْنَۃً لٰکِنَّھَا غَیْرُ مَرْسُوْمَۃٍ، اِنْ نَوَی الطَّلَاقَ یَقَعُ وَاِلاَّ فَلَا، وَاِنْ کَانَتْ مَرْسُوْمَۃً یَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوٰی اَوْ لَمْ یَنْوِ، ثُمَّ الْمَرْسُوْمَۃُ لَا تَخْلُوْ، اِمَّا اِنْ اَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِاَنْ کَتَبَ ''اَمَّا بَعْدُ فَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَلَمَّا کَتَبَ ھٰذَا یَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُھَا الْعِدَّۃُ مِنْ وَّقْتِ الْکِتَابَۃِ، وَاِنْ عَلَّقَ طَلَاقَھَا بِمَجِیْءِ الْکِتَابِ، بِاَنْ کَتَبَ: ''اِذَا جَائَکِ کِتَابُ ھٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَجَاءَھَا الْکِتَابُ فَقَرَأَتْہُ اَوْ لَمْ تَقْرَأْ یَقَعُ الطَّلَاقُ، کَذَافِی الْخُلَاصَۃِ رَجُلٌ اُکْرِہَ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ عَلٰی اَنْ یَّکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِہٖ فُلَانَۃِ بِنْتِ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، فَکَتَبَ اِمْرَأَتُہٗ فُلَانَۃُ بِنْتُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ طَالِقٌ، لَا تُطْلَقُ اِمْرَأَتُہٗ لِاَنَّ الْکِتَابَۃَ اُقِیْمَتْ مَقَامَ الْعِبَارَۃِ بِاِعْتِبَارِ الْحَاجَۃِ وَلَا حَاجَۃَ ھٰھُنَا''۔

ترجمہ: ''تحریری طلاق کی دو قسمیں ہیں: مرسومہ اور غیر مرسومہ۔ مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ با قاعدہ مکتوب الیہ کے نام اور پتے کے ساتھ شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کو خط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: اِلٰی فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ اور اردو میں لکھتے ہیں: بنامِ فلاں یا فلاں کے نام، یعنی فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔ غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر با قاعدہ اُسے مخاطب نہ کیا جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اور نظر آنے والا وہ ہے جسے کاغذ یا دیوار یا زمین پر اس طرح لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو اور غیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوا یا پانی یا کسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے) پر لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن نہ ہو، تو غیر واضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔ اور اگر تحریر تو

واضح ہے لیکن مکتوب الیہ کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے نہیں لکھی گئی، تو اگر لکھنے والے نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہو جائے گی۔ پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطب کر کے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔

(۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطب کر کے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب اُس کی بیوی کو تحریر ملے گی، طلاق واقع ہوگی خواہ اس کی بیوی نے وہ تحریر پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو (یعنی تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: اور آدمی کو مار اور قید کے ذریعے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی فلانہ بنت فلان بن فلاں کو طلاق لکھ کر دے دے، پس اس نے اپنی بیوی کو لکھا: فلانہ بنت فلاں بن فلاں کو طلاق ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر ضرورت کی بنا پر الفاظ کے قائم مقام قرار پاتی ہے اور یہاں کوئی حاجت نہیں ہے، (قاضی خان، ج:1،ص:233)''۔

حاشیہ شلبی میں تبیین الحقائق کی مذکورہ عبارت کے تحت شیخ شلبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ (مَرْسُوْمٌ) اَلْمَقْصُوْدُ مِنَ الْمَرْسُوْمِ اَنْ یَّکُوْنَ عَلَی الْوَجْهِ الْمُعْتَادِ فِیْ اِظْهَارِ الْاَمْرِ عُرْفًا کَالْکُتُبِ الْمُعَنْوَنَةِ اَوِ الْمَحَاضِرِ وَالسِّجِلَّاتِ وَالْقِصَصِ وَنَحْوِهَا، اِنْتَهٰی۔ قَوْلُهٗ (وَمُسْتَبِیْنٌ غَیْرُ مَرْسُوْمٍ) وَهُوَ کِنَایَةٌ فَیَحْتَاجُ اِلَی النِّیَّةِ ، اِنْتَهٰی، قَوْلُهٗ (لَا عَلٰی وَجْهِ الرَّسْمِ) اَیْ لَا عَلٰی وَجْهِ الْمُعْتَادِ فِیْ اِثْبَاتِ الْمَقَاصِدِ کَمَا یُکْتَبُ عَلَی الْکَاغَذِ لِتَجْرِبَةِ

الْمَدَادِ اَوِ الْقَلَمِ اَوِ الْخَطِّ وَنَحْوِهَا، اِنْتَهٰی ، قَوْلُهٗ (کَالنِّیَّةِ) فَاِنْ کَانَ صَحِیْحًا یُبَیِّنُ نِیَّتَهٗ بِلِسَانِهٖ وَاِنْ کَانَ اَخْرَسَ یُبَیِّنُ نِیَّتَهٗ بِالْکِتَابَةِ ، کَذَا فِی الْمَبْسُوْطِ ، انتھیٰ"۔

ترجمہ:"(مرسوم) سے مقصود یہ ہے کہ وہ لوگوں کی عادت کے مطابق ہو جس طرح عرف میں کسی امر کے اظہار کے لیے تحریر لکھی جاتی ہے، جیسا کہ (مُرسَل الیہ) کا نام لکھ کر مخاطب کیے جانے والے خطوط یا سرکاری دستاویزات اور معاہدات اور رجسٹر اور قصے اور اس طرح کی دیگر تحریریں اور صاحبِ تبیین کا قول (وَمُسْتَبِیْنٌ غَیْرُ مَرْسُوْمٍ) اس کا حکم کنایہ طلاق والا ہے، لہٰذا اس میں قائل کی نیت پوچھی جائے گی اور ان کا یہ قول (لَا عَلٰی وَجْهِ الرَّسْمِ) یعنی مقاصد کو ثابت کرنے کے لوگوں کی عادت اور معروف طریقے پر نہ ہو، جیسا کہ کاغذ پر روشنائی چیک کرنے کے لیے یا قلم یا خط چیک کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ صاحبِ تبیین کا قول (کَالنِّیَّةِ) اگر لکھنے والا بیان پر قادر ہے تو زبان سے اپنی نیت بتائے گا اور اگر گونگا ہے تو لکھ کر اپنی نیت بتائے گا، "مبسوط" میں اسی طرح ہے۔ (حاشیہ شلبی علی تبیین الحقائق ، مَسَائِلُ شَتّٰی بحث کِتَابَةُ الْاَخْرَسِ، ج:6، ص:218، مکتبہ امدادیہ ملتان)، (المبسوط للسرخسی، باب طلاق الاخرس، ج:6، ص:166، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

طلاقِ مرسومہ اور غیر مرسومہ کا یہ فرق عوام کے عرف کی وجہ سے ہے کہ مرسومہ وہ طلاق نامہ ہے جو لوگوں کے عرف و عادت کے مطابق تحریر کیا گیا ہو اور غیر مرسومہ وہ طلاق نامہ ہے جو ان کے عرف و عادت کے موافق نہ ہو۔ لہٰذا غیر مرسومہ میں جب تک نیت یا اس کے قائم مقام اور کوئی چیز نہ ہو تو اس میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ مرسومہ اور غیر مرسومہ کی مذکورہ صورتیں فقہاء نے اپنے اپنے ادوار میں پائے جانے والے عرف کے اعتبار سے کی ہیں، جیسا کہ علامہ شلبی رحمۃ اللہ علیہ نے سرکاری دستاویزات کو مرسومہ میں بیان کیا اور ہم نے جو یہ تحریر کیا کہ "جب تک اسٹامپ پیپر پر طلاق نامہ نہ لکھا جائے، وہ غیر مرسومہ ہے" یہ درحقیقت فقہاء سابقین کا قولِ ضروری ہی ہے کہ اگر وہ اس دور میں ہوتے اور لوگوں کے موجودہ عرف کو دیکھتے تو وہ بھی یہی کہتے۔

لیکن موجودہ دور میں کسی بھی تحریر پر، چاہے لکھنے والے کے اپنے ہاتھ سے ہو، جب تک خود لکھنے یا لکھانے والے کے دستخط یا نشانِ انگوٹھا یا مُہر نہ ہو، معتبر نہیں مانی جاتی اور ہمارے نظامِ عدل وقانون میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ اُس سے کوئی چیز ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ ہی نفی کی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مکاتیب پر باقاعدہ توثیقی مہر لگائی جاتی تھی، آپ کی مُہر مبارک پر ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ'' لکھا ہوا تھا۔

بعض اوقات کوئی شخص اپنی نافرمان بیوی کو ڈرانے کے لیے بھی طلاق کے الفاظ لکھ دیتا ہے اور اُس کا مقصد عام طور پر اِنشائے طلاق نہیں ہوتا یا کسی سے لکھوا دیتا ہے اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اختلاف کو طے کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو طلاق نامے پر دستخط کر کے اُسے موثّر بنادیا جائے گا۔ آج کل اس حوالے سے بڑے مسائل درپیش ہیں، لہٰذا ہمارے مفتیانِ کرام اور فقیہانِ ملّت کو اپنے عہد کے عُرف اور دستور کا اعتبار اور لحاظ کرنا چاہیے، ہاں اگر کسی شخص نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا لکھوایا ہے اور وہ اقرار کرتا ہے کہ میں نے طلاق دینے کی نیت سے لکھا یا لکھوایا ہے تو اُس کے موثر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اگر طلاق دینے کی نیت کے ساتھ لکھتا ہے یا لکھواتا ہے اور بعد میں بیان بدل دیتا ہے، تو عند اللہ یعنی دیانۃً یہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

''ثُمَّ قَدْ شَاعَ فِیْ بِلَادِنَا أَنَّ اَحَدَھُمْ اِذَا اَرَادَ اَنْ یُّطَلِّقَ اِمْرَاَتَهٗ، دَعَا الصَّکَّاكَ وَأَمَرَهٗ أَنْ یَّکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِهٖ ثَلَاثاً مَثَلاً، فَیَعِظُهُ النَّاسُ وَیَسْتَنْزِلُوْنَهٗ عَنِ الثَّلَاثِ، فَیَقُوْلُ سَمْعًا: ''اُکْتُبْ طَلَاقَیْنِ''۔۔۔وَھٰکَذَا، وَکُلُّ ذٰلِكَ دَلِیْلٌ قَاطِعٌ عَلٰی أَنَّھُمْ لَا یَرَوْنَ بِالْأَمْرِ اِلَّا التَّوْکِیْل، وَلَا یَفْھَمُوْنَ مِنْهُ الْاِقْرَارَ أَصْلاً، فَوَجَبَ التَّعْوِیْلُ عَلٰی مَا فِی ''الْقُنْیَةِ'' وَ''الْاَشْبَاهِ''، وَھُوَ الْمُصَحَّحُ الْمُفْتٰی بِهٖ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، فَقَدْ وَضَحَ الصَّوَابُ، وَانْکَشَفَ الْحِجَابُ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَزِیْزِ الْوَھَّابِ''۔

ترجمہ: ''پھر ہمارے خطے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا

ارادہ کرے تو وہ وثیقہ نویس کو بلاتا ہے اور اُسے حکم دیتا ہے کہ مثلاً: ''میری بیوی کو تین طلاقیں لکھ دو، تو لوگ اُسے سمجھاتے ہیں اور تین طلاق کے ارادے سے نیچے لے آتے ہیں، پس وہ کہتا ہے: ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کی بات مان لیتا ہوں، چلو دو طلاقیں لکھ دو اور اِسی طرح بعض صورتوں میں ایک طلاق تک آجاتا ہے'' اور یہ پوری صورتِ حال اس بات پر دلیلِ قطعی ہے کہ وہ شوہر کے طلاق لکھنے کے امر کو توکیلِ طلاق سمجھتے ہیں اور وہ قطعاً اِسے اقرار (وانشائے) طلاق نہیں سمجھتے، پس ''القُنیہ'' اور ''الاِشباہ'' میں جو بیان کیا گیا ہے، اس پر اعتماد کرنا لازم ہے اور وہی صحیح مفتیٰ بہٖ قول ہے، وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ، پس اس مسئلے میں صائب رائے واضح ہوگئی اور مسئلہ کھل کر سامنے آگیا، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَزِیْزِ الْوَھَّابِ، (جدالممتار علی ردالمحتار، ج:5، ص:68، دارالفقیہ)''۔

اس سے مستفاد یہ ہے کہ دستخط کیے بغیر محض طلاق لکھنے یا کسی کو لکھنے کا حکم دینے کو ہر صورت میں ارادہ وانشائے طلاق پر محمول کرنا لازم نہیں ہے۔ ہماری یہ بحث اس صورت پر محمول ہے کہ دستخط کیے بغیر طلاق نامے کی بابت شوہر یہ کہے کہ میری نیت اِنشائے طلاق کی نہیں تھی، تو مفتی کو اُسے تسلیم کرنا چاہیے اور اگر وہ ارادۂ طلاق کا اقرار کرتا ہے یا مروّجہ طلاق نامے پر دستخط کردیتا ہے، تو پھر یہ ساری بحث غیر متعلق ہوجاتی ہے۔

پس اگر آپ کا بیان درست ہے کہ طلاق نامہ لکھواتے وقت آپ کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، تو طلاق واقع نہیں ہوئی اور زویا بدستور آپ کی بیوی ہے۔ اگر آپ نے طلاق دینے کی نیت سے طلاق نامہ لکھوایا تھا، تو پھر وہ طلاق مؤثر ہوگئی ہے اور بیان بدلنے کی صورت میں ازدواجی تعلقات قائم کرنے پر آپ حرام کے مرتکب ہوں گے۔ چونکہ طلاق نامے میں بیوی کا نام ''ظلہوہ'' ہی کو صحیح سمجھ کر لکھا ہے اور آپ کی مراد بھی اپنی بیوی ہی ہے، تو حکم وہی رہے گا۔

طلاقِ مُعلق کا حکم

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیوی سے فون پر کہا: اگر تم نے میری ماں کے سامنے اُف بھی کی تو تم مجھ پر تین طلاق''۔اس کے چند دن بعد بہو نے ساس سے کہا: امی کھانا کھالیں،ساس نے جواب دیا مجھے بار بار کھانے کا نہ کہو، میں تنگ ہوں میں یہاں سے نکل کر چلی جاؤں گی۔پھر بہو نے کہا: امی آپ کے بیٹے نے ایسی سخت بات کی ہوئی ہے،آپ مجھے تنگ کررہی ہیں تو مجھے ہی جانا پڑے گا۔سسر نے ساری گفتگوسن کر کہا: تم نے تو اُف کردی، اب تمہیں اپنے باپ کے گھر جانا پڑے گا۔کچھ دیر بعد بہو نے ساس سے کہا: میں اپنے خاوند کے بڑے بھائی کے گھر جارہی ہوں۔ساس نے منع کیا کہ مت جاؤ لیکن بہو نے ساس کو جواب دیا کہ امی آپ احساس کریں کہ آپ کے بیٹے کی بات سے میرا گھر خراب ہو رہا ہے اور نکل کر جیٹھ کے گھر چلی گئی، گھنٹے پون گھنٹے بعد واپس آ گئی۔ساس اور بہو کے درمیان ہونے والی اس گفتگو میں بہو کا قول اُف کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟۔نوٹ: یہ تحریر ساس، بہو کے سامنے لکھی گئی ہے اور دونوں نے حلفاً اقرار کیا کہ ہمارے درمیان یہی گفتگو ہوئی تھی،(سراج الحق تنولی، مانسہرہ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر والدین سے حسنِ سلوک کا حکم فرمایا ہے اور اُن کے حقوق کی جانب مُتوجہ فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا''۔

ترجمہ:''اور آپ کے رب نے حکم فرمایا ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اگر تمہاری زندگی میں وہ دونوں یا اُن میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور اُنہیں نہ جھڑکنا اور اُن کے ساتھ ادب سے

بات کرنا، (بنی اسرائیل:23)"۔
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کو "اُف" کہنے اور جھڑکنے سے منع فرمایا ہے۔
اُف سے مراد زبان سے ایسا کلمہ کہنا جو ماں باپ کے لیے ذہنی اذیت اور رنج وملال کا باعث ہو، یہ حکم دراصل ماں باپ کو اذیّت وآزار پہنچانے سے بچنے کے لیے مبالغہ کے طور پر آیا ہے، یعنی جب اُنہیں زبان سے "اُف" تک کہنا منع ہے، تو ذہنی اور جسمانی طور پر اذیت پہنچانے کے گناہ کی سنگینی کا عالم کیا ہوگا؟۔ تفسیر کشاف میں ہے: "اس سے مراد یہ ہے کہ ماں باپ کو احترام کے ساتھ پکارے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشرک ہونے کے باوجود اپنے (عرفی) باپ کو "یَاأَبَتِ" (اے میرے باپ) کہہ کر پکارا، (مریم:42)"۔
اگر آپ کا بیان درست ہے تو بیوی کے لہجے اور اندازِ تخاطُب میں گستاخی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ساس کو امی جان کہہ کر مخاطب کررہی ہے اور اپنی مشکل بیان کررہی ہے، جس میں عاقبت نااندیش شوہر نے اُسے مبتلا کردیا ہے اور اس کے لیے صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کو مشکل بنادیا ہے، کیونکہ کوئی بھی انسان جذبات سے مکمل طور پر عاری نہیں ہوتا۔ اب شوہر پر بھی لازم ہے کہ اپنی والدہ ماجدہ کو احساس دلائے کہ وہ بھی صبر وضبط سے کام لیں تاکہ گھر برباد نہ ہو اور بیوی کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ شوہر کا بیوی پر اتنی کڑی شرط لگانا زیادتی ہے اور اُسے مشکل ترین صورتِ حال سے دوچار کرنا ہے۔
سوال میں خط کشیدہ الفاظ طلاقِ مُعلّق کے قبیل سے ہیں، یعنی "طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مُعلّق کرنا"۔ ایسی صورت میں شرط کے پائے جانے پر طلاق واقع ہوجاتی ہے۔
علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں:
"وَإِذَا اَضَافَهُ اِلٰى شَرْطٍ، وَقَعَ عَقِيبَ الشَّرْطِ، مِثْلَ أَنْ يَّقُولَ لِامْرَاَتِهٖ اِنْ دَخَلْتِ الدَّارَ فَأَنْتِ طَالِقٌ، وَهٰذَا بِالِاتِّفَاقِ"۔
ترجمہ: "اگر طلاق کو شرط کی طرف منسوب کیا ہو، تو اس شرط کے پائے جانے کے بعد وہ طلاق واقع ہوجائے گی، مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے: "اگر تو گھر میں داخل ہوئی

تو تجھے طلاق ہے" (تو بیوی کے گھر میں داخل ہوتے ہی طلاق واقع ہوجائے گی)، سو یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، (ہدایہ، جلد 3، ص:196)"۔ ہماری نظر میں صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی، مگر آئندہ کے لیے شوہر، بیوی اور شوہر کی ماں سب کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر شوہر کی ماں کی خدمت کے لیے کوئی متبادل انتظام ہوسکتا ہے (مثلاً کوئی دوسرا بیٹا یا بیٹی وغیرہ)، تو بہتر ہوگا کہ شوہر اپنے بیوی بچوں کی رہائش کے لیے الگ انتظام کرلے۔

اس تعلیق کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو طہارت کے اُن دنوں میں، جن میں شوہر نے اس سے قربت نہ کی ہو، ایک طلاق دیدے، پھر عدت کے اندر رجوع نہ کرے، عدت گزرنے پر وہ طلاق بائن ہوجائے گی۔ عدت ختم ہونے کے بعد عورت شوہر کی ماں کو اُف کہے اور ناراضی کے کچھ کلمات کہہ لے، کیونکہ اب یہ عورت نہ نکاح میں ہے اور نہ عدت میں، اس لیے اس پر کوئی اور طلاق واقع نہیں ہوگی اور شرط پوری ہونے کی وجہ سے تعلیق بھی ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد شوہر نیا مہر مقرر کرکے باہمی رضامندی سے اُسی عورت سے نیا نکاح کرلے، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اب شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی ہے اور اگر خدانخواستہ اس نے آئندہ طلاق دی، تو پچھلی طلاق اس کے ساتھ جمع ہونے کے لیے موثر رہے گی۔ نیز عدت کے دوران شرط کی پابندی کرنی ہوگی، ورنہ عدت میں شرط پوری ہونے کی صورت میں تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

مُطلقہ کے نفقے کا تعین

سوال:

جس طرح روزہ یا قسم کا کفارہ/فدیہ مقرر ہے، تو کیا شریعت میں طلاق یافتہ عورت کے لیے نفقہ اور رہائش کی مقدار بھی مقرر ہے، اس کا نصاب کیا ہے؟، (محمد اشرف، قصبہ اورنگی)۔

جواب:

دورانِ عدت مطلقہ عورت کا نفقہ شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق اُس پر لازم ہے،

بشرطیکہ وہ شوہر کے مکان میں عدت گزارے۔ شریعت نے اس کے لیے کوئی لگا بندھا معیار مقرر نہیں کیا، جو سب پر یکساں طور پر لاگو ہو، بلکہ شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق ان پر لازم کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا''۔

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے نفقہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اپنی عطا کردہ مالی استطاعت کے مطابق ذمے دار قرار دیتا ہے، (الطلاق: 7)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''فَتَسْتَحِقُّ النَّفَقَةَ بِقَدْرِ حَالِهِمَا بِهٖ يُفْتٰى، وَيُخَاطَبُ بِقَدْرِ وُسْعِهٖ وَالْبَاقِيْ دَيْنٌ اِلَى الْمَيْسَرَةِ''۔

ترجمہ: ''عورت دونوں کی حیثیت کے مطابق نفقہ کی حقدار ہے، اسی پر فتویٰ دیا جائے گا اور خاوند اپنی وسعت کے مطابق ادائیگی کا مکلف ہوگا اور جو رقم باقی رہ جائے تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا، جس کو وہ اپنی سہولت سے ادا کرے گا''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قَالَ فِي الْبَحْرِ: وَاتَّفَقُوْا عَلٰى وُجُوْبِ نَفَقَةِ الْمُوْسِرِيْنَ إِذَا كَانَا مُوْسِرَيْنِ، وَعَلٰى نَفَقَةِ الْمُعْسِرِيْنَ إِذَا كَانَا مُعْسِرَيْنِ، وَإِنَّمَا الْاِخْتِلَافُ فِيْمَا إِذَا كَانَ أَحَدُهُمَا مُوْسِرًا وَالْآخَرُ مُعْسِرًا، فَعَلٰى ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ الْاِعْتِبَارُ لِحَالِ الرَّجُلِ، فَإِنْ كَانَ مُوْسِرًا وَهِيَ مُعْسِرَةٌ فَعَلَيْهِ نَفَقَةُ الْمُوْسِرِيْنَ، وَفِيْ عَكْسِهٖ نَفَقَةُ الْمُعْسِرِيْنَ وَأَمَّا عَلَى الْمُفْتٰى بِهٖ فَتَجِبُ نَفَقَةُ الْوَسَطِ فِي الْمَسْأَلَتَيْنِ وَهُوَ فَوْقَ نَفَقَةِ الْمُعْسِرَةِ وَدُوْنَ نَفَقَةِ الْمُوْسِرَةِ''۔

ترجمہ: ''''البحر الرائق'' میں ہے: تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں خوش حال ہیں، تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ واجب ہوگا۔ اور اگر دونوں تنگ دست ہیں، تو ان کے حال

کے مطابق خاوند پر نفقہ ہوگا اور اختلاف صرف اس صورت میں ہے، جب دونوں میں سے ایک امیر اور دوسرا غریب ہے، ظاہر روایت کے مطابق مرد کے حال کا اعتبار ہوگا، پس اگر خاوند خوشحال ہے اور زوجہ تنگ دست، تو اُس پر خوشحالی کا نفقہ واجب ہوگا اور اس کے برعکس صورتِ حال میں (کہ شوہر تنگ دست ہے اور عورت خوش حال) ہوتو تنگ دستی کا نفقہ واجب ہوگا، اور مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں درمیانی معیار کا نفقہ واجب ہوگا اور وہ یہ ہے کہ خوشحالی سے کم اور تنگ دستی سے زائد ہو''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وَیُؤَیِّدُہٗ قَوْلُ الْبَدَائِعِ حَتّٰی لَوْ کَانَ الرَّجُلُ مُفْرِطًا فِی الْیَسَارِ یَأْکُلُ خُبْزَ الْحُوَّارَی وَلَحْمَ الدَّجَاجِ وَالْمَرْأَۃُ مُفْرِطَۃً فِی الْفَقْرِ تَأْکُلُ فِی بَیْتِ أَھْلِھَا خُبْزَ الشَّعِیرِ یُطْعِمُھَا خُبْزَ الْحِنْطَۃِ وَلَحْمَ الشَّاۃِ''۔

ترجمہ: ''بدائع الصنائع'' میں ہے: اگر خاوند انتہائی خوشحال ہونے کی بنا پر صاف باریک آٹا اور مرغ کا گوشت کھاتا ہے اور بیوی انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنے گھر والوں کے ہاں جو کی روٹی کھاتی ہے، تو خاوند اسے گندم کی روٹی اور بکرے کا گوشت نفقہ کے طور پر کھانے کو دے گا''، (جلد 5، ص:226-225)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''وَلَا یُقَدَّرُ نَفَقَتُھَا بِالدَّرَاھِمِ وَالدَّنَانِیرِ عَلٰی أَیِّ سِعْرٍ کَانَتْ بَلْ یُقَدَّرُ بِھَا عَلٰی حَسَبِ اِخْتِلَافِ الْأَسْعَارِ غَلَاءً وَرَخْصًا رِعَایَۃً لِلْجَانِبَیْنِ کَذَا فِی ''الْبَدَائِعِ''۔

مفہوم: ''نفقہ کا تعین اشیاءِ ضرورت کی مروجہ قیمت سے صرفِ نظر کر کے (ایک مستقل معیار کے طور پر) درہم و دینار (روپوں) سے نہیں کیا جاسکتا، کہ ہمیشہ اتنے ہی روپے دیے جائیں، اس لیے کہ اشیاءِ ضرورت کی قیمتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں، بلکہ (ہر دور میں) مہنگائی اور ارزانی کے اعتبار سے نفقہ کا تعین ہوگا تاکہ جانبین کی رعایت ملحوظ رہے، (یعنی ارزانی و گرانی دونوں حالات میں مصارف یکساں نہیں ہوسکتے، بلکہ گرانی میں اس کے لحاظ سے نفقہ کی رقم بڑھائی جائے گی اور ارزانی میں کم کی جائے گی)، ''بدائع الصنائع'' میں بھی اسی طرح

ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:547)''۔

غیر حائض مُطلقہ عورت کی عدت

سوال:

ہند کی بچہ دانی نکالے جانے کے سبب حیض نہیں آتے ،عمر 25 سال ہے، طلاق کی صورت میں عدت کے ایام کا شمار کس طرح ہوگا؟، (محمد اشرف، قصبہ اورنگی)۔

جواب:

اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہوجاتا ہے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ''۔

ترجمہ:''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہوچکی ہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اور وہ عورتیں جن کو حیض نہیں آتا (ان عدت بھی تین ماہ ہے)، (الطلاق:4)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''وَالْعِدَّۃُ فِیْ حَقِّ مَنْ لَّمْ تَحِضْ لِصِغَرٍ بِاَنْ لَّمْ تَبْلُغْ تِسْعًا اَوْ کِبَرٍ بِاَنْ بَلَغَتْ سِنَّ الْاِیَاسِ اَوْ بَلَغَتْ بِالسِّنِّ وَلَمْ تَحِضْ۔۔۔۔ثَلَاثَۃُ اَشْھُرٍ بِالْاَھِلَّۃِ لَوْفِی الْغُرَّۃِ وَاِلَّا فَبِالْاَیَّامِ''۔

ترجمہ:''اور جس عورت کو کم عمری کے سبب حیض نہ آتا ہو (یعنی اس کی عمر نو سال بھی نہ ہوئی ہو) یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو یا وہ عمر کے اعتبار سے تو بالغ ہوگئی ہو (لیکن اس کے باوجود اسے حیض نہ آتا ہو)، تو اس کی عدت تین ماہ ہے، اگر طلاق قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو دے دی گئی ہو تو تین قمری مہینے مکمل ہونے پر عدت پوری ہوجائے، ورنہ 90 دن مکمل ہونے پر عدت پوری ہوگی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص:146، 149)''۔

علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر لکھتے ہیں:

"وَإِذَا كَانَتِ الْمَرْأَةُ لَا تَحِيضُ مِنْ صِغَرٍ أَوْ كِبَرٍ فَأَرَادَ أَنْ يُطَلِّقَهَا ثَلَاثًا لِلسُّنَّةِ طَلَّقَهَا وَاحِدَةً فَإِذَا مَضَى شَهْرٌ طَلَّقَهَا أُخْرَى، فَإِذَا مَضَى شَهْرٌ طَلَّقَهَا أُخْرَى لِأَنَّ الشَّهْرَ فِي حَقِّهَا قَائِمٌ مَقَامَ الْحَيْضِ"۔

ترجمہ: "جب عورت کو کم عمری یا سن ایاس کو پہنچنے کے سبب حیض نہ آتا ہو، اور اسے (اس کا شوہر) سنت میں تعلیم فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق تین طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ اس کو ایک طلاق دے پھر ایک مہینہ گزرنے کے بعد دوسری طلاق دے، پھر ایک مہینہ گزرنے کے بعد تیسری طلاق دے، کیونکہ مہینہ (گزرنا) اس کے حق میں حیض کے قائم مقام ہے، (ہدایہ، ج:3، ص:134، مکتبۃ البشریٰ)"۔

عدت کے دوران دینی مقاصد کے لیے نکلنے کا حکم

سوال:

عدتِ وفات میں عورت دینی تعلیم کے حصول کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے یا نہیں؟، (مہر النساء، آگرہ تاج کالونی)۔

جواب:

عدت کی قرآن مجید میں چار صورتیں بیان کی گئی ہیں: (ا) مطلّقہ حائض کی عدت حیض کے تین دورانیوں کا گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" ترجمہ: "اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ:228)"۔

(ب) مُطلقہ آئسہ (یعنی جسے کسی جسمانی نقص کے سبب سرے سے حیض ہی نہ آتا ہو یا اس کی بچہ دانی نکال لی گئی ہو یا زیادہ عمر ہونے کے سبب حیض آنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہو) کی عدت تین ماہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ"۔

ترجمہ:''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اور وہ عورتیں جن کو حیض نہیں آتا (ان کی عدت بھی تین ماہ ہے)، (الطلاق:4)''۔

(ج) حاملہ کی عدت طلاق ہو یا وفات، دونوں صورتوں میں وضع حمل یعنی بچے کا پیدا ہونا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ''۔

ترجمہ:''اور حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضع حمل ہے، (الطلاق:4)''۔

(د) عدت وفات یعنی بیوگی کی عدت جبکہ حمل سے نہ ہو، چار ماہ دس دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ''۔

ترجمہ: اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں، (البقرۃ: 234)۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ''۔

ترجمہ:''تم (عدت میں) ان کو اپنے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں''، (الطلاق:1)۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَتَعْتَدَّانِ أَيْ مُعْتَدَّةُ طَلَاقٍ وَمَوْتٍ فِي بَيْتٍ وَجَبَتْ فِيهِ وَلَا يَخْرُجَانِ مِنْهُ إِلَّا أَنْ تُخْرَجَ أَوْ يَتَهَدَّمَ الْمَنْزِلُ أَوْ تَخَافَ انْهِدَامَهُ، أَوْ تَلَفَ مَالِهَا أَوْ لَا تَجِدَ كِرَاءَ الْبَيْتِ وَنَحْوَ ذٰلِكَ

مِنَ الضَّرُوْرَاتِ فَتَخْرُجُ لِأَقْرَبِ مَوْضِعٍ إِلَيْهِ"۔

ترجمہ:"عدت طلاق یا عدت وفاتِ (زوج) گزارنے والی عورتیں، وہ اسی گھر میں عدت گزاریں، جہاں یہ عدت واجب ہوئی ہے اور اِن وجوہ کے بغیر اس گھر سے نہ نکلیں کہ انہیں زبردستی نکالا جارہا ہے یا عمارت گرائی جارہی ہے یا اس کے گرنے کا اندیشہ ہے یا اس کے مال کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے یا اس کے پاس گھر کا کرایہ نہیں ہے وغیرہ ، یہ ایسی ضروریات ہیں کہ ان کے سبب عدت گزارنے والی عورت اس گھر سے نکل سکتی ہے، پس وہ سب سے قریب (دستیاب) جگہ کی طرف نکل کر جائے، (جلد 5،ص:180)"۔

عدت کے دوران نہ حج کے لیے سفر کرسکتی ہے اور نہ ہی کسی اور مقصد کے لیے کہیں جاسکتی ہے۔علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اَلْمُعْتَدَّۃُ لَا تُسَافِرُ لَا لِلْحَجِّ وَلَا لِغَیْرِہٖ"۔

ترجمہ:"مُعْتَدَّہ (عدت کے دنوں میں) کوئی سفر نہیں کرسکتی ،نہ حج کے لیے اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لیے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:535)"۔

پس عدت گزارنے والی تبلیغ یا دینی تعلیم کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں جاسکتی، کیونکہ جب حج کے لیے نہیں جاسکتی جو اللہ تعالیٰ کا فریضہ ہے،تو کسی اور مستحب یا مباح امر کے لیے جواز کیسے ثابت ہوسکتا ہے۔البتہ اگر وہ اپنے گھر کے اندر چھوٹے بچوں یا بڑی لڑکیوں کو بھی قرآن کریم اور دین کی تعلیم دینا چاہے،تو وہ ایسا کرسکتی ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکمِ عدت کی تعمیل میں مانع نہیں ہے۔اسی طرح کسی قریبی عزیز کی موت واقع ہونے کی صورت میں تعزیت کے لیے بھی نہیں جاسکتیں، کیونکہ تعزیت مسنون ہے، جبکہ عدت واجب ہے۔

کتابتِ طلاق کا حکم

سوال:

زبانی طلاق اور لکھی ہوئی طلاق کے نفوذ میں شرعاً کیا فرق ہے، (قاری محمد افضل ہاشمی، کوٹ ادو)۔

جواب:

اپنی اصل کے اعتبار سے طلاق کا انشاء (Pronouncement) زبان سے ہوتا ہے۔ضرورت کی بناء پر تحریر کو زبانی طلاق کے قائم مقام مانا گیا ہے، لیکن موجودہ دور میں بعض صورتوں میں تحریر کا اعتبار زبانی بیان سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور عدالتوں میں زبانی بیان اور شہادتوں کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔قرآنِ مجید میں بعض احکام کی فرضیت کے لیے بھی کتابت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جیسے: ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ''، ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی''، ''کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ'' وغیرُھا من الآیات۔مستقبل کے تنازعات سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرض کے لین دین کے معاملات کو بھی ضبطِ تحریر میں لانے اور اُس پر گواہ قائم کرنے کا استحبابی حکم فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے دعوتی اور سفارتی خطوط سب تحریری صورت میں تھے۔صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاہدہ لکھنے کا حکم فرمایا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر شریعت کی نظر میں بھی ایک معتبر چیز ہے اور اُس کی اہمیت ہے۔آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی مبارک انگوٹھی پر آپ کی مُہر تھی، جسے آپ تحریری دستاویزات پر ثبت فرماتے تھے۔

ہمارے متقدمین فقہائے کرام نے قرار دیا کہ جب کوئی شخص کسی کاتب سے کہے: ''میری بیوی کو طلاق لکھ دو'' اور اُس نے لکھ دی یا وہ خود لکھ کر طلاق دے دے، تو طلاق واقع ہوجائے گی۔فقہائے کرام کی عبارات درج ذیل ہیں:

ردالمحتار علی الدرالمختار میں ہے:

''وَلَوْ قَالَ لِلْکَاتِبِ: اُکْتُبْ طَلَاقَ اِمْرَأَتِی کَانَ إِقْرَارًا بِالطَّلَاقِ وَإِنْ لَمْ یَکْتُبْ، وَلَوْ اسْتَکْتَبَ مِنْ آخَرَ کِتَابًا بِطَلَاقِهَا وَقَرَأَهُ عَلَی الزَّوْجِ فَأَخَذَهُ الزَّوْجُ وَخَتَمَهُ وَعَنْوَنَهُ وَبَعَثَ بِهِ إِلَیْهَا فَأَتَاهَا، وَقَعَ إِنْ أَقَرَّ الزَّوْجُ أَنَّهُ کِتَابُهُ أَوْ قَالَ لِلرَّجُلِ ابْعَثْ بِهِ إِلَیْهَا، أَوْ قَالَ لَهُ اُکْتُبْ نُسْخَةً وَابْعَثْ بِهَا إِلَیْهَا، وَإِنْ لَمْ یُقِرَّ أَنَّهُ کِتَابُهُ وَلَمْ تَقُمْ بَیِّنَةٌ لٰکِنَّهُ وَصَفَ الْأَمْرَ عَلَی وَجْهِهِ لَا تُطَلَّقُ قَضَاءً وَلَا دِیَانَةً، وَکَذَا کُلُّ کِتَابٍ لَمْ یَکْتُبْهُ بِخَطِّهِ وَلَمْ

لِهٖ بِنَفْسِهٖ لَا یَقَعُ الطَّلَاقُ، مَالَمْ یُقِرَّ اَنَّهٗ کِتَابُهٗ"۔

ترجمہ: "اور اگر کاتب سے کہا: "میری بیوی کو طلاق لکھ دو"، تو یہ اقرارِ طلاق ہے، اگرچہ کاتب نہ لکھے اور کسی اور سے بیوی کے نام طلاق نامہ لکھوایا، کاتب نے شوہر کو پڑھ کر سنایا اور شوہر اس کو لے لے اور اس پر مہر لگا کر اور پتا لکھ کر اسے بیوی کی طرف بھیجے اور بیوی کو مل جائے، اگر شوہر اقرار کرتا ہے کہ یہ اس کا خط ہے، تو طلاق واقع ہوگئی یا کسی شخص سے کہا کہ یہ خط میری بیوی کو بھیج دو یا اس سے کہے کہ اس کی نقل کر کے اُسے بھیج دو اور اگر وہ اسے اپنا خط ماننے سے انکار کرتا ہے اور اس پر گواہ بھی نہیں ہیں، لیکن وہ معاملے کو اپنے طریقے سے بیان کرتا ہے، تو طلاق واقع نہ ہوگی نہ قضاءً نہ دیانۃً اور اسی طرح (طلاق نامے کی) ہر وہ تحریر جو اس نے نہ خود لکھی ہو اور نہ دوسرے کو لکھوائی ہو، تو جب تک وہ اسے اپنی تحریر ماننے کا اقرار نہیں کرتا، طلاق واقع نہیں ہوگی، (ردالمحتار، ج:4،ص:337)"۔

علامہ حسن بن منصور اوزجندی متوفّٰی 592ھ، لکھتے ہیں:

"اَلْکِتَابَةُ عَلٰی نَوعَیْنِ: مَرْسُوْمَةٌ وَغَیْرُ مَرْسُوْمَةٍ، وَنَعْنِیْ بِالْمَرْسُوْمَةِ اَنْ یَّکُوْنَ مُصَدَّراً وَمُعَنْوَنًا، مِثْلَ مَایُکْتَبُ اِلَی الْغَائِبِ، وَغَیْرُالْمَرْسُوْمَةِ لَا یَکُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، وَهُوَ عَلٰی وَجْهَیْنِ مُسْتَبِیْنَةٌ وَغَیْرُ مُسْتَبِیْنَةٍ، فَالْمُسْتَبِیْنَةُ مَایُکْتَبُ عَلَی الصَّحِیْفَةِ وَالْحَائِطِ وَالْاَرْضِ عَلٰی وَجْهٍ یُمْکِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَائَتُهٗ وَغَیْرُ الْمُسْتَبِیْنَةِ مَا یُکْتَبُ عَلَی الْهَوَاءِ وَالْمَاءِ وَشَیْئٍ لَا یُمْکِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَائَتُهٗ، فَفِیْ غَیْرِ الْمُسْتَبِیْنَةِ لَا یَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰی، وَاِنْ کَانَتْ مُسْتَبِیْنَةً لٰکِنَّهَا غَیْرُ مَرْسُوْمَةٍ، اِنْ نَوَی الطَّلَاقَ یَقَعُ وَاِلَّا فَلَا، وَاِنْ کَانَتْ مَرْسُوْمَةً یَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوٰی اَوْ لَمْ یَنْوِ، ثُمَّ الْمَرْسُوْمَةُ لَا تَخْلُوْ، اِمَّا اِنْ اَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِاَنْ کَتَبَ "اَمَّا بَعْدُ فَاَنْتِ طَالِقٌ"، فَلَمَّا کَتَبَ هٰذَا یَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُهَا الْعِدَّةُ مِنْ وَّقْتِ الْکِتَابَةِ، وَاِنْ عَلَّقَ طَلَاقَهَا بِمَجِیْئِ الْکِتَابِ، بِاَنْ کَتَبَ: "اِذَا جَاءَكِ کِتَابُ هٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ"، فَجَاءَهَا الْکِتَابُ فَقَرَأَتْهُ اَوْ لَمْ تَقْرَأْ یَقَعُ الطَّلَاقُ، کَذَا فِی الْخُلَاصَةِ رَجُلٌ اُکْرِهَ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ عَلٰی اَنْ یَّکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِهٖ فُلَانَةِ بِنْتِ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، فَکَتَبَ

اِمْرَأَتُہٗ فُلَانَۃُ بِنْتُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ طَالِقٌ، لَا تُطْلَقُ اِمْرَأَتُہٗ لِاَنَّ الْکِتَابَۃَ اُقِیْمَتْ مَقَامَ الْعِبَارَۃِ بِاِعْتِبَارِ الْحَاجَۃِ وَلَا حَاجَۃَ ھٰھُنَا''۔

ترجمہ: ''تحریری طلاق کی دو قسمیں ہیں: مرسومہ اور غیر مرسومہ۔ مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ با قاعدہ مکتوب الیہ کے نام اور پتے کے ساتھ شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کو خط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: اِلٰی فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ اور اردو میں لکھتے ہیں: بنامِ فلاں یا فلاں کے نام، یعنی فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔ غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر با قاعدہ اُسے مخاطَب نہ کیا جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اور نظر آنے والا وہ ہے جسے کاغذ یا دیوار یا زمین پر اس طرح لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو اور غیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوا یا پانی یا کسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے) پر لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن نہ ہو، تو غیر واضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔ اور اگر تحریر تو واضح ہے لیکن مکتوب الیہ کو نام کے ساتھ مخاطَب کر کے نہیں لکھی گئی، تو اگر لکھنے والے نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطَب کر کے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہو جائے گی۔ پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطَب کر کے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔ (۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطَب کر کے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب اُس کی بیوی کو تحریر ملے گی، طلاق واقع ہوگی خواہ اس کی بیوی نے وہ تحریر پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو (یعنی تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت

بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''،''خلاصۃ الفتاویٰ''میں اسی طرح ہے۔۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: اور آدمی کو مار اور قید کے ذریعے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی فلانہ بنت فلان بن فلاں کو طلاق لکھ کر دے دے، پس اس نے اپنی بیوی کو لکھا: فلانہ بنت فلاں بن فلاں کو طلاق ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر ضرورت کی بنا پر الفاظ کے قائم مقام قرار پاتی ہے اور یہاں کوئی حاجت نہیں ہے، (قاضی خان، ج:1،ص:233)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن عابدین شامی نے بھی علامہ قاضی خان ہی کی عبارت کو نقل کیا ہے اور بعینہٖ ایسا ہی بیان کیا ہے۔

اس طرح طلاق نامے کی دو قسمیں ہوئیں: (۱) مستبینہ مرسومہ طلاق نامہ (۲) مستبینہ غیر مرسومہ طلاق نامہ۔

مستبینہ مرسومہ طلاق نامہ: وہ طلاق نامہ جس میں طلاق کا عنوان اور تمہید یعنی طلاق دینے کی وجہ، الفاظِ طلاق اور شوہر کے دستخط بھی موجود ہوں، جیسا کہ فی زمانہ اسٹام پیپر والا قانونی طلاق نامہ ہوتا ہے۔اس طرح کے طلاق نامے سے بغیر نیت کے بھی قضاءً طلاق واقع ہوجائے گی۔بغیر اسٹام پیپر کے طلاق نامہ کو موجودہ دور میں مکمل طلاق نامہ نہیں سمجھا جاتا، سادہ کاغذ پر طلاق نامہ تحریر کرے تو اسٹام پیپر پر لکھ کر دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔لہٰذا سادہ کاغذ پر لکھا گیا طلاق نامہ غیر مرسومہ (رواج کے خلاف) طلاق نامہ قرار پائے گا۔

مستبینہ غیر مرسومہ طلاق نامہ: وہ طلاق نامہ جو طلاق کے عنوان، سببِ طلاق کے بیان، شوہر کے دستخط کے بغیر ہو یا موجودہ دور میں سادہ کاغذ پر ہو یا ان میں سے کسی بھی ایک چیز کے بغیر ہو۔اس طرح کے طلاق نامے کے سبب طلاق کا حکم اس وقت دیا جائے گا کہ جب شوہر اس تحریر سے طلاق کی نیت کا اظہار کردے کہ میں نے یہ تحریر طلاق دینے ہی کے لیے لکھی تھی یا اس کی نیت کے موجود ہونے پر دو معتبر شخص گواہی دیں کہ اس نے ہمارے سامنے اقرار کیا تھا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے طلاق تحریر کررہا ہوں۔

علامہ ابوالولید لسان الدین ابن الشحنہ الحلبی المتوفی 882ھ، لکھتے ہیں:

''وَذَكَرَ مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى فِيْ ''كِتَابِ الطَّلَاقِ'': وَلَوْ كَتَبَ الطَّلَاقَ عَلَى الرَّسْمِ فِيْ مِثْلِهِ ثُمَّ قَالَ لَمْ أَنْوِبِهِ الطَّلَاقَ، لَا يُصَدَّقُ، فَكَذَا الْإِقْرَارُ''۔

ترجمہ: ''اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الطلاق میں ذکر کیا ہے: کوئی شخص (اپنی بیوی کا) نام اور پتا لکھ کر تحریری طلاق دے اور پھر کہے: میری نیت طلاق کی نہیں تھی، تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور اقرار کا حکم بھی یہی ہے، (لسان الحکام، ج:1، ص:237)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم المصری المتوفّٰی 970ھ، لکھتے ہیں:

''وَإِنَّمَا ذَكَرَ إِشَارَتَهُ دُوْنَ كِتَابَتِهِ لِمَا أَنَّهَا لَا تَخْتَصُّ بِهِ ،لِأَنَّ غَيْرَ الْأَخْرَسِ يَقَعُ طَلَاقُهُ بِكِتَابَتِهِ إِذَا كَانَ مُسْتَبِيْنًا، لَا مَا لَا يَسْتَبِيْنُ ،فَإِنْ كَانَ عَلٰى وَجْهِ الرَّسْمِ لَا يَحْتَاجُ إِلَى النِّيَّةِ وَلَا يُصَدَّقُ فِي الْقَضَاءِ أَنَّهُ عَنٰى تَجْرِبَةَ الْخَطِّ وَرَسْمُهَا أَنْ يُكْتَبَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَمَّا بَعْدُ إِذَا وَصَلَ إِلَيْكِ كِتَابِيْ فَأَنْتِ طَالِقٌ فَإِنْ كَانَ مُعَلَّقًا بِالْإِتْيَانِ إِلَيْهَا، لَا يَقَعُ إِلَّا بِهِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مُعَلَّقًا، وَقَعَ عَقِيْبَ الْكِتَابَةِ''۔

ترجمہ: ''اور تحریر کی بجائے گونگے کے اشارے کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ گونگے کے ساتھ خاص نہیں ہے، کیوں کہ صحت مند آدمی کی واضح تحریری طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے اور غیر واضح تحریری طلاق واقع نہیں ہوتی، تو نام اور عنوان کے ساتھ تحریر کی صورت میں نیت کی حاجت نہیں ہے اور طلاق دینے والے کی اس بات کی کہ وہ لکھنے کا تجربہ کر رہا تھا، تصدیق نہیں کی جائے گی اور مرسومہ یہ ہے کہ لکھے: ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَمَّا بَعْد! جب تجھے میرا یہ خط ملے تو تجھے طلاق ہے، تو اگر خط بیوی کو ملنے کے ساتھ معلّق ہے تو خط ملے بغیر واقع نہیں ہوگی اور اگر ملنے پر معلّق نہ ہو تو لکھنے کے بعد واقع ہوجائے گی، (البحر الرائق، ج:3، ص:267)''۔

علامہ سراج الدین عمر بن ابراہیم بن نجیم حنفی متوفّٰی 1005، لکھتے ہیں:

''وَقَالُوْا: لَوْ كَتَبَ الطَّلَاقَ أَوِ الْعِتَاقَ مُسْتَبِيْنًا لٰكِنْ لَا عَلٰى وَجْهِ الرِّسَالَةِ وَالْخِطَابِ يَنْوِيْ فِيْهِ الْكَلَامَ فَإِنْ كَانَ كَقَوْلِهٖ أَمَّا بَعْدُ يَا فُلَانَةُ فَأَنْتِ طَالِقٌ أَوْ أَنْتِ حُرَّةٌ أَوْ إِذَا

وَصَلَ إِلَيْكِ كِتَابِيْ فَأَنْتِ كَذَا فَإِنَّهٗ يَقَعُ مُنْجِزًا عَقِبَ الْكِتَابَةِ إِذَا لَمْ يَقُلْهُ وَلَا يُصَدَّقُ فِيْ عَدَمِ النِّيَّةِ، وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ''۔

ترجمہ:''اور علماء نے کہا ہے: اگر طلاق اور عتاق واضح طور پر لکھے جائیں لیکن پیغام یا خطاب کی شکل میں نہ ہو جس سے کلام کی نیت کی جائے، پس اگر اس طرح کہے:''اَمَّا بَعْدُ! اے فلانی! تم کو طلاق ہے یا تم آزاد ہو یا جب تمہیں میرا خط پہنچے تو تجھے طلاق ہے''، تو یہ لکھنے کے فوراً بعد طلاق واقع ہوجائے گی، اگرچہ زبان سے نہ کہا ہو، اور اس کی اس بات کی تصدیق نہیں کی جائے گی کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی، (النہر الفائق، ج:2،ص:361)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''كُتِبَ الطَّلَاقُ، وَإِنْ مُسْتَبِيْنًا عَلٰى نَحْوِ لَوْحٍ وَقَعَ إِنْ نَوٰى، وَقِيْلَ مُطْلَقًا، وَلَوْ عَلٰى نَحْوِ الْمَاءِ فَلَا مُطْلَقًا. وَلَوْ كُتِبَ عَلٰى وَجْهِ الرِّسَالَةِ وَالْخِطَابِ، كَأَنْ يَكْتُبُ يَا فُلَانَةُ: إِذَا أَتَاكِ كِتَابِيْ هٰذَا فَأَنْتِ طَالِقٌ طُلِّقَتْ بِوُصُوْلِ الْكِتَابِ''۔

ترجمہ:''واضح طور پر طلاق لکھی گئی جیسے تختی پر تو اگر طلاق کی نیت تھی تو واقع ہوجائے گی، اور بعض نے کہا ہے: مطلقاً طلاق واقع ہوجائے گی یعنی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا اور اگر اس نے پانی پر لکھا تو مطلقاً واقع نہیں ہوگی، یعنی نیت کرے یا نہ کرے دونوں صورتوں میں طلاق واقع نہیں ہوگی اور اگر پیغام یا خطاب کی شکل میں لکھا ہے جیسے وہ لکھے:''اے فلانی! تمہارے پاس جب بھی میرا یہ خط پہنچے تو تجھے طلاق ہے'' تو خط وصول ہوتے ہی اسے طلاق واقع ہوجائے گی، (تنویر الابصار مع الدر المختار، ج:4،ص:336)''۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفّٰی 861ھ، لکھتے ہیں:

''وَلَوْ كَتَبَ الصَّحِيْحُ إِلَى امْرَأَتِهٖ بِطَلَاقِهَا ثُمَّ أَنْكَرَ الْكِتَابَ وَقَامَتْ عَلَيْهِ الْبَيِّنَةُ أَنَّهٗ كَتَبَهٗ بِيَدِهٖ فُرِّقَ بَيْنَهُمَا فِي الْقَضَاءِ، أَمَّا فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى إِنْ كَانَ لَمْ يَنْوِ بِهِ الطَّلَاقَ فَهِيَ امْرَأَتُهٗ، وَلَوْ كَتَبَ إِلَيْهَا أَمَّا بَعْدُ أَنْتِ طَالِقٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى، إِنْ كَانَ مَوْصُوْلًا بِكِتَابَتِهٖ لَا تُطَلَّقُ، وَإِنْ كَتَبَ الطَّلَاقَ ثُمَّ فَتَرَ فَتْرَةً ثُمَّ كَتَبَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ يَقَعُ

الطَّلَاقُ لِأَنَّ الْمَكْتُوبَ إِلَى الْغَائِبِ كَالْمَلْفُوظِ، كَذَا فِي الْفَتَاوٰى الْكُبْرٰى لِلْخَاصِي وَالْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ:''اور اگر بولنے پر قدرت رکھنے والا شخص اپنی بیوی کو لکھ کر طلاق دے دے اور پھر خط کا انکار کرے اور اُس پر گواہ پیش ہوں کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، تو اُن کے درمیان قضاء یعنی قاضی کی عدالت میں تفریق کا فیصلہ کیا جائے گا، اور اگر اُس شخص کی نیت طلاق کی نہیں تھی، تو وہ عورت عند اللہ اس کی بیوی رہے گی۔ اگر بیوی کو لکھا:''اما بعد! تجھے طلاق ہے ان شاء اللہ''، تو اگر یہ اس کے طلاق کے لکھے ہوئے الفاظ سے پیوستہ ہے تو واقع نہیں ہوگی اور اگر طلاق کے الفاظ لکھے، پھر کچھ دیر توقف کیا، پھر لکھا ان شاء اللہ، تو طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ غائب کو لکھا ہوا خط حاضر کی زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ کی طرح ہے، (فتح القدیر، ج:4،ص:68)''۔

تبیین الحقائق میں امام فخر الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''ثُمَّ الْكِتَابُ عَلٰى ثَلَاثِ مَرَاتِبَ مُسْتَبِيْنٌ مَرْسُوْمٌ وَهُوَ اَنْ يَّكُوْنَ مُعَنْوَنًا اَیْ مُصَدَّرًا بِالْعُنْوَانِ، وَهُوَ اَنْ يَّكْتُبَ فِیْ صَدْرِهٖ مِنْ فُلَانٍ اِلٰی فُلَانٍ عَلٰی مَاجَرَتْ بِهِ الْعَادَةُ فِیْ تَسْيِيْرِ الْكِتَابِ فَهٰذَا كَالنُّطْقِ فَلَزِمَ حُجَّةً۔ وَمُسْتَبِيْنٌ غَيْرُ مَرْسُوْمٍ كَالْكِتَابَةِ عَلَى الْجُدْرَانِ وَاَوْرَاقِ الْاَشْجَارِ اَوْ عَلَى الْكَاغَذِ لَا عَلٰى وَجْهِ الرَّسْمِ فَاِنَّ هٰذَا يَكُوْنُ لَغْوًا لِاَنَّهٗ لَا عُرْفَ فِیْ اِظْهَارِ الْاَمْرِ بِهٰذَا الطَّرِيْقِ فَلَا يَكُوْنُ حُجَّةً اِلَّا بِاِنْضِمَامِ شَيْءٍ آخَرَ اِلَيْهِ كَالنِّيَّةِ وَالْاِشْهَادِ عَلَيْهِ وَالْاِمْلَاءِ عَلَى الْغَيْرِ حَتّٰى يَكْتُبَهٗ لِاَنَّ الْكِتَابَةَ قَدْ تَكُوْنُ لِلتَّجْرِبَةِ وَقَدْ تَكُوْنُ لِلتَّحْقِيْقِ وَبِهٰذِهِ الْاَشْيَاءِ تَتَعَيَّنُ الْجِهَةُ وَقِيْلَ الْاِمْلَاءُ مِنْ غَيْرِ اِشْهَادٍ لَا يَكُوْنُ حُجَّةً وَالْاَوَّلُ اَظْهَرُ۔ وَغَيْرُ مُسْتَبِيْنٍ كَالْكِتَابَةِ عَلَى الْهَوَاءِ اَوِ الْمَاءِ وَهُوَ بِمَنْزِلَةِ كَلَامٍ غَيْرِ مَسْمُوْعٍ وَلَا يَثْبُتُ بِهٖ شَيْءٌ مِنَ الْاَحْكَامِ وَاِنْ نَوٰی''۔

ترجمہ:''تحریر کی تین اقسام ہیں: (پہلی قسم) مستبینہ مرسومہ: یہ وہ تحریر ہے جس کے شروع میں عنوان ہو اور شروع میں اس طرح لکھے کہ فلاں سے فلاں کی طرف جس طرح عادتاً خط

ارسال کیا جاتا ہے تو یہ زبان سے بولنے کی طرح ہے اور یہ تحریر ضرور حجت ہے۔ (دوسری قسم:) مستبینہ غیر مرسومہ: جیسے دیواروں پر لکھنا اور درختوں کے پتوں پر لکھنا یا کاغذ پر رواج کے خلاف لکھنا، بے شک یہ تحریر لغو ہے کیونکہ اس طریقے سے کسی امر کے اظہار کا ہمارے ہاں عرف نہیں۔ پس یہ تحریر حجت بھی نہیں ہوگی مگر جب اس کے ساتھ کوئی دوسری چیز ملی ہوئی ہو، جیسا کہ طلاق کی نیت کرنا یا اس تحریر پر گواہ بنانا اور کسی دوسرے سے بول کر لکھوانا حتیٰ کہ وہ لکھ دے، کیونکہ تحریر کبھی تجربہ کے لیے ہوتی ہے اور کبھی تحقیق کے لیے، ان مذکورہ چیزوں کے ساتھ اس کی جہت متعین ہو جائے گی۔ اور بعض نے کہا کہ املاء کروانا گواہوں کے بغیر ہو تو وہ حجت نہیں اور پہلا قول زیادہ واضح ہے۔ اور (تیسری قسم) غیر مستبینہ جیسا کہ ہوا یا پانی پر لکھنا اور یہ اس کلام کی طرح ہے جو اتنا آہستہ ہو کہ سنا نہ جا سکے (جس طرح دل میں کہی ہوئی بات) اس سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اگرچہ اس نے نیت بھی کی ہو۔ (تبیین الحقائق، مسائل شتیٰ بحث کتابۃ الاخرس، ج:6،ص:218، مکتبہ امدادیہ ملتان) اور اسی طرح (غمز العیون البصائر المعروف شرح حموی، الفن الثالث، ج:3،ص:123، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی) میں بھی منقول ہے۔

حاشیہ شلبی میں تبیین الحقائق کی مذکورہ عبارت کے تحت شیخ شلبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَوْلُهٗ (مَرْسُوْمٌ) اَلْمَقْصُوْدُ مِنَ الْمَرْسُوْمِ اَنْ يَّكُوْنَ عَلَى الْوَجْهِ الْمُعْتَادِ فِیْ اِظْهَارِ الْاَمْرِ عُرْفًا كَالْكُتُبِ الْمَعْنَوِيَّةِ اَوِ الْمَحَاضِرِ وَالسِّجِلَّاتِ وَالْقِصَصِ وَنَحْوِهَا، انتهى۔ قَوْلُهٗ (وَمُسْتَبِيْنٌ غَيْرُ مَرْسُوْمٍ) وَهُوَ كِنَايَةٌ فَيَحْتَاجُ اِلَى النِّيَّةِ ، انتهى۔ قَوْلُهٗ (لَا عَلٰى وَجْهِ الرَّسْمِ) اَیْ لَا عَلٰى وَجْهِ الْمُعْتَادِ فِیْ اِثْبَاتِ الْمَقَاصِدِ كَمَا يُكْتَبُ عَلَى الْكَاغَذِ لِتَجْرِبَةِ الْمَدَادِ اَوِ الْقَلَمِ اَوِ الْخَطِّ وَنَحْوِهَا، اِنْتَهٰى ۔ قَوْلُهٗ (كَالنِّيَّةِ) فَاِنْ كَانَ صَحِيْحًا يُبَيِّنُ نِيَّتَهٗ بِلِسَانِهٖ وَاِنْ كَانَ اَخْرَسَ يُبَيِّنُ نِيَّتَهٗ بِالْكِتَابَةِ ، كَذَا فِی الْمَبْسُوْطِ ، انتهىٰ"۔

ترجمہ: "(مرسوم) سے مقصود یہ ہے کہ وہ لوگوں کی عادت کے مطابق ہو جس طرح عرف میں کسی امر کے اظہار کے لیے تحریر لکھی جاتی ہے، جیسا کہ عنوان والے خطوط یا سرکاری

دستاویزات اور معاہدات اور رجسٹر اور قصے اور اس طرح کی دیگر تحریریں۔ اور صاحبِ تبیین کا قول (و مستبین غیر مرسوم) اس کا حکم کنایہ طلاق والا ہے، لہٰذا اس میں نیت کی احتیاج ہوگی اور ان کا یہ قول (لا علی وجہ الرسم) یعنی مقاصد کو ثابت کرنے کے لوگوں کی عادت اور معروف طریقے پر نہ ہو۔ جیسا کہ کاغذ پر روشنائی چیک کرنے کے لیے یا قلم یا خط چیک کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ تبیین کا قول (کَالنِّیَّةِ) اگر لکھنے والا صحیح ہو تو زبان سے اپنی نیت بتادے گا اور اگر گونگا ہو تو لکھ کر اپنی نیت بتادے گا، اسی طرح مبسوط میں ہے۔ (حاشیہ شلبی علی تبیین الحقائق، مسائل شتیٰ بحث کتابۃ الاخرس، ج:6، ص:218، مکتبہ امدادیہ ملتان)، (المبسوط للسرخسی، باب طلاق الاخرس، ج:6، ص:166، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''وَعِبَارَۃُ الْمَالِکِیَّةِ: مَنْ کَتَبَ الطَّلَاقَ عَازِمًا عَلَیْهِ، لَزِمَهٗ إِذَا لَمْ یَکُنْ مُتَرَدِّدًا فِیْهِ، فَإِنْ کَتَبَ الطَّلَاقَ عَازِمًا عَلَیْهِ أَوْ لَمْ یَکُنْ لَهٗ نِیَّةٌ، لَزِمَهٗ بِمُجَرَّدِ کِتَابَةِ (طَالِق) وَإِنْ لَمْ یَکُنْ عَازِمًا الطَّلَاقِ حَالَ الْکِتَابَةِ، بَلْ کَانَ مُتَرَدِّدًا أَوْ مُسْتَشِیْرًا، فَلَا یَقَعُ مَا لَمْ یَخْرُجِ الْکِتَابَ مِنْ یَدِهٖ، وَیُعْطِیْهِ لِمَنْ یُوْصِلُهٗ، فَیَصِلُ إِلَیْهَا أَوْ لِوَلِیِّهَا، فَإِنْ أَخْرَجَهٗ مِنْ یَدِهٖ عَازِمًا الطَّلَاقِ، فَیَقَعُ بِمُجَرَّدِ إِنْفَاذِهٖ، وَلَوْ لَمْ یَصِلْ۔۔۔ وَالْخُلَاصَةُ أَنَّ الْعِبْرَۃَ عِنْدَهُمْ فِیْ کِتَابِ الطَّلَاقِ النِّیَّةَ۔۔۔ وَقَالَ الشَّافِعِیَّةُ مِثْلُ الْمَالِکِیَّةِ: إِذَا کَتَبَ رَجُلٌ طَلَاقَ اِمْرَأَتِهٖ بِلَفْظٍ صَرِیْحٍ وَلَمْ یَنْوِهٖ، فَهُوَ لَغْوٌ لَمْ یَقَعْ بِهِ الطَّلَاقُ، لِأَنَّهٗ الْکِتَابَةُ تَحْتَمِلُ إِیْقَاعَ الطَّلَاقِ وَتَحْتَمِلُ اِمْتِحَانَ الْخَطِّ، فَلَمْ یَقَعِ الطَّلَاقُ بِمُجَرَّدِهَا۔ وَإِنْ نَوَی الطَّلَاقَ فَالْأَظْهَرُ وُقُوْعُهٗ، وَلَا یَقَعُ الطَّلَاقُ بِالْکِتَابَةِ إِلَّا فِیْ حَقِّ الْغَائِبِ۔۔۔ وَکَذٰلِکَ قَالَ الْحَنَابِلَةُ مِثْلُ الشَّافِعِیَّةِ وَالْمَالِکِیَّةِ۔۔۔ وَإِنْ کَتَبَ الطَّلَاقَ مِنْ غَیْرِ نِیَّةٍ، قِیْلَ: یَقَعُ، وَقِیْلَ: لَا یَقَعُ إِلَّا بِنِیَّةٍ، وَهُوَ الظَّاهِرُ۔۔۔ وَالْخُلَاصَةُ: یَقَعُ الطَّلَاقُ عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ بِالْکِتَابَةِ مَعَ النِّیَّةِ، وَیَقَعُ عِنْدَ الْحَنَفِیَّةِ فِی الْکِتَابَةِ الْمَرْسُوْمَةِ کَالصَّرِیْحِ، وَفِیْ غَیْرِ الْمَرْسُوْمَةِ کَالْکِنَایَةِ تَحْتَاجُ إِلٰی نِیَّةٍ وَلَا یَقَعُ الطَّلَاقُ بِالْکِتَابَةِ عَلَی الْمَاءِ أَوِ الْهَوَاءِ

وَنَحْوِہٖ بِالِاتِّفَاقِ۔ وَمَنْ طَلَّقَ فِیْ قَلْبِہٖ لَمْ یَقَعْ، وَاِنْ تَلَفَّظَ بِہٖ اَوْ حَرَّکَ لِسَانَہٗ، وَقَعَ وَلَوْ لَمْ یَسْمَعْہُ''۔

ترجمہ:''اور مالکیہ کی عبارت یہ ہے:''جو طلاق کے ارادے سے بغیر کسی ترڈُد کے الفاظِ طلاق لکھ دے، تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر طلاق کے ارادے سے لکھے یا طلاق کی نیت نہیں تھی تو طلاق دینے والے کے محض لکھنے سے لازم ہوجائے گی اور اگر لکھتے وقت طلاق کا ارادہ نہیں تھا بلکہ اسے ترڈُد تھا یا کسی سے مشورہ لے رہا تھا تو جب تک خط اُس کے پاس ہے، طلاق واقع نہیں ہوگی اور کسی کو پہنچانے کے لیے دیا اور بیوی کو یا اس کے ولی کو ملا، پس اگر اس نے طلاق کے ارادے سے بھجوایا ہے تو محض بھجوانے سے بیوی کو خط ملے بغیر طلاق واقع ہوجائے گی''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:''اور خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہ کے نزدیک تحریری طلاق میں نیت کا اعتبار ہے۔۔۔اور شافعیہ نے مالکیہ کی طرح کہا ہے کہ جب کوئی صریح لفظ کے ساتھ بیوی کو طلاق دے اور اُس کی نیت طلاق کی نہ ہو تو یہ لغو ہے اور اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ تحریر میں وقوعِ طلاق اور لکھنے کی مشق دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے، تو نیت کے بغیر محض تحریر سے طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر طلاق کی نیت کی تھی تو قولِ اظہر کے مطابق طلاق واقع ہوجائے گی اور تحریری طلاق صرف غائب کے حق میں واقع ہوتی ہے''۔۔۔اور حنابلہ بھی شافعیہ اور مالکیہ کی طرح کہتے ہیں۔۔اور اگر بغیر نیت کے تحریری طلاق دی تو بعض نے کہا کہ واقع ہوجائے گی اور بعض نے کہا کہ بغیر نیت کے واقع نہیں ہوگی ،اور یہ قول ظاہر ہے۔۔۔آخر میں لکھتے ہیں:''خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک تحریری طلاق نیت کے ساتھ واقع ہوجاتی ہے اور احناف کے نزدیک جو تحریر نام اور عنوان کے ساتھ ہو، یہ صریح کی طرح ہے اور اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے اور جو تحریر نام اور عنوان کے ساتھ نہ ہو یعنی کسی کو مخاطب کر کے نہ لکھی گئی ہو تو یہ کنایہ کی طرح ہے اور اس میں نیت کے واضح ہونے کی ضرورت ہے اور پانی اور ہوا اور اُس جیسی چیزوں پر طلاق تحریر کرنے سے بالاتفاق طلاق واقع نہیں ہوگی،(الفقہ الاسلامی، ج:9،ص:04-6903)''۔

طلاقِ مرسومہ اور غیر مرسومہ کا یہ فرق عوام کے عرف کی وجہ سے ہے کہ مرسومہ وہ طلاق نامہ ہے جو لوگوں کے عرف وعادت کے مطابق تحریر کیا گیا ہو اور غیر مرسومہ وہ طلاق نامہ ہے جو ان کے عرف وعادت کے موافق نہ ہو۔ لہٰذا غیر مرسومہ میں جب تک نیت یا اس کے قائم مقام اور کوئی چیز نہ ہو تو اس میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ مرسومہ اور غیر مرسومہ کی مذکورہ صورتیں فقہاء نے اپنے ادوار میں پائے جانے والے عرف کے اعتبار سے کی ہیں، جیسا کہ علامہ شلبی رحمۃ اللہ علیہ نے سرکاری دستاویزات کو مرسومہ میں بیان کیا اور ہم نے جو یہ تحریر کیا کہ ''جب تک اسٹامپ پیپر پر طلاق نامہ نہ لکھا جائے، وہ غیر مرسومہ ہے'' یہ درحقیقت فقہاء سابقین کا قولِ ضروری ہی ہے کہ اگر وہ اس دور میں ہوتے اور لوگوں کے موجودہ عرف کو دیکھتے تو وہ بھی یہی کہتے۔

لیکن موجودہ دور میں کسی بھی تحریر پر، چاہے لکھنے والے کے اپنے ہاتھ سے ہو، جب تک خود لکھنے یا لکھانے والے کے دستخط یا نشانِ انگوٹھا یا مُہر نہ ہو، معتبر نہیں مانی جاتی اور ہمارے نظامِ عدل وقانون میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ اُس سے کوئی چیز ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ ہی نفی کی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مکاتیب پر باقاعدہ توثیقی مہر لگائی جاتی تھی، آپ کی مُہر مبارک پر ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ'' لکھا ہوا تھا۔

بعض اوقات کوئی شخص اپنی نافرمان بیوی کو ڈرانے کے لیے بھی طلاق کے الفاظ لکھ دیتا ہے اور اُس کا مقصد عام طور پر اِنشائے طلاق نہیں ہوتا یا کسی سے لکھوا دیتا ہے اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اختلاف کو طے کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو طلاق نامے پر دستخط کر کے اُسے مؤثّر بنا دیا جائے گا۔ آج کل اس حوالے سے بڑے مسائل درپیش ہیں، لہٰذا ہمارے مفتیانِ کرام اور فقیہانِ ملّت کو اپنے عہد کے عُرف اور دستور کا اعتبار اور لحاظ کرنا چاہیے، ہاں اگر کسی شخص نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا لکھوایا ہے اور وہ اقرار کرتا ہے کہ میں نے طلاق دینے کی نیت سے لکھا یا لکھوایا ہے تو اُس کے موثر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

"ثُمَّ قَدْ شَاعَ فِيْ بِلَادِنَا أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُّطَلِّقَ اِمْرَاتَهٗ، دَعَا الصَّكَّاكَ وَأَمَرَهٗ أَنْ يَّكْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِهٖ ثَلَاثًا مَثَلًا، فَيَعِظُهُ النَّاسُ وَيَسْتَنْزِلُوْنَهٗ عَنِ الثَّلَاثِ، فَيَقُوْلُ سَمْعًا "اُكْتُبْ طَلَاقَيْنِ ـــ وَهٰكَذَا، وَكُلُّ ذٰلِكَ دَلِيْلٌ قَاطِعٌ عَلٰى أَنَّهُمْ لَا يَرَوْنَ بِالْأَمْرِ اِلَّا التَّوْكِيْلَ، وَلَا يَفْهَمُوْنَ مِنْهُ الْاِقْرَارَ أَصْلًا، فَوَجَبَ التَّعْوِيْلُ عَلٰى مَا فِيْ "الْقُنْيَةِ وَالْأَشْبَاهِ"، وَهُوَ الْمُصَحَّحُ الْمُفْتٰى بِهٖ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، فَقَدْ وَضَحَ الصَّوَابُ، وَانْكَشَفَ الْحِجَابُ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ"۔

ترجمہ: "پھر ہمارے خطے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے تو وہ وثیقہ نویس کو بلاتا ہے اور اُسے حکم دیتا ہے کہ مثلاً: "میری بیوی کو تین طلاقیں لکھ دو، تو لوگ اُسے سمجھاتے ہیں اور تین طلاق کے ارادے سے نیچے لے آتے ہیں، پس وہ کہتا ہے: ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کی بات مان لیتا ہوں، چلو دو طلاقیں لکھ دو اور اسی طرح بعض صورتوں میں ایک طلاق تک آجاتا ہے" اور یہ پوری صورتِ حال اس بات پر دلیلِ قطعی ہے کہ وہ شوہر کے طلاق لکھنے کے امر کو توکیلِ طلاق سمجھتے ہیں اور وہ قطعاً اِسے اقرار (وانشائے) طلاق نہیں سمجھتے، پس "القنیہ" اور "الاشباہ" میں جو بیان کیا گیا ہے، اس پر اعتماد کرنا لازم ہے اور وہی صحیح مفتیٰ بہٖ قول ہے، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، پس اس مسئلے میں صائب رائے واضح ہوگئی اور مسئلہ کھل کر سامنے آگیا، والحمد للہ العزیز الوھّاب، (جد الممتار علی رد المحتار، ج:5، ص:68، دار الفقیہ)"۔

اس سے مستفاد یہ ہے کہ دستخط کیے بغیر محض طلاق لکھنے یا کسی کو لکھنے کا حکم دینے کو ہر صورت میں ارادہ وانشائے طلاق پر محمول کرنا لازم نہیں ہے۔ ہماری یہ بحث اس صورت پر محمول ہے کہ دستخط کیے بغیر طلاق نامے کی بابت شوہر یہ کہے کہ میری نیت اِنشائے طلاق کی نہیں تھی، تو مفتی کو اُسے تسلیم کرنا چاہیے، ورنہ اگر وہ ارادۂ طلاق کا اقرار کرتا ہے یا مروّجہ طلاق نامے پر دستخط کردیتا ہے، تو پھر یہ ساری بحث غیر متعلق ہوجاتی ہے۔

حاملہ بیوہ کی عدت

سوال:

میرے برادرِ نسبتی کا انتقال ہوگیا ہے، سوم والے دن میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اُن کی بیوہ تقریباً 3 ماہ کی حاملہ ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا اس کی عدت چار ماہ دس دن ہی ہوگی یا شریعت میں اس کا حکم کوئی اور ہے اور آیا عدت میں اس بچی کو اپنی ماں کے گھر یا دوسرے معاملات کے لیے گھر سے باہر جانے کی اجازت ہوگی۔ برائے مہربانی کلام پاک اور احادیث کی روشنی میں مفصل اور مدلل جواب عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی، (عمران احمد، کراچی)۔

جواب:

یہاں لوگوں کو اشتباہ اس لیے ہوتا ہے کہ حاملہ بیوہ کی دو حیثیتیں ہیں: ایک حاملہ ہونا اور دوسری بیوہ ہونا اور اس حوالے سے قرآنِ مجید میں مندرجہ ذیل دو احکام موجود ہیں:

(الف)''وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ''۔

ترجمہ:''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں، تو وہ (بیویاں) اپنے آپ کو (نکاح سے) چار ماہ اور دس دن روکے رکھیں، پھر جب وہ اپنی عدت کو پوری کر لیں، تو وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق جو بھی فیصلہ کریں، (اس میں) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب باخبر ہے، (البقرۃ:234)''۔

اس آیت میں بیوہ کی عدتِ وفات چار ماہ دس دن بیان فرمائی گئی ہے۔

(ب):''وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ''۔

ترجمہ:''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل (بچے کی پیدائش) ہے، (الطلاق:4)''۔ اب اگر عورت حاملہ ہو اور اسے طلاق دے دی گئی ہو، تو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ اس کی

عدت وضعِ حمل ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بیوہ حاملہ ہے اور اس کا شوہر فوت ہوجائے تو اس پر کون سی عدت کا اطلاق ہوگا۔

حدیث پاک میں ہے:

"عن أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، أَنَّ زَيْنَبَ بِنْتَ أَبِي سَلَمَةَ، أَخْبَرَتْهُ عَنْ أُمِّهَا أُمِّ سَلَمَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ امْرَأَةً مِنْ أَسْلَمَ يُقَالُ لَهَا سُبَيْعَةُ، كَانَتْ تَحْتَ زَوْجِهَا، تُوُفِّيَ عَنْهَا وَهِيَ حُبْلَى، فَخَطَبَهَا أَبُو السَّنَابِلِ بْنُ بَعْكَكٍ، فَأَبَتْ أَنْ تَنْكِحَهُ، فَقَالَ: وَاللهِ مَا يَصْلُحُ أَنْ تَنْكِحِيهِ حَتّٰى تَعْتَدِّي آخِرَ الْأَجَلَيْنِ، فَمَكُثَتْ قَرِيبًا مِنْ عَشْرِ لَيَالٍ، ثُمَّ جَاءَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: انْكِحِي"۔

ترجمہ: "حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمان بیان کرتے ہیں: زینب بنت ابوسلمہ کو اُن کی والدہ ماجدہ حضرت ام المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا: بنو اسلم کی سبیعہ نامی ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا اور وہ اس وقت حاملہ تھی، ابوالسنابل بن بعکک نے اُسے نکاح کا پیغام دیا تو اس نے نکاح کرنے سے انکار کردیا۔ ابوالسنابل نے کہا: اللہ کی قسم! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اس سے نکاح کرو حتیٰ کہ تم دو مدتوں میں سے جس کی مدت زیادہ ہے، وہ عدت گزارلو۔ چنانچہ وہ دس راتیں ٹھہری رہیں، پھر وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نکاح کرلو، (صحیح البخاری: 5318)"۔

علامہ علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا عِدَّةُ الْحَبَالِ فَهِيَ مُدَّةُ الْحَمْلِ، وَسَبَبُ وُجُوبِهَا الْفُرْقَةُ أَوِ الْوَفَاةُ، وَالْأَصْلُ فِيهِ قَوْلُهُ تَعَالَى: "وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ. (الطلاق: 4)" أَيْ انْقِضَاءُ أَجَلِهِنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، وَإِذَا كَانَ انْقِضَاءُ أَجَلِهِنَّ بِوَضْعِ حَمْلِهِنَّ كَانَ أَجَلُهُنَّ، لِأَنَّ أَجَلَهُنَّ مُدَّةُ حَمْلِهِنَّ، وَهٰذِهِ الْعِدَّةُ إِنَّمَا تَجِبُ لِئَلَّا يَصِيرَ الزَّوْجُ بِهَا سَاقِيًا مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ، وَشَرْطُ وُجُوبِهَا أَنْ يَكُونَ الْحَمْلُ مِنْ نِكَاحٍ صَحِيحًا كَانَ أَوْ فَاسِدًا، لِأَنَّ الْوَطْءَ فِي النِّكَاحِ الْفَاسِدِ يُوجِبُ الْعِدَّةَ، وَلَا تَجِبُ عَلَى الْحَامِلِ بِالزِّنَا؛ لِأَنَّ الزِّنَا لَا

يُوجِبُ الْعِدَّةَ إِلَّا أَنَّهُ إِذَا تَزَوَّجَ امْرَأَةً، وَهِيَ حَامِلٌ مِنَ الزِّنَا جَازَ النِّكَاحُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَمُحَمَّدٍ لَا يَجُوزُ لَهُ أَنْ يَطَأَهَا مَا لَمْ تَضَعْ لِئَلَّا يَصِيرَ سَاقِيًا مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ.

ترجمہ: ''اور رہی حاملہ کی عدت تو وہ حمل کی مدت ہے اور اس کے وجوب کا سبب جدائی یا وفات ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے'' یعنی ان کے بچے کی پیدائش ہی ان کی عدت کا پورا ہونا ہے اور ان کی عدت کا پورا ہونا ان کا وضع حمل ہے، تو وضع حمل ہی اُن کی عدت ہے، کیونکہ ان کی عدت ان کی حمل کی مدت ہے اور یہ عدت اس لیے واجب ہے تاکہ (دوسرا) شوہر کسی اور کی کھیتی کو پانی دینے والا نہ بنے۔ اس کے وجوب کی شرط یہ ہے کہ حمل نکاح سے ہو، خواہ وہ نکاح صحیح ہو یا فاسد، کیونکہ نکاحِ فاسد کے بعد عورت سے وطی کرلی جائے، تو (بھی) عدت واجب ہوجاتی ہے اور جو عورت زنا سے حاملہ ہو، اس پر عدت واجب نہیں ہوتی، کیونکہ زنا عدت کو واجب نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ کسی نے زنا سے حاملہ عورت سے شادی کی ہو تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس سے نکاح جائز ہے، ناکح کے لیے اس سے وطی کرنا جائز نہیں جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے، تاکہ وہ کسی اور کی کھیتی کو پانی دینے والا نہ بنے، (بدائع الصنائع: جلد:3، ص:281)''۔ البتہ اگر اُسی زانی سے نکاح ہوا ہے تو وہ وطی کرسکتا ہے۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

''(قَوْلُهُ وَلِلْحَامِلِ وَضْعُهُ) أَيْ وَعِدَّةُ الْحَامِلِ وَضْعُ الْحَمْلِ لِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ ''وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، (الطلاق:4)''، أَطْلَقَهَا فَشَمِلَ الْحُرَّةَ وَالْأَمَةَ الْمُسْلِمَةَ وَالْكِتَابِيَّةَ مُطَلَّقَةً أَوْ مُتَارَكَةً فِي النِّكَاحِ الْفَاسِدِ أَوْ وَطْءٍ بِشُبْهَةٍ وَالْمُتَوَفَّىٰ عَنْهَا زَوْجُهَا لِإِطْلَاقِ الْآيَةِ وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مَنْ شَاءَ بَاهَلْتُهُ أَنَّ سُورَةَ النِّسَاءِ الْقُصْرَىٰ نَزَلَتْ بَعْدَ الَّتِي فِي الْبَقَرَةِ يُرِيدُ بِالْقُصْرَىٰ ''يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، (الطلاق:1)'' وَبِالطُّولَىٰ: ''وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ، (البقرة: 234) الْآيَةَ'' وَالْمُبَاهَلَةُ الْمُلَاعَنَةُ، وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ شَاءَ لَاعَنْتُهُ، وَفِي رِوَايَةٍ حَالَفْتُهُ وَكَانُوا إِذَا اخْتَلَفُوا

فِي أَمْرٍ يَقُولُونَ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِ مِنَّا قَالُوا وَهِيَ مَشْرُوعَةٌ فِي زَمَانِنَا كَمَا فِي غَايَةِ الْبَيَانِ وَفَتْحِ الْقَدِيرِ وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لَوْ وَضَعَتْ وَزَوْجُهَا عَلَى سَرِيرِهِ لَانْقَضَتْ عِدَّتُهَا وَيَحِلُّ لَهَا أَنْ تَتَزَوَّجَ وَعَنْ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ تَعْتَدُّ الْحَامِلُ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا بِأَبْعَدِ الْأَجَلَيْنِ يَعْنِي لَا بُدَّ مِنْ وَضْعِ الْحَمْلِ وَمُضِيِّ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔

ترجمہ: علامہ نسفی کا قول: ''اور حاملہ کی عدت بچے کی پیدائش ہے''، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل ہے، (الطلاق:1)''۔قرآنِ کریم نے (حاملہ کی عدت کا) یہ حکم مطلق بیان فرمایا، پس یہ آزاد عورت، باندی، مسلمہ اور کتابیہ سب کو شامل ہے، خواہ ان عورتوں میں سے کوئی مطلّقہ ہو یا ایسی عورت ہو جس سے نکاحِ فاسد یا وطی بالشُّبہ کے بعد علیحدگی اختیار کی گئی ہو اور اس کو بھی جس کا شوہر وفات پا گیا ہو، یہ حکم سب کو شامل ہے، کیونکہ آیت مُطلَق ہے۔اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اس مسئلے پر) جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ چھوٹی سورۃ النساء یعنی سورۃ الطلاق سورۂ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے، یہاں القُصریٰ سے مراد سورۃ الطلاق کی آیت نمبر 4 ہے، جس میں حاملہ عورت کی عدت کو بیان کیا گیا ہے، اس کے مقابل بڑی سورت سے مراد سورۃ البقرہ کی آیت:234 ہے، جس میں (بیوہ کی) عدت کو بیان کیا گیا ہے اور مباہلہ سے مراد مُلاعنہ ہے (یعنی معاملے کے فریقین گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو، اس پر اللہ کی لعنت ہو)، اور ایک روایت کی رُو سے عبداللہ بن مسعود نے کہا: جو چاہے میں اس سے مباہلہ یا مُلاعنہ کرنے کے لیے تیار ہوں اور ایک روایت میں ہے: میں اس پر بھی تیار ہوں کہ میں اور میرے مخالف موقف رکھنے والا آئے، ہم دونوں اپنے اپنے موقف کے حق ہونے کے بارے میں قسم کھالیں اور اس دور میں معمول یہ تھا کہ جب کسی مسئلے میں دو افراد میں اختلاف ہوتا تو ہر ایک کہتا: ہم میں سے جو جھوٹا ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہو، فقہاء نے کہا ہے: مُلاعنہ ہمارے زمانے میں بھی مشروع ہے، جیسا ''غایۃ البیان'' اور ''فتح القدیر'' میں

ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر حاملہ (بیوہ یا مطلقہ عورت) کا بچہ پیدا ہو جائے اور اس کا شوہر انتقال کے بعد جنازہ کی چار پائی پر ہو، تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ نکاح کرے اور حضرت علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم حاملہ بیوہ کی دو عدتوں (عدتِ وضعِ حمل اور عدتِ وفات) میں سے جس کی مدت زیادہ ہو، اسے شمار کرتے تھے، یعنی بچہ بھی پیدا ہو جائے اور چار ماہ اور دس دن (یعنی حاملہ بیوہ والی دونوں عدتیں) گزر جائیں، (البحر الرائق، ج:4،ص:226)''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا تَیَقُّن کے ساتھ یہ بتانا کہ الطلاق :4 میں بیان کردہ حکم البقرہ:234 کے بعد نازل ہوا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حاملہ بیوہ پر وضعِ حمل کی عدت کا اِطلاق ہوگا اور اُس کے حق میں عدتِ وفات منسوخ سمجھی جائے گی، پس حاملہ بیوہ کی عدت، اگر حمل زیادہ عرصے کا ہے، چار ماہ دس دن سے پہلے بھی ختم ہو سکتی ہے اور اگر حاملہ بیوہ کا حمل کم عرصے کا ہے تو عدت چار ماہ دس دن سے طویل بھی ہو سکتی ہے، الغرض یہ وضعِ حمل پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

عِدَّةُ الْحَبَلِ هِيَ مُدَّةُ الْحَمْلِ وَسَبَبُ وُجُوْبِهَا الْفُرْقَةُ أَوِالْوَفَاةُ، حَتّٰى لَا تَخْتَلِطَ الْأَنْسَابُ وَتَشْتَبِهُ الْمِيَاهُ، فَلَا يَسْقِيْ رَجُلٌ مَائَهٗ زَرْعَ غَيْرِهٖ۔

ترجمہ: ''اور حاملہ کی عدت حمل کی مدت ہے اور اس کے وجوب کا سبب جدائی یا (شوہر کی) وفات ہے تاکہ نسب گڈمڈ نہ ہوں اور پانی (یعنی صحتِ نسب) مشتبہ نہ ہو، پس کسی مرد کا پانی (نطفہ) کسی غیر (منکوحہ) کی کھیتی (رحم) کو سیراب نہ کرے، (اَلْفِقْهُ الْاِسْلَامِيُّ وَاَدِلَّتُهٗ: ص:7176)''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''عِدَّةُ الْحَامِلِ تَجِبُ بِسَبَبِ الْمَوْتِ أَوِالطَّلَاقِ، وَتَنْتَهِيْ بِوَضْعِ الْحَمْلِ اِتِّفَاقاً لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: ''وَأُوْلَاتِ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، (الطلاق:4)، أَيْ اِنْقِضَاءُ أَجَلِهِنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، وَلِأَنَّ بَرَاءَةَ الرَّحِمِ لَا تَحْصُلُ فِي الْحَامِلِ، كَمَا هُوَ وَاضِحٌ، إِلَّا بِوَضْعِ الْحَمْلِ، فَإِذَا كَانَتِ الْمَرْأَةُ حَامِلاً، ثُمَّ طُلِّقَتْ أَوْ مَاتَ عَنْهَا زَوْجُهَا اِنْتَهَتْ عِدَّتُهَا

بِوَضْعِ الْحَمْلِ وَلَوْ بَعْدَ الْوَفَاةِ بِزَمَنٍ قَلِيْلٍ بِدَلِيْلِ أَنَّ سُبَيْعَةَ بِنْتَ الْحَارِثِ تُوُفِّيَ عَنْهَا زَوْجُهَا وَهِيَ حُبْلٰى، فَوَضَعَتْ بَعْدَ نَحْوِ عَشْرِ لَيَالٍ مِنْ وَفَاةِ زَوْجِهَا، ثُمَّ جَائَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنْكِحِيْ. وَفِيْ رِوَايَةٍ فَأَفْتَانِيْ بِأَنِّيْ قَدْ حَلَلْتُ حِيْنَ وَضَعْتُ حَمْلِيْ، وَأَمَرَنِيْ بِالتَّزْوِيْجِ إِنْ بَدَا لِيْ، وَعَلٰى هٰذَا تَكُوْنُ عِدَّةُ الْحَامِلِ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا بِوَضْعِ الْحَمْلِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: ''وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، (الطلاق:4) ،قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ مَنْ شَاءَ بَاهَلْتُهٗ، لَاعَنْتُهٗ، أَنَّ سُوْرَةَ النِّسَآءِ الْقُصْرٰى نَزَلَتْ بَعْدَ الْاٰيَةِ الَّتِيْ فِيْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ) وَفِيْ رِوَايَةِ الْبَزَّارِ مَنْ شَاءَ حَالَفْتُهٗ أَنَّ ''وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ،(الطلاق:4)، نَزَلَتْ بَعْدَ اٰيَةِ الْمُتَوَفّٰى، فَإِذَا وَضَعَتِ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا حَمْلُهَا، فَقَدْ حَلَّتْ، وَقَرَأَ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا، (البقرة:234)''۔

ترجمہ: ''حاملہ عورت کی عدت شوہر کی موت یا طلاق سے واجب ہوتی ہے اور وضع حمل پر ختم ہوجاتی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل ہے، (الطلاق:4)''، یعنی بچے کی پیدائش پر ہی اس کی عدت پوری ہوجاتی ہے، کیونکہ جیسا کہ واضح ہے حاملہ عورت کے رحم کی پاکی صرف وضعِ حمل سے حاصل ہوتی ہے، پس جب عورت حاملہ ہو، پھر اُسے طلاق دیدی جائے یا اس کا شوہر وفات پا جائے تو اس کی عدت وضع حمل پر پوری ہوجائے گی، خواہ یہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد قریبی مدت میں ہی ہو، اس کی دلیل یہ ہے: ''سُبَیْعَہْ بنتِ حارث کے شوہر وفات پا گئے اور وہ اس وقت حاملہ تھیں، پھر ان کے ہاں اپنے شوہر کی وفات کے تقریباً دس دن بعد بچے کی ولادت ہوئی اور وہ نبی ﷺ کے پاس مسئلہ دریافت کرنے آئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نکاح کرلو'' اور ایک روایت کے مطابق وہ بیان کرتی ہیں: ''آپ ﷺ نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اپنے وضعِ حمل کے وقت سے ہی عدت سے نکل گئی ہوں اور مجھے اجازت دی کہ اگر میں چاہوں تو شادی کرسکتی ہوں''، پس اسی سبب ایسی حاملہ عورت، جس کا

شوہر وفات پا جائے، کی عدت وضعِ حمل ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل ہے، (الطلاق:4)''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کیلئے تیار ہوں اور جو چاہے میں اس سے لعان کیلئے تیار ہوں کہ چھوٹی سورۃ النساء یعنی سورۃ الطلاق سورۃ البقرہ (آیت:234) کے بعد نازل ہوئی ہے''، بزار کی روایت میں ہے: ''جو چاہے مجھ سے قسم لے لے، سورۃ الطلاق:4 ، البقرۃ:234 کے بعد نازل ہوئی ہے، جس میں عدت وفات کا ذکر ہے''۔ پس ایسی حاملہ عورت جس کا شوہر وفات پا جائے، اس کے ہاں جب بچے کی ولادت ہوجائے تو اس کی عدت پوری جاتی ہے اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: ''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ (عورتیں) اپنے آپ کو (نکاح سے) چار ماہ دس دن روکے رکھیں، (البقرۃ:234)''، (الفقہ الاسلامی وادلتہ: 7177)''۔

پس آپ کے بیان کے مطابق آپ کی سلہج (یعنی سالے صاحب کی بیوہ) چونکہ شوہر کی وفات کے وقت تین ماہ کی حاملہ تھیں، لہٰذا عدتِ وفات (چار ماہ دس دن) گزرنے کے بعد بھی اُن کی عدت ختم نہیں ہوگی، بلکہ بدستور وہ عدت میں رہیں گی اور جب بچہ پیدا ہوگا تو اُسی وقت اُن کی عدت ختم ہوجائے گی، وضعِ حمل سے پہلے نہ اُن کی عدت ختم ہوگی اور نہ وہ کسی سے نکاح کرسکیں گی۔

اگر زمانۂ عدت میں اس کی کفالت کرنے والا کوئی موجود ہے یا اُس کے پاس اپنا مال ہے یا اُسے ترکے میں اتنا مال ملا ہے کہ گھر بیٹھے گزر اوقات ہوسکتی ہے، تو وہ گھر سے باہر نہ جائیں، اگر ڈاکٹر سے رجوع کرنا ناگزیر ہو تو لیڈی ڈاکٹر کو ترجیح دیں اور اُسے گھر پر بلالیں، ورنہ ڈاکٹر کو دکھا کر واپس گھر آجائیں۔ اس کے مَحرم رشتے دار، جیسے باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے، چچا، ماموں وغیرہ گھر آکر اس سے مل سکتے ہیں، غیر محرموں سے بے حجاب نہ ملیں اور اگر عدت گزارنے والی عورت کے پاس نہ اپنا مال ہو، نہ اُسے ترکے میں مال ملا ہو اور نہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا ہو، تو وہ دن کے وقت معاشی ضرورت کے لیے باہر جاسکتی ہے۔

خرید وفروخت کے مسائل

غیر شرعی اور غیر قانونی کمیٹیاں

سوال:
ایک 35 ماہ پر مشتمل کمیٹی رکھی گئی ہے، ٹوٹل ممبران 100 ہیں جو ماہانہ =/3000 روپے جمع کرائیں گے، 35 ماہ میں ہر شخص کی جمع شدہ رقم ایک لاکھ پانچ ہزار روپے ہوگی۔ ہر ماہ قرعہ اندازی کی جائے گی اور جس کا نام نکلے گا، اُسے عمرے پر بھیج دیا جائے گا۔ 35 ماہ بعد بقیہ 65 ممبران ایک ساتھ جائیں گے۔ اگر کسی ممبر کا درمیان میں انتقال ہوجائے تو بقیہ رقم اگر اس کے ورثاء ادا کرنا چاہیں تو ٹھیک ورنہ کوئی لازمی نہیں ہوگی۔ نیز اگر عمرہ کرنے سے پہلے کوئی فوت ہوجاتا ہے، تو اس کی رقم ورثاء کو واپس کردی جائے گی۔ اس کمیٹی کے ذریعے عمرہ پیکیج، عام عمرہ پیکیج سے مہنگا ہے، کیا یہ طریقہ درست ہے؟، (محمد اختر مغل، نواب شاہ)۔

جواب:
آپ نے جو صورت بیان کی ہے، وہ مبہم اور غیر واضح ہے اور اس کے معاملات مجہول ہیں، لہٰذا اس میں شرکت جائز نہیں ہے۔ عام طور پر لالچ اور طرح طرح کی ترغیبات پر مبنی اسکیموں میں آئے دن لوگوں کا پیسہ ڈوب جاتا ہے اور اس طرح کی اسکیمیں جاری کرنے والے منظر سے غائب ہوجاتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اس طرح کی تمام اسکیموں پر پابندی لگائے۔ اس کے لیے باقاعدہ قانون سازی کی جائے۔ ان اسکیموں کے شریعت کے مطابق ہونے کے لیے کسی ثقہ مفتی کی تصدیق وتوثیق لازمی قرار دی جائے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ اُس کا سارا طریقۂ کار (Mechanism) واضح طور پر بیان کیا گیا ہو اور شریعت کے مطابق ہو اور اُسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہو، کسی قانونی تحفظ کے بغیر ایسی تمام اسکیموں کا اجرا ممنوع اور قابلِ تعزیر قرار دیا جائے۔ ماضی میں مُضاربت کے نام پر لوگوں کے کھربوں روپے ڈوب چکے ہیں اور بعض لوگ پوری زندگی کی کمائی ہوئی پونجی سے محروم

ہو گئے۔ اسی طرح جن اسکیموں میں لاٹری، قمار اور جوے کی صورت ہو، اُنہیں مطلقاً ممنوع قرار دیا جائے۔

امریکا میں غیر مسلم کے گیس اسٹیشن پر ملازمت کا حکم

سوال:

ایک شخص امریکا میں مقیم ہے اور وہاں گیس اسٹیشن پر کام کرتا ہے، جس کے ساتھ مارٹ یا اسٹور بھی ہوتا ہے، جہاں حلال اشیاء کی فروخت کے ساتھ ساتھ حرام اشیاء یعنی الکحل کی خرید وفروخت اور لاٹری (جوا) کا کام بھی ہوتا ہے۔ کیا اس کی آمدنی جائز ہے جبکہ دوسرے روزگار بھی دستیاب ہیں، اسٹیشن میں نہ صرف الکحل اور لاٹری کے ٹکٹ کی فروخت کرنا پڑتی ہیں، بلکہ ان اشیاء کو شیلف میں سیٹ کر کے رکھنا بھی کرنا پڑتا ہے، (اسلام نبی)۔

جواب:

اسلام نے حصولِ رزق کے حلال ذرائع اختیار کرنے اور حرام سے بچنے کا حکم دیا۔ اگر پیٹرول پمپ کا مالک غیر مسلم ہے، تو ملازمت کا اجارہ جائز ہے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں:

''مَنْ حَمَلَ لِذِمِّيٍّ خَمْرًا فَإِنَّهُ يَطِيبُ لَهُ الْأَجْرُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَقَالَ أَبُوْيُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللهُ يُكْرَهُ لَهُ ذَالِكَ، لِأَنَّهُ إِعَانَةٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ، وَقَدْ صَحَّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ فِي الْخَمْرِ عَشْرًا حَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَ إِلَيْهِ، وَلَهُ أَنَّ الْمَعْصِيَةَ فِيْ شُرْبِهَا وَهُوَ فِعْلُ فَاعِلٍ مُخْتَارٍ، وَلَيْسَ الشُّرْبُ مِنْ ضَرُوْرَاتِ الْحَمْلِ، وَلَا يُقْصَدُ بِهِ، وَالْحَدِيْثُ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْحَمْلِ الْمَقْرُوْنِ بِقَصْدِ الْمَعْصِيَةِ''۔

ترجمہ: ''امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''جس نے ذمی (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) کے لیے شراب کی بار برداری کی، تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اُس کے لیے اس کی اجرت حلال ہے''، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا: ''یہ اجرت اس کے لیے مکروہ ہے کیونکہ یہ معصیت پر مدد کرنا ہے اور حدیث صحیح میں رسول اللہ ﷺ نے شراب

کے بارے میں دس اشخاص پر لعنت فرمائی: (ان میں) شراب اٹھانے والا اور جس کے لیے اٹھائی جائے (دونوں) شامل ہیں، امامِ اعظم کی دلیل یہ ہے کہ معصیت پینے میں ہے اور وہ ایک فاعلِ مختار کا (دانستہ) فعل ہے اور اٹھانے کے لیے پینا لازم نہیں ہے اور نہ یہ (ہرصورت ہی میں) مقصود ہوتا ہے اور حدیث میں بیان کی گئی لعنت اُس اٹھانے پر محمول ہے جو معصیت کے ارادے سے ہو، (ہدایہ، جلد 7، ص:235)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''وَجَازَ (حَمْلُ خَمْرِ ذِمِّيٍّ) بِنَفْسِهِ أَوْدَابَّتِهِ (بِأَجْرٍ) لَا عَصْرُهَا لِقِيَامِ الْمَعْصِيَةِ بِعَيْنِهِ''۔

ترجمہ: ''اور (کسی شخص کا) اجرت پر غیر مسلم کی شراب خود یا اپنی سواری پر اٹھانا جائز ہے، اور شراب نچوڑنے کی اجرت جائز نہیں کہ یہ بعینہٖ معصیت ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:9، ص:477-478، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

الغرض بامرِ مجبوری امام اعظم کے قول کو اختیار کر کے غیر مسلم کے گیس اسٹیشن پر ملازمت کر سکتے ہیں، لیکن آپ نے لکھا ہے کہ متبادل بالکل حلال روزگار بھی دستیاب ہے، تو اس صورت میں یہ ملازمت چھوڑ کر اس حلال روزگار کو اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ بہرحال صاحبین کے نزدیک یہ روزگار کراہت سے خالی نہیں ہے۔

آرڈر پر سونے کے زیورات بنوانا

سوال:

ہم نے سنا ہے کہ سونا چاندی کی خرید فروخت ہاتھوں ہاتھ ہونی چاہیے۔ اگر رقم پہلے سے دی اور سونے کی ڈیلیوری چند دن بعد ہو جیسا کہ آرڈر پر زیور بنواتے ہیں تو یہ ادھار کہلائے گا اور یہ ناجائز ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو درست طریقہ کیا ہونا چاہیے؟، (ثاقب محمود گلشن اقبال بلاک 13 اے، کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! یہ درست ہے کہ سونا اور چاندی کی خرید وفروخت ہاتھوں ہاتھ ہونی چاہیے یعنی

اُدھار ممنوع ہے۔ ایسے عوضین کے تبادلے کو ''بیع صرف'' کہتے ہیں، جن میں سے ہر ایک ثمن کی جنس سے ہو۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر مرغینانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلصَّرْفُ هُوَالْبَيْعُ اِذَا كَانَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْ عِوَضَيْهِ مِنْ جِنْسِ الْاَثْمَانِ، سُمِّيَ بِهٖ لِلْحَاجَةِ اِلَى النَّقْلِ فِيْ بَدَلَيْهِ مِنْ يَدٍ اِلٰى يَدٍ، وَالصَّرْفُ هُوَالنَّقْلُ وَالرَّدُّ لُغَةً، أَوْلِاَنَّهٗ لَا يُطْلَبُ مِنْهُ اِلَّا الزِّيَادَةُ، اِذْلَا يُنْتَفَعُ بِعَيْنِهٖ، وَالصَّرْفُ هُوَالزِّيَادَةُ لُغَةً''۔

ترجمہ: ''صرف بھی بیع ہے جبکہ اس کے دونوں عوضوں میں سے ہر ایک ثمن کی جنس سے ہو، اس کا نام ''صرف'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے دونوں عوض ہاتھوں ہاتھ نقل کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور ''صرف'' لغت میں منتقل کرنے اور پھیرنے کو کہتے ہیں یا اس لیے کہ اِس عقد سے فقط زیادتی مطلوب ہوتی ہے کیونکہ اس کی ذات سے نفع نہیں اٹھایا جاتا اور لغت میں صرف زیادتی کو کہتے ہیں، (ہدایہ، جلد 5، ص:253)''۔

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَآءً بِسَوَآءٍ يَدًا بِيَدٍ فَاِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ اِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سونے کی بیع سونے کے عوض اور چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جَو کی بیع جَو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض، نمک کی بیع نمک کے عوض ہو، برابر برابر اور نقد بہ نقد ہو اور جب یہ اَقسام مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو، بیچو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہو، (صحیح مسلم:4060)''۔

(۲) ایک روایت میں فرمایا:

''فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبیٰ إِلَّا مَا اخْتَلَفَتْ أَلْوَانُهُ''۔

ترجمہ:''جس نے زیادہ دیا، یا زیادہ لیا تو اس نے سودی کاروبار کیا، سوائے اِس کے کہ اقسام بدل جائیں، (صحیح مسلم:4063)''۔

(۳) حضرت براء بن عازب اور حضرت زید بن ارقم بیان کرتے ہیں:

''نَھٰی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ بَیْعِ الذَّھَبِ بِالْوَرِقِ دَیْناً''۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کی اُدھار کی بیع سے منع فرمایا ہے، (صحیح بخاری:2180)''۔

(۴) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نَھٰی النَّبِیُّ ﷺ عَنِ الْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ، وَالذَّھَبِ بِالذَّھَبِ، إِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ وَأَمَرَنَا أَنْ نَبْتَاعَ الذَّھَبَ بِالْفِضَّةِ كَيْفَ شِئْنَا، وَالْفِضَّةَ بِالذَّھَبِ كَيْفَ شِئْنَا''۔

ترجمہ:''نبی ﷺ نے چاندی کی چاندی کے ساتھ اور سونے کی سونے کے ساتھ بیع سے منع فرمایا سوائے اس کے کہ مقدار برابر ہو اور ہمیں حکم دیا کہ ہم سونے کا چاندی کے عِوَض اور چاندی کا سونے کے عِوَض جس طرح چاہیں، لین دین کریں، (صحیح بخاری:2182)''۔

آرڈر پر زیورات بنوانا ''اِسْتِصْنَاع'' کہلاتا ہے، یعنی ایسا عقد کہ جس کے تحت کسی شے کے وجود میں آنے سے پہلے اس کو خرید لیا جائے اور اُس کی تیاری کا آرڈر دے دیا جائے۔

ڈاکٹر وہبہ زُحیلی لکھتے ہیں:

''وَذَھَبَ الْحَنَفِیَّةُ إِلٰی أَنَّهُ یَجُوْزُ الِاسْتِصْنَاعُ اِسْتِحْسَاناً، لِتَعَامُلِ النَّاسِ وَتَعَارُفِھِمْ عَلَیْهِ فِیْ سَائِرِ الْأَعْصَارِ مِنْ غَیْرِ نَكِیْرٍ''۔

ترجمہ:''ائمۂ احناف کا موقف یہ ہے کہ اِستصناع بطور استحسان کے جائز ہے، کیونکہ ہر زمانے میں اس کا لوگوں کے درمیان تعامل رہا ہے اور یہ لوگوں میں متعارف رہا ہے اور اس پر کسی کا انکار بھی ثابت نہیں ہے''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَقَدِ اسْتَصْنَعَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ خَاتِماً، وَاحْتَجَمَ ﷺ وَأَعْطَی الْحَجَّامَ أَجْرَهُ''۔

قادر) ہو، (بہارِ شریعت، جلد 3 ص:698)''۔

رہن کی تعریف: اصطلاحِ شریعت میں رَہن اُس مال کو کہتے ہیں، جو مدیون (مقروض) اپنے دائن (قرض خواہ) کے پاس بطورِ ضمانت جمع کراتا ہے تاکہ دائن کو قرض کی ادائیگی کا یقین ہوجائے۔

مجلّۃ الاحکام العدلیہ میں ہے:

''حَبْسُ مَالٍ وَتَوْقِيْفُهٗ فِيْ مُقَابَلَةِ حَقٍّ يُمْكِنُ اِسْتِيْفَاؤُهٗ مِنْهُ، وَيُسَمّٰى ذٰلِكَ الْمَالُ مَرْهُوْنًا وَرَهْنًا''۔

ترجمہ: ''مال کو کسی ایسے حق کے مقابل اپنے قبضے میں رکھنا، جس کی ادائیگی اُس مال سے ممکن ہو، (بطورِ ضمان قرض خواہ کے قبضے میں روکے ہوئے) اُس مال کو مرہون اور رَہن کہا جاتا ہے، (مادّہ:701)''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلرَّهْنُ لُغَةً حَبْسُ الشَّيْئِ بِأَيِّ سَبَبٍ كَانَ، وَفِي الشَّرِيْعَةِ جَعْلُ الشَّيْءِ مَحْبُوْسًا بِحَقٍّ يُمْكِنُ اِسْتِيْفَاؤُهٗ مِنَ الرَّهْنِ كَالدُّيُوْنِ''۔

ترجمہ: ''لغت میں رہن کے معنی روکنا ہیں، خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو اور اصطلاحِ شریعت میں دوسرے کے مال کو اپنے حق کے عوض اس لئے روکنا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے حق کا (کُل یا جُز) وصول کرنا ممکن ہو، جیسے دین کے عوض مدیون کی کوئی چیز روکے رکھنا، (ہدایہ، جلد 7، ص:341)''۔

شریعتِ مطہرہ میں ''عقدِ رہن'' کو صرف اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ قرض دہندہ کو اپنی رقم کی واپسی کے بارے میں اطمینان ہوجائے اور رقم ڈوبنے کا خدشہ نہ رہے۔ مالِ مرہون کا ایک حق مرتہن کے متعلق ہوجاتا ہے کہ مرتہن کو اس شے کی حفاظت اور اپنے پاس بطورِ ضمانت روکے رکھنے کے علاوہ تصرُّف کا حق حاصل نہیں ہوتا کیونکہ وہ شے اس کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنے پاس اس طرح روکی ہوئی ہے کہ مالک اس سے نفع نہیں

اٹھا سکتا۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(لَا الِانْتِفَاعُ بِهِ مُطْلَقًا) لَا بِاسْتِخْدَامٍ وَلَا سُكْنٰى وَلَا لُبْسٍ وَلَا اِجَارَةٍ وَلَا اِعَارَةٍ، سَوَاءٌ كَانَ مِنْ مُّرْتَهِنٍ أَوْ رَاهِنٍ (اِلَّا بِاِذْنٍ) كُلٍّ لِلْآخَرِ، وَقِيْلَ لَا يَحِلُّ لِلْمُرْتَهِنِ لِاَنَّهٗ رِبًا، وَقِيْلَ اِنْ شَرَطَهٗ كَانَ رِبًا، وَاِلَّا، لَا"۔

ترجمہ: "مرتہن کو مرہون شئ سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے، مثلاً اگر غلام یا باندی ہے تو اُس سے خدمت لینے کی اجازت نہیں، مکان رہن رکھا ہوا ہے تو مرتہن کے لیے اس میں رہنے کی اجازت نہیں ہے، لباس ہے تو اسے پہننے کی اجازت نہیں ہے اور نہ رہن رکھی ہوئی چیز کو اُجرت ہی پر دینے یا عاریتاً دینے کی اجازت ہے۔ یہ انتفاع راہن یا مرتہن دونوں میں سے کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ ایک دوسرے (یعنی راہن، مرتہن کو یا مرتہن، راہن) کو انتفاع کی اجازت دے دے (تو درست ہے)۔ بعض علماء نے کہا کہ اگرچہ راہن اجازت دے دے تب بھی مرتہن کو نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ یہ سود ہے اور بعض نے کہا کہ: عقدِ رہن میں فائدہ اٹھانے کی شرط رکھی ہے تو سود ہے اور اگر شرط نہیں رکھی، تو سود نہیں ہے"۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِبْنِ اَسْلَمَ السَّمَرْقَنْدِيِّ، وَكَانَ مِنْ كِبَارِ عُلَمَاءِ سَمَرْقَنْدَ أَنَّهٗ لَا يَحِلُّ لَهٗ أَنْ يَّنْتَفِعَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بِوَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوْهِ وَاِنْ أَذِنَ لَهُ الرَّاهِنُ، لِاَنَّهٗ أَذِنَ لَهٗ فِي الرِّبَا، لِاَنَّهٗ يَسْتَوْفِيْ دَيْنَهٗ كَامِلًا فَتَبْقٰى لَهُ الْمَنْفَعَةُ فَضْلًا فَيَكُوْنُ رِبًا"۔

ترجمہ: "عبداللہ محمد بن اسلم سمرقندی جو سمرقند کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں، بیان کرتے ہیں: مرتہن کو مرہون سے کچھ بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ راہن نے اجازت دے دی ہو کیونکہ یہ سود کی اجازت ہے، اس لئے مرتہن نے اپنا دین (قرض) پورا پالیا، تو جو منفعت حاصل کی، وہ اصل رقم پر زیادتی ہے اور یہی تو سود ہے، (ردالمحتار علی

الدر المختار، جلد 10 ،ص:70، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نوٹ: فتاویٰ رضویہ، جلد:25،ص:242 اور غمز عیون البصائر، جلد:3،ص:244 پر عبداللہ بن محمد بن اسلم ہے۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ الْعَزِیْز سے سوال کیا گیا: شے مرہون کو اپنے استعمال میں لانا یا اُس میں سکونت کرنا کسی طور جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں فرمایا: کسی طرح جائز نہیں ہے۔ کنز العمّال میں حدیث پاک ہے، جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے:

''كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًوا، اَخْرَجَهُ الْحَارِثُ عَنْ سَيِّدِنَا عَلِيٍّ كَرَّمَ اللهُ تَعَالٰى وَجْهَهٗ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ''۔

ترجمہ:''ہر وہ قرض جس کے ذریعے سے کوئی منفعت حاصل کی جائے، وہ سود ہے''۔اس حدیث کو حارث نے حضرت علی سے روایت کیا ہے۔

علامہ طحطاوی پھر علامہ شامی خود شرح درمختار میں فرماتے ہیں:

''اَلْغَالِبُ مِنْ اَحْوَالِ النَّاسِ اَنَّهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُوْنَ عِنْدَ الدَّفْعِ الْاِنْتِفَاعُ، وَلَوْلَاهُ لَمَا اَعْطَاهُ الدَّرَاهِمَ، وَهٰذَا بِمَنْزِلَةِ الشَّرْطِ لِاَنَّ الْمَعْرُوْفَ كَالْمَشْرُوْطِ، وَهُوَ مِمَّا يُعَيِّنُ الْمَنْعَ، اَقُوْلُ: وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذَا بِعَيْنِهٖ حَالُ اَهْلِ الزَّمَانِ يَعْرِفُهٗ مِنْهُمْ كُلُّ مَنِ اخْتَبَرَ، وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ اَحْكَامَ الْفِقْهِ اِنَّمَا تَبْنِيْ عَلَى الْكَثِيْرِ الشَّائِعِ وَلَاتُذْكَرُ حَالٌ شُذَّتْ وَنَدُرَتْ فِيْهِ الْجَوَازُ كَمَا نَصَّ عَلَيْهِ الْمُحَقِّقُ حَيْثُ اَطْلَقَ فِيْ ''فَتْحِ الْقَدِيْرِ'' وَغَيْرُهٗ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْكِرَامِ فَالْحُكْمُ فِيْ زَمَانِنَا هُوَ اِطْلَاقُ الْمَنْعِ لَايَرْتَابُ فِيْهِ مَنْ لَّهٗ اِلْمَامٌ بِالْعِلْمِ''۔

ترجمہ:''لوگوں کا غالب حال یہ ہے کہ وہ مرہون شے دیتے وقت نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر نفع اٹھانا مطلوب نہ ہو تو وہ قرض کے لیے رقم ہی نہ دیں اور یہ شرط کے درجے میں ہے، اس لیے کہ جو چیز معروف (Understood) ہو، وہ مشروط (Conditional) ہی کی طرح ہوتی ہے اور یہی بات مرہون شئ سے نفع اٹھانے میں ممانعت کو معیّن کرتی ہے۔

میں (امام احمد رضا قادری) کہتا ہوں : اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے زمانے کے لوگوں کا یہی حال ہے جسے ہر باخبر شخص جانتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ فقہی احکام کی بنیاد کثیر الوقوع امور پر ہوتی ہے اور شاذ امور کا ذکر نہیں کیا جاتا اور ان امور کا بھی جن میں جواز کا قول نادر ہو، جیسا کہ اس پر مُحقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہُمام نے ''فتح القدیر'' میں اور دیگر علماء کرام نے مطلقاً ممانعت کا قول کر کے صراحت فرمائی ہے۔ پس ہمارے زمانے میں مرہون شے سے مطلقاً نفع اٹھانے کی ممانعت کا حکم ہے، جس کا دینی علم سے معمولی تعلق بھی ہوگا، اُسے اس مسئلے میں کوئی شک نہیں ہوگا، (فتاویٰ رضویہ، ج:25،ص:217،218)''۔

اگر عقد کے وقت مالِ رہن سے مرتہن نے صراحۃً عدمِ استفادے کی شرط لگائی ہوتو عقدِ رہن جائز ہوگا، استفادے کی شرط کی صورت میں جائز نہیں۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز اس عقد کے جواز کی صورت یوں بیان فرماتے ہیں: ''ہاں! اگر مُرتَہِن حصولِ نفع کی شرط کے بغیر قرض دے اور صرف اپنی رقم کی واپس وصولی کا یقین حاصل کرنے کے لیے رہن لے، جو رہن کی مشروعیت سے شارع کا مقصود ہے اور عاقدَین وقتِ عقد، صراحۃً شرط کرلیں کہ مُرتہن کسی طرح نفع اٹھانے کا مُجاز نہ ہوگا، وَذٰلِکَ لِاَنَّ مَاصَارَ مَعْرُوفاً لَایَصِیْرُ مَرفُوعًا بِالسُّکُوتِ، فَلَایَکْفِی عَدمُ الشَّرطِ بَلْ شَرطُ الْعَدَمِ یَفُوْقُ الصَّرِیْحُ الدَّلَالَۃَ۔ ترجمہ: ''یہ اس لیے کہ جو چیز معروف ہوچکی ہو، وہ چپ رہنے سے مرفوع نہیں ہوجاتی، لہٰذا (مال مرہون سے نفع اُٹھانے کی) شرط نہ لگانا کافی نہیں، بلکہ عدمِ نفع کی شرط ضروری ہوگی تاکہ صریح، دلالت پر فوقیت پاجائے''۔ یعنی جہاں مَرہون سے نفع اُٹھانے کا عُرف ہے، اُس پر نفع نہ اُٹھانے کی صراحت دلالت پر فوقیت پاجائے۔ پھر رَاہن اپنی خوشی سے مُرتَہِن کو انتفاع (نفع اُٹھانے) کی اجازت دے اور مُرتَہِن صرف بربنائے اجازت، نہ کہ اپنا استحقاق جان کر نفع اٹھائے اور حال یہ ہو کہ اگر رَاہن کسی وقت روک دے تو فوراً رُک جائے۔ یعنی نفع نہ اٹھانے کی اس شرط کے بعد مالک نے اپنی

دار، مکان یا فلیٹ خالی کردے اور ڈپازٹ اور مکان یا فلیٹ کا مالک اپنا مکان یا فلیٹ خالی کرا کے واپس لے لے۔

غبن کی ایک صورت

سوال:

میں ایک دکان میں ملازم ہوں، میرے مالک نے کہا ہے کہ جو ریٹ چیزوں کا ہے، اسی ریٹ پر چیزیں فروخت کرو اور اگر کچھ فائدہ ہو تو ریٹ کم بھی کر سکتے ہو۔ اب اگر کسی چیز کا ریٹ پانچ روپے ہے اور میں اس کو چھ روپے میں بیچتا ہوں اور پانچ روپے مالک کو دے کر ایک روپیہ خود رکھ لوں، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟۔ کیونکہ مالک نے تو ریٹ پانچ روپے مقرر کیے ہیں جو کہ اس کو مل گئے، (بندۂ خدا، لاہور)۔

جواب:

یہ صورت ناجائز ہے کہ مالک کے علم میں لائے بغیر زائد رقم اپنے پاس رکھ لینا مالک کو دھوکا دینا اور غبن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا''۔ ترجمہ: ''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں، (صحیح مسلم:283)''۔

(۲) ''عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بُریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو ہم کسی کام کے لیے مقرر کریں اور اُسے اُس کی اُجرت ادا کردیں، تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا، (سُنن ابوداؤد: 2936)''۔ ہاں! اگر مالک آپ کو یہ اجازت دیدے کہ اس چیز کی قیمتِ فروخت یہ ہے اور اگر آپ اس سے زیادہ نفع پر بیچ سکتے ہوں، تو وہ اضافی نفع آپ رکھ سکتے ہیں۔

سود کی رقم کا حکم

سوال:

بینک میں میرا کرنٹ اکاؤنٹ ہے، میں اس سے سود نہیں لیتا ،فرض کریں میرے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ روپیہ ہے، جس پر سالانہ آٹھ لاکھ روپے سود بنتا ہے، جو میں نہیں لیتا، وہ آٹھ لاکھ بینک میں رہ جاتا ہے، جس سے بینک یا سودی ادارے مضبوط ہوتے ہیں، کیا سود کی یہ رقم بینک سے نکال کر مستحق اور غریب لوگوں پر خرچ کی جاسکتی ہے، (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن)۔

جواب:

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کی شرعی حیثیت قرض کی ہے اور اس پر آپ کسی نفع کے حقدار نہیں ہیں۔ہم کسی کو یہ مشورہ نہیں دیتے کہ وہ سودی اکاؤنٹ کھولیں اور اس پر سود لیں، لیکن اگر کسی نے ایسا کرلیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ یہ رقم ثواب کی نیت کے بغیر فقراء ومساکین کو دیدے، کیونکہ سود حرام ہے اور حرام پر آپ کی ملک ثابت نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ کسی اسلامی مالیاتی ادارے میں مُضاربت کی بنیاد پر اپنی رقم لگالیں ،اگر وہاں شرعی احکام کی پاس داری کی جارہی ہے، تو اس کا منافع آپ کے لیے جائز ہوگا ،اسے خود بھی استعمال کرسکتے ہیں اور ثواب کی نیت سے فُقراء ومساکین کو بھی دے سکتے ہیں۔

دواؤں پر ڈاکٹر کے لیے ڈسکاؤنٹ

سوال:

ایک ڈاکٹر جس کی کلینک کے اندر ادویات کی دکان بھی ہے، دواساز کمپنی کی مختلف اسکیمیں ہوتی ہیں۔ دکاندار مال کی خریداری کے لیے تگ ودو کرتا ہے جہاں سے زیادہ ڈسکاؤنٹ ملے، ان کا مال لاکر بیچتا ہے، کمپنیاں کچھ فیصد دکان دار کو ڈسکاؤنٹ دینے کے علاوہ دوا تجویز کرنے والے ڈاکٹر کو بھی کچھ فیصد کمیشن کی پیشکش کرتی ہیں، جبکہ دوسری کمپنی کی اسی قسم کی پراڈکٹ تھوڑی زیادہ قیمت پر ملتی ہے، جبکہ دونوں پروڈکٹس مریض کو تقریبا ایک قیمت پر ملتی ہیں۔ اوّل الذکر میں مارجن ہونے کی وجہ سے مریض کو ڈسکاؤنٹ بھی

دیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ حکومت کی طرف سے منظور شدہ مقررہ قیمت مقرر پیکٹ پر لکھی ہوتی ہے، دکاندار اس سے زیادہ لینے کے مجاز نہیں ہیں، اسلام کی رو سے اس کو کس تناظر میں دیکھا جائے، (ڈاکٹر پراچہ)۔

جواب:

آج کل فارماسیوٹیکل (دواساز) کمپنیاں اپنی پروڈکٹ کی مارکیٹنگ کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتی ہیں، دکاندار کا ڈسکاؤنٹ تو قابلِ فہم بات ہے، لیکن مریض کو خاص برانڈ کی دوا تجویز (Prescribe) کرنے پر ڈاکٹر کا کمیشن ایک نیا عنصر ہے، اسی کو وہ لوگ مارکیٹنگ سائنس سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس چیز کی خرید وفروخت پر مشتری اور بائع باہم قیمت پر رضامند ہوجائیں، فقہی اعتبار سے وہ آمدن حلال ہے۔ دوا کے پیکٹ یا سیرپ کی بوتل پر حکومت کی منظوری سے خوردہ (Retail) قیمت لکھی ہوتی ہے، لہٰذا مُقررہ قیمت یا اس سے کم پر فروخت کرنا قانوناً بھی جائز ہے، بعض جگہ میڈیکل اسٹور والے کاروباری مسابقت کی بنا پر اپنے حصے کے نفع سے گاہک کو کچھ ڈسکاؤنٹ بھی دے دیتے ہیں، یہ بھی جائز ہے۔ اب اگر ڈاکٹر کو مزید کچھ ڈسکاؤنٹ دینے والی کمپنی دوا کی مقدار یا معیار (Quantity or Quality) پر سمجھوتہ کرکے یہ رعایت دیتی ہے، تو یہ خیانت ہے اور اس خیانت میں حصے دار بن کر ڈاکٹر بھی گناہ میں شریک ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر مقدار اور معیار سو فیصد درست ہے اور کمپنی اپنے منافع میں سے ڈاکٹر کو کچھ دیتی ہے تو شرعاً یہ حرام نہیں ہے، لیکن طبی اخلاقیات کے خلاف ہے، کیونکہ ڈاکٹر اپنی پیشہ ورانہ فیس مریض سے لے چکا ہے، سواسے ڈسکاؤنٹ کی رقم مریض کو دے دینی چاہیے۔ اگر ڈاکٹر محض ڈسکاؤنٹ کی خاطر مریضوں کے لیے غیر معیاری دوائیں تجویز کرتا ہے، تو یہ ناجائز ہے اور طبی اخلاقیات کے بھی خلاف ہے۔

ایک ہی طبی فارمولے کے تحت یکساں قیمت پر اگر دو مختلف دواساز کمپنیوں کی برانڈڈ دوائیں دستیاب ہیں، تو اپنے مریض کے لیے اُس برانڈ کو تجویز کرے جس کا معیار دوسروں

کے مقابلے میں بہتر ہے، کیونکہ یہ انسانی جان کے تحفظ کا مسئلہ ہے اور ڈاکٹر کی پیشہ ورانہ دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے۔لیکن اگر ڈاکٹر نے اپنے کلینک کے ساتھ اپنا میڈیکل اسٹور بھی کھول رکھا ہے اور مریض صرف اس اسٹور سے دوا لینے کا پابند نہیں ہے،تو دیگر میڈیکل اسٹورز کی طرح ڈاکٹر کے لیے بھی نفع پر دوائیں فروخت کرنی جائز ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اشیاءِ صرف کی قیمت مُقرر کرنا

سوال:

کسی شے کو فروخت کرنے پر کتنا نفع لیا جاسکتا ہے،مثلاً ایک چیز نو روپے کی خریدی، اسے بیس روپے میں فروخت کرنا جائز ہے؟،(شرمین زیدی)۔

جواب:

اسلام نے کاروبار میں نفع کی کوئی خاص شرح مُقرر نہیں کی ،کیونکہ جب تک رَسد پر کنٹرول نہ ہو یا رَسد حسبِ ضرورت نہ ہوتو یہ نا قابلِ عمل ہوجاتا ہے۔اصولی طور پر تجارت کا مقصد نفع حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔لہٰذا فی نفسہٖ جائز طریقے سے نفع کمانا کوئی معیوب بات نہیں ہے،کیونکہ تجارت ذریعۂ معاش بھی ہے،معاشرے کی ضرورت اور خدمت بھی ہے۔

تاجر ہی وہ فرد ہے جو صنعت کار،کاشت کار اور صارف کے درمیان رابطہ بنتا ہے۔اسلام دینِ فطرت ہے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عام حالات میں کاروبار فطری تقاضوں کے مطابق چلتا رہے،اس کے ساتھ ساتھ اسلام ہر طبقے کے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت بھی کرتا ہے اور مذموم صفات،مثلاً: حرص وہوس،انسانوں کی اذیت رسانی اور مصنوعی مہنگائی پیدا کرنے والے عوامل کی روک تھام کرتا ہے،اِسی طرح اسلام انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے۔

قیمتیں مُقرر کرنے کے بارے میں حدیث پاک میں ہے:

”عَنْ أَنَسٍ قَالَ:غَلَا السِّعْرُ عَلٰی عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ،فَقَالُوا:يَا رَسُولَ اللّٰهِ!

سَعِّرْلَنَا، فَقَالَ: اِنَّ اللهَ هُوَالْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ البَاسِطُ الرَّزَّاقُ، وَاِنِّی لَأَرْجُوْ أَنْ أَلْقٰی رَبِّی وَلَیْسَ أَحَدٌ مِنْکُم یَطلُبُنِی بِمَظْلِمَةٍ فِی دَمٍ وَلَا مَالٍ"۔

ترجمہ:"حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں (ایک بار) مہنگائی ہوگئی تو لوگوں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ! ہمارے لیے قیمتیں مُقرر فرمادیجیے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ ہی (اپنے قانونِ فطرت کے مطابق) قیمتیں مُقرر فرمانے والا ہے، (وہی) روزی میں تنگی اور کشادگی فرمانے والا ہے، میری خواہش ہے کہ میں اپنے رب سے اِس حال میں ملوں کہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہو جو مجھ سے جان یا مال (یعنی حقوق العباد) سے متعلق کسی ظلم وزیادتی پر (اللہ تعالیٰ سے انصاف) کا مطالبہ کرے، (سُنن ترمذی:1314)"۔البتہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسی تعلیمات فرمائیں، جو مصنوعی طریقوں سے قیمتیں بڑھانے سے روکتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(الف) آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم فرمایا:"اَلْجَالِبُ مَرزُوقٌ وَالْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ"۔

ترجمہ:"(مارکیٹ میں مال لاکر بیچنے والا) تاجر خوش بخت ہے اور ذخیرہ اندوز ملعون ہے، (سُنن ابن ماجہ:2153)"۔

تاجر صنعتکار، اہلِ حرفت، کاشتکار اور صارف کے درمیان واسطہ بنتا ہے اور اگر وہ اپنے منافع کو جائز حدود میں رکھتا ہے، تو اُسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے بشارت دی ہے:

"اَلتَّاجِرُالصَّدُوقُ الأَمِینُ مَعَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ"۔ ترجمہ:"بہت سچے اور دیانت دار تاجر (کا حشر) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، (سنن ترمذی:1209)"۔

ذخیرہ اندوزی سے مراد یہ ہے کہ تاجر اشیائے ضرورت کو بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرے، اُس کی رسد روک دے تاکہ طلب بڑھے اور پھر وہ مصنوعی طریقے سے من پسند قیمت وصول کرکے لوگوں کا استحصال کرے، یہ سنگ دلی، بے رحمی اور شقاوت ہے۔ مَعمر بن عبداللہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:"لَایَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِیءٌ"

ترجمہ: ''ذخیرہ اندازی صرف گنہگار شخص کرتا ہے، (صحیح مسلم:4120)''۔
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے سنا:
''مَنِ احتَکَرَ عَلَی الْمُسْلِمِینَ طَعَاماً ضَرَبَہُ اللہُ بِالْجُذَامِ وَالاِفلَاسِ''۔
ترجمہ: ''جس شخص نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے ذخیرہ اندوزی کی اللہ تعالیٰ اُس پر جذام (کوڑھ) اور افلاس کو مسلّط کردے گا، (سُنن ابن ماجہ:2155)''۔
(ب) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ''تَلَقِّی الجَلَب'' سے منع فرمایا تھا، اس سے مراد یہ ہے کہ باہر سے اشیائے ضرورت فروخت کرنے کے لیے جو لوگ شہر میں لاتے ہیں، راستے میں اُن سے کم دام میں خریدے اور پھر مارکیٹ میں زیادہ دام میں فروخت کرے، اسے حدیث مبارک میں ''بَیْعُ الْحَاضِرِ لِلبَادِی'' یعنی شہری کی دیہاتی کے لیے بیع سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس سے کاروبار کا فطری عمل متاثر ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں صارفین کا حق پامال ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں آڑھت یا کمیشن ایجنٹ کا ادارہ ناگزیر ہوگیا ہے اور حکومت کے لیے اُسے کنٹرول کرنا یا ختم کرنا مشکل ہے، کیونکہ دور دراز سے مال لے کر آنے والے صنعتکار یا کاشت کار کے لیے ممکن نہیں کہ اپنے مال کو شہر میں آکر اسٹاک کرے اور براہِ راست صارفین کو بیچے، بلکہ اب بہت سے تاجر دیہات میں جاکر باغات کو براہِ راست خرید لیتے ہیں اور کئی تاجر باغات کے قریب اپنے پروسیسنگ پلانٹ لگا لیتے ہیں اور زیادہ منافع کماتے ہیں، اسے آج کل کی معاشی اصطلاح میں Value Addition کہا جاتا ہے، یعنی یہ کہ خام مال نہ بیچے، کیونکہ اس کے دام کم ملیں گے، بلکہ اسے پروسیس کر کے بیچے، جیسے پھلوں کو صاف کر کے اور ان کی درجہ بندی (Grading) کر کے خوبصورت پیکنگ کرنا تاکہ جب وہ صارف کے پاس پہنچے تو تیار ہو، نہ کچا ہو اور نہ گلا سڑا، اسی لیے آج کل عالمی مارکیٹوں میں اشیائے خوراک اور دواؤں کے پیکٹ پر استعمال کی انتہائی تاریخ (Expiry Date) لکھنا بھی ضروری ہے۔ اِسی طرح روئی سے دھاگا بنانا اور پھر دھاگے سے کپڑا بنانا اور پھر اسے مطلوبہ ڈیزائن میں پرنٹ کر کے پیک کرنا، اسے آج کل

ڈائنگ کہتے ہیں، یہ بھی Value Addition ہے۔

(ج) اسلام کی حکمت یہ ہے کہ معاشرے کو باہمی احترام اور ایک دوسرے کے لیے ایثار واخلاص کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے، مدینہ منورہ میں جب قحط پڑا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنا تمام مال صدقہ کردیا:

"عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَحِطَ النَّاسُ فِي زَمَانِ أَبِي بَكْرٍ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: لَا تُمْسُونَ حَتّٰى يُفَرِّجَ اللّٰهُ عَنْكُمْ، فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْغَدِ جَاءَ الْبَشِيرُ إِلَيْهِ قَالَ: قَدِمَتْ لِعُثْمَانَ أَلْفُ رَاحِلَةٍ بُرًّا وَطَعَامًا، قَالَ: فَغَدَا التُّجَّارُ عَلٰى عُثْمَانَ فَقَرَعُوا إِلَيْهِ الْبَابَ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمْ وَعَلَيْهِ مُلَاءَةٌ، وَقَدْ خَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهَا عَلٰى عَاتِقَيْهِ فَقَالَ لَهُمْ مَا تُرِيدُونَ؟، قَالُوا: بَلَغَنَا أَنَّهُ قَدِمَ لَكَ أَلْفُ رَاحِلَةٍ بُرًّا وَطَعَامًا، بِعْنَا حَتّٰى نُوَسِّعَ بِهٖ عَلٰى فُقَرَاءِ الْمَدِينَةِ، فَقَالَ لَهُمْ عُثْمَانُ: أُدْخُلُوا، فَدَخَلُوا فَإِذَا أَلْفُ وِقْرٍ قَدْ صُبَّ فِي دَارِ عُثْمَانَ، فَقَالَ لَهُمْ: كَمْ تُرْبِحُونِي عَلٰى شِرَائِي مِنَ الشَّامِ؟، فَقَالُوا: اَلْعَشَرَةُ اِثْنَيْ عَشَرَ، قَالَ: قَدْ زَادُونِي، قَالُوا اَلْعَشَرَةُ أَرْبَعَةَ عَشَرَ، قَالَ: قَدْ زَادُونِي، قَالُوا: اَلْعَشَرَةُ خَمْسَةَ عَشَرَ، قَالَ: زَادُونِي، قَالُوا: وَمَنْ زَادَكَ وَنَحْنُ تُجَّارُ الْمَدِينَةِ؟، قَالَ: زَادُونِي بِكُلِّ دِرْهَمٍ عَشَرَةً عِنْدَكُمْ زِيَادَةٌ، قَالُوا: لَا، قَالَ: فَأُشْهِدُكُمْ مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّهَا صَدَقَةٌ عَلٰى فُقَرَاءِ مَدِينَةٍ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَبِتُّ لَيْلَتِي فَإِذَا أَنَا بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مَنَامِي وَهُوَ عَلٰى بِرْذَوْنٍ أَشْهَبَ يَسْتَعْجِلُ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ مِنْ نُورٍ وَبِيَدِهٖ قَضِيبٌ مِنْ نُورٍ وَعَلَيْهِ نَعْلَانِ شِرَاكُهُمَا مِنْ نُورٍ، فَقُلْتُ لَهُ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا رَسُولَ اللّٰهِ! لَقَدْ طَالَ شَوْقِي إِلَيْكَ، فَقَالَ ﷺ إِلٰى مُبَادِرٍ لِأَنَّ عُثْمَانَ تَصَدَّقَ بِأَلْفِ رَاحِلَةٍ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ قَبِلَهَا مِنْهُ وَزَوَّجَهُ بِهَا عَرُوسًا فِي الْجَنَّةِ وَأَنَا ذَاهِبٌ إِلٰى عُرْسِ عُثْمَانَ"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں (مدینہ میں) قحط پڑا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم صبح نہیں کرو گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر (رزق) کشادہ فرمادے گا۔ اگلے دن صبح یہ خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے ایک ہزار اونٹ گندم اور اشیائے خوراک کے منگوائے ہیں، راوی بیان کرتے ہیں: مدینے کے تاجر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، آپ اس حال میں گھر سے باہر تشریف لائے کہ چادر آپ کے کاندھوں پر تھی اور اُس کے دونوں سرے مخالف سمت میں کاندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔ حضرت عثمان نے مدینے کے تاجروں سے پوچھا: تم لوگ کس لئے آئے ہو؟، کہنے لگے: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ غلے کے آئے ہیں، آپ اُنہیں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجئے تاکہ ہم مدینے کے فقراء پر آسانی کریں، اُنہوں نے فرمایا: اندر آؤ، پس وہ اندر داخل ہوئے، تو ایک ہزار تھیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں رکھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: اگر میں تمہارے ہاتھ فروخت کروں، تم مجھے کتنا منافع دو گے؟، تاجروں نے کہا: دس پر بارہ، آپ نے فرمایا: کچھ اور بڑھاؤ، اُنہوں نے کہا: دس پر چودہ، آپ نے فرمایا: اور بڑھاؤ، اُنہوں نے کہا: دس پر پندرہ، آپ نے فرمایا: اور بڑھاؤ، اُنہوں نے کہا: اِس سے زیادہ کون دے گا، جبکہ ہم مدینے کے تاجر ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا: اور بڑھاؤ، کیا ہر درہم پر دس درہم تمہارے لئے زیادہ ہیں۔ تاجروں نے کہا: نہیں، پھر اُنہوں نے فرمایا: اے گروہِ تجار! تم گواہ ہو جاؤ کہ (یہ تمام مال) میں نے مدینہ کے فقراء پر صدقہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: رات رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم میرے خواب میں تشریف لائے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سیاہی مائل سفید سواری پر تشریف فرما تھے، آپ جلدی میں تھے اور آپ کے دست مبارک میں نور کی ایک قندیل تھی (جس سے روشنی نور کی طرح پھوٹ رہی تھی) نعلین مبارک کے تسموں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان، (آپ کے دیدار کے لیے) میرا اشوق بے کراں ہو رہا ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے جلدی ہے، عثمان نے ایک ہزار لدے ہوئے اونٹوں کا سامان اللہ کی راہ میں صدقہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبولیت سے نوازا ہے اور اُس کا نکاح جنت کی ایک حور سے فرما دیا اور میں عثمان کی خوشیوں میں شریک ہونے جا رہا ہوں، (اِزالۃ الخفاء، جلد 2، ص: 224)''۔

آج کل عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ،عہدِ خلافت راشدہ اور قرونِ اُولیٰ کے مقابلے میں حکومتوں کے مالی وسائل اور ذمے داریوں میں کافی اضافہ ہوگیا ہے اور حکومتِ پاکستان نے 1977ء میں Price Control and Prevention of Profiteering and Hoarding Act یعنی ''قیمتوں پر کنٹرول اور نفع اندوزی وذخیرہ اندوزی کی ممانعت'' کے عنوان سے ایک قانون بھی بنایا ہے۔ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بھی قیمتوں کو مناسب حدود میں رکھنا ہے،اس میں بھی نفع کی کوئی خاص شرح مُقرر نہیں کی گئی،لیکن جب حکومت محسوس کرے کہ اشیائے ضرورت کی قیمتیں عوام کی قوتِ خرید سے باہر ہورہی ہیں،تو حکومت مداخلت کرتی ہے اور اُس کی ممکنہ صورتیں یہ ہوتی ہیں:

(الف) یہ کہ صارفین کے لیے کم از کم خوردہ قیمت (Retail Price) مقرر کرے۔

(ب) اپنے اسٹاک سے اُن اشیاء کی مارکیٹ میں رسد (Supply) بڑھادے۔

(ج) ہنگامی بنیادوں پر اُن اشیاء کی درآمد کی اجازت دے اور درآمدی ڈیوٹی عارضی طور پر ختم کردے یا کم کرے۔

(د) ذخیرہ اندوزی کو کنٹرول کرے۔

(ہ) حکومت صارفین کے لیے زرِتلافی (Subsidy) دے۔

پس موجودہ دور میں یہ عرف رائج ہے اور شرعی اعتبار سے بھی درست ہے،کیونکہ معاملات میں عرف بھی حاکم ہوتا ہے۔پس ایسے حالات میں تَسعیر (Price Fixation) درست ہے، بشرطیکہ حکومت یہ کام ذمے داری سے کرے تاکہ صنعتکار ، تاجر اور صارف (Consumer) سب کے جائز مفادات کا تحفظ ہوسکے۔

آپ نے نو روپے کی چیز بیس روپے میں بیچنے کی بابت سوال کیا ہے،نفع کا یہ تناسب سو فیصد سے بھی زیادہ ہے اور کھلا استحصال ہے،ایسے رجحانات کو کنٹرول کرنا حکومت کی ذمے داری ہے۔سب کو معلوم ہے کہ جلد گلنے سڑنے والی اور تلف ہونے والی (Perishable) اشیاء (جیسے سبزیاں اور پھل وغیرہ) کا نفع نسبتاً زیادہ ہوتا ہے،لیکن اسے بھی ایک حد کے اندر

رہنا چاہیے۔لیکن اس کے لیے کوئی مستقل ضابطہ مُقرر کرنا مشکل ہے، جو دائمی طور پر قابلِ عمل ہو، یہ اُمور حالات اور اسباب پر منحصر ہوتے ہیں اور ان تمام عوامل پر نظر رکھنا حکومت کی ذمے داری ہے۔اس لیے اب حکومتیں ضابطہ کار (Regulator) کا کردار ادا کرتی ہیں۔

مردار جانور کے گوشت کی خرید وفروخت

سوال:

مرغی کے کاروبار سے وابستہ کچھ لوگ ہوٹلوں اور دکانوں پر کم ریٹ میں مردہ مرغی بھی سپلائی کرتے ہیں، اس بات کا علم دکاندار اور ہوٹل مالکان کو بھی ہوتا ہے، ایسی صورت میں شرعی حکم بیان فرمائیں، (محمد اشرف، قصبہ اورنگی)۔

جواب:

مُردار جانور حرام ہے (لیکن اِس عموم سے بالاتفاق مچھلی اور ٹڈی مستثنیٰ ہیں)۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(1) ''إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ''۔

ترجمہ:''بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر مُردار اور بہتا ہوا خون حرام کر دیا ہے، (البقرۃ:173، النحل:115)''۔

(2) ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ''۔

ترجمہ:''تم پر مُردار (کا کھانا) حرام کیا گیا ہے، (المائدۃ:3)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(بَطَلَ بَيْعُ مَا لَيْسَ بِمَالٍ كَالدَّمِ) الْمَسْفُوحِ فَجَازَ بَيْعُ كَبِدٍ وَطِحَالٍ (وَالْمَيْتَةِ) سِوَى سَمَكٍ وَجَرَادٍ''۔

ترجمہ:''ایسی اشیاء جو مال نہ ہوں، جیسے ذبح کے وقت بہنے والا خون اور مُردار کی بیع باطل ہے، تلّی اور کلیجی کی بیع جائز ہے (یعنی اِن پر دَمِ مَسفوح کا اطلاق نہیں ہوتا) اور (شکار کے ذریعے) جو مچھلی اور ٹڈی مرجائے، وہ حلال ہے (یعنی اُس پر مردار کا اطلاق نہیں ہوتا)،

(جلد7،ص:171)''۔

امام احمد رضا قادری قدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا:''جوجانور حلال مرجائے،اُس کو مسلمان کا بکری (فروخت) کرکے اپنی ضرورت پوری کرنی جائز ہے یانہیں؟،آپ نے جواب میں لکھا:جوجانور مُردار ہوگیا بغیر ذبح شرعی کے مرگیا،اُس کا بیچنا حرام ہے اوراس کے دام حرام،(فتاویٰ رضویہ،جلد17،ص:171)''۔

الغرض مردار سے مراد ایسا حلال جانور ہے،جو ذبح کئے بغیر طبعی موت مرجائے،اُس کا گوشت کھانا اور فروخت کرنا بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے اوراس سے حاصل کردہ کمائی بھی حرام ہے،ایسے لوگوں کواللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

وراثت کے مسائل

ورثاء سے کرائے کا مطالبہ

سوال:

ہمارے والدین کا انتقال ہوچکا ہے، سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ والدین کا ترکہ ایک مکان (گراؤنڈ + دو فلور) ہے، گراؤنڈ فلور کرائے پر ہے، پہلی اور دوسری منزل پر پانچ بھائی رہتے ہیں، دو بیٹے علیحدہ رہائش کیے ہوئے ہیں۔ مکان کا جو کرایہ آتا ہے، سب ورثاء کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ دو بھائی یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ پانچوں بھائی دو منزلوں پر رہتے ہیں، اُس کا کرایہ بھی دیں گے۔ شرعی حکم کیا ہے؟، (شیراز، کورنگی)۔

جواب:

جس قدر جلد ممکن ہو ترکے تقسیم کردینا چاہیے، تقسیم میں تاخیر بہت سے مفاسد اور پیچیدگیوں کا سبب بنتی ہے۔ آپ کے والدین کا تمام ترکہ بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا۔

تمام ورثاء کو حقِ وراثت حاصل ہے اور اپنے اپنے حصوں کے بقدر تمام ورثاء جائیداد میں تصرف کا حق رکھتے ہیں۔ آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ ورثاء میں سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں، جن میں سے پانچ بیٹے اُس مکان میں رہتے ہیں، تقسیمِ ترکہ کے نتیجے میں جتنی جگہ اُن کے حصے میں آتی ہے، اُسی قدر تصرُّف کا اختیار اُنہیں حاصل ہے، دوسرے ورثاء کے حصے میں اُن کی اجازت کے بغیر تصرُّف نہیں کرسکتے۔ اگر بغیر اجازت دوسرے ورثاء کے حصے کو برتا، تو اُن کے مطالبے پر اُس جگہ کا کرایہ دینا ہوگا۔ لیکن اگر پانچ بیٹے دوسرے ورثاء کی اجازت سے رہتے رہے ہیں یا اُنہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ اُن کی طرف سے تبرع اور احسان سمجھا جائے گا اور ان پر کسی قسم کا کوئی کرایہ لازم نہیں ہوگا۔

ترکے میں پوتوں کے حصے کی شرعی حیثیت

سوال:

بیٹے کے انتقال کے بعد اس کے بچوں کا دادا کے ترکے میں کتنا حصہ ہے، جبکہ وہ بیٹا والد کی حیات میں وفات پاچکا ہو؟، (محمد یوسف)۔

جواب:

کسی شخص کے انتقال کے بعد اُس کے جو ورثاء حیات ہیں، ترکہ اُن کے درمیان قرآن کریم میں بیان کیے ہوئے اَحکامِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے صاحبِ اولاد بیٹے کا اس کی زندگی میں انتقال ہوچکا ہے اور اس کی دیگر اولاد (بیٹے بیٹیاں) موجود ہیں، تو اس شخص کی وفات کے بعد اس فوت شدہ بیٹے کی اولاد (پوتے پوتیوں) کو اس کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''، اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(مَنْ أَدْلٰی بِشَخْصٍ لَایَرِثُ مَعَهٗ) کَابْنِ الْاِبْنِ لَایَرِثُ مَعَ الْاِبْنِ۔

ترجمہ: ''ہر وہ شخص جس کو میت سے کسی شخص کے ذریعہ سے تعلق ہو، وہ اس درمیانی شخص کی موجودگی میں وراثت سے محروم رہے گا، جیسے کہ پوتا، بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں بنے گا، (جلد 10، ص:435، بیروت)''۔ تاہم اگر ورثاء حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اولاد کو بطور استحسان کچھ دے دیں، تو اجر پائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا''۔

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتیم اور مسکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے)، تو انہیں بھی (رضاکارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء:8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصدِ خیر کے لیے سفارش اور مشاورت کی ہے، لہٰذا جتنا حصہ فوت شدہ بیٹے کے حیات ہونے کی صورت میں اُسے مل سکتا تھا، اگر تمام ورثاء اتفاقِ رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرُّع اور استحسان کے طور پر تقسیم ترکہ کے موقع پر ان بچوں کو بطور ہبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔

قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے:

''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا''۔

ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنے پیچھے) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے ہیں، تو انہیں ان کے (رُلنے اور خوار ہونے کا) اندیشہ لاحق ہوگا، سو اُنہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء:9)''۔ پس قرآن نے بتایا کہ لوگ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیمِ وراثت کے وقت ان کی مدد کر لیا کریں۔

ہبہ کے شرعی اصول

سوال:

ہبہ کا شرعی اصول بتائیے، کیا اسلامی قوانین میں شامل ہے؟۔

جواب:

بلا معاوضہ تبرُّع واحسان کے طور پر کوئی چیز کسی کو دی جائے، تو اسے ''ہبہ'' (Gift) کہتے ہیں۔ ہبہ کرنے والے کو ''واہب'' (Donor) اور جسے ہبہ کیا جائے اسے ''مَوهُوب لَهٗ'' کہتے ہیں اور جو چیز ہبہ کی جائے، اُسے ''موہوب'' (Gifted) کہتے ہیں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(وَشَرَائِطُ صِحَّتِهَا فِي الْوَاهِبِ: اَلْعَقْلُ وَالْبُلُوْغُ وَالْمِلْكُ فَلَا تَصِحُّ هِبَةُ صَغِيْرٍ وَرَقِيْقٍ

وَلَوْ مُكَاتِبًا (وَ) شَرَائِطُ صِحَّتِهَا (فِي الْمَوْهُوبِ أَنْ يَكُوْنَ مَقْبُوْضًا غَيْرَ مُشَاعٍ مُمَيَّزًا غَيْرَ مَشْغُوْلٍ وَ رُكْنُهَا) هُوَ (اَلْإِيْجَابُ وَالْقَبُوْلُ)"۔

ترجمہ:''ہبہ صحیح ہونے کی چند شرائط ہیں: واہب (ہبہ کرنے والا) عاقل، بالغ اور اس شے کا مالک ہو۔ پس نابالغ اور غلام، اگرچہ مکاتب ہو، کا ہبہ صحیح نہیں ہے اور جو چیز ہبہ کی جارہی ہے، وہ (موجود ہو)، قبضہ میں ہو، مشاع نہ ہو، ممیز ہو، مشغول نہ ہو اور ہبہ کے ارکان ایجاب وقبول ہیں، (جلد 8، ص:424)''۔ ہبہ کے صحیح ہونے کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں، ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

(الف) جو چیز ہبہ کی جارہی ہے، وہ واہب کے قبضے میں ہو (ب) ایک سے زائد افراد کی کوئی ایسی مشترکہ ملکیت نہ ہو جو ابھی تقسیم نہیں ہوئی یا وہ ناقابلِ تقسیم ہے (ج) اس کے اپنے یا غیر کے زیرِ استعمال نہ ہو (د) وہ چیز بالکل واضح اور نمایاں ہو، مبہم نہ ہو۔

جی ہاں! ہبہ اسلامی قوانین کا حصہ ہے۔ ہبہ اُس وقت صحیح ہے، جب واہب کی زندگی میں مَوْهُوْب لَہٗ قبضہ کرلے، قبضہ سے پہلے واہب فوت ہوگیا، تو ہبہ باطل ہوگیا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَاِذَا مَاتَ الْوَاهِبُ قَبْلَ التَّسْلِيْمِ بَطَلَتْ"۔

ترجمہ:''اگر واہب موہوب لہ کے (شے پر) قبضے سے پہلے وفات پاجائے تو ہبہ باطل ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:400)''۔

ہبہ کے لیے ضروری ہے کہ موہوب لہٗ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ بھی کرلے، اس طرح ہبہ تام (مکمل) ہوجاتا ہے اور وہ شے واہب کی ملکیت سے نکل کر موہوب لہٗ کی ملکیت بن جاتی ہے، اسے اس پر مالکانہ تصرُّف کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ حقیقی قبضہ سے مراد یہ ہے کہ عملاً (Physically) موہوب لہٗ موہوب شے پر قبضہ کرلے اور حکمی قبضے سے مراد یہ ہے کہ واہب اس چیز کو اپنے قبضے اور تصرُّف سے خالی کردے تاکہ موہوب لہٗ کے قبضہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"قَالَ فِي "التَّتَارخَانِيَة": قَدْ ذَكَرْنَا اَنَّ الْهِبَةَ لَاتَتِمُّ اِلاَّ بِالْقَبْضِ وَالْقَبْضُ نَوعَانِ حَقِيقِيٌّ وَأَنّه ظَاهِرٌ وَحُكْمِيٌّ وَذٰلِكَ بِالتَّخْلِيَةِ"۔

ترجمہ: "تتارخانیہ میں ہے: ہم ذکر کر چکے ہیں کہ بے شک ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی: وہ تو ظاہر ہے اور (۲) حکمی تو وہ تخلیہ سے ہوتا ہے، (منحۃ الخالق علی حاشیۃ بحر الرائق، جلد 7، ص: 486)"۔ تخلیہ سے مراد یہ ہے کہ واہب ہبہ کی ہوئی چیز کو اپنے استعمال، تصرُّف اور قبضے سے فارغ کردے تاکہ جس شخص کو یہ ہبہ کی گئی ہے، وہ اس پر قبضہ کرسکے اور اس قبضے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

"ہبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث مبارک ہے:

"حَدَّثَنِي النُّعْمَانُ بْنُ بَشِيرٍ، أَنَّ أُمَّهُ بِنْتَ رَوَاحَةَ، سَأَلَتْ أَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهِبَةِ مِنْ مَالِهِ لِابْنِهَا، فَالْتَوَى بِهَا سَنَةً ثُمَّ بَدَا لَهُ، فَقَالَتْ: لَا أَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَا وَهَبْتَ لِابْنِي، فَأَخَذَ أَبِي بِيَدِي وَأَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ، فَأَتٰى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ أُمَّ هٰذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ أَعْجَبَهَا أَنْ أُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِي وَهَبْتُ لِابْنِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا بَشِيرُ أَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا؟، قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ: أَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهُ مِثْلَ هٰذَا؟، قَالَ لَا، قَالَ: فَلَا تُشْهِدْنِي إِذًا، فَإِنِّي لَا أَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ"۔

ترجمہ: "نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد (بشیر) سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ انکے بیٹے (نعمان) کو ہبہ کر دیں، میرے والد ایک سال تک اس معاملے کو ٹالتے رہے، پھر انھیں اس کا خیال آیا (اور انہوں نے نعمان کو ہبہ دے دیا)، تو میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو گواہ نہ بنالو۔ پس میرے

والد نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، پس وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! (میں نے اس بیٹے کو ہبہ کیا ہے) اس کی ماں بنتِ رواحہ کو یہ بات پسند ہے کہ میں اپنے بیٹے کو دیے گئے اس ہبے پر آپ کو گواہ بناؤں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے ساری اولاد کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انہوں نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر مجھے اس پر گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، (صحیح مسلم: 4104)"۔

دوسری حدیث میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَكُلَّ بَنِيكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟، قَالَ: لَا، قَالَ: فَأَشْهِدْ عَلَى هٰذَا غَيْرِي، ثُمَّ قَالَ أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟، قَالَ: بَلٰى، قَالَ: فَلَا إِذًا"۔

ترجمہ: "کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو اتنا دیا ہے جتنا نعمان کو دیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو (اس پر مجھے گواہ نہ بناؤ بلکہ) اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ یکساں طور پر نیک برتاؤ کرے؟، اُنھوں نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) کیوں نہیں!، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر (تم بھی) ایسا نہ کرو، (یعنی تم بھی اپنی اولاد کے ساتھ یکساں سلوک کرو)، (صحیح مسلم: 4073)"۔

ان احادیثِ مبارکہ سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو بیٹے اور بیٹی کی تمیز کے بغیر تمام اولاد کو برابر دے، ورنہ آپ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ فقہِ حنفی میں یہ حکم ایجابی تو نہیں ہے، البتہ استحبابی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے پسند فرمایا ہے۔ البتہ باپ کسی خاص ترجیحی وجہ کی بنا پر اولاد میں سے کسی ایک کو ہبہ میں زیادہ حصہ دے سکتا ہے، مثلاً: کوئی دینداری اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ ہے یا والدین کا زیادہ خدمت گزار ہے یا علم میں فائق ہے یا معذور ہے یا معاشی

اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں کمزور ہے۔

سیونگ سرٹیفکیٹس میں نامزدگی حیثیت

سوال:

ہمارے والد ایاز راشدی کا دسمبر 2016ء کو انتقال ہوا، ورثاء میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ترکے میں ایک مکان اور نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں۔ مکان کی تقسیم میں کوئی تنازعہ نہیں ہے، البتہ سیونگ سرٹیفکیٹس میں دونوں بیٹوں، ایک نواسا، تین پوتیاں اور ایک بہو کو نامزد کیا ہے۔ نواسے کو 12 لاکھ، تین پوتیوں کو 26 لاکھ اور بہو کو دو لاکھ روپے نامزد کیے ہیں، جبکہ دونوں بیٹوں میں سے بڑے بیٹے کو تیس لاکھ روپے اور دوسرے بیٹے کو بیس لاکھ روپے نامزد کیے ہیں، بیوہ اور بیٹی کو محروم رکھا ہے، کیا یہ عمل درست ہے اور بیٹی اور بیوہ کو اس میں سے حصہ ملے گا؟۔

نوٹ: سرٹیفکیٹس کی مالیت ایک کروڑ دس لاکھ روپے ہے، (امرین راشدی، کلفٹن کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی وفات یافتہ شخص کے ترکے کو تقسیم کرنے سے قبل تین قسم کے مصارف وضع کئے جاتے ہیں: (۱) مصارف تکفین وتدفین (2) وفات یافتہ شخص کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس کی ادائیگی (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک وصیت کا نفاذ، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مقررہ تناسب سے تقسیم ہوتا ہے۔ آپ کے والد کا کل ترکہ 40 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 5 حصے ملیں گے اور بقیہ ترکے سے ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت دو بیٹوں کو 28 حصے (فی کس 14 حصے) اور ایک بیٹی کو 7 حصے ملیں گے۔

سیونگ سرٹیفکیٹس میں نامزدگی کی حیثیت وصیت کی ہے، کیونکہ اپنی زندگی میں تو

سرٹیفکیٹ ہولڈر خود تصرُّف کرتا ہے، قومی بچت کا ادارہ نامزدگی اس لیے مانگتا ہے کہ سرٹیفکیٹ ہولڈر کی وفات کی صورت میں اس کی جمع شدہ رقم نامزد کیے گئے افراد (Nominees) کو دی جاسکے۔ اصولی طور پر ہر قسم کے سیونگز سرٹیفکیٹس کی بابت یہ قانون بنایا جانا چاہیے کہ سرٹیفکیٹ ہولڈر کی وفات کی صورت میں یہ رقم اس کے شرعی ورثاء کو دی جائے گی، جیسا کہ بینک اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم کے بارے میں ہوتا ہے، البتہ وہ کسی غیر وارث کو کل یا جمع شدہ رقم کے لیے نامزد کرنا چاہے، تو کل ترکے کے تہائی حد تک وہ وصیت نافذ العمل ہوگی، لیکن وارث کے حق میں وہ وصیت کالعدم قرار پائے گی۔ رہا یہ سوال کہ وارث کون کون لوگ ہیں، اس کا تعین کسی شخص کی وفات پر ہی ہوسکتا ہے، پہلے نہیں، کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ پہلے کون مرے گا اور بعد میں کون؟، یہ فقط اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

وصیت صرف تہائی ترکے کی حد تک جائز ہے، مگر وارث کے حق میں وصیت شرعاً معتبر نہیں، حدیث پاک میں ہے:

''سَمِعتُ أَبَا أُمَامَةَ، سَمِعتُ رَسُولَ اللّٰہ ﷺ یَقُولُ: اِنَّ اللّٰہَ قَدْ أَعطٰی کُلَّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ: ''ابوامامہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 2862)''۔ یعنی بیٹے، بیٹیاں شرعی وارث ہیں، وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رَد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

نواسا، پوتیاں اور بہو چونکہ وارث نہیں ہیں، اس لیے ان کو جتنی رقم کے لیے نامزد کیا گیا ہے، اگر وہ پوری رقم فوت شدہ شخص کے مجموعی ترکے کی ایک تہائی کے برابر یا اس سے کم ہے، تو وہ وصیت کے مطابق وہ اس رقم کے حق دار ہیں۔ سرٹیفکیٹس کی بقیہ رقم کو مجموعی ترکے میں شامل کرکے مذکورہ بالا تناسب کے مطابق سب وارثوں کو پورا حصہ دیا جائے، بیوہ اور

بیٹی کو ترکے کے کسی حصے سے محروم رکھنا درست نہیں ہے۔

والد کی اولاد کے حق میں وصیت

سوال:

صاحب حیثیت والد صاحب نے اپنی زندگی میں کچھ بچوں کی شادی کردی اور زبانی وصیت کی کہ اگر وہ فوت ہوجائیں تو اُن کے ترکہ میں سے پہلے باقی بچوں کی شادی کے اخراجات کئے جائیں پھر باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ اس وصیت کی شرعی حیثیت کیا ہے، یہ وصیت جائز ہے یا نہیں۔ اگر ترکہ پہلے تقسیم ہونا ہے تو پھر غیر شادی شدہ بچوں کے شادی کے اخراجات کس کی رقم سے ہونگے، (محمد سرور، راولپنڈی)۔

جواب:

سب سے پہلے یہ بات جان لیجیے کہ وارث کے حق میں وصیت شرعاً معتبر نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

''اِنَّ اللہَ قَدْ أَعطٰی کُلَّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد: 2862)''۔ یعنی بیٹے، بیٹیاں شرعی وارث ہیں، وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

شادی کا خرچہ ترکے سے منہا نہیں کیا جائے گا، شادی کے مصارف والد یا دیگر ورثاء کے ذمے لازم نہیں تھے۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''شادی کا صَرف (خرچ) مانگنا محض بے معنی ہے، جس کی شریعت میں کچھ اصل نہیں، مصارفِ شادی زید پر دَین (قرض) نہ تھے کہ اُس کے ترکے سے لئے جائیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 170)''۔ یہ وصیت شرعاً معتبر نہیں ہے اور شادی کے اخراجات اُن کے اپنے مال سے کیے جائیں۔ والد اپنی بعض اولاد کی شادی پر جو رقم خرچ

کر چکے ہیں، یہ تبرُّع اور ہبہ ہے۔لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں غیر شادی شدہ بچوں کو فی کس اُتنی ہی رقم ہبہ کر کے انہیں اُس کا مالک بنادیں، یہ شرعاً درست اور مبنی بر انصاف ہوگا اور اس سے اولاد کے درمیان عدمِ انصاف بھی لازم نہیں آئے گا۔

مُطلقہ عورت وارث نہیں بنتی

سوال:

ایک آدمی کی بیٹی تین ماہ کی تھی، تب اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور دُوسری شادی کر لی جس سے اولاد بھی ہوئی۔پہلی طلاق شدہ عورت نے بھی دوسری شادی کر لی اور اُس کی بھی اولاد ہوئی۔وہ آدمی فوت ہوگیا ہے، کیا اس کے ترکہ میں پہلی بیٹی کے ساتھ اُس کی ماں کا بھی حصّہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کتنا ہے، (محمد سرور، راولپنڈی)۔

جواب:

وفات یافتہ شخص کا ترکہ اُس کے ورثاء میں اسلام کے قوانینِ وراثت کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے، طلاق یافتہ عورت کو عدت گزرنے اور نکاح سے نکلنے کے بعد سابق شوہر کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا۔انتقال کے وقت جو عورت اُس شخص کے نکاح میں تھی، وہی وراثت میں حصہ پائے گی۔چونکہ میت کی اولاد موجود ہے، لہٰذا بیوہ کو کل ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا اور بقیہ ترکہ بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت تقسیم ہوگا۔اس شخص کی سابق بیوی سے جو بیٹی ہے، وہ دوسری اولاد کے ساتھ وارث بنے گی اور اپنے حصے کی حق دار ہوگی۔البتہ ایک صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ اپنی بیوی کو اپنے مرضِ وفات میں طلاق بائن دیدے اور عدّت کے اندر شوہر کا انتقال بھی ہوجائے، تو وہ مُطلّقہ بائنہ بھی اپنے شوہر کی وارث بنے گی۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

''وَاِذَا طَلَّقَ الرَّجُلُ اِمْرَأَتَهٗ فِيْ مَرَضِ مَوْتِهٖ طَلَاقًا بَائِنًا، فَمَاتَ وَهِيَ فِي الْعِدَّةِ، وَرِثَتْهُ،

وَاِنْ مَاتَ بَعْدَ اِنْقِضَاءِ الْعِدَّةِ، فَلَا مِيْرَاثَ لَهَا"۔

ترجمہ: ''اور جب کوئی شخص اپنی بیوی کو مرض موت میں طلاق بائن دیدے اور (مطلّقہ بیوی کی) عدّت کے دوران شوہر فوت ہوجائے تو وہ عورت اپنے شوہر کے ترکے سے حصہ پائے گی اور اگر اُس شخص کا انتقال عدت گزرنے کے بعد ہو تو عورت کو ترکے سے کچھ بھی نہیں ملے گا، (فتح القدیر، جلد 4،ص:129)''۔ یہ استثنائی حکم اس لیے ہے کہ شاید شوہر نے اپنی بیوی کو ترکے سے محروم کرنے کے لیے اپنے مرضِ وفات میں طلاق دی ہو اور اسلام دوسرے کو ضرر پہنچانے سے روکتا ہے۔

صدرالشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مرضِ وفات میں طلاقِ معلّق کی کئی صورتیں بیان کی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''مریض نے طلاق بائن کسی غیر کے فعل پر معلق کی مثلاً اگر فلاں یہ کام کرے گا تو میری عورت کو طلاق ہے اگرچہ وہ غیر خود اِن دونوں کی اولاد ہو یا کسی وقت کے آنے پر تعلیق ہو، مثلاً: جب فلاں وقت آئے تو تجھ کو طلاق ہے اور تعلیق اور شرط کا پایا جانا دونوں حالت مرض میں ہیں یا اپنے کسی کام کرنے پر طلاق معلق کی، مثلاً: اگر میں یہ کام کروں تو میری عورت کو طلاق ہے اور تعلیق وشرط دونوں مرض میں ہیں یا تعلیق صحت میں ہو اور شرط کا پایا جانا مرض میں یا عورت کے کسی کام کرنے پر معلق کی اور وہ کام ایسا ہے جس کا کرنا شرعاً یا طبعاً ضروری ہے، مثلاً: اگر تو کھائے گی یا نماز پڑھے گی اور تعلیق وشرط دونوں مرض میں ہوں یا صرف شرط (مرض میں پائی جائے)، تو اِن صورتوں میں عورت وارث ہوگی اور اگر فعل غیر یا کسی وقت کے آنے پر معلق کی اور تعلیق وشرط دونوں یا فقط تعلیق صحت میں ہو یا عورت کے فعل پر معلق کیا اور وہ فعل ایسا نہیں جس کا کرنا عورت کے لیے ضروری ہو تو اِن تمام صورتوں میں وارث نہیں، (بہارِ شریعت، حصہ:8،ص:166، مکتبۃ المدینہ کراچی)''۔

اپنی زندگی میں وصیت سے رجوع کرنے کا حکم

سوال:

محمد شفیق مرحوم نے 9 سال پہلے ایک وصیت لکھی تھی، پھر ایک دن مجھ سے کہا کہ وہ وصیت پرانی ہوگئی ہے، میں نئی وصیت کرنا چاہتا ہوں اور اپنے حقیقی بھائی کو دو کمروں کا فلیٹ دینے کے بعد بقیہ جائیداد کسی ٹرسٹ یا دینی مدرسہ کو دوں گا۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟۔ محمد شفیق کنوارے تھے، صرف ایک چھوٹا بھائی محمد رفیق حیات تھا، جس کا اُن کے بعد انتقال ہوا، اولاد کوئی نہیں تھی، اُس کی بیوہ اور دونوں بھائیوں کی ایک باپ شریک بہن ہے، (م۔ سجاول)۔

جواب:

آپ کے بقول محمد شفیق نے اپنی زندگی میں اپنی وصیت کو تبدیل کر دیا تھا، جس کا اظہار اُنہوں نے آپ سے کیا، وصیت کرنے والا اپنی وصیت سے رجوع کر سکتا ہے اور اُس کے وصیت سے رجوع کرنے کی صورت میں وہ پہلی وصیت باطل ہو جائے گی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

”وَيَصِحُّ لِلْمُوْصِيْ الرُّجُوْعُ عَنِ الْوَصِيَّةِ، ثُمَّ الرُّجُوْعُ قَدْ يَثْبُتُ صَرِيْحاً وَقَدْ يَثْبُتُ دَلَالَةً، فَالْاَوَّلُ بِاَنْ يَّقُوْلَ رَجَعْتُ اَوْنَحْوَهُ، وَالثَّانِيْ بِاَنْ يَّفْعَلَ فِعْلاً يَدُلُّ عَلَى الرُّجُوْعِ، ثُمَّ كُلُّ فِعْلٍ لَوْفَعَلَهُ الْاِنْسَانُ فِيْ مِلْكِ الْغَيْرِ يَنْقَطِعُ بِهِ حَقُّ الْمَالِكِ، فَاِذَا فَعَلَهُ الْمُوْصِيْ كَانَ رُجُوْعًا۔۔۔۔۔ وَكَذَا كُلُّ تَصَرُّفٍ اَوْجَبَ زَوَالَ مِلْكِ الْمُوْصِيْ فَهُوَ رُجُوْعٌ“۔

ترجمہ: ”وصیت کرنے والے کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے، یہ رجوع کبھی صراحۃً ہوتا ہے اور کبھی دلالۃً ہوتا ہے۔ صریح کی صورت یہ ہے کہ صاف لفظوں میں کہے: ”میں نے اپنی وصیت سے رجوع کیا“ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ کہے“۔ دلالۃً رجوع یہ ہے: کوئی ایسا عمل کرے جو رجوع کرنے پر دلالت کرتا ہے، (اس کے لیے قاعدۂ کلیہ یہ ہے:) کہ ہر ایسا فعل جس کے ذریعے اُس چیز کو پہلے ”موصٰی لہٗ“ (یعنی جس کے حق میں وصیت کی گئی تھی) کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے تصرُّف میں دیدے کہ اِس سے اُس کا اپنا مالکانہ حق

ختم ہوجائے، اگر مُوصی (یعنی وصیت کرنے والا) ایسا کام کرے، تو یہ اُس کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا ہوگا (مثلاً: اس نے وصیت کی کہ میرے بعد یہ مکان یا دکان یا گاڑی فلاں کی ہوگی اور پھر ان چیزوں کو فروخت کردیا یا کسی اور کو ھبہ کردیا)۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اور اسی طرح مُوصی (وصیت کرنے والے) کا ہر وہ تصرف جس کے ذریعے اُس کی مِلکیت وصیت کی ہوئی چیز سے زائل ہوجائے، تو یہ بھی رجوع ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6،ص:90 تا 92)''۔اگر محمد شفیق نے کسی مدرسے یا ٹرسٹ کے لیے وصیت کی ہے، تو کل ترکے کے صرف ایک تہائی حصے کی حد تک وہ وصیت نافذ ہوگی۔ مرحوم کا چھوٹا بھائی محمد رفیق اُن کا وارث ہے، لہٰذا اس کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

''اِنَّ اللهَ قَدْ أَعطٰی کُلّ ذِی حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ:''بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد:2862)''۔پس تقسیمِ وراثت کے ابتدائی لازمی امور نمٹانے کے بعد محمد شفیق کا کل ترکہ اس کے بھائی محمد رفیق کو ملے گا، اب جبکہ محمد رفیق کا بھی انتقال ہوگیا ہے تو محمد رفیق کے کل ترکے میں سے چوتھائی حصہ اُس کی بیوہ کو اور بقیہ ترکہ اُس کی باپ شریک (علاّتی) بہن کو ملے گا۔ اسلامی قانونِ وراثت کا اصول یہ ہے کہ اگر ایک کسی کا وارث تھا، یعنی مُورِث (وراثت چھوڑ کر فوت ہونے والے) کی وفات کے وقت وہ حیات تھا، مگر تقسیم ترکہ سے پہلے وہ فوت ہوگیا، تو اسے زندہ فرض کرکے پہلے ترکہ اس کے نام منتقل ہوگا اور اس کی وفات کے وقت جو ورثاء زندہ تھے، پھر ان کو ملے گا۔

ہبہ کا ایک مسئلہ

سوال: ایک شخص نے ایک کمرشل جائیداد اپنی بیوی کے نام سے خریدی، لیکن تا حال تمام

اختیارات، تمام آمدنی شوہر کے پاس رہتی ہے۔ بیوی کو نہ کوئی اختیار تھا اور نہ ہی کوئی نفع ملتا تھا۔ اب بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، شوہر حیات ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا یہ جائیداد تقسیم ہوگی؟۔ فوت شدہ خاتون کے ورثاء میں شوہر، ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، (عبداللہ، لاہور)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر یہ جائیداد خاتون کی ملکیت تھی، تو تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی: کل ترکہ 20 حصوں میں منقسم ہوگا، شوہر کو 5 حصے ایک بیٹے کو 6 حصے اور تینوں بیٹیوں کو 9 حصے (فی کس 3 حصے) ملیں گے۔

لیکن اگر مذکورہ جائیداد کی ملکیت خاتون کو نہیں دی گئی تھی اور تمام اختیارات شوہر کے پاس ہی تھے، صرف قانونی ضرورت کے لیے انہوں نے یہ جائیداد اپنی بیوی کے نام کردی تھی اور قبضہ اور تصرُّف کا حق نہیں دیا تھا، تو یہ ہبہ (Gift) نامکمل ہے اور شرعاً مؤثر نہیں ہے۔ اس صورت میں وہ شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کا خود مالک ہے، ان سے کسی کو تقسیمِ وراثت کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، بعد میں ان کے انتقال کے وقت جو اولاد (بیٹا اور بیٹیاں) حیات ہوں گے، وہ اسلامی قانون وراثت کے مطابق اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

زندگی میں صرف ایک بیٹے کو ہبہ کرنا اور دوسروں کو محروم رکھنا

سوال:

ایک مفتی صاحب سے سوال کیا گیا: ''میرا ایک بیٹا فرماں بردار اور ایک گستاخ اور نافرمان ہے، میں اپنے فرماں بردار بیٹے کے نام زندگی میں اپنی ملکیتی زمین کا تیسرا حصہ کرنا چاہتا ہوں، بقیہ زمین میرے انتقال کے بعد قانون کے مطابق تمام ورثاء کے نام منتقل ہوجائے گی، سوال یہ ہے کہ کیا شرعی اور قانونی طور پر اپنے ایک بچے کے نام اپنی ملکیتی زمین کا تیسرا حصہ منتقل کرسکتا ہوں؟''۔ انہوں نے جواب میں لکھا: ''فرماں بردار اولاد کو عطیہ دینا اور نافرمان اولاد کو محروم رکھنا ازروئے شرع درست ہے''۔ اس کے برخلاف ہم

نے پڑھا اور سنا ہے کہ بیویوں اور اولاد کے درمیان مساوات برتنا چاہیے، آپ سے شرعی رہنمائی کی درخواست ہے،(منور احمد، ملیر کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں اس کا مال بطور ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتا، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے پسندیدہ اَمر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' (Gift) کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی تعلیم دی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث مبارک ہے:

''حَدَّثَنِي النُّعْمَانُ بْنُ بَشِيرٍ، أَنَّ أُمَّهُ بِنْتَ رَوَاحَةَ، سَأَلَتْ أَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهِبَةِ مِنْ مَالِهِ لِابْنِهَا، فَالْتَوَى بِهَا سَنَةً ثُمَّ بَدَا لَهُ، فَقَالَتْ: لَا أَرْضَى حَتَّى تُشْهِدَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَا وَهَبْتَ لِابْنِي، فَأَخَذَ أَبِي بِيَدِي وَأَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ، فَأَتَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ أُمَّ هٰذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ أَعْجَبَهَا أَنْ أُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِي وَهَبْتُ لِابْنِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا بَشِيرُ أَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا؟، قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ: أَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهُ مِثْلَ هٰذَا؟، قَالَ: لَا، قَالَ: فَلَا تُشْهِدْنِي إِذًا، فَإِنِّي لَا أَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ''۔

ترجمہ: ''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد (بشیر) سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ انکے بیٹے (نعمان) کو ہبہ کر دیں، میرے والد ایک سال تک اس معاملے کو ٹالتے رہے، پھر انھیں اس کا خیال آیا (اور انہوں نے نعمان کو ہبہ دے دیا)، تو میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گواہ نہ بنالو۔ پس میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس

حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! (میں نے اس بیٹے کو ہبہ کیا ہے) اس کی ماں بنتِ رواحہ کو یہ بات پسند ہے کہ میں اپنے بیٹے کو دیے گئے اس ہبے پر آپ کو گواہ بناؤں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے ساری اولاد کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انہوں نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر مجھے اس پر گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، (صحیح مسلم:4104)"۔

دوسری حدیث میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَكُلَّ بَنِيكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟، قَالَ:لَا، قَالَ:فَأَشْهِدْ عَلَى هٰذَا غَيْرِي، ثُمَّ قَالَ أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟، قَالَ:بَلٰى، قَالَ:فَلَا إِذًا"۔

ترجمہ: "کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو اتنا دیا ہے جتنا نعمان کو دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو (اس پر مجھے گواہ نہ بناؤ بلکہ) اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ یکساں طور پر نیک برتاؤ کرے؟، اُنھوں نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) کیوں نہیں!، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر (تم بھی) ایسا نہ کرو، (یعنی تم بھی اپنی اولاد کے ساتھ یکساں سلوک کرو)، (صحیح مسلم:4073)"۔ ان احادیثِ مبارکہ سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو بیٹے اور بیٹی کی تمیز کے بغیر تمام اولاد کو برابر دے، ورنہ آپ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے، فقہِ حنفی میں یہ حکم ایجابی تو نہیں ہے، البتہ استحبابی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے پسند فرمایا ہے۔ البتہ باپ کسی خاص ترجیحی وجہ کی بنا پر اولاد میں سے کسی ایک کو ہبہ میں زیادہ حصہ دے سکتا ہے، مثلاً: کوئی دینداری اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ ہے یا والدین کا زیادہ خدمت گزار ہے یا علم میں فائق ہے یا معذور ہے یا معاشی اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں کمزور ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْوَهَبَ رَجُلٌ شَيْئًا لِأَوْلَادِهٖ فِي الصِّحَةِ وَأَرَادَ تَفْضِيْلَ بَعْضٍ عَلَى الْبَعْضِ فِيْ ذٰلِكَ، لَارِوَايَةَ لِهٰذَا فِي الْأَصْلِ عَنْ أَصْحَابِنَا، وَرُوِيَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَّهٗ لَابَأْسَ بِهٖ إِذَا كَانَ التَّفْضِيْلُ لِزِيَادَةِ فَضْلٍ لَهٗ فِي الدِّيْنِ وَإِنْ كَانَا سَوَاءً يُكْرَهُ، وَرَوَى الْمُعَلّٰى عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَّهٗ لَابَأْسَ بِهٖ إِذَا لَمْ يَقْصُدْ بِهِ الْإِضْرَارَ، وَإِنْ قَصَدَ بِهِ الْإِضْرَارَ سَوّٰى بَيْنَهُمْ يُعْطِي الْإِبْنَةَ مِثْلَ مَايُعْطِيْ لِلْإِبْنِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى هٰكَذَا فِيْ فَتَاوٰى ''قَاضِيْخَان'' وَهُوَالْمُخْتَارُ كَذَا فِي ''الظَّهِيْرِيَّة''۔

ترجمہ: ''اگر کوئی اپنی صحت کے عالم میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے اور اس میں بعض کو بعض پر ترجیح دینا چاہے، ہمارے اصحاب سے اصل (یعنی مبسوط) میں اس کی بابت کوئی روایت منقول نہیں ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: اگر (اولاد میں سے) کسی کو ترجیح دینے کا سبب اس کی زیادہ دین داری ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر دونوں (یا سب) دین داری میں برابر ہوں تو پھر کسی (ایک) کو ترجیح دینا مکروہ ہے۔ اور ''المعلیٰ'' نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: اگر مقصد کسی ایک کو نقصان پہنچانا نہیں ہے، تو کسی ایک کو کچھ زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے تو پھر بیٹے بیٹی سب کو برابر دے اور اسی پر فتویٰ ہے اور ''فتاویٰ قاضی خان'' میں بھی اسی طرح ہے اور یہی مختار ہے، ''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''وَإِنْ كَانَ فِيْ وُلْدِهٖ فَاسِقٌ لَايَنْبَغِيْ أَنْ يُعْطِيَهٗ أَكْثَرَ مِنْ قُوْتِهٖ كَيْلَا يَصِيْرَ مُعِيْنًا لَهٗ فِي الْمَعْصِيَةِ كَذَا فِي ''خِزَانَةِ الْمُفْتِيْنَ''، وَلَوْكَانَ وَلَدُهٗ فَاسِقًا وَأَرَادَ أَنْ يَصْرِفَ مَالَهٗ إِلٰى وُجُوْهِ الْخَيْرِ وَيَحْرِمَهٗ عَنِ الْمِيْرَاثِ، هٰذَا خَيْرٌ مِنْ تَرْكِهٖ كَذَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ: ''اگر اس کی اولاد میں کوئی بیٹا فاسق ہے، تو اس کی قوت (یا ضرورت) سے زیادہ نہ دے تاکہ معصیت میں اعانت کا سبب نہ بنے، ''خزانۃ المفتین'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر اس کا بیٹا فاسق ہے اور وہ اپنے مال کو نیکی کے کاموں میں صرف کرنا چاہتا ہے، تو مال

چھوڑ کر جانے سے ایسی فاسق اولاد کو وراثت سے محروم کردینا بہتر ہے، جیسا کہ "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص: 391)"۔

فتاویٰ عالمگیری کی اِس عبارت کی رو سے جب ہبہ کرتے وقت دین داری اور تقویٰ کی بنا پر اولاد میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جاسکتی ہے تو کسی کی معذوری یا معاشی بدحالی (مثلاً کثیرالاولاد اور قلیل الوسائل ہونے) کی بنا پر بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے اور اسی طرح اولاد میں سے جو ماں باپ کا بہت زیادہ فرماں بردار اور خدمت گزار ہے یا جو خود بھی ماں باپ پر زیادہ خرچ کرتا ہے، اس کے لیے بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے، لیکن محض جنس یا صنف کی بناء پر ترجیح بہرحال ناپسندیدہ ہے۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"یُکْرَہُ تَفْضِیْلَ بَعْضِ الْاَوْلَادِ عَلَی الْبَعْضِ فِی الْھِبَۃِ حَالَۃَ الصِّحَّۃِ اِلَّالِزِیَادَۃِ فَضْلٍ لَہٗ فِی الدِّیْنِ، وَاِنْ وَھَبَ مَالَہٗ کُلَّہٗ لِوَاحِدٍ جَازَ قَضَاءً وَھُوَآثِمٌ، کَذَافِی "الْمُحِیط"۔

ترجمہ: "حالتِ صحت میں بعض اولاد کو بعض پر ہبہ میں ترجیح دینا مکروہ ہے، سوائے اس کے کہ ترجیح دینے کا سبب اس کی دین داری ہو، اور اگر اپنا تمام مال کسی ایک کو ہبہ کردیا تو قضاءً جائز ہے (یعنی یہ فیصلہ نافذ ہوجائے گا)، لیکن (دیانۃً) گنہگار ہوگا، جیسا کہ "محیط" میں ہے، (البحرالرائق، جلد 7، ص: 490)"۔

تاہم کسی وارث کو محروم کرنے کی نیت سے ایسا کرنا ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے، حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ فَرَّ مِنْ مِیْرَاثِ وَارِثِہٖ، قَطَعَ اللہُ مِیْرَاثَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ"۔ ترجمہ: "جو شخص اپنے وارث کو وراثت (پہنچنے) سے راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی میراث جنت سے قطع فرمادے گا، (سنن ابن ماجہ: 2703)"۔

ایک طویل حدیث میں سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حجۃ الوداع کے سال میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی

اور دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میری ایک ہی بیٹی ہے، کیا میں اپنے مال سے تین حصے صدقہ کروں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، حضرت سعد نے پوچھا: نصف (صدقہ کروں) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، پھر فرمایا: ''اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَبِیْرٌ أَوْ کَثِیْرٌ اِنَّکَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ أَغْنِیَاءَ، خَیْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ، وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِی بِهَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا أُجِرْتَ بِهَا حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِی فِیِّ امْرَأَتِکَ''۔

ترجمہ: ''تہائی (صدقہ کرو) اور تہائی بھی بہت ہے، زیادہ ہے، تمہارا اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑنا، اُس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگ دست چھوڑ کر مرو اور وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو کچھ خرچ کرو گے، اُس پر تمہیں اجر ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو (اُس پر بھی اجر ہے)، (صحیح بخاری: 1295)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی ترکہ میں چھوڑ کر فوت ہوجاتا ہے اور اس کے ورثاء اس سے فیض یاب ہوتے ہیں، تو اس پر بھی اسے اجر ملے گا۔ اگر مطلقاً مال جمع کرنا عیب ہوتا تو زکوٰۃ اور وراثت کے اَحکام کا کوئی مقصد باقی نہ رہتا۔ ہبہ میں اولاد میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے یا کسی کو بالکل محروم کردینے کا شرعی اعتبار سے معقول سبب ہونا چاہیے، محض ضرر رسانی مقصود نہیں ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''صِلْ مَنْ قَطَعَکَ، وَقُلِ الْحَقَّ وَلَوْعَلٰی نَفْسِکَ، وَأَحْسِنْ اِلٰی مَنْ أَسَاءَ اِلَیْکَ''۔

ترجمہ: ''جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے، اُس سے تعلق جوڑو اور حق بات کہو، خواہ اس کی زد تمہاری اپنی ذات پر پڑے اور جو تمہارے ساتھ برا کرے، اس کے ساتھ اچھا کرو، (معجم ابن الاعرابی: 1507)''۔

الغرض اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات پسندیدہ ہے اور معقول سبب کی بنا پر کسی کو ترجیح دینے کی گنجائش ہے، بیوی اور اولاد کے درمیان مساوات لازم نہیں ہے، بیوی کو جتنا

چاہے ہبہ کرسکتا ہے، البتہ اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کی کسی دوسری بیوی سے اولاد کو سوتیلے پن کی وجہ سے محروم کرنا چاہے یا کم دلانے کی کوشش کرے، تو یہ قطع رحمی ہے اور شرعاً ناپسندیدہ ہے۔ بعض اولاد اور ورثاء کو جان بوجھ کر تنگ دست چھوڑنے کو بھی رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا، پس توازن واعتدال پسندیدہ شعار ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: ''زید کے دو دختر اور دو پسر ہیں، وہ چاہتا ہے کہ اپنا مال اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں ان چاروں کو عطا کرے، آیا برابر تقسیم کرے یا وراثت کے اصول پر کرے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''پوچھی گئی صورت میں مُفتیٰ بہٖ قول کے مطابق افضل یہی ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں سب کو برابر دے، امام ابویوسف کا قول یہی ہے اور امام محمد کا قول کہ'' وراثت کے اصول پر مرد کو دو عورتوں کے برابر دے''، بھی ممنوع و ناجائز نہیں، اگرچہ ترکِ اولیٰ ہے، ردّالمحتار میں ہے:

''علامہ خیر الدین رملی کہتے ہیں: فتویٰ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے کہ مرد اور عورت کو برابر برابر دینا ہے، یہ تقسیم امام محمد کے قول سے افضل ہے جس میں عورت کو مرد سے آدھا ملتا ہے''۔ علامہ احمد بن محمد طحطاوی درّ مختار کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

''(امام محمد کے نزدیک) بیٹے اور بیٹی کو ہبہ دینے میں میراث کے اصول پر تین حصے کرنا افضل ہے اور (امام ابویوسف کے نزدیک) دونوں کو برابر دینا قولِ مختار ہے''۔ بالجملہ اختلاف افضلیت میں ہے اور مذہبِ مختار پر (بیٹے بیٹی کو) برابر دینا اولیٰ ہے، ہاں اگر بعض اولاد فضلِ دینی میں بعض سے زائد ہو، تو اس کی ترجیح میں اصلاً بات نہیں۔

علامہ طحطاوی نے فرمایا: ''اولاد درجہ میں برابر ہو، تو کسی ایک کو زیادہ دینا مکروہ ہے، جیسا کہ منحٔ اور ہندیہ میں ہے، لیکن اگر اولاد درجہ میں مساوی نہ ہو، مثلاً ایک (کل وقتی) علمِ دین میں مشغول ہے اور کسب نہیں کرتا، تو اس کو دوسروں پر فضیلت دینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ ملتقط میں ہے، یعنی مکروہ نہیں ہے۔ اور منحٔ میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے

کہ جب کوئی دین میں فضیلت رکھتا ہو،تو اُسے (ہبہ میں) فضیلت دینے میں کوئی حرج نہیں،(فتاویٰ رضویہ،ج:19،ص:232۔231)''۔

ترکے کا ایک مسئلہ

سوال:

میرے والد نے دوشادیاں کیں تھیں،ان کی وفات 1992ء میں ہوئی،اس وقت دونوں بیویاں حیات تھیں،میری حقیقی والدہ کا انتقال 2011ء میں ہوا،دوسری والدہ کی کوئی اولاد نہیں ہے،جبکہ میری حقیقی والدہ سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں،ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی،(فرخندہ جبیں)۔

جواب:

آپ کے والد کا ترکہ 16 حصوں میں منقسم ہوگا،اس میں سے ہر بیوہ کو ایک ایک حصہ (مجموعی طور پر 2 حصے)،دونوں بیٹوں کو 8 حصے(فی کس 4 حصے) اور تین بیٹیوں کو 6 حصے(دو دو حصے) ملیں گے۔آپ کی حقیقی والدہ کا ترکہ 7 حصوں میں تقسیم ہوگا،دونوں بیٹوں کو 4 حصے(فی کس 2 حصے) اور تین بیٹیوں کو تین حصے(ہر بیٹی کو ایک ایک حصہ) ملے گا۔

ترکے کا مسئلہ

سوال:

ایک شخص کا انتقال ہوا۔اس کے انتقال کے وقت اس کے مندرجہ ذیل ورثاء تھے: ایک بیوہ،ایک بیٹی،دو بھائی اور ایک بہن(جو فوت ہوگئی) ہے،اس شخص کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا،(بابر اقبال،کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''وَاِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ''۔

ترجمہ:''اور اگر فوت شدہ شخص کی صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ (کل ترکے کا) نصف ہے،(النساء:11)''۔

''فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم''۔

ترجمہ: ''اور اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہارے ترکے میں سے اُن (بیویوں) کا آٹھواں حصہ ہے، (النساء:12)''۔

فوت شدہ شخص کے کل ترکے سے آٹھواں حصہ اُس کی بیوہ کو ملے گا، ایک بیٹی کو کل ترکے کا نصف ملے گا اور بقیہ ترکہ بھائی بہن کے درمیان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنثَيَيْن'' (لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النسا:11) کے تحت تقسیم ہوگا۔ آپ نے سوال میں یہ نہیں لکھا کہ بہن کا انتقال بھائی کی زندگی میں ہوا یا اُس کے انتقال کے بعد؟، دونوں صورتوں میں ترکے کی تقسیم جدا جدا ہوگی۔ اگر فوت شدہ بہن اُس شخص کے انتقال کے وقت حیات تھی اور بعد میں وہ وفات پا گئیں تو تقسیم حسبِ ذیل ہوگی:

کل ترکے کے 40 حصے بنیں گے، بیوہ کو 5 حصے، بیٹی کو 20 حصے، دو بھائیوں کو 12 حصے (فی کس 6 حصے) اور ایک بہن کو 3 حصے ملیں گے۔ پھر فوت شدہ بہن کا حصہ اُس کے ان وارثوں میں تقسیم ہوگا، جو ان کی وفات کے وقت زندہ تھے۔ اگر بہن اُس شخص کی زندگی میں وفات پا چکی تھی، تو پھر ترکہ 16 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ کو 2 حصے، بیٹی کو 8 حصے اور دونوں بھائیوں کو 6 حصے (فی کس 3 حصے) ملیں گے۔ وراثت کے سوالات بھیجنے والوں سے گزارش ہے کہ کسی وفات یافتہ شخص کے ترکے کی تقسیم کی بابت سوال کرتے وقت ان تمام وارثوں کی تفصیل بتایا کریں، جو اُس کی وفات کے وقت حیات تھے، خواہ ان میں سے کوئی بعد میں ترکے کی تقسیم سے پہلے وفات پا گیا ہو، کیونکہ پھر اسے زندہ فرض کرکے اس کا حصہ طے ہوگا اور پھر بعد میں اس کا حصہ اس کے اُن شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا، جو اس کی وفات کے وقت موجود تھے۔ اگر وفات کی تاریخیں لکھ دی جائیں، تو مزید آسانی ہوتی ہے۔

وراثت کا مسئلہ

سوال:

ایک صاحب کا انتقال ہوا، ورثاء میں ایک بیٹا اور ایک بیوہ ہے، ترکہ کس طرح تقسیم

ہوگا؟،(ندیم احمد)۔

جواب:

ورثاء کے درمیان ترکے کی تقسیم سے قبل کے ضروری اُمور نمٹانے کے بعد ترکے کے آٹھ حصے کیے جائیں گے،ان میں سے ایک حصہ بیوہ کو ملے گا اور بقیہ سات حصے بطور عصبہ کے بیٹے کو ملیں گے۔

اولاد کی موجودگی میں دادا کی وراثت میں پوتوں کا حق نہیں

سوال:

ہمارے بڑے بھائی کا 1976ء میں انتقال ہوگیا تھا،اُس وقت والد صاحب حیات تھے۔عدت مکمل کرنے کے بعد بھابھی اپنی ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو لے کر میکے چلی گئی تھیں،پھر کچھ عرصہ بعد انہوں نے شادی کرلی۔ بھائی کی بیٹی شادی شدہ ہے اور بیٹے کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ والد کا ترکہ ایک مکان ہے، بھابھی اور اُن کے دونوں بچوں کا مسلسل اصرار ہے کہ ہمیں، ہمارا حق دیا جائے۔کیا اِس گھر میں اُن کا کوئی حصہ بنتا ہے؟،(سید راحت علی،سید اختر علی)۔

جواب:

جس بیٹے کا انتقال والد سے پہلے ہوا،اُسے یا اُس کی اولاد کو ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''،اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں۔تاہم اگر آپ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اولاد کو بطور استحسان کچھ دے دیں،تو اجر پائیں گے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا''۔

ترجمہ:''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے)،تو انہیں بھی (رضاکارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے

دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء:8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصد خیر کے لیے سفارش اور مشاورت کی ہے۔ لہٰذا جتنا حصہ آپ کے والد کی وفات کے وقت آپ کے بڑے بھائی کے حیات ہونے کی صورت میں انہیں ملنا چاہیے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاقِ رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرُّعاً اور استحساناً رضا کارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان بچوں کو بطور ہبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔ قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے:

''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْتَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا''۔

ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنی وفات) کے بعد (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے، تو اُنہیں اُن (کے رُلنے) کا خوف ہوتا، تو اُنہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء:9)''۔

الغرض قرآن نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کر لیا کرو۔ تاہم چونکہ آپ کے فوت شدہ بھائی کی اولاد شرعاً وارث نہیں ہے، اس لیے انہیں وراثت میں حصہ پانے کے لیے مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

متفرق مسائل

غیر آلِ رسول کے لیے سید کا استعمال

سوال:

کسی بزرگ کے نام کے ساتھ معنوی لحاظ سے ''سید'' لکھا یا بولا جائے، تو جائز ہے یا نہیں؟۔ (عثمان اعوان، سولجر بازار)۔

جواب:

سید کے لغوی معنیٰ ''سردار'' کے ہیں۔ علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

''اَلسَّیِّدُ: اَلرَّبُّ، اَلْمَالِکُ، اَلْفَاضِلُ، اَلْکَرِیْمُ ، اَلْحَلِیْمُ مُتَحَمِّلُ اَذٰی قَوْمِہٖ، اَلزَّوْجُ، اَلرَّئِیْسُ، اَلْمُقَدَّمُ''۔

ترجمہ: ''سید کا معنی ہے: پالنے والا، مالک صاحبِ شرف، صاحب فضیلت، کریم، بردبار، اپنی قوم کی خاطر تکلیف برداشت کرنے والا، خاوند، رئیس، سب سے آگے رہنے والا، (لسان العرب، جلد 6، ص:422)''۔

سید مرتضیٰ حسین زبیدی لکھتے ہیں:

''اَلسَّیِّدُ الَّذِیْ فَاقَ غَیْرَہٗ بِالْعَقْلِ وَالْمَالِ وَالدَّفْعِ وَالنَّفْعِ ، اَلْمُعْطِیْ لَہٗ فِیْ حُقُوْقِہٖ، اَلْمُعِیْنُ بِنَفْسِہٖ، اَلسِّیَادَۃُ الشَّرَفُ، اَلسَّیِّدُ اَلرَّئِیْسُ، اَلَّذِیْ لَایَغْلِبُہٗ غَضَبُہٗ، اَلْعَابِدُ، اَلْوَرَعُ اَلْحَلِیْمُ، سُمِّیَ سَیِّدٌ لِاَنَّہٗ یَسُوْدُ سُوَادَ النَّاسِ، اَلسَّیِّدُ الْکَرِیْمُ، اَلسَّیِّدُ اَلْمَلِکُ، اَلسَّیِّدُ السَّخِیُّ سَادَۃٌ''۔

ترجمہ: ''سید وہ جو دوسروں پر عقل و مال کے حساب سے، تکلیف دور کرنے اور فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے فائق ہو، دوسروں کو حقوق دینے والا ہو، اپنی ذات سے مدد کرے۔ سیادت کا معنی بزرگی، سید ایسا رئیس (سردار) جس پر غصہ غالب نہ ہو، عبادت گزار، پرہیزگار، برداشت کرنے والا۔ اس کو سید اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی جماعت کا رہنما ہوتا ہے۔ سید کریم، سید بادشاہ، سید سخی، اس کی جمع سادۃ ہے، (تاج العروس شرح۔

القاموس، جلد 2، ص:384)''۔
قرآنِ کریم میں شرافت وسیادت دینی کے لیے ''سید'' کا کلمہ آیا ہے:
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
(۱) ''اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ''۔
ترجمہ:''(اے زکریا!) بے شک اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو (عیسیٰ) کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے، سردار، عورتوں سے بہت بچنے والے اور صالح نبی ہوں گے، (آل عمران:39)''۔
اِسی طرح دنیاوی سیادت کے لیے بھی یہ کلمہ آیا ہے:
(۲) ''وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا''۔
ترجمہ:''اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی، سو اُنہوں نے ہمیں گمراہ کردیا، (الاحزاب:67)''۔
رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی سیادت وشرف دینی اور حضرت حسن کے لیے بھی یہ کلمہ استعمال فرمایا ہے:
(۱) ''عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ، وَبِيَدِي لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ''۔
ترجمہ:''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں قیامت کے دن (تمام) اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور میں فخر نہیں کرتا اور قیامت کے دن لواءِ حمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اس پر فخر نہیں کرتا، (سنن ترمذی:3615)''۔
(۲) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ، وَأَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ''۔
ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں قیامت

کے دن (تمام) اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا، سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی، (صحیح مسلم: 2278، سنن ابوداؤد: 4673)''۔

(۴) ''عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، قَالَ قَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، وَنَظَرَ إِلَى ابْنِهِ الْحَسَنِ، فَقَالَ إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ كَمَا سَمَّاهُ النَّبِيُّ ﷺ ''۔

ترجمہ: ''ابواسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: یہ میرا بیٹا سردار ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے اس کا نام رکھا، (سنن ابوداؤد: 4290)''۔

اس معنیٰ میں حدیث پاک میں منافق کو سید کہنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ منافق کا اکرام اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کا سبب ہے:

(۵) ''لَا تَقُولُوا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ، فَإِنَّهُ إِنْ يَكُ سَيِّدًا فَقَدْ أَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ''۔

ترجمہ: ''کسی منافق شخص کو ''سید'' نہ کہو، پس اگر تم نے اسے سردار بنایا تو تم نے اپنے رب کو ناراض کیا، (سنن ابوداؤد: 4977)''۔ اس حدیث کی شرح میں محدثین نے لکھا ہے: اگر وہ ظاہری معنی کے اعتبار سے سردار ہے، یعنی اُس کے خدام ہیں، مال ہے، تو بھی اس منافق کی تعظیم کر کے تم نے اللہ کو ناراض کیا، کیونکہ منافق قابلِ تعظیم نہیں ہوتا اور اگر وہ ظاہری معنی کے اعتبار سے بھی ایسا نہیں ہے، تو تم نے اُسے سردار کہہ کر اللہ کو ناراض بھی کیا اور جھوٹ بھی بولا جو پہلی صورت سے بھی زیادہ قبیح بات ہے۔

(۶) ''رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک چھ سال تھی، آپ کے چچا ابوطالب آپ کو ملکِ شام لے گئے، وہاں ایک عیسائی راہب نے آپ کو دیکھا اور رسول اللہ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑ کر کہا: ''هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ، هٰذَا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ، يَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ''۔

ترجمہ: 'یہ دو عالم کے سردار ہیں، یہ رَبُّ الْعَالَمِیْن کے رسول ہیں، اللہ نے ان کو رَحْمَةٌ

لِلْعٰلَمِیْن بنا کر بھیجا ہے، (سنن ترمذی:3620)''۔

حدیث مبارک میں یوم جمعہ کو بھی سید الایام فرمایا گیا ہے:

(۷) ''قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ یَوْمَ الْجُمُعَةِ سَیِّدُ الْأَیَّامِ وَأَعْظَمُھَا عِنْدَ اللّٰہِ''۔

ترجمہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بے شک جمعہ دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظمت والا ہے، (سنن ابن ماجہ:1084)''۔

لیکن ہمارے اس خطے (پاک وہند) میں یہ عرف رائج ہے کہ آلِ رسول یعنی آلِ علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما کو ''سید'' کہا جاتا ہے، ہمارے عُرف میں اُنہیں ''سادات'' کہتے ہیں اور عرف شرعاً معتبر ہوتا ہے، اس لیے کسی بزرگ کے لیے سید کا استعمال مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس سے مُتَبادَر اِلَی الفَھْم آلِ رسول ہونا ہوتا ہے اور غیر آلِ رسول کا اپنے آپ کو آلِ رسول کے طور پر متعارف کرنا یا کروانا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ادّعاءِ باطل (Void) ہے۔ روزمرّہ اور محاورے میں کسی شخص کے اِکرام کے لیے محترم یا جناب کے الفاظ مستعمل ہیں، انگریزی میں Sir، اور ہندی میں شِری وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں، اسی طرح آج کل عالَمِ عرب میں ''سید'' جناب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، ہوائی اڈے اور ہوائی جہاز میں اعلان کے وقت خواتین وحضرات یا Ladies & Gentlemen کی جگہ ''سیّداتی وساداتی'' بولا جاتا ہے۔

قرآن کریم، احادیث اور لغاتِ عرب (قدیم وجدید) میں لفظ سید جس طرح اللہ کے نیک بندوں کے لیے استعمال ہوا ہے، اسی طرح غیر مسلم زُعماء کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِھِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْھُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا''۔

ترجمہ: ''جس دن اُن (جہنمیوں) کے چہرے (باربار) آگ میں پلٹے جائیں گے، (تب) وہ کہیں گے: کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں (سَادَتَنَا) اور اپنے بڑوں کا کہا مانا، تو انہوں نے ہمیں گمراہ کردیا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت فرما، (الاحزاب:68-66)''۔ حدیث پاک میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے (انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کے لیے فرمایا): ''قُوْمُوْا لِسَيِّدِكُمْ''، ترجمہ: اپنے (سید) سردار کے لیے کھڑے ہوجاؤ، (صحیح بخاری:3043)''۔

جس طرح دنیاوی جاہ ومرتبہ اور مال ودولت کے سبب کسی کو سردار کہایا مانا جاتا ہے، اسی طرح علم، تقویٰ، روحانی، ایمانی اور اُخروی سرداری پر بھی دلالت کرتا ہے۔ البتہ اپنی ذات کی طرف نسبت کرکے ''سیدی فلاں'' کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس کے معنیٰ ہوں گے: ''میرے سردار، میرے بزرگ اور میرے آقا'' کے ہیں۔

سوفٹ ویئر کے ذریعے انسانی شکل کو کارٹون میں تبدیل کرنا

سوال:

آج کل ایک سوفٹ ویئر ہے جس کا نام ''Prisma'' ہے، اس کے ذریعے تصویر کو بگاڑا جاتا ہے اور کارٹون کی شکل میں اور دیگر مختلف شکلوں میں لوگ شوق سے اپنی اور دوستوں کی تصویریں بناتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟، (صاحبزادہ محمد شعیب معینی)۔

جواب:

انسانی صورت کو بگاڑ کر اُسے قابلِ تضحیک بنانا قطعاً درست نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا مذاق بنانا ہے اور انسانی اَقدار کے منافی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آزادیِ اظہارِ رائے کے نام پر لوگوں کے کارٹون بنانا اور اُن کی تضحیک کے لیے ہر حد کو عبور کرلینا معمول بن چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ''۔ ترجمہ: ''اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی،

(الاعراف:11)''۔حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خَلَقَ اللهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی (پسندیدہ) صورت پر پیدا کیا ہے، (صحیح البخاری:6227)''۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ، فَإِنَّ اللهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ''۔

ترجمہ:''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے جھگڑے تو (چہرے پر) مارنے سے بچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی (پسندیدہ) صورت پر پیدا کیا ہے، (صحیح مسلم:2612)''۔اس حدیث پاک میں انسانی تکریم کے سبب چہرے پر مارنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

کسی کا تمسخر اُڑانا یا برے القاب سے پکارنا گناہ ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ''۔

ترجمہ:''اے ایمان والو! مردوں کا کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو، ایمان کے بعد فاسق کہلانا کتنا برا نام ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں، (الحجرات:11)''۔مذکورہ سوفٹ ویئر کے ذریعے شکل بگاڑنا گویا اُس کی تضحیک کرنا یا تمسخر اڑانا ہی ہے۔

حدیث پاک میں کسی مسلمان کی تحقیر کو شر سے تعبیر فرمایا ہے:''بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ''۔ترجمہ:''کسی مسلمان کے شریر ہونے کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے

کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ،(صحیح مسلم:2564)''۔

عورتوں کے پرفیوم لگانے کا حکم

سوال:

میرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں عورت کو پرفیوم لگانے کی ممانعت ہے؟ کچھ جاننے والے حدیث کا حوالہ دے کہ کہتے ہیں کہ عورت کا پرفیوم لگانا جائز نہیں،(جاوید رجب)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:''عَنْ أَبِي مُوسٰى، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: كُلُّ عَيْنٍ زَانِيَةٌ، وَالمَرْأَةُ إِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالمَجْلِسِ فَهِيَ كَذَا وَكَذَا يَعْنِي زَانِيَةً''۔

ترجمہ:''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر (اجنبیہ کی طرف شہوت کی نیت سے دیکھنے والی) آنکھ زنا کرنے والی ہے اور جو عورت عطر لگا کر (مخلوط) مجلس میں جائے تو وہ ایسی اور ایسی ہے، یعنی زانیہ ہے،(کیونکہ وہ غیر محرم مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے والی ہے)،(سنن ترمذی:2786)''۔

عورت کا زیب وزینت اور آرائش سے مطلوب شوہر کا دل لبھانا ہو، تو شرعاً جائز ہے، لیکن مردوزن کی مخلوط مجالس میں خوشبویات کا استعمال لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہوتو یہ محرّکاتِ زنا میں سے ہونے کی بنا پر ممنوع ہے۔

گالی دینا فسق ہے

سوال:

کیا منبر رسول پر بیٹھ کر کسی شخص کا دوسرے کو گالیاں دینا جائز ہے،(محمد شفیق باروی)۔

جواب:

محراب ومنبر وعظ ونصیحت کا مقام ہے، دعوت وتبلیغِ دین کا کام انبیاء علیہم السلام کی سنّت

ہے، جس کا اسلوب قرآن نے یوں بیان کیا:

''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ''۔

ترجمہ: ''آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے اور احسن طریقہ کے ساتھ ان پر حجت قائم کیجیے، (النحل:125)''۔

حدیث پاک میں ہے: ''سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ''۔

ترجمہ: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور (انسانی جان کی حرمت کو حلال جان کر) اُسے قتل کرنا کفر ہے، (صحیح البخاری:48، صحیح مسلم:64)''۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کو گالی دے، حدیث پاک میں گالی دینے کو فسق فرمایا، گالی دینے والا فاسق ہے۔ منبرِ رسول ﷺ کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، فاسق اس مقام کا اہل نہیں، منبر پر بیٹھ کر گالیاں دینے والا قوم کا مُصلح ہرگز نہیں ہوسکتا۔

شراب کے کاروبار کی ممانعت کا مقدمہ

سوال:

پاکستان میں جب شراب کی حرمت کا قانون نافذ کیا گیا، تو ابتدا میں یہ قانونِ عام (Public Law) تھا۔ بعد میں دوسرے مذاہب، مثلاً مسیحیت، ہندومت اور سکھ مذہب وغیرہ کی آڑ لے کر غیر مسلموں کے نام پر شراب کے لائسنس جاری کیے جانے لگے۔ قرائن وشواہد سے معلوم ہوا کہ اس کاروبار کے پیچھے بعض حریص دولت مند مسلمان ہیں اور غیر مسلموں کا نام اپنے کاروباری منفعت کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ اب غیر مسلموں نے خود عدالت سے رجوع کیا ہے کہ ہم شراب کی حرمت کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں اور ہماری آڑ میں منشیات کا جو کاروبار کیا جارہا ہے، اِس چور دروازے کو بند کیا جائے۔ حرام کمانے کے لیے حریص مسلمان ہمارا نام ناجائز طور پر استعمال کررہے ہیں، آپ شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں تاکہ ہم عدالت میں اس موقف کو پیش کرسکیں، (محمد علی شیخ، پاکستان فلاح پارٹی، کراچی)۔

ب:
دستورِ پاکستان کا آرٹیکل نمبر 2 واضح طور پر قرار دیتا ہے: ''اسلام پاکستان کا ریاستی مذہب ... آرٹیکل 2A میں قراردادِ مقاصد کو ریاست کے اساسی قانون (Subtantive La... کا درجہ دے دیا گیا ہے اور قراردادِ مقاصد میں کہا گیا ہے: اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیتِ اعلیٰ ...تعالیٰ کے لیے خاص ہے اور مسلمان اللہ کی زمین پر اُس کے نائب کی حیثیت سے اُس کے ...کام وقوانین یعنی شریعتِ اسلامی کو نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ آرٹیکل 227 میں قرار دیا گیا ہے: ''قرآن وسُنّت کے مُنافی کوئی قانون سازی نہیں ہوگی اور تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسُنّت کے مطابق بنایا جائے گا''۔ یعنی اگر ریاست میں نافذ کوئی قانون یا قانون کا کوئی جز قرآن وسنت کے خلاف ہے، تو اُسے منسوخ یا تبدیل کر کے قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ دستور کا آرٹیکل 31 ریاست کو اس بات کا پابند بناتا ہے: ''پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور نظریات کے مطابق گزارنے کے لیے ریاست تمام ضروری اقدامات کرے گی''۔

خنزیر اور شراب اسلام میں حرامِ قطعی ہیں اور اسلام کے تمام مکاتبِ فکر کے نزدیک یہ اَمر اجماعی اور مُسلّمہ ہے، لٰہذا ریاست کی ذمے داری ہے کہ پاکستان کے اندر خنزیر اور شراب کی ممانعت کے لیے ضروری قانون سازی کرے اور اُسے سختی سے نافذ کرے۔ یہ اسلامی ریاست کا قانونِ عام یعنی Public Law ہے اور اِس کا اِطلاق مسلم اور غیر مسلم تمام شہریوں پر بلاامتیاز ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی روایت رہی ہے کہ ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتی ہے، وہ اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہب کے مطابق عبادات ادا کر سکتے ہیں اور ریاست اُن کے اِس حق کا تحفظ کرے گی۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کے نصاریٰ کو جو امان اور ضمان باقاعدہ تحریری دستاویز کی شکل میں دی تھی، وہ اِس کے لیے رہنما اصول ہے اور اُس کا متن درجِ ذیل ہے:

''یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر نے ایلیا (بیت المقدس) کے لوگوں کو عطا کی، یہ امان اُن کی جان و مال، اُن کے کلیساؤں اور اُن کی صلیبوں اور اُن کے ہر بیمار و تندرست اور پوری ملتِ نصاریٰ کے لیے ہے۔ قرار دیا کہ اُن کے کلیساؤں میں نہ کوئی قیام کرے گا، نہ اُنہیں ڈھایا جائے گا، نہ اُن کو نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ ہی اُن کی صلیبوں اور مال میں کچھ کمی کی جائے گی، نہ اُن کے دینی معاملات میں اُن پر جبر کیا جائے گا، نہ اُن میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ ہی کوئی یہودی اُن کے ساتھ بیت المقدس میں رہائش اختیار کر سکے گا۔ اس امان کے عوض اہلِ ایلیا پر لازم ہوگا کہ وہ اہلِ مدائن کی طرح جزیہ دیں۔ اُن میں سے جو روم جانا چاہیں، انہیں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے تک جان و مال کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اُن کے گرجاؤں اور صلیبوں کے لیے امان ہے اور اُن میں سے جو بیت المقدس میں رہنا چاہیں، انہیں وہاں کے دیگر باشندوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ اس تحریری معاہدے پر اللہ تعالیٰ، اُس کے رسولِ مکرم ﷺ، خلفائے کرام اور اہلِ ایمان کی اُس وقت تک ضمانت ہے، جب تک کہ وہ جزیہ دیتے رہیں گے۔ اس معاہدے پر خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ بن سفیان (رضی اللہ عنہم) کو گواہ بنایا گیا اور یہ معاہدہ 15 ہجری میں طے پایا''۔

پاکستان میں موجود غیر اسلامی مذاہب (ہندومت، سکھ مت، مسیحیت، پارسی مذہب وغیرہ) میں سے کسی بھی مذہب میں خنزیر کھانا اور شراب پینا مذہبی اَقدار و تعلیمات کے اعتبار سے لازم نہیں ہے۔ یہ نہایت مَسَرّت و اطمینان کی بات ہے کہ ہندو مذہب، سکھ مذہب اور مسیحی مذہب کے ماننے والوں نے حُرمتِ شراب کے قانون کو بلا امتیاز نافذ کرنے کے لیے سندھ ہائی کورٹ میں استدعا کے لیے باقاعدہ پٹیشن دائر کی ہے۔

پس ہماری نظر میں ہماری اعلیٰ عدلیہ کی آئینی، قانونی اور شرعی ذمے داری ہے کہ اوّلین فرصت میں اس پٹیشن کی سماعت کرے اور اسلام اور دستورِ پاکستان کی روشنی میں اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ بنیادی انسانی حقوق سے متعلق دستور کے آرٹیکل کا اس پر اطلاق اس لیے

نہیں ہوتا کہ شراب نوشی کسی شہری کے بنیادی حقوق میں شامل نہیں ہے۔
اسلام کی رُو سے خمر وخنزیر کی تجارت، اُس سے انتفاع اور اُس میں معاون ومددگار بننا، یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ"۔

ترجمہ: "اللہ نے تم پر جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ صرف مردار، (ذبح کے وقت بہنے والا) خون، سور کا گوشت اور وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، (البقرۃ:173)"۔

(۲) "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾"

ترجمہ: "اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض ناپاک، شیطانی کام ہیں، سو اِن سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نمازوں سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو؟، (المائدۃ:91-90)"۔ اِس آیت میں متعدد محرمات کے ساتھ ملا کر شراب کی حُرمت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ اس کی سنگینی اہلِ ایمان پر واضح ہو جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: (اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ) الآيَةُ عَشْرُ دَلَائِلَ عَلٰى حُرْمَتِهَا

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(قوله عَشْرُ دَلَائِلَ) هِيَ نَظْمُهَا فِي سِلْكِ الْمَيْسِرِ، وَمَا عُطِفَ عَلَيْهِ وَتَسْمِيَتُهَا رِجْسًا وَعَدُّهَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ، وَالْأَمْرُ بِالِاجْتِنَابِ، وَتَعْلِيقُ الْفَلَاحِ بِاجْتِنَابِهَا وَإِرَادَةُ الشَّيْطَانِ إِيقَاعَ الْعَدَاوَةِ بِهَا، وَإِيقَاعُ الْبَغْضَاءِ وَالصَّدُّ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى، وَعَنِ الصَّلَاةِ وَالنَّهْيُ الْبَلِيغُ بِصِيغَةِ الِاسْتِفْهَامِ الْمُؤْذِنِ بِالتَّهْدِيدِ۔

ترجمہ: ''شیخ محمد بن عبداللہ بن تمر تاش الغزّی نے کہا: اس آیت میں شراب کی حُرمت پر دس دلائل ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) شراب کا ذکر جوئے، بت اور فال کے تیروں کے ساتھ کیا ہے (اور یہ سب حرام ہے (2) ان چیزوں کو ناپاک (رِجس) فرمایا (اور ناپاک چیز حرام ہوتی ہے)۔ (۳) ان چیزوں کو شیطانی عمل قرار دیا (اور ہر شیطانی عمل حرام ہوتا ہے)۔ (۴) شراب سے اجتناب کا حکم فرمایا (اور جس سے اجتناب فرض ہو، اس کا ارتکاب حرام ہوتا ہے)۔ (۵) فلاح کو شراب سے اجتناب پر معلق کیا (لہٰذا فلاح کے حصول کے لیے شراب نوشی سے اجتناب فرض اور اس کا ارتکاب حرام ہوا)۔ (٦) شیطان شراب نوشی کے ذریعے اہلِ ایمان میں عداوت پیدا کرتا ہے (اور عداوت حرام ہے اور جو چیز اس کا سبب بنے، وہ بھی حرام ہے)۔ (۷) شراب نوشی کے ذریعے شیطان اہلِ ایمان میں بغض پیدا کرتا ہے (پس بغض حرام اور اس کا سبب بھی حرام ہے)۔ (۸) شیطان شراب نوشی کے ذریعے اللہ کے ذکر سے روکتا ہے (اور یہ فعل حرام ہے اور اس کا سبب بھی حرام ہے)۔ (۹) شیطان شراب نوشی کے ذریعے نماز سے روکتا ہے (اور نماز فرض اور اس سے روکنے کا سبب حرام ہے)۔ (۱۰) اللہ تعالیٰ نے استفہام کے صیغے کے ساتھ (شراب نوشی سے) بلیغ انداز میں نہی فرمائی، (اور اتنے بلیغ انداز میں تہدید محرمات سے روکنے کے لیے ہوتی ہے)، (ردّالمحتار علی الدرالمختار، جلد 10، ص: 27، بیروت)''۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ بِالْمَدِينَةِ، قَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ اللهَ تَعَالَى يُعَرِّضُ بِالْخَمْرِ، وَلَعَلَّ اللهَ سَيُنْزِلُ فِيهَا أَمْرًا، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهَا شَيْءٌ فَلْيَبِعْهُ وَلْيَنْتَفِعْ بِهِ، قَالَ: فَمَا لَبِثْنَا إِلَّا يَسِيرًا، حَتَّى قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللهَ تَعَالَى حَرَّمَ الْخَمْرَ، فَمَنْ أَدْرَكَتْهُ هَذِهِ الْآيَةُ وَعِنْدَهُ مِنْهَا شَيْءٌ فَلَا يَشْرَبْ، وَلَا يَبِعْ، قَالَ: فَاسْتَقْبَلَ النَّاسُ بِمَا كَانَ عِنْدَهُ مِنْهَا فِي

طَرِيقِ الْمَدِينَةِ فَسَفَكُوهَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے شراب (کی حرمت) کا اشارۃً ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ عنقریب اس کے متعلق کوئی (حتمی) حکم نازل فرمائے گا، سوجس شخص کے پاس کچھ شراب ہو وہ اس کو فروخت کر کے اس (کی قیمت) سے فائدہ اٹھالے، حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ہمیں چند روز ہی ہوئے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کردیا ہے، سوجس شخص کو حرمت شراب کی آیت معلوم ہوجائے تو وہ اسے نہ پیے اور نہ فروخت کرے۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ پھر جن لوگوں کے پاس شراب تھی، اُنہوں نے اس کو لاکر مدینہ کے راستوں پر بہادیا، (صحیح مسلم:1578)''۔

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: لَمَّا نَزَلَتِ الْآيَاتُ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاقْتَرَأَهُنَّ عَلَى النَّاسِ، ثُمَّ نَهَى عَنِ التِّجَارَةِ فِي الْخَمْرِ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: جب سورۃ البقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (گھر سے) باہر نکلے اور یہ آیات لوگوں کے سامنے پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خمر کی تجارت سے منع فرمایا، (صحیح مسلم:1580)''۔

خمر کی حرمت کے بارے میں آیات تدریج کے ساتھ نازل ہوئیں اور اس حدیثِ مبارک میں بقرہ:219 کی طرف اشارہ ہے۔

''عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ: إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ''۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتحِ مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں فرمایا: اللہ اور اس کے رسول نے خمر، مردار، خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام کردیا ہے، (صحیح مسلم:1581)''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''لَعَنَ اللہُ الْخَمْرَ، وَشَارِبَهَا، وَسَاقِيَهَا، وَبَائِعَهَا، وَمُبْتَاعَهَا، وَعَاصِرَهَا، وَمُعْتَصِرَهَا، وَحَامِلَهَا، وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ''۔

ترجمہ:''شراب، اس کے پینے والے، پلانے والے، اس کے بیچنے والے اور اس کے خریدنے والے، اس کے کشید کرنے والے اور کشید کرانے والے، اس کے اٹھانے والے اور جس کے لیے اٹھا کر لائی گئی ہے، (سب پر) اللہ نے لعنت فرمائی ہے، (سُنن ابوداؤد: 3669)''۔مسند امام احمد بن حنبل (5390) کی ایک روایت میں ''وَآكِلَ ثَمَنِهَا''(اور اس کی قیمت سے فائدہ اٹھانے والے پر لعنت) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

پرندے پالنے کا حکم

سوال:

پرندے گھر میں رکھنا گناہ تو نہیں، میرے بیٹے کو طوطے رکھنے کا شوق ہے اور میں 2 طوطے گھر میں اس کی ضد پر لے آیا ہوں۔لیکن اب میرے دل میں خیال آیا کہ آپ سے پوچھ لوں کہیں گناہ نہ ہو، (جنید جدون، پیرو خیل)۔

جواب:

پرندے رکھنا اور ان کو پالنا شرعاً جائز ہے اور شرع میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے بھائی ابو عُمیر نے ایک چڑیا پال رکھی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب تشریف لاتے تو پوچھتے:''يَا أَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ نُغَرٌ كَانَ يَلْعَبُ بِهِ''۔

ترجمہ:''اے ابو عمیر! نُغیر (ایک پرندہ) کا کیا ہوا؟، وہ بچہ اُس پرندہ سے کھیلتا تھا، (صحیح بخاری: 6129)''۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت انس کے گھر میں ان کے بھائی نے ایک پرندہ پال رکھا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے بارے میں دریافت فرماتے، مگر آپ نے اسے رکھنے سے منع نہیں فرمایا۔پس معلوم ہوا کہ پرندوں کو گھر میں پالنے کی اجازت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

''إِنَّ فِی الْحَدِیثِ دَلَالَةً عَلٰی جَوَازِ إِمسَاكِ الطَّیْرِ فِی الْقَفَصِ وَنَحوِہٖ وَیَجِبُ عَلٰی مَن حَبَسَ حَیْوَانًا مِنَ الْحَیوَانَاتِ أَنْ یُّحْسِنَ إِلَیهِ وَیُطْعِمَهُ مَا یَحْتَاجُهُ لِقَولِ النَّبِیِّ''۔

ترجمہ: ''اس حدیث سے پرندے کو پنجرے وغیرہ میں بند کرنے کے جواز پر دلیل ملتی ہے۔ پرندے کو رکھنے والے پر واجب ہے کہ وہ اس سے اچھا سلوک کرے اور اسے حسبِ ضرورت خوراک دے، کیونکہ نبی ﷺ نے اس کی بابت ارشاد فرمایا ہے، (عسقلانی، فتح الباری، ج:10، ص:584، دار المعرفۃ بیروت)''۔تو جب پرندوں کو پالنا جائز ہے، تو ان کا کاروبار بھی جائز ہے۔

پرندوں کو پالنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے: اُن کے پالنے میں کسی دوسرے شخص کو تکلیف نہ ہو۔اُن کے ذریعے دوسروں کے پرندوں کو پکڑنا مقصود نہ ہو، اُن کا پنجرہ اتنا بڑا ہو کہ اس میں ان کو اذیت نہ ہو، صفائی اور صحت کا خصوصی خیال رکھا جائے، اُن کی خوراک کا انتظام کیا جائے، کیونکہ ان کو خوراک مہیا نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَبدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ عُذِّبَتِ امرَأَةٌ فِی هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتّٰی مَاتَتْ فَدَخَلَتْ فِیهَا النَّارَ لَاهِیَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا اِذْ حَبَسَتْهَا وَلَاهِیَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عورت کو بلی کے سبب عذاب دیا گیا، جسے اُس نے باندھ کر رکھا یہاں تک کہ وہ مرگئی، وہ عورت اس کے سبب سے جہنم میں داخل ہوئی، کیونکہ اس عورت نے اس بلی کو باندھے رکھا اور اسے کھلایا پلایا نہیں اور نہ اسے آزاد ہی کیا تاکہ وہ کیڑے مکوڑے کھا کر گزارہ کرتی، (صحیح مسلم:2242)''۔

کبوتروں، تیتروں اور بٹیروں کو تجارت یا گھر کی زینت کیلئے رکھا جائے تو جائز ہے، مقابلہ بازی کے لیے پرندے رکھنا جائز نہیں ہے، کبوتر بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی اور مرغ لڑانا وغیرہ سب فضول اور ناجائز مشاغل ہیں۔اگر ان کے مقابلوں میں شرط لگائی جائے،

جس میں ہارنے والا، جیتنے والے کوکوئی چیز یا نقد رقم ادا کرے، تو یہ جوا ہے، جسے قرآن کریم نے حرام، نجس اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ بہر حال ہر وہ مشغلہ جس کو جائز حد سے زیادہ اہمیت دی جائے اور اس سے وقت اور رقم کا ضیاع ہو، وہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يَتْبَعُ حَمَامَةً فَقَالَ شَيْطَانٌ يَتْبَعُ شَيْطَانَةً''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو کبوتر کا پیچھا کرتے دیکھا تو فرمایا: ایک شیطان، دوسرے شیطان کا پیچھا کر رہا ہے، (سُنن ابن ماجہ: 3765)''۔

مذکورہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبوتر بازی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے شیطانی کام سے تعبیر کیا ہے۔ کبوتر کو شیطان اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے مفاسد کی وجہ سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبوتر بازی کی طرح، بٹیر بازی، تیتر بازی، پتنگ بازی بھی فضول اور خطرناک مشغلہ ہے۔ ایک مسلمان کو ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایسے کاموں کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایسے کاموں میں مشغول ہو کر وقت ضائع کرتے ہیں حتیٰ کہ نماز کی بھی پروا نہیں کرتے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(يُكْرَهُ إِمْسَاكُ الْحَمَامَاتِ) وَلَوْ فِي بُرْجِهَا (إِنْ كَانَ يَضُرُّ بِالنَّاسِ) بِنَظَرٍ أَوْ جَلْبٍ وَالِاحْتِيَاطُ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِهَا ثُمَّ يَشْتَرِيَهَا أَوْ تُوهَبَ لَهُ مُجْتَبَى (فَإِنْ كَانَ يُطَيِّرُهَا فَوْقَ السَّطْحِ مُطَّلِعًا عَلَى عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ وَيَكْسِرُ زُجَاجَاتِ النَّاسِ بِرَمْيِهِ تِلْكَ الْحَمَامَاتِ عُزِّرَ وَمُنِعَ أَشَدَّ الْمَنْعِ فَإِنْ لَمْ يَمْتَنِعْ بِذَلِكَ ذَبَحَهَا) أَيْ الْحَمَامَاتِ (الْمُحْتَسِبُ) وَصَرَّحَ فِي الْوَهْبَانِيَّةِ بِوُجُوبِ التَّعْزِيرِ وَذَبْحِ الْحَمَامَاتِ وَلَمْ يُقَيِّدْهُ بِمَا مَرَّ وَلَعَلَّهُ اعْتَمَدَ عَادَتَهُمْ، وَأَمَّا لِلِاسْتِئْنَاسِ فَمُبَاحٌ''۔

ترجمہ:''اور کبوتروں کا رکھنا مکروہ ہے، اگرچہ وہ ڈربوں میں بند ہوں، اگر لوگوں کو نظر یا جلب سے نقصان پہنچے (نظر کا ضرر یہ ہے کہ لوگوں کے مکانات اور عورتوں پر کبوتر باز کی نظر پڑتی ہو اور جلب یہ کہ اس کے کبوتر کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا کبوتر آجائے اور یہ اُس کو پکڑ لے) اور جو غیر کا کبوتر پکڑ لے اور اس کے مالک کو نہ جانتا ہو تو احتیاط یہ ہے کہ اسے کسی ضرورت مند کو صدقہ کردے، پھر اس ضرورت مند سے خرید لے یا تصدق کے بعد اس کو ہبہ کردیا جائے، کبوتر باز انہیں چھت پر اڑاتا ہو اور اس عمل سے غیر محرم عورتوں پر نظر پڑتی ہو، لوگوں کے اموال کو نقصان پہنچتا ہو تو اس کبوتر باز کو تعزیر دی جائے گی، اور سختی سے منع کیا جائے گا، اگر باز نہ آئے تو محتسب کبوتروں کو ذبح کرڈالے اور ''وہبانیہ'' میں کبوتروں کے ذبح کرنے اور تعزیر دیئے جانے کی تصریح ہے، اس پر کسی کے مطلع کرنے کی قید نہیں لگائی شاید ان کی عادت پر اعتماد کیا ہوگا (یعنی ان کے زمانے میں جھانکنے تانکنے اور پتھر پھینکنے کی عادت رہی ہوگی)۔ کبوتر پالنا دفعِ وحشت کے لیے ہے، تو جائز ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:490-489، بیروت)''۔

پرندوں کا کاروبار اور خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ وہ بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں ہوں اور ان کو سپرد کرنے پر قدرت بھی ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''وَیَجُوزُ بَیْعُ الْبَازِی وَالشَّاهِینَ وَالصَّقْرِ وَأَمْثَالِهَا وَالْهِرَّةِ، وَیَضْمَنُ مُتْلِفُهَا، لَا بَیْعُ الْحِدَأَةِ وَالرَّخَمَةِ وَأَمْثَالِهِمَا وَیَجُوزُ بَیْعُ رِیشِهَا، لٰکِنْ فِی الْخَانِیَّةِ بَیْعُ الْکَلْبِ الْمُعَلَّمِ عِنْدَنَا جَائِزٌ، وَکَذَا السِّنَّوْرُ''۔

ترجمہ:''اور باز، شاہین اور شکرے اور ان جیسے دیگر پرندوں اور بلی کی بیع جائز ہے اور اس کے ہلاک ہوجانے کی صورت میں ضمان لازم ہوگا، چیل، گدھ اور ان جیسے دیگر پرندوں کی بیع جائز نہیں ہے، ان کے پروں کی بیع جائز ہے۔ ''خانیہ'' میں ہے: سکھائے ہوئے کتے کی بیع ہمارے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ بلی کی بیع جائز ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 7، ص:191، بیروت)''۔

فری اسٹائل ریسلنگ ، باکسنگ اور جانوروں کے لڑانے کے وہ کھیل جن میں اذیت رسانی ہو اور بعض صورتوں میں جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو، ناجائز ہیں اور ان کو دیکھنا اور لطف اندوز ہونا بھی ناجائز، اور ان پر جوا تو حد درجہ حرام ہے۔ ایسے مشاغل کو صرف اذیت وآزار پسند لوگ ہی فروغ دے سکتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

''نَهٰى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّحْرِيشِ بَيْنَ الْبَهَائِمِ ''۔

ترجمہ:'' رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو جوش دلا کر لڑانے سے منع فرمایا،(سُنن ابوداؤد:2562)''۔

تلاوتِ قرآن کے بارے میں ابتدائی قواعد

سوال:

تجوید اور قراءت میں کیا فرق ہے؟، کیا تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھنا فرض ہے؟، کیا عام طور پر سادہ طریقے سے جو تلاوت قرآن کی جاتی ہے، غلط ہے؟، (منور احمد، ملیر کراچی)۔

جواب:

تمام حروف کو اُن کے مخارج سے اس طرح ادا کرنا کہ ہر حرف دوسرے سے ممتاز اور واضح ہو جائے ،قراءت کہلاتا ہے۔ مخارج اور صفات کے ساتھ حرف کا ادا کرنا اور وقوف کی پہچان حاصل کرنا تجوید کہلاتا ہے۔ تجوید کا لغوی معنیٰ ''اَلتَّحسِينُ وَالِاتيَانُ بِالجَيِّد'' سنوارنا، خوبصورت کرنا اور کسی کام کو عمدگی سے کرنا۔ فیضانِ تجوید (ص:1) میں ہے:

''هُوَعِلْمٌ يُّبْحَثُ فِيهِ عَنْ مَّخَارِجِ الْحُرُوفِ وَصِفَاتِهَا وَعَن طُرُقِ تَصْحِيحِ الْحُرُوفِ وَتَحْسِينِهَا''۔

ترجمہ:''علم تجوید اس علم کا نام ہے، جس میں حروف کے مخارج اور ان کی صفات اور حروف کی صحیح ادائیگی اور تحسین کے بارے میں بحث کی جاتی ہے''۔

علامہ شمس الدین محمد الجزری رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَالاخذُ بِالتَّجوِيدِ حَتمٌ لَّازِمٌ مَنْ لَّمْ يُجَوِّدِ القُرآنَ آثِمٌ
لِاَنَّهٗ بِهٖ الاِلٰهُ أَنْزَلَا وَهٰكَذَا مِنهُ اِلَيْنَا وَصَلَا

ترجمہ: ''تجوید کا حاصل کرنا ضروری اور لازمی ہے، جو قرآن کریم کو تجوید سے نہ پڑھے، وہ گنہگار ہے۔ اس لیے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے تجوید کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ سے ہم تک پہنچا ہے، (المقدمة الجزرية، باب معرفة التجويد، ص:5)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا''۔

ترجمہ: ''اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، (المزمل:4)''۔ ''ترتیل'' کا معنیٰ ہے: کلام کو ٹھہر ٹھہر کر اور خوش اسلوبی سے پڑھنا۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''رتّل'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو مرتب اور منظّم طور پر وارد کرنا اور ''ترتیل'' کا معنیٰ ہے: لفظ کو سہولت اور استقامت کے ساتھ منہ سے نکالنا، (المفردات، جلد 1، ص:249)''۔

ہمارے ہاں تجوید پر قراءت کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ وہ قراءت کے ساتھ قرآن پڑھ رہا ہے، حالانکہ قراءت کا مطلب ''پڑھنا'' ہی ہے، لیکن عموماً لوگ تجوید اور ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھنے کو قراءت کہتے ہیں۔ تجوید کے اصول اور مخارج سے حروف کی صحیح ادائیگی کرنا لازم ہے اور کوئی سادہ تلاوت اس طرح کرتا ہے کہ وہ صفاتِ لازمہ کا خیال رکھتا ہے اور صفاتِ عارضہ میں اس سے کچھ رہ جاتا ہے تو تلاوت ہو جائے گی لیکن بہتر یہ ہے کہ صفاتِ لازمہ و عارضہ دونوں کی رعایت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کی جائے اور لہجے اور خوبصورت آواز کا بھی خیال رکھا جائے۔

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) ''عَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَيِّنُوا الْقُرآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ''۔

ترجمہ: ''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کو اپنی (خوبصورت) آوازوں سے زینت بخشو، (مسند امام احمد بن حنبل: 18494)''۔

(۲)"عَنْ حُذَیفَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: اِقْرَأُوا الْقُرآنَ بِلُحُونِ الْعَرَبِ وَاَصْوَاتِھَا وَاِیَّاکُمْ وَلُحونَ اَھْلِ الْعِشْقِ وَلَحُونَ اَھْلِ الْکِتَابَیْنِ وَسَیَجِیُٔ بَعْدِی قَوْمٌ یُرَجِّعُونَ بِالْقُراٰنِ تَرجِیعَ الْغِنَاءِ وَالنَّوحِ لَایُجَاوِزُ حَنَاجِرَھُمْ مَفْتُونَةٌ قُلُوبُھُمْ وَقُلُوبُ الَّذِیْنَ یُعْجِبُھُمْ شَانُھُمْ (رَوَاہُ الْبَیْھَقِی فِی شُعبِ الاِیمَان)"۔

ترجمہ:"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: قرآن کو اہلِ عرب کے لہجے اور اُن کے انداز میں پڑھو اور فاسقوں کے لہجوں (یعنی راگ رنگ کی طرز پر) اور یہود و نصاریٰ کے لہجوں میں بھی نہ پڑھو اور میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کو گانوں کی دھنوں پر حلق میں گھما گھما کر پڑھیں گے اور نوحہ خوانوں کے انداز میں پڑھیں گے اور یہ قرآن مجید ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، ان کے دل فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اُن لوگوں کے دل بھی آزمائش میں مبتلا ہوں گے جو اُن کے اس انداز کو پسند کرتے ہیں، (امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس کو روایت کیا، شعب الایمان: 2649)"۔

کیونکہ اس صورت میں سننے والوں کی توجہ قرآن کے حسنِ ادا اور معانی پر نہیں ہوگی بلکہ وہ ان کے راگ رنگ اور طرزوں یعنی فن سے محظوظ ہوتے ہیں اور یہ چیز انہیں اصل مقصد (قرآن میں غور وفکر) سے ہٹادیتی ہے۔ چنانچہ طاؤس سے ایک مُرسَل روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال ہوا: وہ کون سی آواز ہے جس سے تلاوت قرآن میں حسن پیدا ہوتا ہے اور اچھی قراءت ہوتی ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب تو اسے قرآن پڑھتا ہوا سنے، تو تجھے نظر آئے کہ اس کے دل میں خشیتِ الٰہی ہے اور حضرت طلق کی تلاوت ایسی ہی تھی، (مشکوٰۃ المصابیح: 2209 بحوالہ سنن دارمی)"۔

باسی روٹی کے بارے میں شرعی حکم

سوال:

کیا شرعی نقطہ نظر سے باسی روٹی کھانا ممنوع ہے، کس روٹی پر "باسی" کا اطلاق ہوگا، (سیّد خوشنود علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

ایک روایت سے رسول اللہ ﷺ کا باسی روٹی تناول فرمانا ثابت ہوتا ہے:

"عَنْ أُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ أَبِي طَالِبٍ قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟، فَقُلْتُ: لَا، إِلَّا كِسَرٌ يَابِسَةٌ وَخَلٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَرِّبِيهِ، فَمَا أَقْفَرَ بَيْتٌ مِنْ أُدْمٍ فِيهِ خَلٌّ"۔

ترجمہ: ''حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور پوچھا: کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟۔ میں نے عرض کی: نہیں، روٹی کے باسی ٹکڑوں اور سرکے کے سوا کچھ نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اسے لے آؤ۔ وہ گھر کبھی سالن سے خالی نہیں ہوگا، جس میں سرکہ موجود ہے، (سُنن ترمذی: 1842)''۔

آپ ﷺ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر میں خشک روٹی کے ٹکڑے کھانے کے لیے سالن دستیاب نہ ہو، تو سرکے سے کام چلایا جاسکتا ہے یا گزارہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اپنے کاشانۂ اقدس میں اکثر تو روٹی بچتی ہی نہیں تھی، بلکہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ پیٹ بھر کر کھایا ہو، جو کچھ میسر ہوتا تناول فرمالیتے۔

رزق اور کھانے پینے کی اشیاء اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں، اس نعمت کی ناشکری بہت بڑا گناہ ہے۔ بچی ہوئی روٹی سالن یا کسی دوسری چیز کو پھینک دینا یہ بھی ناشکری کے ضمن میں آتا ہے، کتنے ایسے لوگ ہیں جو سوکھی ہوئی روٹی کو بھی ترستے ہیں، کتنے ایسے مفلوک الحال ہیں جو مہینوں سالن کو ترستے رہتے ہیں اور کتنے ایسے غریب ہیں جو مہینوں پھلوں کی شکل نہیں دیکھتے۔ بعض لوگ بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے جانوروں کو کھلاتے ہیں، بعض چرند و پرند یا حشرات الارض کے لیے باہر رکھ دیتے ہیں اور بعض دوبارہ کسی نہ کسی چیز میں استعمال کر لیتے ہیں، یہ تینوں طریقے درست اور مفید ہیں۔ عموماً خواتین خشک روٹی کو دوبارہ استعمال کرنے کے لیے متعدد طریقوں سے کام لیتی ہیں۔ اگر روٹی بچ جائے تو دوسرے وقت کم پکائیں اور

بچی ہوئی ساتھ استعمال کرلیں اس میں نہ کوئی قباحت ہے نہ نقصان بلکہ تواضع ہے اور کفایت بھی۔

شام کی روٹی صبح تک اور صبح کی شام تک رہ جائے، تو اسے باسی کہتے ہیں، زیادہ مدت کی کوئی قید نہیں ہے اور باسی روٹی یا سالن کو کھانا جائز ہے۔ البتہ اگر اس پر پھپھوند لگ جائے یا بیکٹیریا لگ جائے، جس کے نتیجے میں وہ مضرِ صحت ہوجاتی ہے، جسے آج کل Food Poisoning کہتے ہیں، تو اس سے اجتناب کریں۔ آج کل گھروں میں ریفریجریٹر ہیں، جن میں کھانے پینے کی اشیاء کئی دنوں تک مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہیں، انہیں گرم کر کے کھایا جاسکتا ہے، اس سے خوراک کا ضیاع اور بے قدری کم ہوگی۔

بہو پر سسر کی خدمت فرض نہیں ہے

سوال:

کیا بہو پر اپنے بوڑھے ساس وسسر کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، آج کل گھروں میں یہ بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے، (نفیس عالم حنفی، کراچی)۔

جواب:

شرعاً بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، لیکن اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ اُنہیں اپنے والدین کی مثل سمجھے اور اُن کی خدمت کرے، تو یہ اس کے لیے باعثِ اجر ہو گا۔ زوجین ایک دوسرے کے والدین کا ادب واحترام کریں تو دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی عزت واحترام بڑھتا ہے۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کا بہترین طریقہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے والدین کو اپنے والدین کی طرح سمجھیں، تو اس سے باہمی احترام کا ماحول پیدا ہوتا ہے، بنیادی طور پر گھروں میں لڑائی جھگڑے کی زیادہ تر وجوہات یہی ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے والدین کو اپنے والدین کی طرح نہیں سمجھتے ہیں، جس کی بنا پر آپس میں نفرتیں جنم لیتی ہیں اور معاملات بڑھتے بڑھتے بعض اوقات میاں بیوی میں علیحدگی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ ایک دوسرے کے والدین

کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض سمجھیں، پھر دیکھیں زندگی کتنی خوشگوار گزرتی ہے۔اس کے باوجود کوئی عورت آمادہ نہ ہو تو ساس سسر اور شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ بیوی کو اس پر مجبور نہ کریں، شوہر کو یہ حق نہیں کہ وہ بیوی کو اپنے والدین یا بھائی بہنوں کے کام پر مجبور کرے۔ اِسی طرح بیوی شوہر کے ماتحت ہوتی ہے اور جائز اُمور میں بیوی پر صرف شوہر کی اطاعت شرعاً لازم ہے، ساس سسر کی اطاعت لازم وضروری نہیں، ان کی اطاعت نہ کرنے پر گناہ نہ ہوگا۔ساس سسر سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی اُن کی خدمت اور دیکھ بھال ممکن ہے یا کم از کم شوہر کو اُن کی خدمت سے نہ روک کر بیوی کسی قدر اُس خدمت میں اپنا حصہ شامل کرسکتی ہے۔

حیلہ کی شرعی حیثیت

سوال:

پی ایل ایس اکاؤنٹ میں سال میں ایک یا دو دفعہ ڈیپازٹ پر فکس منافع یا سود ملتا ہے، وہ ہمارے لیے سود ہے۔ اگر کسی نے مجھے قرض کی رقم ادا کرنی ہے اور میں اسے سود کی رقم ادا کر کے کہوں: یہ میرے لیے سود ہے اور تم یہ سود کی رقم لے لو اور اس میں سے اپنا قرض ادا کر دو جتنا تم کرنا چاہو، کیا یہ درست ہے؟۔دوسرا یہ کہ اگر کسی نے رقم ادا کرنی ہے اور وہ جان بوجھ کے رقم ادا نہیں کرتا، اس کی طرف سے یہ حیلہ کسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟، برائے مہربانی دونوں طریقوں کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں بتائیے۔

جواب:

ترجیحی بنیاد پر پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ سودی اکاؤنٹ ختم کروائیں، اسلامی بینکاری یا کرنٹ اکاؤنٹ کھلوائیں تاکہ سود کے وبال سے بچ سکیں۔سود کی رقم مالِ خبیث اور حرام ہے، اگر خبیث مال آدمی کی ملک میں آجائے تو اس کو اپنی ملک سے نکالنا ضروری ہے، اب دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ اُسے کسی طرح تلف کردے، مثلاً سمندر میں پھینک کر ضائع کردے، دُوسری یہ کہ اپنی مِلک سے خارج کر کے کسی محتاج کو ثواب کی نیت کے بغیر دے دے۔ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت کی شریعت نے اجازت نہیں دی، لہٰذا

دُوسری صورت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ضرورت مند کو دیتے وقت اُس پر ثواب کی نیت نہ رکھے۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں: ''علماء نے یہاں تک فرمایا کہ مال حرام فقیر کو دے کر ثواب کی امید رکھنا کفر ہے اور اگر فقیر کو معلوم ہو کہ اس نے مال حرام دیا ہے اور اس کے لیے دعا کرے اور وہ آمین کہے، تو دونوں نئے سرے سے کلمہ اسلام پڑھیں اور تجدید نکاح کریں۔ محیط و عالمگیریہ و جامع الفصولین وغیرہا میں ہے:

''تَصَدَّقَ عَلَى الْفَقِيْرِ شَيْئًا مِّنَ الْمَالِ الْحَرَامِ وَيَرْجُو الثَّوَابَ كَفَرَ وَلَوْ عَلِمَ بِهِ الْفَقِيْرُ وَدَعَالَهٗ وَاَمَّنَ الْمُعْطِي كَفَرَا''۔

ترجمہ: ''کسی نے مال حرام میں سے کچھ فقیر پر صدقہ کیا اس حال میں کہ وہ اس سے ثواب کی امید کرتا ہے تو کافر ہو گیا اور اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال حرام ہے اس کے باوجود اس نے دینے والے کو دعا دی اور دینے والے نے اس پر آمین کہی، تو دونوں کافر ہو گئے''۔

زرِ حرام والے کو یہ حکم ہوتا ہے کہ جس سے لیا، اُسے واپس دے، وہ نہ رہا تو اس کے وارثوں کو دے، اُن کا پتا نہ چلے تو فقراء پر تصدق کرے، یہ تصدق بطور تبرع و احسان و خیرات نہیں، بلکہ اس لئے کہ مالِ خبیث میں اس کا تصرف حرام ہے اور اُس کا پتا نہیں، جسے واپس دیا جاتا، لٰہذا دفعِ خُبث و تکمیل توبہ کے لیے فقراء کو دینا ضرور ہوا۔ اس غرض کے لیے جو مال دفع کیا جائے وہ مساجد وغیرہ امور خیر میں صرف کرنا (جائز نہیں) کہ یہ مالِ خبیث ہے اور یہ (مساجد وغیرہ) مالِ خبیث کا مصرف نہیں، ہاں فقیر اگر لے کر بعد قبول و قبضہ اپنی طرف سے مسجد میں دے دے، تو مضائقہ نہیں:

''قَالَ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هُوَلَهَا صَدَقَةٌ وَّلَنَا هَدِيَّةٌ، وَاللهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ''۔

ترجمہ: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (صدقے کا) یہ (گوشت) اُس (حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا) کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ، (فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص:352)''۔

حیلہ ہر جگہ جائز نہیں، مخصوص حالات میں حیلہ کی اجازت ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی لکھتے ہیں:

''کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

(۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود اور رشوت وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔

(۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو یہ حیلہ مستحب یا واجب ہے۔

(۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے۔

(۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے، (فتح الباری، جلد 12، ص:326)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَحِيلَةُ الْجَوَازِ أَنْ يُعْطِيَ مَدْيُونَهُ الْفَقِيرَ زَكَاتَهُ ثُمَّ يَأْخُذَهَا عَنْ دَيْنِهِ، وَلَوِ امْتَنَعَ الْمَدْيُونُ مَدَّ يَدَهُ وَأَخَذَهَا لِكَوْنِهِ ظَفَرَ بِجِنْسِ حَقِّهِ، فَإِنْ مَانَعَهُ رَفَعَهُ لِلْقَاضِي''۔

ترجمہ:''جواز کا حیلہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقروض کو (جو صاحبِ نصاب نہ ہو) اپنی زکوٰۃ دے کر (اسے مالک بنا دے)، پھر اس مقروض سے اپنا قرض لے لے اور اگر وہ نہ دے تو ہاتھ بڑھا کر اس سے چھین لے کیونکہ وہ اپنا حق لینے میں کامیاب ہوا، پھر بھی اگر وہ اس سے روکے تو اپنا مقدمہ قاضی کے پاس لے جائے، (جلد5، ص:460)''۔

شمس الائمہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَالْحَاصِلُ أَنَّ مَا يَتَخَلَّصُ بِهِ الرَّجُلُ مِنَ الْحَرَامِ أَوْ يَتَوَصَّلُ بِهِ إِلَى الْحَلَالِ مِنَ الْحِيَلِ فَهُوَ حَسَنٌ، وَإِنَّمَا يُكْرَهُ ذٰلِكَ أَنْ يَحْتَالَ فِي حَقٍّ لِرَجُلٍ حَتّٰى يُبْطِلَهُ أَوْ فِي بَاطِلٍ حَتّٰى يُمَوِّهَهُ أَوْ فِي حَقٍّ حَتّٰى يُدْخِلَ فِيهِ شُبْهَةً ،فَمَا كَانَ عَلٰى هٰذَا السَّبِيلِ فَهُوَ مَكْرُوهٌ، وَمَا كَانَ عَلَى السَّبِيلِ الَّذِي قُلْنَا أَوَّلًا ،فَلَا بَأْسَ بِهِ؛ لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ:''وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، (المائدة:2)''، فَفِي النَّوْعِ الْأَوَّلِ

مَعْنَى التَّعَاوُنِ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَفِي النَّوْعِ الثَّانِي مَعْنَى التَّعَاوُنِ عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"۔

ترجمہ: ''خلاصۂ کلام یہ کہ جس حیلہ کے ذریعے انسان کسی حرام کام سے بچ جائے یا اُس کے ذریعے انسان کسی حلال چیز کو حاصل کرلے، تو وہ حیلہ مستحسن ہے۔ جب انسان حیلے کے ذریعے کسی شخص کے حق کو باطل کرے یا کسی باطل چیز کو حیلے کے ذریعے ملمع کاری کرکے حاصل کرے یا کسی حق کو مُشتبہ بنادے، تو حیلے کی (یہ تمام صورتیں) مکروہ (تحریمی) ہیں۔ اور جو حیلہ ہماری بیان کی گئی پہلی صورت کے مطابق ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اور تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (مائدہ:2)''۔ پس ہم نے حیلہ کی جو پہلی صورت بیان کی ہے، اس میں نیکی اور تقویٰ پر تعاون ہے (جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے) اور جو دوسری صورت بیان کی ہے، اس میں گناہ اور ظلم پر تعاون ہے (جس سے منع فرمایا ہے اور دونوں کا فرق واضح ہے)، (المبسوط، جلد 30، ص:210)''۔

ارباز نام کے معنی

سوال: میرے نواسے کا نام ارباز احمد ہے، آیا یہ نام بامعنی ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟، (عدنان الحق)۔

جواب: ارباز کا مادّہ اگر ''ربز'' ہے تو بابِ کَرُمَ سے اس کے معنی ہیں: چالاک ودانا ہونا، اسی سے ''ربیز'' کے معنی ہیں: زیرک ودانا، ''مُنْتَهَى الْأَرَب'' میں ارباز کے معنی ہیں: عاقل ہونا اور ''اقرب الموارد'' میں اس کے معنی ہیں: دنبے کا موٹا ہونا وغیرہ، فارسی لغت میں گوسپند اور گوسفند بھیڑ کو کہتے ہیں۔ الغرض ارباز احمد نام رکھنا درست ہے، کیونکہ اس میں زیرکی ودانائی کے معنی پائے جاتے ہیں۔

تنوین والے کلمے کو بعد والے کلمے کے ساتھ نون لگا کر ملانا

سوال:

آج کل قاری صاحبان تلاوت کے دوران ''اَللهُ الصَّمَدُ'' سے پہلے ''ن'' لگا کر پڑھتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟، (راجہ عظمت حسین، راولپنڈی)۔

جواب:

دو زبر، دو زیر اور دو پیش کو تنوین کہتے ہیں، ان کے تلفظ میں چونکہ نون کی آواز آتی ہے، اس لیے اُسے ''نونِ تنوین'' کہتے ہیں اور تنوین والے لفظ کو عربی میں ''مُنَوَّنْ'' کہتے ہیں۔ تنوین والے لفظ پر وقف کرنا ہو تو نون کی آواز پیدا نہیں ہوگی، جیسے: ''قُل ھُوَاللهُ اَحَدٌ''، اسے وقف کی صورت میں ''اَحَدْ'' پڑھیں گے، لیکن اگر اُسے بعد والے لفظ کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہو تو تنوین، نونِ مکسور کی صورت اختیار کرلے گی، جیسے: ''قُلْ ھُوَاللهُ اَحَدُنِ اللهُ الصَّمَدُ''، یہ تجوید کے قواعد کے مطابق درست ہے، لیکن ائمۂ کرام کو چاہیے کہ وقتاً فوقتاً یہ مسائل آسان انداز میں نمازیوں کو بتادیا کریں تاکہ وہ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں یا جہری نمازوں میں اس سے اجتناب کریں تاکہ نمازیوں کے ذہن میں تشویش نہ ہو۔ البتہ اگر ''اَحَدْ'' پر وقف کرلیا ہے، تو پھر ہمزۂ وصلی کو زبر دے کر اگلے کلمے کو الگ پڑھیں گے، جیسے: ''اَللهُ الصَّمَدُ''، یعنی اس صورت میں پہلے کلمے کے ساتھ وصل نہیں ہوگا۔

اجتماعِ ساکنین علیٰ غیر حدہٖ کی دو صورتیں ہیں:

(1) دو ساکن حروف دو کلموں میں اس طرح جمع ہوں کہ پہلا ساکن حرف مدّہ ہو، اس کے پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ پہلے حرفِ مدّہ کو حذف کردیا جائے گا، جیسے: وَقَالَا اَلحَمدُ کو وَقَالَا الْحَمدُ، اَخِی اُشْدُدْ کو اَخِی اشْدُدْ اور تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا کو تَعْدِلُوا اعْدِلُوْا پڑھا جائے، یہ درست ہے۔

دو ساکن حروف کو دو کلموں میں پڑھنا دشوار ہوتا ہے تو اُس دشواری کو دور کرنے کی بہترین اور آسان صورت یہی ہے کہ حرفِ مدہ کو حذف کردیا جائے۔

(2)دوسری صورت: دوساکن حروف دوکلموں میں اس طرح جمع ہوں کہ پہلا ساکن حرف مدہ نہ ہو۔اس کے پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ عربی کے قاعدے کے مطابق پہلے ساکن حرف کو کسرہ دیا جائے گا اور عربی کا قاعدہ ہے: ''اَلسَّاکِنُ اِذَا حُرِّكَ حُرِّكَ بِالْکَسْرِ''یعنی کسی ساکن حرف کوحرکت دینی پڑے تو کسرہ دیا جائے۔جیسے: قُلْ اَلْحَقُّ سے قُلِ لْحَقُّ، بِئْسَ اَلِا سْمُ سے بِئْسَ الِاسْمُ اور اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ سے اَحَدُ نِ اللّٰہُ الصَّمَدُ پڑھا جائے،(تبیان التجوید،ص:146)''۔اس طرح ن مکسورہ کے ساتھ دوکلموں کوملاکر پڑھنا درست ہے۔جن حروف پر مَد ہوتی ہے،وہ حروفِ مدّہ کہلاتے ہیں اوروہ تین ہیں:(۱)الف ماقبل مفتوح (۲)واؤ ساکن ماقبل مضموم (۳) ی ساکن ماقبل مکسور۔

چھوٹے کا بڑے کو کام کے لیے کہنا

سوال:

کیا چھوٹا بڑے کو کہہ سکتا ہے کہ مجھے پانی پلائیں ،جبکہ چھوٹا مصروف بھی نہ ہو،(امیر حمزہ، سبی)۔

جواب:

دینِ اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بنیادی تعلیمات کا حصہ ہیں ۔اصولی اعتبار سے چھوٹے کا بڑے کو یہ کہنا کہ مجھے پانی پلائیں، خلافِ ادب ہے،لیکن اَسلاف کا طریقہ رہا ہے کہ نیکی کمانے کا کوئی معمولی ذریعہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور یقیناً پانی پلانا بھی ایک نیکی ہے،اس کا اجر حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهَا قَالَتْ:یَارَسُولَ اللهِ! مَا الشَّیْءُ الَّذِی لَایَحِلُّ مَنْعُهُ؟، قَالَ: اَلْمَاءُ وَالْمِلْحُ وَالنَّارُ، قَالَتْ: قُلْتُ: یَارَسُولَ اللهِ! هٰذَا الْمَاءُ قَدْ عَرَفْنَاهُ، فَمَا بَالُ الْمِلْحِ وَالنَّارِ؟، قَالَ یَاحُمَیْرَاءُ مَنْ أَعْطٰی نَارًا،فَکَأَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیعِ مَا أَنْضَجَتْ تِلْكَ النَّارُ، وَمَنْ أَعْطٰی مِلْحًا،فَکَأَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیعِ مَاطَیَّبَ ذٰلِكَ الْمِلْحُ،وَمَنْ سَقٰی

مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ، حَيْثُ يُوجَدُ الْمَاءُ، فَكَأَنَّمَا أَعْتَقَ رَقَبَةً، وَمَنْ سَقَى مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ، حَيْثُ لَا يُوجَدُ الْمَاءُ، فَكَأَنَّمَا أَحْيَاهَا"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: انہوں نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! کس چیز کا منع کرنا حلال نہیں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: پانی، نمک اور آگ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! پانی کو تو ہم نے سمجھ لیا، مگر نمک اور آگ کا منع کرنا کیوں حلال نہیں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اے حُمیرا! (آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت عائشہ کو پیار سے حُمیرا کہہ کر پکارتے تھے) جس نے آگ دے دی گویا اس نے پورے (طعام) کا صدقہ دیا جو آگ سے پکایا گیا اور جس نے نمک دے دیا، گویا اُس نے اُس پورے کھانے کو صدقہ دیا جو اس نمک سے لذیذ بنایا گیا اور جس نے مسلمان کو اُس جگہ پانی کا گھونٹ پلایا، جہاں پانی ملتا ہے، تو گویا اس نے گردن کو آزاد کیا اور جس نے کسی مسلمان کو ایسی جگہ پانی کا گھونٹ پلایا، جہاں پانی نہیں ملتا ہے تو گویا اس نے اسے حیات عطا کردی (کیونکہ حیات کا مدار پانی پر ہے)، (سُنن ابن ماجہ: 2474)''۔

''عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا سَقَى امْرَأَتَهُ الْمَاءَ أُجِرَ، قَالَ: فَقُمْتُ إِلَيْهَا، فَسَقَيْتُهَا مِنَ الْمَاءِ، وَأَخْبَرْتُهَا مَا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔

ترجمہ: ''عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بے شک شوہر جب اپنی بیوی کو پانی پلائے، تو (اس پر) اُسے اجر ملے گا، وہ بیان کرتے ہیں: میں بیوی کے پاس آیا اور میں نے اُسے پانی پلایا اور جو بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنی تھی، اُسے بتائی، (المعجم الاوسط: 854)''۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ جو ہم حسنِ سلوک کرتے ہیں، بعض کاموں میں اُس کی مدد کرتے ہیں، اگر یہ کام رواج یا عادت کے طور پر کیے جائیں تو خالص معاشرتی عمل ہے، لیکن اگر یہی کام اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کیے جائیں، تو اِن پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرماتا ہے۔

''عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ أُتِيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ، فَشَرِبَ، وَعَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ هُوَ أَحْدَثُ الْقَوْمِ وَالأَشْيَاخُ عَنْ يَسَارِهِ، قَالَ: يَا غُلَامُ! أَتَأْذَنُ لِي أَنْ أُعْطِيَ الأَشْيَاخَ، فَقَالَ: مَا كُنْتُ لِأُوثِرَ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَدًا يَا رَسُولَ اللهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس (مشروب کا) ایک پیالہ لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس میں سے پیا، آپ کی دائیں جانب ایک لڑکا جو سب سے کم عمر تھا اور معمر لوگ آپ کی بائیں جانب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں (یہ پیالہ) معمر لوگوں کو دے دوں؟، اس لڑکے نے کہا: آپ سے مجھے جو میرا حصہ ملے گا، اس پر میں کسی کو ترجیح نہیں دوں گا، پس آپ نے اسے دیا، (صحیح بخاری: 2366)''۔

الغرض بچوں کو آداب ضرور سکھانے چاہئیں، حدیث پاک میں ہے:

(۱) ''عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَأَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کسی شخص کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع (کھجور یا گندم) صدقہ کرنے سے بہتر ہے، (جامع ترمذی: 1958)''۔

(۲) ''مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کسی والد کا اپنی اولاد کو اچھا ادب سکھانا اس کے لیے سب سے افضل عطیہ ہے، (جامع ترمذی: 1959)''۔

فارغ بیٹھے ہوئے چھوٹے کا بڑے کو پانی پلانے کے لیے کہنا اگرچہ پسندیدہ عادت نہیں ہے، لیکن یہ گناہ بھی نہیں ہے۔

واعظین اور مقررین علماء کا مانگ کر معاوضہ لینا

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ بعض مقررین اور واعظین علماء لوگوں سے اپنے وعظ اور تقریر کا معاوضہ طلب کرتے ہیں اور بعض تو بہت زیادہ یعنی لاکھوں میں مانگتے ہیں، جب کہ ان کی مالی حالت کافی مضبوط ہوتی ہے۔ کیا اس طرح ان علماء کا مطالبہ کرنا اور وعظ پر پیسے مانگنا جائز ہے، اس کا شرعی حکم بیان فرمادیں، (محمد احسن جاوید، لیہ)۔

جواب:

وعظ وتذکیر اور پند ونصیحت کرنا طاعات، عبادات اور علماء کے فرائض منصبی میں سے ہیں۔ علمائے کرام کو وعظ ونصیحت خلوصِ نیت، اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین کی تبلیغ اور ترویج واشاعت کے لیے دینی چاہیے، اس کو اپنا پیشہ اور مال جمع کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ اگر سامعین یا منتظمین میں سے کوئی بغیر طلب کیے واعظ کو کچھ رقم یا اور کچھ دے دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ اسے طمع نہ ہو اور وعظ اس نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا ہو یا وعظ تو اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا ہے، لیکن وہ حاجت مند ہے اور نذرانے کے بغیر اس کا گزارا نہیں ہے طمع اگرچہ ہے لیکن حاجت کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن وہ مقرر یا واعظ جو اپنے وعظ کا معاوضہ طے کر کے اور طلب کر کے لیتا ہے اور اگر اس کے طے شدہ مال میں سے کوئی کم دیتا ہے تو اس پروگرام میں شرکت نہیں کرتا یعنی وعظ وہ صرف مال جمع کرنے کے لیے کرتا ہے تو اس صورت میں یہ سراسر ناجائز ہے۔ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے۔

علامہ مرغینانی حنفی ہدایہ میں فرماتے ہیں:

''وَلَا بَأسَ بِرِزْقِ الْقَاضِیْ، لِاَنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ بَعَثَ عَتَّابَ بْنَ أُسَیْدٍ اِلٰی مَکَّۃَ وَفَرَضَ لَہٗ وَبَعَثَ عَلِیًّا اِلَی الْیَمَنِ وَفَرَضَ لَہٗ، وَلِاَنَّہٗ مَحْبُوْسٌ لِحَقِّ الْمُسْلِمِیْنَ، فَتَکُوْنُ نَفَقَتُہٗ فِیْ مَالِھِمْ، وَھُوَ مَالُ بَیْتِ الْمَالِ، وَھٰذَا لِاَنَّ الْحَبْسَ مِنْ أَسْبَابِ النَّفَقَۃِ کَمَا فِی الْوَصِیِّ،

وَالْمُضَارِبُ إِذَا مَاسَافَرَ بِمَالِ الْمُضَارَبَةِ وَهٰذَا فِيمَا يَكُونُ كِفَايَةً ،فَإِنْ كَانَ شَرْطًا فَهُوَ حَرَامٌ ،لِأَنَّهُ إِسْتِئْجَارٌ عَلَى الطَّاعَةِ ،إِذَا الْقَضَاءُ طَاعَةٌ، بَلْ هُوَ أَفْضَلُهَا ، ثُمَّ الْقَاضِيُ إِذَا كَانَ فَقِيرًا فَالْأَفْضَلُ، بَلِ الْوَاجِبُ الْأَخْذُ، لِأَنَّهُ لَا يُمْكِنُهُ إِقَامَةُ فَرْضِ الْقَضَاءِ إِلَّا بِهِ، إِذَا الْإِشْتِغَالُ بِالْكَسْبِ يَقْعُدُهُ عَنْ إِقَامَتِهٖ، وَإِنْ كَانَ غَنِيًّا فَالْأَفْضَلُ الْإِمْتِنَاعُ''۔

ترجمہ: ''اور قاضی کے تنخواہ لینے میں کوئی حرج نہیں ، کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا قاضی بنا کر بھیجا اور ان کے لیے تنخواہ مقرر کی اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ الکریم کو یمن بھیجا اور ان کے لیے تنخواہ مقرر کی اور اس لیے کہ قاضی مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو ان کا نفقہ ان کے اموال میں سے ہوگا اور وہ بیت المال کا مال ہے، کیونکہ مشغولیت اسبابِ نفقہ میں سے ہے جیسا کہ وصی اور مضارب جب مال مضاربت کے ساتھ سفر کرے۔ اور یہ تنخواہ بقدرِ کفایتِ رزق میں ہوگا اور اگر یہ شرط کی بناء پر ہو تو حرام ہے، کیونکہ یہ عبادت پر اجارہ ہے، جب کہ قضاء عبادت بلکہ افضل عبادت ہے، پھر قاضی اگر حاجت مند ہے تو اس کے لیے تنخواہ لینا افضل بلکہ واجب ہے، کیونکہ قضاء کے فرض کی ادائیگی اس کے بغیر ناممکن ہے، جب کہ کام میں مشغولیت اسے فرض کی ادائیگی سے روکتی ہے اور اگر قاضی مال دار ہے تو تنخواہ نہ لینا اس کے لیے بہتر ہے، (ہدایہ، ج:9،ص:49-248)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''اَلْمُنَاظَرَةُ فِي الْعِلْمِ لِنُصْرَةِ الْحَقِّ عِبَادَةٌ ، وَلِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ حَرَامٌ لِقَهْرِ مُسْلِمٍ وَإِظْهَارِ عِلْمٍ، وَنَيْلِ دُنْيَا أَوْ مَالٍ أَوْ قَبُولٍ۔ اَلتَّذْكِيرُ عَلَى الْمَنَابِرِ لِلْوَعْظِ وَالْإِتِّعَاظِ سُنَّةُ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، وَلِرِيَاسَةٍ وَمَالٍ وَقَبُولٍ عَامَّةٍ مِنْ ضَلَالَةِ الْيَهُودِ وَالنَّصَارٰى''۔

ترجمہ: ''حق کی نصرت کے لیے علم میں مناظرہ عبادت ہے اور تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے حرام ہے: (۱) مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لیے، (۲) اپنی علمی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے (۳) اور دنیا اور مال کو حاصل کرنے کے لیے یا لوگوں میں شہرت حاصل کرنے کے

لیے۔منبروں پر لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنا انبیاء ومرسلین کی سنت ہے اور ریاست، مال جمع کرنے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے وعظ کہنا یہود ونصاریٰ کی گمراہیوں میں سے ہے، (تنویر الابصار مع الدر المختار، ج:9،ص:18-517)۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: ''اور علماء جو وعظ مساجد جامعہ یا غیر جامع میں کہتے ہیں اور حاضرین کو پند ونصائح سناتے ہیں اور سامعین ان کی خدمت گزاری نقد وجنس سے کرتے ہیں، یہ امر مساجد وغیر مساجد میں مباح ودرست ہے یا نہیں؟ اور یہ آمدنی ان کے واسطے درجہ جواز میں ہے یا عدمِ جواز میں، یہ لوگ ماتحت آیۂ کریمہ (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے) کے داخل ہیں یا خارج؟''۔آپ نے جواب میں فرمایا: ''اگر وعظ کہنے اور حمد ونعت پڑھنے سے مقصود یہی ہے کہ لوگوں سے کچھ مال حاصل کریں تو بے شک اس آیۂ کریمہ کے تحت میں داخل ہیں اور حکم ''لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا، (البقرۃ:41)'' (میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ وصول کرو)، کے مخالف وہ آمدنی ان کے حق میں خبیث ہے، خصوصاً جب کہ ایسے حاجت مند نہ ہوں جن کو سوال کی اجازت ہے کہ اب تو بے ضرورت سوال دوسرا حرام ہوگا اور وہ آمدنی خبیث تر وحرام مثل غصب ہے، عالمگیریہ میں ہے: ''مَا جَمَعَ السَّائِلُ بِالتَّكَدِّيْ فَهُوَ خَبِيْثٌ'' (سائل نے کدوکاش سے جو کچھ جمع کیا، وہ ناپاک ہے)۔دوسرے یہ کہ وعظ وحمد ونعت سے مقصود محض اللہ ہے اور مسلمان بطور خود ان کی خدمت کریں تو یہ جائز ہے اور مال حلال، تیسرے یہ کہ وعظ سے مقصود تو اللہ ہی ہے مگر ہے حاجت مند اور عادۃً معلوم ہے کہ لوگ خدمت کریں گے، اس خدمت کی طمع بھی ساتھ لگی ہوئی ہے تو گرچہ یہ دوم کے مثل محمود نہیں مگر صورتِ اولیٰ کی طرح مذموم بھی نہیں جیسے درمختار میں فرمایا: ''اَلْوَعْظُ لِجَمْعِ الْمَالِ مِنْ ضَلَالَةِ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى'' (مال جمع کرنے کے لیے وعظ کہنا یہود ونصاریٰ کی گمراہیوں سے ہے)۔یہ تیسری صورت بین بین ہے اور دوم بہ نسبت اول کے قریب تر ہے، جس طرح حج کو جائے

اور تجارت کا کچھ مال بھی ساتھ لے جائے جسے ''لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ، فرمایا، (البقرۃ:198)'' ترجمہ: (تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی رزق حلال) تلاش کرو۔ لہٰذا فتویٰ تیسری صورت کے جواز پر ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:23،ص:380)

اس لیے وعظ ونصیحت اور تقاریر کا مقصد ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہونی چاہیے اور دنیاوی اغراض ومقاصد کو اللہ کی رضا کے مقابل نہیں لانا چاہیے اوران طاعات پر اللہ تعالیٰ سے اجر کا طالب ہونا چاہیے اوران پر لوگوں سے اجرت طلب نہیں کرنی چاہیے، ہاں اگر اپنی خوشی اور رضا سے بغیر طلب کیے کچھ نذرانے یا تحفے دے دے، تو اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مدرسہ اور طالب علم کے درمیان معاہدے کا خلاصہ

ا۔ طالب علم کی بیرون ملک 6 سالہ تعلیم کا سارا خرچ مدرسہ اٹھائے گا۔

۲۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد طالب علم مدرسہ میں باقاعدہ 6 سال تک تدریسی خدمات سرانجام دے گا اسکے عوض مدرسہ اسکو تنخواہ بھی ادا کرے گا۔

۳۔ تعلیم کے مکمل اخراجات 56 ہزار پاؤنڈ تھے، ان کا 60 فیصد 33 ہزار 6 سو پاؤنڈ سٹوڈنٹ فنڈ سے مہیا کیا گیا، باقی 40 فیصد 22 ہزار 400 پاؤنڈ زکوٰۃ فنڈ سے مہیا کئے گئے۔ ادارے کو اپنے کاموں کے لیے مسلمانوں سے دوطرح کی مالی اعانت ملتی ہے، ایک صدقاتِ نافلہ یعنی نفلی خیرات اور دوسرے صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ، فطرہ، نذر اور کفارات وغیرہ۔

۴۔ فریقین متفق ہیں کہ معاہدہ اسی طرح تھا، معاہدہ کی کوئی تحریری صورت نہیں ہے۔ طالب علم کی طرف سے معاہدہ پر عمل نہ ہوا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ طالب علم تدریس سرانجام دینے لگا، 2 سال تدریس مکمل کرنے کے بعد طالب علم نے مدرسہ کو آگاہ کیا کہ میں بقایا 4 سال تدریس نہیں کر پاؤنگا۔ طالب علم نے کہا میں ذہنی دباؤ

محسوس کررہا ہوں اور انتظامی امور سے بھی ناخوش ہوں حالانکہ پہلے دوسالوں میں طالب علم کی طرف سے یہ نہیں کہا گیا۔

۲۔ مدرسہ نے طالب علم کو آسانی دینے کیلئے مختلف تبدیلیاں کیں لیکن طالب علم راضی نہ ہوا، استعفیٰ دے دیا اور مزید تدریس کرنے سے انکار کردیا۔

۳۔ یہاں (برطانیہ) میں مدرس کیلئے آرام دہ ماحول فراہم کیا گیا تھا 20 ہزار پاؤنڈ سالانہ تنخواہ بھی مقرر تھی، تدریسی ڈیوٹی 20 گھنٹے اور 15 گھنٹے اسباق کی تیاری کیلئے، ایک ہفتے میں 35 گھنٹے مقرر تھے یہ ملازمت کے معاہدے میں بھی شامل تھے۔

۴۔ سارے معاملے کے بعد طالب علم سے 3 میٹنگز ہوئیں ہر سہولت دینے کی آفر کی گئی طالب علم سے یہ بھی کہا گیا کہ آپ ایک سال اور تدریس کریں بقیہ 3 سال کیلئے آپ کو مجبور نہیں کیا جائے گا آپ آزاد ہونگے۔

۵۔ ایک ثالث مقرر ہوا، جس نے طالب علم سے نصابی کتب لکھنے کو کہا، آپ سے تدریس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا لیکن اس کیلئے بھی وہ تیار نہ ہوا۔

۶۔ طالب علم نے دو ماہ مدرسہ سے بیماری کی رخصت لی تھی۔ مگر اس کے دوران اس نے ایک نئی تنظیم بنالی جو بچوں اور بڑوں کی تعلیم کیلئے تھی اس نے باقاعدہ اسکی تشہیر بھی شروع کر دی۔ اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی اپنی تنظیم کے لیے تدریس شروع کردی۔

مدرسہ کا طالب علم کے خلاف دعویٰ:

بیان کردہ حقائق سے واضح ہے کہ طالب علم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی، 6 سالہ تدریس پوری نہ کی۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ سٹوڈنٹ فنڈ سے جو رقم اس کی تعلیم پر خرچ ہوئی وہ واپس کی جائے۔ 6 سال کی رقم 33 ہزار 600 پاؤنڈ ہے۔ دو سال تدریس کے نکالے جائیں تو بقیہ 4 سال کے 22 ہزار 400 پاؤنڈ بنتے ہیں، ہم زکوۃ فنڈ والی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتے، البتہ یہ دعویٰ ہے کہ 24 ہزار 400 پاؤنڈ طالب علم واپس کرے اور مدرسہ اس کا حق دار ہے، (سائل: خالد حسین، کیتھلے، برطانیہ)۔

جواب:

زکوٰۃ فنڈ کے علاوہ اساتذہ فنڈ سے جو رقم طلبہ پر صرف کی جاتی ہے، وہ نفلی صدقات شمار کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا''۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات ضائع نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال ریاکاری کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال اس چکنے پتھر کی طرح ہے جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہوئی، جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا، وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قدرت نہیں پائیں گے، (البقرۃ:264)''۔

اس آیت میں صدقہ کی مقبولیت اور اس پر اجر کی تین شرطیں بیان فرمائیں: (۱) احسان نہ جتایا جائے (۲) جس کو صدقہ دیا ہو اس کو طعنہ دے کر اذیت نہ پہنچائی جائے (۳) اخلاص کے ساتھ صدقہ دیا جائے، لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے نہ دیا جائے۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

''وَأَخْرَجَ الْبَزَّارُ وَالْحَاکِمُ وَصَحَّحَهٗ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: ثَلَاثَةٌ لَا یَنْظُرُ اللهُ إِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ الْعَاقُّ لِوَالِدَیْهِ وَمُدْمِنُ الْخَمْرِ وَالْمَنَّانُ بِمَا أَعْطٰی''۔

ترجمہ: ''امام بزار اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تین اشخاص کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا: والدین کا نافرمان، عادی شرابی اور کچھ دے کر احسان جتانے والا، (الدر المنثور، جلد2، ص:44)''۔

آپ کا دعویٰ درست نہیں ہے، زکوٰۃ کی رقم کے علاوہ جو رقم اسٹوڈنٹ فنڈ سے خرچ کی گئی، وہ صدقہ ہے، صدقہ واپس نہیں ہوتا اور شرطِ فاسد سے صدقہ فاسد نہیں ہوتا، بلکہ وہ شرط باطل ہو جائے گی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''قَالَ أَصْحَابُنَا جَمِيْعًا: إِذَا وَهَبَ هِبَةً وَشَرَطَ فِيْهَا شَرْطًا فَاسِدًا، فَالْهِبَةُ جَائِزَةٌ وَالشَّرْطُ بَاطِلٌ كَمَنْ وَهَبَ لِرَجُلٍ أَمَةً فَاشْتَرَطَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَبِيْعَهَا أَوْ شَرَطَ عَلَيْهِ أَنْ يَّتَّخِذَهَا أُمَّ وَلَدٍ أَوْ أَنْ يَبِيْعَهَا مِنْ فُلَانٍ أَوْ يَرُدَّهَا عَلَيْهِ بَعْدَ شَهْرٍ فَالْهِبَةُ جَائِزَةٌ وَهٰذِهِ الشُّرُوْطُ كُلُّهَا بَاطِلَةٌ، كَذَا ''فِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''۔

ترجمہ: ''ہمارے تمام اصحاب فرماتے ہیں: جب کسی کو کوئی شے کسی فاسد شرط کے ساتھ ہبہ کی، تو ہبہ جائز ہوگا اور شرط باطل ہوگی، جیسے کسی نے کسی کو کنیز ہبہ کی اور شرط رکھی کہ اس کو فروخت نہیں کرے گا یا یہ شرط رکھی کہ اسے اُمِ ولد بنائے گا یا اس کو فلاں کو فروخت کرے گا یا مہینے کے بعد اُس کو لوٹا دے گا، پس ان تمام صورتوں میں ہبہ جائز (درست) ہوگا اور یہ تمام شرطیں باطل ہوں گی، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:396)''۔

صدقہ دے کر واپس لینا جائز نہیں، لہٰذا جس کو صدقہ دیا تھا، اُس نے عاریت یا ودیعت سمجھ کر واپس کر دیا، تو دینے والے کو واپس لینا جائز نہیں، اگر لے لیا، تو واپس کر دے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''اَلصَّدَقَةُ بِمَنْزِلَةِ الْهِبَةِ فِي الْمُشَاعِ وَغَيْرِ الْمُشَاعِ وَحَاجَتِهَا إِلَى الْقَبْضِ، إِلَّا أَنَّهُ لَا رُجُوعَ فِي الصَّدَقَةِ إِذَا تَمَّتْ وَيَسْتَوِي إِنْ تَصَدَّقَ عَلٰى غَنِيٍّ أَوْ فَقِيْرٍ فِي أَنَّهُ لَا رُجُوعَ فِيْهَا وَمِنْ أَصْحَابِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ يَقُوْلُ: اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْغَنِيِّ وَالْهِبَةُ سَوَاءٌ، كَذَا فِي الْمُحِيْطِ۔۔۔۔۔ وَلَوْ دَفَعَ إِلٰى رَجُلٍ ثَوْبًا بِنِيَّةِ الصَّدَقَةِ فَأَخَذَهُ الْمَدْفُوْعُ إِلَيْهِ ظَانًّا أَنَّهُ وَدِيْعَةٌ أَوْ عَارِيَةٌ فَرَدَّهُ عَلَى الدَّافِعِ لَا يَحِلُّ لِلدَّافِعِ أَخْذُهُ؛ لِأَنَّهُ قَدْ زَالَ عَنْ مِلْكِهِ حِيْنَ

قَبَضَهُ الرَّجُلُ فَإِنْ أَخَذَهُ لَزِمَهُ رَدُّهُ، كَذَا فِي "السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ".

ترجمہ: "مشاع (Divisible) اور غیر مشاع (Undivisible) میں صدقہ ہبہ کے منزلہ ہے، جو قبضہ سے پورا ہو جاتا ہے، جب مکمل ہو جائے تو صدقہ میں رجوع نہیں ہو سکتا، خواہ غنی پر صدقہ کیا ہو یا فقیر پر، ہمارے اُن اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک صدقہ میں رجوع جائز نہیں ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ غنی اور فقیر دونوں پر صدقہ برابر ہے، "محیط" میں اسی طرح ہے۔ اگر کسی نے کسی شخص کو صدقہ کی نیت سے کپڑے دیے، لینے والے نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ ودیعت ہے یا عاریت، پھر دینے والے کو لوٹا دیے، دینے والے کے لیے اُن کپڑوں کو لینا جائز نہیں اس لیے کہ جب اُس نے قبضہ کرلیا تو دینے والے شخص کی مِلک زائل ہوگئی، پس اگر اُس نے واپس لے لیے ہیں، تو اُس پر لازم ہے کہ اُسے واپس لوٹا دے، "السراج الوہاج" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد4، ص:406)"۔ جو رقم طالبِ علم مذکور کو زکوٰۃ کے فنڈ سے دی جاتی ہے اور وہ مُستحق زکوٰۃ بھی ہے، تو نہ اس کا واپس لینا جائز اور نہ ہی اس پر شرائط عائد کرنا جائز ہے، کیونکہ زکوٰۃ مستحق کو مالکانہ بنیاد پر دی جاتی ہے اور مالِ زکوٰۃ مِلک میں آنے پر وہ تصرُّف میں آزاد ہے۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ صدقے کی رقوم ہبہ کرنے کے بعد آپ واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اگر یہ رقم آپ نے بطور قرض دی تھی تو کیا عطیہ دہندگان (Donors) نے آپ کو یہ اختیار دیا تھا۔ زکوٰۃ وصدقات کے عوض آپ بلا معاوضہ یا معاوضے کے عوض لازمی خدمت کا مطالبہ نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ اجارۃ الخدمات (Ijarah Services) نہیں ہے۔ البتہ اگر انہوں نے حصولِ علم سے فراغت کے بعد آپ کے ادارے میں مشاہرے کے عوض ملازمت کا وعدہ کیا تھا، تو انہیں عہد کی پاس داری کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا"، ترجمہ: "اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد (کے بارے میں آخرت میں) باز پرس ہوگی، (بنی اسرائیل:34)"۔

قرآن کریم میں اہلِ ایمان کے منجملہ اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۱)''وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِہِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ''، ترجمہ:''اور جو اپنی امانتوں اور عہد کی پاس داری کرتے ہیں،(المؤمنون:8)''۔

(۲)''وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا''، ترجمہ:''اور جو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں، جب وہ عہد کریں،(البقرۃ:177)''۔

حدیث پاک میں ہے:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، قَالَ: لَا تُمَارِ أَخَاكَ، وَلَا تُمَازِحْهُ، وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ''۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو، اُس سے (ایسا) مزاح نہ کرو (جس سے اسے ذہنی اذیت پہنچے) اور اس سے ایسا وعدہ نہ کرو کہ جس کی (بعد میں) تم خلاف ورزی کرو،(سُنن ترمذی: 1995)''۔

علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی کے حوالے سے اس کی شرح میں لکھا:

''علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص کسی انسان سے کسی ایسی بات کا وعدہ کرے (جسے پورا کرنا) شرعاً منع نہیں ہے، تو اُسے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے، رہا یہ سوال کہ یہ ایفائے عہد واجب ہے یا مستحب، اس میں علماء کا اختلاف ہے: امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور جمہورِ فقہاء رحمہم اللہ علیہم نے کہا: یہ مستحب ہے، اگر وعدہ پورا نہیں کرے گا تو فضیلت کا تارک ہوگا اور کراہتِ شدیدہ کا ارتکاب کرے گا، لیکن گناہگار نہیں ہوگا اور اگر وعدہ پورا نہ کرکے اُسے ایذا پہنچانا چاہتا ہے، تو گناہگار ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں: علماء کی ایک جماعت نے ایفائے عہد کے واجب ہونے کا قول کیا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب وعدہ کرتے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ کہتے اور یہ بہتر ہے، پھر جب یقینی وعدہ کریں تو اُسے پورا کرنا ضروری ہے، سوائے اس کے کہ کوئی عذرِ (معقول) لاحق ہوجائے، اور اگر وعدہ کرتے

وقت اُسے یقین ہے کہ اسے وفانہیں کرے گا، تو یہ نفاق ہے، (مرقاۃ المفاتیح، ج:7،ص: 3060)''۔ کیونکہ ایسا وعدہ بد نیتی پر مبنی ہوتا ہے۔

(۱) ''عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: إِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ أَخَاهُ، وَمِنْ نِيَّتِهِ أَنْ يَفِيَ لَهُ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِيءْ لِلْمِيعَادِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ:'' زید بن ارقم بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: جب ایک شخص اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس کی نیت یہ ہے کہ اپنے وعدے کو پورا کرے گا، پھر (کسی عذر کے سبب) مقررہ وقت پر وعدہ وفا نہ کر پایا، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، (سُنن ابو داؤد: 4995)''۔

(۲) ''عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ وَيَنْوِي أَنْ يَفِيَ بِهِ فَلَمْ يَفِ بِهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ:'' زید بن ارقم بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ایک شخص کوئی وعدہ کرے اور اس کی ایفاءِ عہد کی نیت بھی ہو، پھر وفا نہ کر سکے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، (سُنن ترمذی:2633)''۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا:'' کسی امر کا وعدہ مستحکم حلف شرعی محمدیہ سے کرے اس کے خلاف کرنا کیسا ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر وہ امر واجب و فرض تھا تو اس وعدہ کا خلاف کرنا حرام و ناجائز ہے اور اگر وہ امر ناجائز و حرام تھا، جیسے کسی نے شراب پینے کا بحلف مستحکم وعدہ بحلف کیا، تو اس کا خلاف کرنا فرض و واجب ہے اور اگر وہ مباح امر تھا اور کوئی عذر پیش آیا تو خلاف وعدہ جائز ہے اور بلا عذر ناپسند ہے، ہاں وعدہ کرتے وقت ہی دل میں تھا کہ پورا نہ کرے گا تو ایسا وعدہ کرنا بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''لَيْسَ الْخُلْفُ أَنْ يَّعِدَ الرَّجُلُ وَمِنْ نِيَّتِهٖ أَنْ يَّفِيَ وَلٰكِنَّ الْخُلْفَ أَنْ يَّعِدَ الرَّجُلُ وَمِنْ نِيَّتِهٖ أَنْ لَّا يَفِيَ، رَوَاهُ أَبُو يَعْلٰى فِي مُسْنَدِهٖ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ بِسَنَدٍ

حَسَنٍ، وَاللہ تَعَالٰی أَعلَمُ"۔

ترجمہ:"یہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کہ آدمی کسی سے وعدہ کرے اوراس کی نیت یہ ہو کہ وہ اسے پورا کرے گا، بلکہ خلاف ورزی یہ ہے کہ آدمی کسی سے وعدہ کرے اور نیت یہ ہو کہ اسے پورا نہ کرے گا، اس کو ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں زید بن اَرقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ اچھی طرح جانتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص:356)"۔

اجارہ پر قبرستان کے لیے حاصل کردہ زمین کا حکم

سوال:

برطانیہ میں مختلف مقامات پر قبرستان کے لیے زمین 75 سے 120 سال کی مدت کے لیے اجارہ (Lease) پر دی جاتی ہے، یعنی دائمی مالکانہ حقوق نہیں ہوتے۔ لیز کی مدت پوری ہونے کے بعد حکومت کو اختیار ہے کہ اس جگہ کو جیسے چاہے تصرف میں لائے، وہ فلیٹ یا مکانات بنادیں یا گراؤنڈ بنادیں یا کسی اور مقصد کے لیے کام میں لائیں۔ ایسے قبرستان میں تدفین کا کیا حکم ہے، جبکہ اجارے کی مدت مکمل ہونے کے بعد حکومت اسے اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی مصرف میں لاسکتی ہے، (مولانا عرفان مدنی، انگلینڈ)۔

جواب:

اسلام میں قبر اور قبرستان کی حُرمت کو قائم رکھنے کا حکم ہے اور قبر کی حُرمت کو پامال کرنے پر احادیث مبارکہ میں وعید آئی ہیں:

(۱)"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَأَنْ يَجلِسَ أَحَدُكُم عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحرِقُ ثِيَابَهُ حَتّٰى تَخلِصَ اِلٰى جِلْدِهٖ خَيرٌ لَهُ مِن أَنْ يَجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ"۔

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ آگ کپڑے جلا کر اس کی کھال تک پہنچ جائے، یہ اذیت اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کی قبر پر بیٹھے، (سُنن ابوداؤد:3226)"۔

(۲) ”عَن عُقْبَةَ بنِ عَامِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَأَنْ أَمْشِيَ عَلَى جَمْرَةٍ أَوْ سَيفٍ أَوْ أَخْصِفَ نَعْلِي بِرِجْلِي، أَحَبُّ إِلَيَّ مِن أَنْ أَمْشِيَ عَلَى قَبرِ مُسْلِمٍ، وَمَا أُبَالِي أَوسَطَ الْقُبُورِ قَضَيْتُ حَاجَتِي، أَو وَسْطَ السُّوقِ“۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (تعلیمِ اُمّت کے لیے) فرمایا: میں آگ کی چنگاری یا تلوار پر چلوں یا اپنے پاؤں سے جوتے پر پیوند لگاؤں، یہ میرے لیے مسلمان کی قبر پر چلنے سے زیادہ پسند ہے، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میری حاجت قبر کے وسط میں پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان میں پوری ہوتی ہے، (ابن ماجہ: 1568)“۔

قبروں پر چلنا اور راستہ بنانا بھی حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”لِأَنَّهُمْ نَصُّوا عَلَى أَنَّ الْمُرُورَ فِي سِكَّةٍ حَادِثَةٍ فِيهَا حَرَامٌ“۔

ترجمہ: ”علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نئے بنائے ہوئے راستے پر چلنا حرام ہے، (ردالمحتار جلد 1 صفحہ: 482، بیروت)“۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ نئے راستے میں کوئی ماضی کی قبر ہو، جس کے نشانات مٹ چکے ہوں، اس لیے احتیاط کا حکم دیا گیا ہے۔

تاہم عذر کے سبب شرعی اباحت کے ہوتے ہوئے ہر قبر کے آثار کو قیامت تک باقی رکھنے کا کوئی ایجابی حکم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ خاتم النّبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا روضۂ انور تو قطعیت اور تواتر کے ساتھ معلوم ہے، آپ ﷺ کے سوا کسی اور نبی یا رسول کی قبر انور کا مقام یا آثار قطعیت کے ساتھ ہمیں معلوم نہیں ہیں، بعض روایات و آثار یا منامات (خوابیں) وحکایات ہیں جو زیادہ سے زیادہ ظن کا فائدہ دیتی ہیں، اسی طرح بعض مُستثنیات کو چھوڑ کر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاراتِ مبارکہ بھی ہمیں قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہیں۔ بعض آثار میں ہے کہ بیت اللہ کے مطاف میں بعض انبیائے کرام کی قبور ہیں، وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

غیر مسلم ممالک میں ان کے قوانین ریاستی اور حکومتی قوت واختیار سے نافذ ہوتے ہیں اور مسلمان غیر مؤثر اقلیت ہونے کے سبب اپنے مطالبات منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔بعض غیر مسلم ممالک میں مسلمان بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے کسی حد تک اپنے حقوق کے حصول کے لیے عدالتوں سے رجوع کر سکتے ہیں اور بعض صورتوں میں کوئی نہ کوئی رعایت مل بھی جاتی ہے،مگر اس کے امکانات کی بابت وہاں کے ماہرین آئین وقانون اور وکلاء ہی بہتر رائے دے سکتے ہیں۔اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ حتی الامکان قبرستان کے لیے ایسی جگہ حاصل کریں،خواہ وہ نسبتاً دور ہی ہو،جس کی حیثیت بعد میں تبدیل نہ کی جاسکتی ہو،ورنہ برسبیلِ تنزل مقامی حکومت کی شرائط پر پچھتر یا صد سالہ لیز پر بھی قبرستان کے لیے جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔آپ کی بیان کردہ تفصیل کی روشنی میں حکومت زمین کی حیثیت تبدیل کرنے کا اختیار تو رکھتی ہے،لیکن ضروری نہیں کہ وہ ایسا کرے اور ہوسکتا ہے کہ بعد میں حالات سازگار ہوجائیں۔تاہم اگر خدانخواستہ کسی ملک کی حکومت کبھی قبرستان کے آثار مٹادیتی ہے،تو اس کا گناہ یا وبال وہاں کے مجبور مسلمانوں پر نہیں ہوگا،اللہ تعالیٰ سے تبدیلی احوال کے لیے دعا کرتے رہیں، وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ (ابراہیم:20) ترجمہ:''اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں ہے''اور'' لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ أَمۡرًا، (الطلاق:1)''۔ترجمہ:''تم کو معلوم نہیں شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی صورت پیدا فرمادے''۔

امام احمد رضا خان قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الۡعَزِیۡز متوفّٰی 1340ھ سے سوال ہوا:''زمین جو دوامی پٹہ کی ہو اس میں دفن جائز ہے یا نہیں؟،بعض لوگ کہتے ہیں کہ دفن کے لیے ملکیتی زمین چاہیے،پھر اس بنا پر تو جاگیرات میں دفن جائز نہ ہوگا،بینوا توجروا؟۔

آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''بلاشبہ جائز ہے،جبکہ باجازت مستاجر ہو،زمین کا غیر کی مِلکیت میں ہونا میت کو دفن کرنے کے جواز کے منافی نہیں ہے،زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ مالک کو قبر ہٹانے کا

اختیار ہوگا،(فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:380)"۔یعنی امام احمد رضا قادری نے پٹے یا لیز کی زمین پر تدفین کی اجازت دی ہے۔آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"کبیری شرح منیۃ المصلّی"میں ہے:"وَلَا یُحْفَرُ قَبْرٌ لِدَفْنِ آخَرَ مَا لَمْ یَبْلَ الْاَوَّلُ، فَلَمْ یَبْقَ لَہٗ عَظْمٌ اِلَّا عِنْدَ الضَّرُوْرَۃِ بِاَنْ لَّمْ یُوْجَدْ مَکَانٌ سِوَاہٗ"۔

ترجمہ:"دوسری میت کو دفن کرنے کے لیے (پہلی میت کی) قبر کو کھودا نہ جائے، جب تک کہ پہلی میت بوسیدہ ہوجائے اور اس کی ہڈیاں باقی نہ رہیں، سوا اس کے کہ جب اس کے سوا کوئی اور جگہ دستیاب نہ ہو، (تو ضرورت کے وقت ایسا کرسکتے ہیں)،(فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:438،رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"(تبدیلی قبرستان سے یہ مراد ہے کہ) اگر وہ جگہ جہاں اموات دفن ہوتے تھے، کسی شخص خاص کی ملک ہے کہ اس کی اجازت سے دفن ہوتے تھے تو بلاشبہ اسے اختیار ہے کہ میت کو نکلوادے۔درمختار میں ہے:

"لَایَخْرُجُ مِنْہُ بَعْدَ اِھَالَۃِ التُّرَابِ اِلَّا لِحَقِّ اٰدَمِیٍّ کَاَنْ تَکُوْنَ الْاَرْضُ مَغْصُوْبَۃً اَوْ اُخِذَتْ بِشُفْعَۃٍ وَیُخَیَّرُ الْمَالِکُ بَیْنَ اِخْرَاجِہٖ وَمُسَاوَاتِہٖ بِالْاَرْضِ"۔

ترجمہ:"میت کو کسی شخص کے حق کے بغیر مٹی ڈالنے کے بعد (قبر سے) نہیں نکالا جائے گا، (حق کی صورت یہ ہے کہ) مثلاً: قبر کی زمین غصب کی ہوئی ہے یا اُسے شفعہ پر لیا گیا ہو، تو مالک کو اختیار ہے کہ میت کو نکال کر زمین کو برابر کردے،(الدرالمختار، باب صلاۃ الجنائز، ج:1،ص:126)"۔اگر وہ زمین کسی کی ملکیتی نہیں بلکہ وقف ہے، تو وقف میں دست اندازی کا کسی کو حق نہیں، اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ (وقف کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتی)، وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ،(فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:384،رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

امام محقق علی الاطلاق کمال الدین محمد بن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ "فتح القدیر" شرح ہدایہ" میں فرماتے ہیں:

''لَا یُدْفَنُ اِثْنَانِ فِیْ قَبْرٍ وَاحِدٍ اِلَّا لِضَرُوْرَۃٍ وَلَا یُحْفَرُ قَبْرٌ لِدَفْنِ اٰخَرَ اِلَّا اَنْ بَلِیَ الْاَوَّلُ فَلَمْ یَبْقَ لَہٗ عَظْمٌ اِلَّا اَنْ لَّا یُوْجَدَ بُدٌّ فَیُضَمُّ عِظَامُ الْاَوَّلِ وَیُجْعَلُ بَیْنَہُمَا حَاجِزٌ مِنْ تُرَابٍ''۔

ترجمہ: ضرورت کے بغیر دو میتوں کو ایک قبر میں دفن نہ کیا جائے اور ایک قبر کو دوسری میت کے دفن کرنے کے لیے کھودا نہ جائے، سوائے اس کے کہ پہلی میت بوسیدہ ہوجائے اور اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں، سوائے اس کے کہ کوئی چارۂ کار نہ رہے، تو اس صورت میں پہلی میت کی ہڈیوں کو ملایا جائے گا اور دونوں میتوں کے درمیان مٹی کی آڑ قائم کی جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:387، رضا فاؤنڈیشن)''۔

آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''صاحبو! اس سے مقصود زمینِ مملوک ہے، یعنی اگر کسی کی ملک میں کوئی میت دفن کردی گئی ہو، تو جب وہ بالکل خاک ہوجائے، مالک کو روا ہے کہ وہاں کھیتی کرے، گھر بنائے، جو چاہے کرے: ''لِاَنَّ الْمِلْکَ مُطْلَقٌ وَالْمَانِعُ زَالَ وَھٰذَا اَیْضًا اِذَا کَانَ ذٰلِکَ بِاِذْنِہٖ وَاِلَّا فَفِی الْغَصْبِ لَہٗ اِخْرَاجُ الْمَیِّتِ وَتَسْوِیَۃُ الْاَرْضِ کَمَا ھِیَ لِحَدِیْثِ مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیِّتَۃً فَھِیَ لَہٗ، وَلَیْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ''۔

ترجمہ: ''کیونکہ مِلک مطلق ہے اور مانع زائل ہوگیا ہے اور یہ بھی اس صورت میں ہے جبکہ (میت کی تدفین) اُس کی اجازت سے ہوئی ہو، ورنہ غصب کی صورت میں اُسے حق ہے کہ میت کو نکالے اور زمین سابق صورت پر برابر کرے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جس نے غیر آباد زمین کو آباد کیا تو وہ اُس کی ملک ہے اور زمین پر ظالم کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص:474، رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

علامہ عمر الدین سنی حنفی قادری ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مصدّقہ فتویٰ ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''اگر معترض پھر عود کرے اور کہے کہ بمبئی وغیرہ عظیم شہروں میں قبریں کھود کر اُن میں دوسری میتیں دفن کی جاتی ہیں، تو اگر قبر کھودنے سے میتوں کی توہین ہوتی ہے تو اِن شہروں میں یہ کام کیوں ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شہروں میں جگہ بہت تنگ ہے، قبرستانوں میں اتنی

وسعت نہیں ہے کہ میت کے لیے الگ الگ قبر ہو، لہٰذا اس ضرورتِ شدیدہ سے یہ جائز ہے کہ: ''اَلضَّرُوْرَۃُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَات'' اس فتوے کی اُس دور میں بدایوں کے اکابر علماء کے ساتھ ہندوستان کے دیگر علماء نے بھی تصدیق وتصویب کی ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9،ص: 438، رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

ہمارے ہاں کراچی میں رہائشی، تجارتی اور رفاہی قطعات اراضی یا تو ادارۂ ترقیات کراچی (KDA) یا بلدیہ عظمیٰ کراچی (KMC)، یا کنٹونمنٹ بورڈ یا محکمۂ مال کے زیرِ اختیار ہیں اور یہ زمینیں بھی ننانوے سال یا ساٹھ سال یا ترپین سال یا تیس سال کی لیز پر دی جاتی ہیں، تاہم عرف میں انہیں مالکانہ حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ پاکستان اسلامی ملک ہے، اس لیے عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ آنے والی کوئی بھی حکومت قبرستان کی حیثیت کو تبدیل کر سکے، لیکن قانون کی حد تک حکومت کے پاس یہ اختیار موجود ہے۔

ذیل میں ہم فقہی حوالہ جات درج کر رہے ہیں، لیکن یہ تمام حوالہ جات اختیاری صورت سے متعلق ہیں، اضطراری صورت سے نہیں ہیں اور اضطراری صورتِ حال کے لیے فقہی ضابطہ یہی ہے: ''اَلضَّرُوْرَۃُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَات'' یعنی ضرورت ممنوعات کو مباح کر دیتی ہے۔ اگر بالفرض کبھی برطانیہ کی حکومت قبرستان کی زمین کو اپنے مقاصد کے لیے بلڈوز کرے اور وہاں دفن میتوں کے پورے اجسام یا بعض اعضاء وآثار مل جائیں، تو انہیں احترام کے ساتھ دوسری دستیاب جگہ میں دفن کر دیا جائے۔ چونکہ مسیحی مذہب کے ماننے والے بھی میتوں کو دفن کرتے ہیں اور اُن کے ہاں قبرستان بڑے مربوط اور منظم ہوتے ہیں اور اُن کی نگہداشت کا بھی انتظام ہوتا ہے، اس لیے ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے قبرستان کی بے حرمتی نہیں کریں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق اسپین کی مسیحی حکومت نے جامع مسجد قرطبہ کی حیثیت تو بدل دی، لیکن وہاں مسلمانوں کے معروف قبرستان کو آثارِ قدیمہ کے طور پر باقی رکھا ہوا ہے۔ پس اگر دائمی وقف قبرستان کے لیے جگہ دستیاب نہ ہو تو حکومت کی مقرر کردہ پچھتر یا سو سالہ لیز پر قبرستان کے لیے زمین لے سکتے

ہیں اور اس میں اموات کی تدفین کر سکتے ہیں۔

قاضی عیاض مالکی متوفّٰی 544ھ اور علامہ محمد بن یوسف صالحی شامی متوفّٰی 942ھ لکھتے ہیں:

''وَقَالَ مُصْعَبٌ: لَمَّا قَدِمَ الْمَهْدِيُّ الْمَدِيْنَةَ اِسْتَقْبَلَهٗ مَالِكٌ وَغَيْرُهٗ مِنْ أَشْرَافِهَا عَلٰى أَمْيَالٍ، فَلَمَّا بَصَرَ بِمَالِكٍ اِنْحَرَفَ الْمَهْدِيُّ إِلَيْهِ فَعَانَقَهٗ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ وَسَايَرَهٗ فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ مَالِكٌ فَقَالَ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِنَّكَ تَدْخُلُ الْآنَ الْمَدِيْنَةَ، فَتَمُرُّ بِقَوْمٍ عَنْ يَّمِيْنِكَ وَيَسَارِكَ، وَهُمْ أَوْلَادُ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِمْ، فَإِنَّ مَا عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ قَوْمٌ خَيْرٌ مِّنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ، وَلَا خَيْرَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ وَمِنْ أَيْنَ قُلْتَ ذٰلِكَ يَا أَبَا عَبْدَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ لِأَنَّهٗ لَا يُعْرَفُ قَبْرُ نَبِيٍّ اَلْيَوْمَ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ غَيْرَ قَبْرِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَمَن كَانَ قَبْرُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهُمْ، فَيَنْبَغِيْ أَنْ يُّعْرَفَ فَضْلُهُمْ عَلٰى غَيْرِهِمْ''۔

ترجمہ: ''اور مصعب نے کہا: جب (خلیفہ) مہدی مدینہ آئے تو امام مالک ودیگر اشرافِ مدینہ نے کئی میل آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا، جب مہدی نے امام مالک کو دیکھا تو اُن کی طرف مڑے، پھر اُن سے معانقہ کیا اور انہیں سلام کیا اور ان کو ساتھ لے کر چلے، امام مالک اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: اے امیر المومنین! آپ اب مدینے میں داخل ہوں گے، تو آپ اس طرح گزریں گے کہ لوگ آپ کے دائیں بائیں ہوں گے اور یہ لوگ مہاجرین وانصار کی اولاد ہیں تو انہیں سلام کیجیے گا، کیونکہ روئے زمین پر کوئی قوم مدینہ اور اہلِ مدینہ سے افضل نہیں ہے۔ (خلیفہ مہدی نے) کہا: اے ابوعبداللہ! آپ یہ بات کیسے کہہ رہے ہیں، تو امام مالک نے جواب دیا: اس لیے کہ روئے زمین پر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی قبر کے بغیر کسی نبی کی قبر (قطعیت کے ساتھ) معلوم نہیں ہے اور ان (اہلِ مدینہ) کے پاس نبی ﷺ کی قبر ہے، تو دوسروں پر ان کی فضیلت کو ماننا چاہیے، (تَرْتِيْبُ الْمَدَارِكِ وَتَقْرِيْبُ الْمَسَالِكِ، ج:2، ص:102، سُبُلُ الْهُدٰى وَالرَّشَاد، ج:3، ص:313)''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفّٰی 620ھ، لکھتے ہیں:

''وَإِنْ بَلِيَ الْمَيِّتُ وَعَادَ تُرَابًا، فَلِصَاحِبِ الْأَرْضِ أَخْذُهَا''۔

ترجمہ: ''اور اگر میت بوسیدہ ہو کر مٹی ہو جائے تو زمین کا مالک اسے واپس لے سکتا ہے، (المغنی لابن قدامہ، ج:2،ص:413)''۔

امام نووی شافعی متوفّٰی 676ھ، لکھتے ہیں:

''وَأَمَّا نَبْشُ الْقَبْرِ فَلَا يَجُوزُ لِغَيْرِ سَبَبٍ شَرْعِيٍّ بِاتِّفَاقِ الْأَصْحَابِ وَيَجُوزُ بِالْأَسْبَابِ الشَّرْعِيَّةِ كَنَحْوِ مَا سَبَقَ وَمُخْتَصَرُهُ أَنَّهُ يَجُوزُ نَبْشُ الْقَبْرِ إِذَا بَلِيَ الْمَيِّتُ وَصَارَ تُرَابًا وَحِينَئِذٍ يَجُوزُ دَفْنُ غَيْرِهِ فِيهِ وَيَجُوزُ زَرْعُ تِلْكَ الْأَرْضِ وَبِنَائُهَا وَسَائِرُ وُجُوهِ الِانْتِفَاعِ وَالتَّصَرُّفِ فِيهَا بِاتِّفَاقِ الْأَصْحَابِ وَإِنْ كَانَتْ عَارِيَةً رَجَعَ فِيهَا الْمُعِيرُ وَهٰذَا كُلُّهُ إِذَا لَمْ يَبْقَ لِلْمَيِّتِ أَثَرٌ مِنْ عَظْمٍ وَغَيْرِهِ قَالَ أَصْحَابُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَيَخْتَلِفُ ذٰلِكَ بِاخْتِلَافِ الْبِلَادِ وَالْأَرْضِ وَيُعْتَمَدُ فِيهِ قَوْلُ أَهْلِ الْخِبْرَةِ بِهَا''۔

ترجمہ: ''اور رہا قبر کا اکھاڑنا، تو اصحابِ مذہب کا اتفاق ہے کہ سبب شرعی کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور شرعی اسباب کی بنا پر جائز ہے، جیسا کہ گزر چکا اور مختصر یہ کہ جب میت بوسیدہ ہو کر مٹی ہو جائے تو قبر کا اکھاڑنا اور اس میں دوسری میت کا دفن کرنا جائز ہے اور اس زمین میں کاشت کرنا، عمارت بنانا اور نفع اٹھانے کے دیگر تصرفات بھی بالاتفاق جائز ہیں اور اگر قبر کی جگہ عاریۃً دی گئی تھی تو عاریۃً دینے والا (قبر خالی کرانے کے لیے) رجوع کر سکتا ہے اور یہ ساری صورت تب ہے کہ جب میت کے آثار یعنی ہڈیاں وغیرہ باقی نہ رہیں، ہمارے اصحابِ (مذہب) رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ (میت کی بوسیدگی کے حوالے سے) مختلف علاقوں اور زمین کے اعتبار سے احوال مختلف ہوتے ہیں، اس کے بارے میں تجربہ کار لوگوں کا قول معتبر ہے، (اَلْمَجْمُوْعُ شَرْحِ الْمُهَذَّبْ، ج:5،ص: 303)''۔ یعنی یہ قیاس کرنے کے لیے کہ میت بوسیدہ ہو چکی ہوگی یا نہیں، تجربہ کار لوگوں کا قول معتبر ہوگا۔

علامہ زیلعی حنفی متوفّٰی 762ھ، لکھتے ہیں:

''وَلَوْ بَلِيَ الْمَيِّتُ وَصَارَ تُرَابًا جَازَ دَفْنُ غَيْرِهِ فِي قَبْرِهِ وَزَرْعُهُ وَالْبِنَاءُ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: اگر میت بوسیدہ ہوکر خاک ہوجائے، تو اس قبر میں دوسری میت کو دفن کرنا، اس میں کاشت کرنا اور اس پر عمارت بنانا جائز ہے، (تَبْیِیْنُ الْحَقَائِق شَرْحُ کَنْزُ الدَّقَائِق، ج:1، ص:246)"، اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے اور مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

علامہ ابن رجب حنبلی متوفّٰی 795ھ لکھتے ہیں:

"وَکَرِہَ بَعْضُ السَّلَفِ نَبْشَ الْقُبُوْرِ الْعَادِیَةِ الْمَجْھُوْلَةِ خَشْیَةَ أَنْ یُّصَادِفَ قَبْرَ نَبِيٍّ أَوْ صَالِحٍ، وَخُصُوْصًا بِأَرْضِ الشَّامِ کَالْأُرْدُنِ وَنَصَّ أَحْمَدُ عَلٰی أَنَّهٗ إِذَا غَلَبَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی أَرْضِ الْحَرْبِ فَلَا تُنْبَشُ قُبُوْرُھُمْ وَھٰذَا مَحْمُوْلٌ عَلٰی مَا إِذَا کَانَ النَّبْشُ عَبَثًا لِغَیْرِ مَصْلَحَةٍ، اَوْ أَنْ یُّخْشٰی مِنْهُ أَنْ یَّفْعَلَ الْکُفَّارُ مِثْلَ ذٰلِكَ بِالْمُسْلِمِیْنَ إِذَا غَلَبُوْا عَلٰی أَرْضِھِمْ"۔

ترجمہ: "اور بعض سلف نے اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کسی نبی یا ولی کی قبر نہ ہو، نامعلوم قبروں کے اکھاڑنے کو ناپسند کیا ہے، خصوصاً شام اور اُردن کی سرزمین پر (کیونکہ وہاں انبیائے کرام کے مزارات کے امکانات ہیں) اور امام احمد نے تصریح کی ہے کہ جب مسلمان دارالحرب پر غالب آجائیں تو اُن کی قبور کو نہ اکھاڑا جائے، یہ ممانعت اس بات پر محمول ہے کہ جب کسی مصلحت کے بغیر بے مقصد قبروں کو اکھاڑا جائے (یعنی مصلحت کی صورت میں جائز ہے) یا اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں کفار مسلمانوں کی سرزمین پر غالب آجائیں تو وہ بھی ردِّ عمل میں ایسا ہی نہ کریں، (فتح الباری، ج:2، ص:213)"۔

حافظ ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم العراقی متوفّٰی 806ھ، لکھتے ہیں:

"وَلَیْسَ فِی قُبُوْرِ الْأَنْبِیَاءِ مَا ھُوَ مُحَقَّقٌ سِوٰی قَبْرِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَأَمَّا قَبْرُ مُوْسٰی فَمَظْنُوْنٌ بِالْعَلَامَةِ الَّتِی فِی الْحَدِیْثِ وَقَبْرُ إِبْرَاھِیْمَ الْخَلِیْلَ وَمَنْ مَّعَهٗ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ أَیْضًا مَظْنُوْنٌ بِمَنَامَاتٍ وَنَحْوِھَا"۔

ترجمہ: "سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روضہ انور کے سوا دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی قبور کے بارے کوئی روایت قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی قبر بھی حدیث پاک

میں بیان کردہ علامت کی رو سے ظنی ہے اور ابراہیم خلیل علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبور کے بارے میں معلومات خوابوں وغیرہ پر مبنی ہیں، جو ظنی ہیں، (طَرْحُ التَّثْرِیب فِی شَرْحِ التَّقْرِیب، ج:3،ص:303)''۔

علامہ مرداوی حنبلی متوفّٰی 885ھ، لکھتے ہیں:

''مَتٰی عُلِمَ أَنَّ الْمَیِّتَ صَارَ تُرَابًا، قَالَ فِی الْفُرُوعِ: وَمُرَادُھُمْ ظَنُّ أَنَّهٗ صَارَ تُرَابًا، وَلِھٰذَا ذَکَرَ غَیْرُ وَاحِدٍ، یُعْمَلُ بِقَوْلِ أَھْلِ الْخُبْرَةِ، فَالصَّحِیْحُ مِنَ الْمَذْھَبِ، أَنَّهٗ یَجُوْزُ دَفْنُ غَیْرِہٖ فِیْهِ. قَالَ أَبُو الْمَعَالِی: جَازَ الدَّفْنُ، وَالزِّرَاعَةُ، وَغَیْرُ ذٰلِكَ. وَمُرَادُہٗ إِذَا لَمْ یُخَالِفْ شَرْطَ وَاقِفِهٖ لِتَعْیِیْنِهِ الْجِهَةَ. وَقِیْلَ: لَا یَجُوْزُ''۔

ترجمہ:''جب معلوم ہوجائے کہ میت گل کر مٹی ہوگئی ہے،تو فروع میں کہا ہے: اور ان کی مراد یہ ہے کہ میت کے گل کر مٹی ہونے کا گمان ہے اور اسی لیے ایک سے زیادہ اہل علم نے کہا ہے: تجربہ کار لوگوں کی رائے پر عمل کیا جائے، پس مذہب کا صحیح موقف یہ ہے کہ اس قبر میں دوسری میت کا دفن کرنا جائز ہے، ابوالمعالی نے کہا: (دوسری میت کا) دفن کرنا اور کاشت وغیرہ کرنا سب جائز ہیں اور ان کی مراد یہ ہے کہ جب یہ تصرف واقف کی شرط کے برعکس نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے ،(اَلْاِنْصَاف فِیْ مَعْرِفَةِ الرَّاجِحِ مِنَ الْخِلَاف، ج:6،ص:244)''۔

علامہ ملا علی قاری متوفّٰی 1014ھ لکھتے ہیں:

''وَمَا صَحَّ قَبْرُ نَبِیٍّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ غَیْرَ قَبْرِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ إِیْمَاءً إِلٰی أَنَّ غَیْرَہٗ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ کَالْبَدْرِ السَّائِرَةِ الْمَسْتُوْرَةِ عَنْ عَیْنِ الشُّهُوْدِ عِنْدَ ظُهُوْرِ نُوْرِ شَمْسِ دَائِرَةِ الْوُجُوْدِ''۔

ترجمہ:''ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کی قبر (کا صحیح مقام) کسی قطعی اور صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے دائرۂ وجود میں سورج کے نور کے نمودار ہونے پر چودھویں کا چاند بھی لوگوں کی

نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے، (شَرحُ الشِّفَاء، ج:1،ص:335)''۔

علامہ زین الدین محمد عبدالرؤف مناوی شافعی متوفّٰی 1031ھ لکھتے ہیں:

''أَخرَجَ ابنُ عَسَاکِر عَنْ کَعْبٍ أَنَّ قَبرَ مُوسٰی بِدِمَشْقَ وَذَکَرَ ابنُ حِبَّانَ فِی صَحِیْحِہٖ أَنَّ قَبرَہٗ بَیْنَ مَدْیَنَ وَبَیْنَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَاعْتَرَضَہُ الضِّیَاءُ الْمُقَدَّسِیُ ثُمَّ ذَکَرَ أَنَّہٗ اشْتَھَرَ أَنَّ قَبرَہٗ قَرِیْبٌ مِنْ اَرِیْحَاءَ بِقُرْبِ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَۃِ وَقَدْ دَلَّتْ مَنَامَاتٌ وَحِکَایَاتٌ عَلٰی أَنَّہٗ قَبرُہٗ. قَالَ الْحَافِظُ الْعِرَاقِیُ وَلَیْسَ فِیْ قُبُوْرِ الْأَنْبِیَاءِ مَا ھُوَ مُحَقَّقٌ إِلَّا قَبرُ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَأَمَّا قَبرُ مُوسٰی وَإِبْرَاھِیْمَ فَمَظْنُوْنٌ''۔

ترجمہ: ''ابن عساکر نے کعب سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قبر دمشق کے مقام پر ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا: اُن کی قبر مدین اور بیت المقدس کے درمیان ہے اور ضیاء مقدسی نے اس پر اعتراض کیا ہے، پھرانہوں نے ذکر کیا: مشہور یہ ہے کہ اُن کی قبر ارضِ مقدسہ کے قریب اَرِیحاء کے مقام پر ہے اور خوابیں اور حکایات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اُن کی قبر ہے۔ حافظ عراقی نے کہا: انبیائے کرام علیہم السلام کی قبور میں سے قطعیت کے ساتھ صرف ہمارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر ثابت ہے اور موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کی قبور کے بارے میں روایات ظنی ہیں، (فَیْضُ الْقَدِیْر،ج:5،ص:519)''۔

علامہ ابن عابدین شامی متوفّٰی 1252ھ، لکھتے ہیں:

صاحبِ امداد نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: ''وَیُخَالِفُہٗ مَا فِی التَّتَارْخَانِیَّۃِ إِذَا صَارَ الْمَیِّتُ تُرَابًا فِی الْقَبرِ یُکرَہُ دَفْنُ غَیْرِہٖ فِی قَبرِہٖ لِأَنَّ الْحُرمَۃَ بَاقِیَۃٌ''۔

ترجمہ: فتاویٰ تتارخانیہ میں اس کے برعکس ہے (وہ لکھتے ہیں): جب میت قبر میں مٹی ہوجائے، تو دوسری میت کا اس میں دفن کرنا مکروہ ہے، کیونکہ قبر کی حرمت اب بھی باقی ہے، (اَلدُّرُّ الْمُختَار،ج:2،ص:233)''۔

ظاہر ہے یہ اس صورت میں ہے کہ قبر کے آثار باقی ہوں۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

’’حَقَّقَ الْعَبْدُ الضَّعِیْفُ فِیْ فَتَاوِیْهِ: اَنَّ کَلَامَ الْاِمَامِ الزَّیْلَعِیِّ هٰذَا فِی الْاَرْضِ الْمَمْلُوْکَةِ دُوْنَ الْمَوْقُوْفِ فَلْیَکُنِ التَّوْفِیْقُ‘‘۔

ترجمہ: بندہ ضعیف نے اپنے فتاویٰ کے باب الوقف میں اس بات کی تحقیق کی ہے کہ امام زیلعی کے جواز کا قول کسی کی ملکیتی زمین کے بارے میں ہے اور یہ جواز وقف شدہ زمین میں نہیں ہے، اس طرح (تتارخانیہ اور زیلعی کے) اقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے، (جِدُّ الْمُمْتَار ج:3، ص:409)‘‘۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی متوفّٰی 1252ھ، لکھتے ہیں:

’’لٰکِنْ فِیْ هٰذَا مَشَقَّةٌ عَظِیْمَةٌ، فَالْاَوْلٰی اِنَاطَةُ الْجَوَازِ بِالْبِلٰی، اِذْ لَا یُمْکِنُ اَنْ یُّعَدَّ لِکُلِّ مَیِّتٍ قَبْرٌ لَا یُدْفَنُ فِیْهِ غَیْرُهٗ، وَاِنْ صَارَ الْاَوَّلُ تُرَابًا لَا سِیَّمَا فِی الْاَمْصَارِ الْکَبِیْرَةِ الْجَامِعَةِ وَاِلَّا لَزِمَ اَنْ تَعُمَّ الْقُبُوْرُ السَّهْلَ وَالْوَعْرَ عَلٰی اَنَّ الْمَنْعَ مِنَ الْحَفْرِ اِلٰی اَنْ یَّبْقٰی عَظْمٌ عَسِرٌ جِدًّا، وَاِنْ اَمْکَنَ ذٰلِکَ لِبَعْضِ النَّاسِ لٰکِنَّ الْکَلَامَ فِیْ جَعْلِهٖ حُکْمًا عَامًّا لِکُلِّ اَحَدٍ، فَتَاَمَّلْ‘‘۔

ترجمہ: لیکن اس میں بڑی مشقت ہے، پس بہتر یہ ہے کہ میت کے بوسیدہ ہونے کے بعد قبر کا مٹانا جائز ہے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہر میت کے لیے ایسی قبر تیار کی جائے جس میں دوسری میت (اُس صورت میں بھی) دفن نہ کی جاسکے، خواہ پہلی میت بوسیدہ ہوچکی ہو، خاص طور پر بڑے شہروں میں (اتنی احتیاط مشکل ہے)، ورنہ لازم آئے گا کہ ہر نرم اور سخت جگہ قبریں ہی قبریں ہوں، قبر کھودنے کی ممانعت کو اس وقت تک قرار دینا کہ میت کی ہڈیاں باقی نہ رہیں، ایسی ممانعت میں سخت مشکل ہے، اگرچہ یہ بعض لوگوں کے لیے ممکن ہوگا، لیکن یہاں گفتگو اسے حکمِ عام قرار دینے کے بارے میں ہورہی ہے، پس غور کا مقام ہے، (رَدُّالْمُحْتَار عَلَی الدُّرِّ الْمُخْتَار، ج:2، ص:234)‘‘۔ علامہ شامی کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہر ایک قبر کو بہرصورت باقی رکھنا لازم قرار دیا جائے، تو ہوسکتا ہے کہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد ایک وقت ایسا آئے کہ زمین پر زندہ لوگوں کے لیے جگہ کی قلت

ہو جائے، لہٰذا عام حکم میں یسر کا پہلو ملحوظ رہنا چاہیے۔

تائیدات وتصدیقات

(1) تائید وتوثیق: مفتی محمد رفیق حسنی مُدَّ ظِلّہم

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستان جوہر، بلاک 15، کراچی)

اَلْجَوَابُ صَحِیح، جب دیارِ کفر میں لیز کی مدت ختم ہو جائے، قبرستان کی زمین حکومت کے ملک میں واپس آ جاتی ہے اور اموات کی تدفین کی اجازت ختم ہو جاتی ہے۔ فقہائے کرام نے ارشاد فرمایا: مملوکہ زمین کا مالک بلا اجازت دفن کیے گئے اصحاب قبور کی قبروں کو مسمار کر کے ذاتی استعمال میں لا سکتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں غیر مسلم ممالک میں لیز کی مدت کے بعد حکومت یا صاحب زمین اُسے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے، وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

(2) تائید وتوثیق: علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری مُدَّ ظِلّہم

(شیخ الحدیث ورئیس دارالافتاء جامعہ غوثیہ رضویہ، باغِ حیات علی شاہ، مومن گلی، سکھر)

قبرستان کے لیے اجارے پر حاصل کی گئی زمین کے بارے میں مفتی منیب الرحمن صاحب کے فتوے سے مکمل طور پر متفق ہوں اور اس کی تائید وتوثیق کرتا ہوں۔

(3) تائید وتوثیق: مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی مُدَّ ظِلّہم

(مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ نضرۃ العلوم، 10-B، گارڈن ویسٹ، کراچی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

فی زمانا منبروں پر بعض غیر سنجیدہ مقررین کی اجارہ داری ہی نہیں بلکہ بھاری بھاری فیسوں کا تقاضا بھی ہے۔ علاوہ ازیں بھرپور استقبال کے لیے منظّم کارندوں کا اہتمام وانصرام، موقع محل دیکھتے ہوئے ہٹو! بچو! کی صداؤں کا التزام، فیس وصول کرنے کے لیے سیکرٹری کا انتظام، مزید برآں چالیس، ساٹھ یا اسّی ہزار روپے طے کرنے پر کتاب الاجارہ سے دلیل کا اِعلام، طالبِ مال کے لیے راہ ہموار کرنے کا پیغام، اگر یہی روش رہی تو وہ دن دور نہیں کہ سننے والے حضرات بھی نعرہ بلند کر دیں کہ جب سنانے والے حضرت صاحب

اجارے کی بنیاد پر بڑی سے بڑی رقم لینے پر تلے ہوئے ہیں تو ہمیں بھی اسی مد میں بڑی نہ سہی چھوٹی رقم ہی دے دی جائے، حضور! ہمارا کیا قصور؟۔سو روپے فی کس کے حساب سے مثلاً سننے والے پانچ صد ہوئے تو کل رقم پچاس ہزار ہی ہوگی، جبکہ سنانے والے حضرت صاحب تو فرد واحد ہونے کے باوجود مثلاً اسّی ہزار روپے وصول کر رہے ہیں۔ بہر حال متذکرہ مقررین وعظ ونصیحت کی محفل کا تقدس بالائے طاق رکھتے ہوئے بسا اوقات غیر شائستہ حرکات وسکنات اور بعض اوقات غیر مہذب گفتار سے سامعین کے دلوں کو لبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح کے صاحبان ان دنوں ''اصلاح عقائد واعمال'' کے مصنف لبیب مفتی اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمٰن مدظلہ العالی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں، جبکہ قبلہ مفتی صاحب بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک کے عوام اہلسنت کی دینی مشکلات حل کرنے کے لیے بطیبِ خاطر کوشاں ہیں، سستی وکاہلی کا نام ونشاں ہی نہیں، اس پر کسی خارجی شہادت کی چنداں حاجت نہیں، خود ان کی کتابیں، رسالے، کالم اور علمی وتحقیقی فتوے اس پر شاہد، نیز عوام وخواص، مساجد ومحافل، ذرائع ابلاغ وحکومتی ایوان میں اصلاحی وتربیتی خطابات عقل سلیم رکھنے والوں کے لیے مُوجِبِ تسکین۔

زیر نظر علمی وتحقیقی اور تفصیلی فتویٰ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو برطانیہ سے آئے ہوئے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا گیا ہے۔راقم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں دعا گو ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ظاہری وباطنی قُویٰ کی سلامتی کے ساتھ قبلہ مفتیِ موصوف کی عمر دراز فرمائے اور ہر شریر کے شر سے حفاظت فرمائے۔

ڈی این اے کے بارے میں چشم کشا حقائق

احادیثِ مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجودِ انسانی کی تخلیق کے ابتدائی مراحل میں جب اُس میں روح پھونکنے کا مرحلہ آتا ہے، تو اُس سے متعلق امور طے کر دیے جاتے ہیں، یعنی رزق، اَجل یا شقی یا سعید ہونا اور جنتی کے جنت میں اور جہنمی کے جہنم میں داخل ہونے تک کے تمام امور طے کر دیے جاتے ہیں، گویا قدرت کی طرف سے اُس کی کمپیوٹر ڈسک

(CD) تمام تر تفصیلات کے ساتھ تیار ہوجاتی ہے۔اب جدید سائنسی معلومات کی رُو سے معلومات کا یہ خزینہ وجودِ انسانی کے ہر خُلیے (Cell) میں اسٹور ہوتا ہےاور لیبارٹری تجزیے سے اُس کے نسبی پسِ منظر کا تعیُّن کیا جاسکتا ہے۔اسی شناخت کا ذریعہ قدرت نے انسان کی انگلیوں کے Fingertips پر جونیم مُدوَّر (Whorl) لکیروں کو بنایا،اسی طرح آنکھ کے اندر جو سیاہ یا نیلا یا بھورا یا سرمئی رنگ کا دائرہ ہوتا ہے،اس کی لائنوں سے بھی انسان کی شناخت کی جاتی ہے اور یہ حیرت کا ایک سمندر ہے کہ آج دنیا میں سات ارب انسان ہیں اوراُن کی ہاتھوں کی ستّر ارب Fingertips ہیں اور چودہ ارب آنکھیں ہیں اور یہ خفیف علامات انسان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔اسی طرح ڈی این اے کے لیے فنگر پرنٹس الگ طرح سے لیے جاتے ہیں۔

چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱)''عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ:حَدَّثَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُوَ الصَّادِقُ المَصْدُوقُ، قَالَ:''إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ مَلَكًا فَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعٍ بِرِزْقِهِ وَأَجَلِهِ، وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ، فَوَاللهِ إِنَّ أَحَدَكُمْ أَوِ الرَّجُلَ يَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، حَتّٰى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا غَيْرُ بَاعٍ أَوْ ذِرَاعٍ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الجَنَّةِ، فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الجَنَّةِ، حَتّٰى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا غَيْرُ ذِرَاعٍ أَوْ ذِرَاعَيْنِ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا''قَالَ آدَمُ:إِلَّا ذِرَاعٌ''۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہم سے فرمایااور آپ صادق اور مصدوق ہیں،آپ نے فرمایا: بے شک تم میں سے کوئی ایک اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے،پھر وہ اس کی مثل (چالیس دن تک) جما ہوا خون رہتا ہے،پھر وہ اس کی مثل (چالیس دن تک) گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے،پھر اللہ تعالیٰ ایک

فرشتے کو بھیجتا ہے پس اس کو چار کلمات لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس کا رزق، اس کی مدتِ حیات، اس کا بد بخت ہونا یا اس کا نیک بخت ہونا۔ پس اللہ کی قسم! بے شک تم میں سے کوئی ایک یا فرمایا کوئی ایک مرد ضرور اہلِ دوزخ کے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے درمیان اور دوزخ کے درمیان صرف ایک باع (دونوں بازوؤں کے پھیلاؤ کا فاصلہ) یا ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر کتاب (وہ لکھا ہوا) سبقت کرتی ہے، پس وہ اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے، سو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور بے شک ایک مرد ضرور اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے یا دو ہاتھوں کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب سبقت کرتی ہے۔ پس وہ اہل دوزخ کے عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، (صحیح البخاری:6594)''۔

(۲)''عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ، قَالَ: نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى رَجُلٍ يُقَاتِلُ الْمُشْرِكِينَ، وَكَانَ مِنْ أَعْظَمِ الْمُسْلِمِينَ غَنَاءً عَنْهُمْ، فَقَالَ: مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَى هٰذَا، فَتَبِعَهُ رَجُلٌ، فَلَمْ يَزَلْ عَلَى ذٰلِكَ حَتَّى جُرِحَ، فَاسْتَعْجَلَ الْمَوْتَ، فَقَالَ بِذُبَابَةِ سَيْفِهِ فَوَضَعَهُ بَيْنَ ثَدْيَيْهِ، فَتَحَامَلَ عَلَيْهِ حَتَّى خَرَجَ مِنْ بَيْنِ كَتِفَيْهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ، فِيمَا يَرَى النَّاسُ، عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ لَمِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَيَعْمَلُ فِيمَا يَرَى النَّاسُ، عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِخَوَاتِيمِهَا''۔

ترجمہ: ''حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مرد کو دیکھا جو مشرکین سے قتال کر رہا تھا اور مسلمانوں کے نزدیک وہ شخص ان سے بہت زیادہ دفاع کرنے والا تھا، تو آپ نے فرمایا: ''جو شخص اس مرد کو دیکھنا چاہے جو اہلِ دوزخ میں سے ہو تو وہ اس مرد کو دیکھ لے''، پھر ایک شخص اس مرد کے پیچھے پیچھے رہا اور اسی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا حتیٰ کہ وہ مرد زخمی ہو گیا اس نے موت کو جلدی طلب کیا اور اس نے تلوار کی نوک کو اپنے دو پستانوں کے درمیان رکھ کر اپنے آپ کو اس تلوار پر گرا دیا حتیٰ کہ وہ تلوار اس کے

دونوں کندھوں کے درمیان سے نکل گئی، تب نبی ﷺ نے فرمایا: بے شک بندہ ضرور عمل کرتا ہے اور لوگ اس کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ اہلِ جنت کا عمل کر رہا ہے اور بے شک وہ اہلِ دوزخ میں سے ہوتا ہے اور ایک بندہ عمل کرتا رہتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دوزخیوں سے عمل کر رہا ہے اور وہ اہل جنت سے ہوتا ہے، اعمال کا دارومدار تو خاتمہ پر ہے، (صحیح البخاری:6493)''۔

(۳)''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: وَكَّلَ اللهُ بِالرَّحِمِ مَلَكًا، فَيَقُولُ أَيْ رَبِّ نُطْفَةٌ، أَيْ رَبِّ عَلَقَةٌ، أَيْ رَبِّ مُضْغَةٌ، فَإِذَا أَرَادَ اللهُ أَنْ يَقْضِيَ خَلْقَهَا، قَالَ: أَيْ رَبِّ، أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثَى، أَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ، فَمَا الرِّزْقُ، فَمَا الأَجَلُ، فَيُكْتَبُ كَذٰلِكَ فِي بَطْنِ أُمِّهِ''۔

ترجمہ:''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے رحم کے ساتھ ایک فرشتہ مقرر کیا ہے، سو وہ کہتا ہے اے رب! نطفہ (قرار پایا)، (پھر کہتا ہے:) اے رب! وہ نطفہ عَلَقہ (جما ہوا خون) بن گیا، (پھر کہتا ہے:) اے رب! اب مُضْغَة (گوشت کا لوتھڑا) بن گیا، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے (تو فرشتہ کہتا ہے:) اے رب! مذکر ہو یا مؤنث (اور) بد بخت ہو یا نیک بخت (اور) اس کا رزق کتنا ہے (اور) اس کی مدتِ حیات کتنی ہے؟ پس اس کی ماں کے پیٹ میں ہی (یہ سب تفصیلات) لکھ دی جاتی ہیں، (صحیح البخاری:6599)''۔

(۴)''عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَنَازَةٍ، فَأَخَذَ شَيْئًا فَجَعَلَ يَنْكُتُ بِهِ الأَرْضَ، فَقَالَ: مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ، وَمَقْعَدُهُ مِنَ الجَنَّةِ، قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ، أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا، وَنَدَعُ العَمَلَ؟، قَالَ: اعْمَلُوا، فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ، أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ السَّعَادَةِ، وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاءِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ، ثُمَّ قَرَأَ:''فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى، (اللیل:6)، الآيَةَ''۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں تھے، پس آپ نے کوئی چیز پکڑی اور اس کے ساتھ زمین کریدنے لگے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کے متعلق اس کا دوزخ میں ٹھکانا اور جنت میں ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے، تو صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! کیا پس ہم اس لکھے ہوئے پر اعتماد نہ کرلیں اور عمل کو چھوڑ دیں؟، آپ نے فرمایا: تم عمل کرو، ہر شخص کے لیے وہ عمل آسان کردیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ رہا وہ شخص جو اہل سعادت میں سے ہے، تو اس کے لیے اہل سعادت کے عمل آسان کردیے جائیں گے اور رہا وہ شخص جو اہل شقاوت میں سے ہے، تو اس کے لیے اہل شقاوت کے عمل آسان کردیے جائیں گے، پھر آپ نے یہ آیتیں پڑھیں: ''پس جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور اللہ سے ڈر کر گناہوں سے بچتا رہا، پس عنقریب ہم اس کو آسانی (جنت) مہیا کریں گے، (اللیل:6-5)''، (صحیح البخاری:4949)''۔

(۵) ''قَالَ زُهَيْرٌ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يَزِيدَ الْمُقْرِئُ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَيْوَةُ، أَخْبَرَنِي أَبُو هَانِئٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْحُبُلِيَّ، أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، يَقُولُ: أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ، كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بے شک تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان قلبِ واحد کی طرح ہیں، وہ جس طرف چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ! دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے، (صحیح مسلم:2654)''۔ ''رحمٰن کی انگلیاں'' یہ متشابہات میں سے ہے، اس کا معنی اور مصداق ہم متعیّن نہیں کرتے، اس سے جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہے، اس پر ہم ایمان لاتے ہیں، تاہم مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کے قبضہ وقدرت اور اختیار میں ہے۔

(٦) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: شَهِدْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْبَرَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ مِمَّنْ مَعَهُ يَدَّعِي الْإِسْلَامَ هٰذَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَلَمَّا حَضَرَ الْقِتَالُ قَاتَلَ الرَّجُلُ مِنْ أَشَدِّ الْقِتَالِ، وَكَثُرَتْ بِهِ الْجِرَاحُ فَأَثْبَتَتْهُ، فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ الَّذِي تَحَدَّثْتَ أَنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، قَدْ قَاتَلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ مِنْ أَشَدِّ الْقِتَالِ، فَكَثُرَتْ بِهِ الْجِرَاحُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمَا إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَكَادَ بَعْضُ الْمُسْلِمِينَ يَرْتَابُ، فَبَيْنَمَا هُوَ عَلَى ذٰلِكَ إِذْ وَجَدَ الرَّجُلُ أَلَمَ الْجِرَاحِ، فَأَهْوَى بِيَدِهِ إِلَى كِنَانَتِهِ فَانْتَزَعَ مِنْهَا سَهْمًا فَانْتَحَرَ بِهَا، فَاشْتَدَّ رِجَالٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ! صَدَّقَ اللّٰهُ حَدِيثَكَ، قَدِ انْتَحَرَ فُلَانٌ فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يَا بِلَالُ، قُمْ فَأَذِّنْ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ خیبر میں گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس مرد کے متعلق فرمایا، جو آپ کے ساتھ تھا اور اسلام کا دعویٰ کرتا تھا، آپ نے فرمایا: یہ اہلِ دوزخ سے ہے، پس جب جنگ شروع ہوئی تو اس مرد نے بہت شدید قتال کیا اور اس کو بہت زیادہ زخم آ گئے پھر بھی وہ ثابت قدم رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک صحابی نے آ کر آپ سے عرض کی: یارسول اللہ! یہ بتائیے کہ آپ نے جس مرد کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ اہلِ دوزخ سے ہے، اس نے تو اللہ کی راہ میں بہت زبردست قتال کیا ہے اور وہ بہت زیادہ زخمی ہو گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لیکن وہ اہلِ دوزخ سے ہے، پر قریب تھا کہ بعض صحابہ (آپ کی نبوت کے متعلق) شک میں پڑ جاتے، پس جس وقت وہ مرد اسی حال پر تھا اچانک اس مرد نے زخم کا بہت درد محسوس کیا اور اس نے اپنا ہاتھ اپنے ترکش کی طرف بڑھایا اور اس میں سے ایک تیر نکالا اور اس تیر سے اس نے اپنے آپ کو

ہلاک کردیا، پھر مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ارشاد کو سچ کردکھایا، اس شخص نے ابھی اپنے اندر تیر کو گھونپ لیا اور اپنے آپ کو قتل کرلیا، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! کھڑے ہوکر اعلان کرو کہ جنت میں صرف مومن داخل ہوگا اور بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی کسی فاسق مرد سے بھی تائید فرماتا ہے، (صحیح البخاری:6606)''۔

گزشتہ سال اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے قرار دیا کہ زنا بالجبر کے ملزم کی ڈی این اے کی لیبارٹری رپورٹ اگر مثبت بھی آجائے، تو اُسے حدِّ زنا جاری کرنے کے لیے حتمی اور قطعی شہادت (Absolute Evidence) کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے لیے عینی شہادت (Eye Witness) کا مطلوبہ شرعی معیار لازمی ہے۔ البتہ اسے ظنّی شہادت (Doubtful Evidence) یا قرائن کی شہادت (Circumstancial Evidence) یا تائیدی شہادت (Supporting Evidence) یا موقع کی شہادت (Forensic Evidence) کے طور پر لیا جاسکتا ہے اور عینی شہادت کی عدم دستیابی کی صورت میں اگر عدالت کو اطمینان ہو، تو مجرم کو تعزیراً سزا دے سکتی ہے، کسی جرم کی تعزیری سزا کے لیے فقہائے کرام نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ وہ اس جرم کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقررہ حد سے کم ہو۔

اس پر ہمارے آزاد الیکٹرانک میڈیا پر حاوی لبرل عناصر نے کہرام مچادیا۔ ان میں حقوقِ نسواں اور حقوقِ انسانی کے نام پر تنظیمیں چلانے والی NGOs اور دیگر فعال (Activist) عناصر سب شامل ہیں۔ چونکہ مغربی ممالک کی اقدار کے پرچارک ان طبقات کو زنا بالرضا (Adultery) پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اس لیے ان کا اصرار ہے کہ زنا بالجبر (Rape) کے ثبوت کے لیے DNA کا لیبارٹری ٹیسٹ اگر مثبت آجائے، تو اسے حتمی اور قطعی شہادت قرار دے کر اُس جرم کے مرتکب پر سزائے موت جاری کردی جائے۔

میں 12 تا 30 جنوری 2017 امریکہ کے دورے پر تھا اور مختلف ریاستوں میں

دوستوں نے دینی پروگرام ترتیب دے رکھے تھے، نیوجرسی اسٹیٹ سے جماعت اہلسنت نارتھ امریکا کے رہنما علامہ مقصود احمد قادری یہ پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ ان میں ایک پروگرام ٹینیسی اسٹیٹ کے شہر نیو جانسن سٹی میں جناب ڈاکٹر شہرام ملک کے مکان پر ہوتا ہے، جو دین دار، علم دوست اور مہمان نواز شخص ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحبان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا ایک حلقۂ احباب ہے جو کافی دور دور سے سفر کر کے یک جا ہوتے ہیں۔ چونکہ تعلیم وتعلّم ہمارا مشن ہے، اس لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ مجلس کا انعقاد اور تبادلۂ خیال بے حد مفید ثابت ہوتا ہے، ان میں کئی احباب میاں بیوی (Couple) دونوں ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ممتاز عالمی شہرت یافتہ آئی سرجن جناب ڈاکٹر خالد اعوان اس حلقۂ احباب کا نقطۂ اتصال ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا قرآن وحدیث کا وسیع مطالعہ ہے اور اُن کی یادداشت اور استدلال قابلِ رشک ہے۔ وہ محض روایتی اور نسلی مسلمان نہیں ہیں کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے اور وراثت میں اسلام کی نعمت بھی مل گئی، بلکہ وہ اُس خوش نصیب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اسلام کو پڑھا، سمجھا اور شعوری طور پر قبول کیا اور عمل بھی کیا۔ ان کے اپنے شعبۂ طب Opthalmology میں ان کے 250 سے زیادہ ریسرچ پیپرز معتبر عالمی طبی جرائد میں طبع ہو چکے ہیں۔ امراضِ چشم کے علاج کے حوالے سے ان کی ایک تحقیق "Awan Syndrome" کے عنوان سے ان کے نام سے منسوب ہے اور بلاشبہ یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ اسی طرح لیزر ٹیکنالوجی سے جو آنکھوں کا علاج ہوتا ہے، ان میں سے بھی ایک خاص "لیزر" کے موجد ڈاکٹر خالد اعوان ہیں، اس لیے یہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ امریکا اور دیارِ مغرب میں مقیم قابلِ فخر کارنامے انجام دینے والے ایسے پاکستانیوں کو قومی اعزاز کے لیے منتخب کیا جانا چاہیے اور امریکا میں مقیم پاکستانی صحافیوں کو ایسے لوگوں کی نشاندہی کرنی چاہیے۔

مجھے ایک عرصے سے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ آیا امریکا اور یورپی ممالک میں DNA ٹیسٹ کی مثبت رپورٹ کو ایسے جرائم کے ثبوت کے لیے، جن کی سزا موت ہے، قطعی

اور حتمی شہادت (Absolute Evidence) کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے یا اسے زیادہ سے زیادہ ہمارے فقہائے کرام کے اقوال کے مطابق ایک ظنّی، مشتبہ اور تائیدی شہادت کے طور پر ہی لیا جاسکتا ہے۔

قرائن کی شہادت کو قبول کرنے کے بارے قرآن کریم میں شواہد موجود ہیں، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(الف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔

ترجمہ: "(صدقات) ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، (آزادانہ طور پر) زمین میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رکھتے، (اُن کی حقیقتِ حال سے) ناواقف شخص انہیں غنی سمجھتا ہے، (اے مخاطب!) تو انہیں اُن کی صورت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، (البقرہ: 273)"۔ اس آیت کریمہ کی تشریح میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

"قَوْلُهُ تَعَالٰى (تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ): فِيهِ دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ لِلسِّيمَا أَثَرًا فِي اعْتِبَارِ مَنْ يَظْهَرُ عَلَيْهِ ذٰلِكَ، حَتّٰى إِذَا رَأَيْنَا مَيِّتًا فِي دَارِ الْإِسْلَامِ وَعَلَيْهِ زُنَّارٌ وَهُوَ غَيْرُ مَخْتُونٍ لَا يُدْفَنُ فِي مَقَابِرِ الْمُسْلِمِينَ، وَيُقَدَّمُ ذٰلِكَ عَلٰى حُكْمِ الدَّارِ فِي قَوْلِ أَكْثَرِ الْعُلَمَاءِ"۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ" میں اس بات کی دلیل ہے کہ ظاہری علامات پر حکم مرتّب ہوتا ہے، حتیٰ کہ جب ہم دارالاسلام میں کوئی ایسی مردانہ میت دیکھیں، جس کے گلے میں زنار ہے اور وہ ختنہ شدہ نہیں ہے، تو اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا اور اکثر علماء کے نزدیک ان ظاہری علامات کو دارالاسلام کے حکم پر مقدم رکھا جائے گا، (تفسیر القرطبی، سورۃ البقرہ: 273)"۔

یعنی زنار اور غیر مختون ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ میت غیر مسلم کی ہے، لہٰذا اس

پر اسلامی اموات کے احکام لاگو نہیں ہوں گے اور اسے اسلامی شِعار کے مطابق مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کے مذہب کے طریقہ کے مطابق ان کے ہم مذہب ان کی آخری رسوم ادا کریں گے، یعنی یہاں قرائن کی بنیاد پر میت کے غیر مسلم ہونے کا حکم عائد ہوگا۔

(ب): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قَالُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾''۔

ترجمہ: ''(برادرانِ یوسف) بولے: اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرنے چلے گئے تھے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا، تو اُس کو بھیڑیے نے کھالیا اور آپ ہم پر یقین کرنے والے نہیں ہو، خواہ ہم سچے ہوں اور وہ اُس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لائے، (یعقوب نے) کہا: بلکہ تمہارے دل نے ایک بات گھڑلی ہے، تو اب صبر (ہی) اچھا ہے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اس پر اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں، (یوسف:18-17)''۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس جب ان کے بیٹے یوسف علیہ السلام کی خون سے لتھڑی ہوئی قمیص لے کر آئے اور یہ دعویٰ کیا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا ہے، تو یعقوب علیہ السلام نے قرائن سے استدلال کرتے ہوئے ان کے اس دعوے کا رد کیا، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

''قَالَ عُلَمَاؤُنَا رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِمْ: لَمَّا أَرَادُوا أَنْ يَجْعَلُوا الدَّمَ عَلَامَةً عَلٰى صِدْقِهِمْ قَرَنَ اللهُ بِهٰذِهِ الْعَلَامَةِ عَلَامَةً تُعَارِضُهَا، وَهِيَ سَلَامَةُ الْقَمِيصِ مِنَ التَّنْيِيبِ، إِذْ لَا يُمْكِنُ افْتِرَاسُ الذِّئْبِ لِيُوسُفَ وَهُوَ لَابِسُ الْقَمِيصِ وَيَسْلَمُ الْقَمِيصُ مِنَ التَّخْرِيقِ، وَلَمَّا تَأَمَّلَ يَعْقُوبُ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقَمِيصَ فَلَمْ يَجِدْ فِيهِ خَرْقًا وَلَا أَثَرًا اسْتَدَلَّ بِذٰلِكَ عَلٰى

كَذِبِهِمْ، وَقَالَ لَهُمْ: مَتٰى كَانَ هٰذَا الذِّئْبُ حَكِيْمًا يَأْكُلُ يُوسُفَ وَلَا يَخْرِقُ الْقَمِيصَ! قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَغَيْرُهُ، رَوٰى إِسْرَائِيلُ عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ الدَّمُ دَمَ سَخْلَةٍ وَرَوٰى سُفْيَانُ عَنْ سِمَاكٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ لَمَّا نَظَرَ إِلَيْهِ قَالَ كَذَبْتُمْ، لَوْ كَانَ الذِّئْبُ أَكَلَهُ لَخَرَقَ الْقَمِيصَ۔ فَقَالَ لَهُمْ يَعْقُوبُ: تَزْعُمُونَ أَنَّ الذِّئْبَ أَكَلَهُ، وَلَوْ أَكَلَهُ لَشَقَّ قَمِيصَهُ قَبْلَ أَنْ يُفْضِيَ إِلٰى جِلْدِهِ، وَمَا أَرٰى بِالْقَمِيصِ مِنْ شَقٍّ، وَتَزْعُمُونَ أَنَّ اللُّصُوصَ قَتَلُوهُ، وَلَوْ قَتَلُوهُ لَأَخَذُوا قَمِيصَهُ، هَلْ يُرِيدُونَ إِلَّا ثِيَابَهُ؟! فَقَالُوا عِنْدَ ذٰلِكَ: ''وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ''، عَنِ الْحَسَنِ وَغَيْرِهِ، أَيْ لَوْ كُنَّا مَوْصُوفِيْنَ بِالصِّدْقِ لَا تَتَّهِمُنَا الثَّالِثَةُ، اِسْتَدَلَّ الْفُقَهَاءُ بِهٰذِهِ الْآيَةِ فِي إِعْمَالِ الْأَمَارَاتِ فِي مَسَائِلَ مِنَ الْفِقْهِ كَالْقَسَامَةِ وَغَيْرِهَا، وَأَجْمَعُوا عَلٰى أَنَّ يَعْقُوبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اسْتَدَلَّ عَلٰى كَذِبِهِمْ بِصِحَّةِ الْقَمِيصِ، وَهٰكَذَا يَجِبُ عَلَى النَّاظِرِ أَنْ يَلْحَظَ الْأَمَارَاتِ وَالْعَلَامَاتِ إِذَا تَعَارَضَتْ، فَمَا تَرَجَّحَ مِنْهَا قَضٰى بِجَانِبِ التَّرْجِيحِ''۔

ترجمہ: ''ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: جب برادرانِ یوسف نے (قمیصِ یوسف پر) لگے ہوئے خون کو اپنی سچائی کی علامت کے طور پر پیش کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس علامت کے ساتھ اس کے مُعارِض ایک اور علامت جوڑ دی اور وہ قمیصِ یوسف کا چیر پھاڑ سے محفوظ رہنا تھا، کیونکہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ یوسف علیہ السلام قمیص پہنے ہوئے ہوں اور بھیڑیا انہیں چیر پھاڑ کھائے اور اُن کی قمیص صحیح سلامت رہ جائے۔ سو جب یعقوب علیہ السلام نے قمیص کا جائزہ لیا تو اُس میں چیر پھاڑ کی کوئی علامت نظر نہ آئی، لہٰذا اس سے انہوں نے اُن کے جھوٹ پر استدلال کیا اور اُن سے کہا: یہ بھیڑیا اتنا دانا کیسے ہوگیا کہ یوسف کو تو کھا جاتا ہے اور قمیص میں کوئی پھٹن نہیں ہے۔ ابن عباس وغیرہ نے کہا: اسرائیل نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے: ''قمیص پر لگا ہوا خون بکری کے بچے کا تھا''۔ ایک اور روایت میں ہے: یعقوب علیہ السلام نے قمیص کو دیکھ کر کہا: ''تم جھوٹ بولتے ہو، اگر بھیڑیے نے

یوسف کو کھایا ہوتا تو قمیص کو بھی پھاڑ دیا ہوتا''۔ علامہ قرطبی مزید لکھتے ہیں: یعقوب علیہ السلام نے اُن سے کہا: ''تم لوگ یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، اگر اُسے بھیڑیے نے کھایا ہوتا تو اُس کے دانت اُن کی جلد تک پہنچنے سے پہلے قمیص کو پھاڑ دیتے، جب کہ مجھے قمیص میں کوئی پھٹن نظر نہیں آتی اور اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ چوروں نے انہیں قتل کیا ہے، پس اگر چوروں نے انہیں قتل کیا ہوتا تو اُس کی قمیص وہ ضرور لے لیتے، کیونکہ یہی اُن کے کام کی چیز تھی''۔ انہوں نے جواب میں کہا: ''ہم سچے بھی ہوں تو آپ ہم پر یقین کرنے والے نہیں ہیں''۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ''فقہاء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مسائلِ فقہ میں ظاہری علامات سے کام لیا جاسکتا ہے، جیسے ''قسامۃ'' وغیرہ۔ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے قمیص کے صحیح سالم ہونے سے اُن کے جھوٹ پر استدلال کیا، سو جب ظاہری نشانیاں باہم متعارض ہوں تو لازم ہے کہ اُن پر غور وفکر کیا جائے اور جو جانب راجح ہو، اُس کے مطابق فیصلہ کیا جائے، (القرطبی، یوسف آیت: 18)''۔

عزیزِ مصر کی بیوی نے، جس کا شوہر ان کا محسن و مربی تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسے عالم میں دعوتِ گناہ دی کہ بظاہر تمام ترغیبات موجود تھیں، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾''۔

ترجمہ: ''اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے، اس نے ان کو اپنی طرف راغب کیا اور دروازے بند کر دیے اور بولی: جلدی آؤ، انہوں نے کہا: اللہ کی پناہ! وہ میرا مربی ہے اور اس نے مجھے اچھا ٹھکانا دیا ہے، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے، اور بے شک اس عورت نے تو ان سے (گناہ کا) قصد کر ہی لیا تھا اور اگر انہوں نے اپنے رب کی مضبوط دلیل نہ

دیکھی ہوتی، تو وہ بھی اس کی طرف راغب ہو جاتے، ہم نے یونہی کیا کہ اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں، بے شک وہ ہمارے چنیدہ بندوں میں سے تھے، (یوسف: 23-24)''، آگے فرمایا:

''وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝ وَ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝''۔

ترجمہ: ''اور وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے ان کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور ان دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس پایا، اس عورت نے کہا: جس شخص نے آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا ہے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہوگی اسے قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے، یوسف (علیہ السلام) نے کہا: اسی نے مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا اور عورت کے خاندان میں سے ایک شخص نے گواہی دی: اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور وہ (معاذ اللہ) جھوٹوں میں سے ہیں اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو عورت جھوٹی ہے یوسف (علیہ السلام) سچوں میں سے ہیں، (یوسف: 25-27)''۔

اس کے باوجود کہ یوسف علیہ السلام کی براءت ثابت ہو چکی تھی، پھر بھی عزیزِ مصر کی بیوی کے کہنے پر یوسف علیہ السلام کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب عزیزِ مصر نے خواب دیکھا اور خواب کی تعبیر بتانے والے اس کی تعبیر بتانے سے عاجز آ گئے اور یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر بتا دی تو عزیزِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دربار میں عزت کے ساتھ بلانے کا حکم دیا۔ اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کے نمائندے سے کہا: پہلے اُن عورتوں کا حال معلوم کیجیے جنہوں نے بے اختیار اپنے ہاتھ کاٹ دیے تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ

النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ "۔

ترجمہ: "اور بادشاہ نے کہا: اُسے (یوسف کو) میرے پاس لے کر آؤ، پس جب قاصد اُن کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اُس سے پوچھو، ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے، (یوسف:50)"، چنانچہ تحقیق کرنے پر عزیزِ مصر کی بیوی نے خود اعتراف کر لیا کہ یوسف علیہ السلام سچے ہیں اور وہ جھوٹی ہے اور یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت اس نے ہی دی تھی، قرآن مجید میں ہے:

"قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ٞ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۲﴾"۔

ترجمہ: "عزیز (مصر) کی بیوی بولی: اب حق بات ظاہر ہوگئی ہے، میں نے اُسے پھسلانے کی کوشش کی اور بے شک وہ راست بازوں میں سے ہے، (یوسف علیہ السلام نے) یہ اس لیے کیا تا کہ وہ جان لے کہ میں نے اُس کے پسِ پشت اُس کی خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی سازش کو کامیاب ہونے نہیں دیتا، (یوسف:52-51)"۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیزِ مصر کی بیوی نے جب دروازہ بند کر کے دعوتِ گناہ دی تو آپ نے انکار کیا اور باہر کی طرف بھاگنے لگے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔ انبیائے کرام معصوم ہوتے ہیں اور ان کے نفوس رضائے الٰہی پر مطمئن ہوتے ہیں۔ اس لئے انبیائے کرام کے بارے میں یہ تصور بھی باطل ہے کہ ان سے گناہ ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین سے اس مقام پر تسامحات سرزد ہوئے اور آیت کا ترجمہ کرتے وقت وہ انبیائے کرام کے مقامِ رفیع کا لحاظ نہ کر سکے۔ پھر یوسف علیہ السلام کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ آخرِ کار جب اللہ تعالیٰ نے اُن کی رہائی کے اسباب مقدر فرمائے، تو انہوں نے رہائی

سے پہلے اپنے اوپر عائد الزام کی بابت فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا۔عزیز مصر نے اس مرحلے پر اہل دانش سے رائے لی۔ یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت بیان کرتے ہوئے فرمایا:"اس نے مجھے بہکانے کی کوشش کی تھی"،توعزیزِ مصر کے گھرانے سے ایک شاہد نے ان کی پاک دامنی پر ظاہری قرینے سے استشہاد کرتے ہوئے کہا:

"اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾"۔

ترجمہ:"اگر یوسف کی قمیص سامنے سے پھٹی ہے،تو وہ عورت سچی ہے اور(عِیَاذاً بِاللّٰہ!)وہ جھوٹے ہیں اور اگر اُس کی قمیص پشت کی جانب سے پھٹی ہے تو وہ عورت جھوٹی ہے اور یہ (یوسف علیہ السلام) سچوں میں سے ہیں،سو جب اُس (عزیزِ مصر) نے اُن کی قمیص کو پشت کی جانب سے پھٹا ہوا دیکھا،تو بولا: یہ تم عورتوں کا مکر ہے اور بے شک تمہارا مکر بہت سنگین ہے،(یوسف:28-26)"۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"فَيَصِحُّ أَنْ يَكُونَ حُجَّةً بِالْحُكْمِ بِالْعَلَامَةِ فِي اللُّقْطَةِ وَكَثِيرٍ مِنَ الْمَوَاضِعِ، حَتّٰى قَالَ مَالِكٌ فِي اللُّصُوصِ إِذَا وُجِدَتْ مَعَهُمْ أَمْتِعَةٌ فَجَاءَ قَوْمٌ فَادَّعَوْهَا، وَلَيْسَتْ لَهُمْ بَيِّنَةٌ فَإِنَّ السُّلْطَانَ يَتَلَوَّمُ لَهُمْ فِي ذٰلِكَ، فَإِنْ لَمْ يَأْتِ غَيْرُهُمْ دَفَعَهَا إِلَيْهِمْ وَقَالَ مُحَمَّدٌ فِي مَتَاعِ الْبَيْتِ إِذَا اخْتَلَفَتْ فِيهِ الْمَرْأَةُ وَالرَّجُلُ إِنَّ مَا كَانَ لِلرِّجَالِ فَهُوَ لِلرَّجُلِ، وَمَا كَانَ لِلنِّسَاءِ فَهُوَ لِلْمَرْأَةِ، وَمَا كَانَ لِلرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ فَهُوَ لِلرَّجُلِ وَكَانَ شُرَيْحٌ وَإِيَاسُ بْنُ مُعَاوِيَةَ يَعْمَلَانِ عَلَى الْعَلَامَاتِ فِي الْحُكُومَاتِ، وَأَصْلُ ذٰلِكَ هٰذِهِ الْآيَةُ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ:"یہ آیت لقطہ اور بہت سے مواقع پر علامت کی بنیاد پر حکم لگانے کے لیے حجت ہے،حتیٰ کہ امام مالک نے چوروں کے بارے میں کہا:"جب اُن کے پاس سامان پایا جائے اور کوئی آکر اس کا دعویٰ کرے اور اُن کے پاس کوئی گواہ نہیں ہے،تو بادشاہ اُن کے

اس دعوے کے بارے میں انتظار کرے گا اور اگر کوئی دوسرا دعوے دار نہ آیا تو سامان اُن کے حوالے کرے گا''۔ گھر کے ساز وسامان کی ملکیت کے بارے میں جب میاں بیوی میں اختلاف ہوجائے، تو امام محمد نے فرمایا: ''جو چیزیں (عرف میں) مردوں کے لیے ہوتی ہیں وہ مرد لے گا اور جو چیزیں (عرف میں) عورتوں کے لیے ہوتی ہیں وہ عورت لے گی اور جو چیزیں مرد وزن میں مشترک ہوتی ہیں، وہ مرد لے گا'' اور قاضی شریح اور ایاس بن معاویہ مقدمات کا فیصلہ کرنے میں ظاہری علامات سے کام لیتے تھے اور اس کی اصل یہی آیت ہے، واللہ اعلم، (تفسیر القرطبی، یوسف:28-26)''۔ یعنی اگر کوئی دوسرا شخص دعوی نہیں کرتا تو یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ جن لوگوں نے دعویٰ کیا ہے، یہ مال انہی کا ہے۔ اگر کسی اور کا ہوتا تو وہ ضرور عدالت میں یا حاکم کے پاس دعویٰ کرنے آتے۔ عرف اور عادت میں مردوں اور عورتوں کی چیزیں الگ ہوتی ہیں اور قرائن سے یہ بات معلوم ہے کہ مرد کا سامان عورت استعمال نہیں کرتی اور عورت کا سامان مرد استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے سامان کا دعوی کرتا ہے تو اس کا رد ہوگا، ماسوا اس کے کہ دعوے کے حق میں کوئی قوی دلیل یا قرینہ موجود ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں مختلف مواقع پر قرائن کی شہادت کو اپنے قیاس کی بنیاد بھی بنایا اور اسے تائیدی شہادت کے طور پر استعمال بھی فرمایا۔ لیکن اسے کسی بھی وقوعے کے بارے میں قطعی اور حتمی شہادت کا درجہ نہیں دیا کہ محض قرائن کی بنیاد پر کوئی شرعی حد جاری کی گئی ہو، ذیل میں ہم اس کی چند مثالیں پیش کر رہے ہیں:

(۱) ابورافع سَلَّام بن ابوالحُقَیق ایک مشہور دشمنِ رسول تھا، وہ آپ کو ایذا پہنچا تا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن عَتِیک کی قیادت میں انصار کے پانچ افراد کو اُسے قتل کرنے کے لیے بھیجا۔ عبداللہ بن اُنیس بیان کرتے ہیں: ہم نے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس کے قتل کی خبر دی، اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں:

''وَاخْتَلَفْنَا عِنْدَهٗ فِيْ قَتْلِهٖ، كُلُّنَا يَدَّعِيْهِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَاتُوْا

أَسْیَافَکُمْ فَجِئْنَاہُ بِھَا، فَنَظَرَإِلٰی سَیْفِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ أُنَیْسٍ، فَقَالَ: ھٰذَا قَتَلَہٗ، أُرِیٰ فِیْہِ أَثَرَالطَّعَامِ''۔

ترجمہ:''ہم میں اختلاف پیدا ہوا کہ وہ شخص کس کی ضرب سے قتل ہوا ہے، کیونکہ ہم میں سے ہر ایک اس اعزاز کا دعوے دار تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''سب اپنی تلواریں لے آؤ''، سو ہم اپنی اپنی تلواریں لے کر آئے تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن اُنَیس کی تلوار کی طرف دیکھا اور فرمایا:''وہ اِس تلوار سے قتل ہوا ہے، کیونکہ مجھے اس پر خوراک کے آثار دکھائے گئے ہیں)، (سیرتِ ابن ہشام، ج:2،ص:275،سبل الہدیٰ ورشاد فی سیرہ خیرالعباد ج6ص104روایت کا خلاصہ)''۔

آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ عبداللہ بن اُنیس کی تلوار ابن ابوالحُقیق کے بدن میں زیادہ گہرائی یعنی معدے تک گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر لگے ہوئے خون کے دھبوں میں خوراک کے ذرات کی آمیزش نظر آرہی تھی۔لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کا وار زیادہ کارگر اور جان لیوا ثابت ہوا۔ یہ فراستِ نبوت کا فیضان تھا کہ آپ ﷺ نے قرائن کی شہادت (Circumstantial Evidence) کا اعتبار کیا اور اسے کسی وقوعے کے ثبوت کے لیے تائیدی شہادت اور قرینے کے طور پر استعمال فرمایا۔آج کل اس سے ملتی جلتی FORENSIC EVIDENCE یعنی موقع کی شہادت ہے اور عدالتیں تائیدی شہادت کے طور پر اس کا اعتبار کرتی ہیں۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے قیاس صحیح سے بھی کام لیا ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ، أَنَّ رَجُلًا أَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: یَا رَسُولَ اللّٰہ! وُلِدَ لِی غُلَامٌ أَسْوَدُ، فَقَالَ: ھَلْ لَکَ مِنْ إِبِلٍ؟، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مَا أَلْوَانُھَا؟، قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: ھَلْ فِیھَا مِنْ أَوْرَقَ؟، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَأَنّٰی ذٰلِکَ؟، قَالَ: لَعَلَّہٗ نَزَعَہٗ عِرْقٌ، قَالَ: فَلَعَلَّ ابْنَکَ ھٰذَا نَزَعَہٗ''۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوا اور عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم!)، میرے ہاں ایک سیاہ فام بیٹے نے جنم لیا ہے (غالباً وہ شخص سفید رنگ کا تھا اور اس بنا پر اُسے اپنے بیٹے کے نسب کے بارے میں شبہ لاحق ہوا)، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟، اُس نے جواب دیا: جی ہاں!، آپ ﷺ نے پوچھا: وہ کس رنگ کے ہیں؟، اُس نے عرض کیا: سرخ، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اُن میں کوئی خاکستری رنگ (Gray Colour) کا بھی ہے؟، اُس نے عرض کیا: جی ہاں!، آپ ﷺ نے فرمایا: تو وہ (سرخ اونٹوں میں خاکستری رنگ کا اونٹ) کہاں سے آ گیا؟، اُس نے عرض کیا: شاید (اُس کے نسبی آباء میں سے) کسی کی رگ نے اُسے کھینچ لیا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تمہارے بیٹے کو بھی (تمہارے نسبی آباء کی) کسی رگ نے کھینچ لیا ہو، (بخاری: 5305)''۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے قیاس کو ثبوتِ نسب کے لیے تائید کے طور پر استعمال فرمایا۔

مندرجہ ذیل حدیث سے اِسے مزید تقویت ملتی ہے:

''حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عَلِيِّ بْنِ رَبَاحٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُ مَا وُلِدَ لَكَ؟، قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا عَسٰى أَنْ يُولَدَ لِي، إِمَّا غُلَامٌ وَإِمَّا جَارِيَةٌ، قَالَ: فَمَنْ يُشْبِهُ؟، قَالَ: مَا عَسَى أَنْ يُشْبِهَ، إِمَّا أُمَّهُ وَإِمَّا أَبَاهُ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: '' مَهْ لَا تَقُولَنَّ كَذٰلِكَ، إِنَّ النُّطْفَةَ إِذَا اسْتَقَرَّتْ فِي الرَّحِمِ أَحْضَرَهَا اللهُ عَزَّ وَجَلَّ كُلَّ نَسَبٍ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَ آدَمَ، أَمَا قَرَأْتَ هٰذِهِ الْآيَةَ فِي كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ، (الانفطار: 8)''۔

ترجمہ: ''موسیٰ ابن علی اپنی سند کے ساتھ اپنے دادا رباح سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اُن سے پوچھا: تمہارے ہاں کیا پیدا ہوا؟، اُس نے جواب دیا: میرے ہاں جو بھی پیدا ہوگا، بیٹا ہوگا یا بیٹی، آپ ﷺ نے پوچھا: وہ بچہ (صورت میں) کس سے مشابہ ہوگا؟، اُس نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم)، یقیناً اپنے باپ یا ماں میں سے کسی کے مشابہ ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا رکو، اس

طرح نہ کہو، (بات یہ ہے کہ) جب نُطفہ ماں کے رحم میں قرار پاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ (اپنی قدرت سے) اُس کے اور آدم علیہ السلام کے درمیان تمام رشتوں (یعنی اُن کی صورتوں) کو حاضر فرما دیتا ہے (اور وہ اُن میں سے کسی سے مشابہت اختیار کرلیتا ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھا: ''وہ جس صورت میں چاہتا ہے، تمہاری صورت تشکیل فرما دیتا ہے، (المعجم الکبیر للطبرانی:4624)''۔

اس کی مزید تائید اس حدیث پاک سے ہوتی ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ وَهُوَ مَسْرُورٌ، فَقَالَ: ''يَا عَائِشَةُ! أَلَمْ تَرَى أَنَّ مُجَزِّزًا الْمُدْلِجِيَّ دَخَلَ عَلَيَّ فَرَأَى أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ وَزَيْدًا (أَيْ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ) وَعَلَيْهِمَا قَطِيفَةٌ، قَدْ غَطَّيَا رُءُوسَهُمَا وَبَدَتْ أَقْدَامُهُمَا، فَقَالَ: إِنَّ هٰذِهِ الْأَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ''۔

ترجمہ: ''ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میرے پاس اس حال میں تشریف لائے کہ آپ بہت خوش تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (عائشہ!) تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟، مُجَزِّز مُدْلجی میرے پاس آیا۔ اُس نے دو اشخاص (زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما) کو چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے اس طرح دیکھا کہ اُن کے سر (اور بدن کا بالائی حصہ) ڈھکا ہوا تھا اور پاؤں کھلے تھے۔ اُس نے کہا: یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں (یعنی یہ دونوں اشخاص آپس میں باپ بیٹا ہیں)، (صحیح بخاری:6771)''۔

ایک روایت میں ہے: ''تَبْرُقُ أَسَارِيرُ وَجْهِهِ'' یعنی خوشی سے آپ کا چہرۂ انور دمک رہا تھا، (صحیح مسلم:1459)''۔

حضرت اسامہ بن زید کا نسب اپنے باپ زید بن حارثہ سے ثابت تھا، لیکن باپ بیٹے کے رنگ میں تفاوت کی وجہ سے کسی منافق نے اُن کے نسب پر طعن کیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیافے کے ماہر مُجَزِّز مُدلجی کے اس مشاہدے کو تائیدی شہادت کے طور پر لیا اور خوشی کا اظہار فرمایا کہ ایک غیر جانبدار ماہر شخص نے پاؤں کی مشابہت سے ان دونوں کے حقیقی باپ

بیٹا ہونے کی تصدیق کردی۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ قیاس صحیح کو تائیدی شہادت کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔

(۳) غزوہ بدر سے پہلے کفار قریش کی صحیح تعداد معلوم کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے کفار کے لشکر میں یومیہ ذبح ہونے والے اونٹوں کی تعداد کے قرینے سے قیاس کر کے لشکرِ کفار کی صحیح تعداد کا اندازہ لگایا کہ وہ لوگ 900 اور 1000 کے درمیان ہیں، سیرت ابن ہشام اور سبل الہدیٰ والرشاد دونوں میں اس کا ذکر ہے۔

''سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد'' میں ہے:

''قَالَ ابْنُ إِسْحَاقَ: ثُمَّ رَجَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَلَمَّا أَمْسَى بَعَثَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ وَالزُّبَيْرَ بْنَ الْعَوَامِ وَسَعْدَ بْنَ أَبِي وَقَّاصٍ فِي نَفَرٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ إِلَى مَاءِ بِبَدْرٍ، يَلْتَمِسُوْنَ الْخَبَرَ لَهُ، فَأَصَابُوْا رَاوِيَةً لِّقُرَيْشٍ فِيْهَا أَسْلَمُ، غُلَامُ بَنِيَّ الْحَجَّاجِ، وَعَرِيْضُ، أَبُوْ يَسَارَ غُلَامُ بَنِي الْعَاصِ بْنِ سَعِيْدٍ فَأَتَوْا بِهِمَا، فَسَأَلُوْهُمَا وَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ، فَقَالَا نَحْنُ سُقَاةُ قُرَيْشٍ بَعَثُوْنَا نَسْقِيَهُمْ مِنَ الْمَاءِ، فَكَرِهَ الْقَوْمُ خَبَرَهُمَا، وَرَجُوْا أَنْ يَّكُوْنَا لِأَبِيْ سُفْيَانَ (وَأَصْحَابِ الْعِيْرِ) فَضَرَبُوْهُمَا فَلَمَّا أَذْلَقُوْهُمَا قَالَا نَحْنُ لِأَبِيْ سُفْيَانَ (وَنَحْنُ فِي الْعِيْرِ) فَتَرَكُوْهُمَا وَرَكَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْهِ ثُمَّ سَلَّمَ وَقَالَ إِذَا صَدَقَاكُمْ ضَرَبْتُمُوْهُمَا وَإِذَا كَذَبَاكُمْ تَرَكْتُمُوْهُمَا، صَدَقَا، وَاللهِ إِنَّهُمَا لِقُرَيْشٍ، أَخْبِرَانِيْ عَنْ قُرَيْشٍ؟ قَالَا: هُمْ وَاللهِ وَرَآءَ هٰذَا الْكَثِيْبِ الَّذِيْ تَرٰى بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى۔ وَالْكَثِيْبِ الْعَقَنْقَلُ۔ فَقَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمِ الْقَوْمُ؟ قَالَا: كَثِيْرٌ، قَالَ مَا عِدَّتُهُمْ؟ قَالَا: لَا نَدْرِيْ، قَالَ: كَمْ يَنْحَرُوْنَ كُلَّ يَوْمٍ؟ قَالَا: يَوْمًا تِسْعًا وَيَوْمًا عَشْرًا، فَقَالَ: رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْقَوْمُ مَا بَيْنَ التِّسْعِمِائَةِ وَالْأَلْفِ۔

ترجمہ: ''ابن اسحاق کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے شام کے وقت علی بن ابی طالب، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی

وقاص کو چند صحابہ کے ساتھ قریش کے حالات معلوم کرنے کیلئے بدر کے پانی کی طرف بھیجا۔ قریش کیلئے پانی لے جانے والے ان کے ہاتھ لگے، جن میں سے ایک اسلم بنی الحجاج کا غلام اور اور دوسرا عریض ابو یسار بنی عاص بن سعید کا غلام تھا۔ صحابہ کرام نے انہیں بلایا اور اُن سے سوال کرنے لگے، اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا: ہم قریش کے لیے پانی لانے والے ہیں، انہوں نے ہمیں بھیجا ہے کہ ان کے لیے پانی لے کر جائیں۔ صحابہ کرام نے ان کے اس بیان کو پسند نہ کیا اور گمان کیا کہ یہ ابوسفیان اور قافلے والوں کے ساتھی ہیں، سو وہ ان کو مارنے لگے۔ پس جب ان پر سختی کی گئی تو انہوں نے کہا: ہم ابوسفیان کے ساتھی ہیں اور ہم قافلے میں ہیں، تو ان کو چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی نماز مکمل کر کے سلام پھیرا اور فرمایا: جب یہ یہ سچ بول رہے تھے تو تم نے ان کو مارا اور جب انہوں نے جھوٹ بولا تو تم نے ان کو چھوڑ دیا، بخدا یہ قریش کے ساقی ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے فرمایا: تم دونوں مجھے قریش کے بارے میں بتاؤ، وہ بولے: بخدا! وہ پرلے کنارے پر عقنقل ٹیلے کے پیچھے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: وہ کتنے افراد ہیں؟، وہ بولے: وہ بہت افراد ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان کی تعداد بتاؤ، وہ بولے: ہمیں صحیح تعداد معلوم نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہ ہر روز کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟، انہوں نے بتایا: یومیہ نو یا دس اونٹ، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان کی تعداد نو سو اور ہزار کے درمیان ہے، (سبل الہدیٰ والرشاد، ج:4، ص:28-27)"۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی فراست سے قیاس کیا کہ ایک اونٹ کا گوشت نوے تا سو افراد کے لیے کفایت کرتا ہے۔

(۴) سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد میں ہے:

"قَدَّمَ أَبُوْ سُفْيَانَ أَمَامَ الْعِيْرِ حَذَرًا حَتّٰى وَرَدَ الْمَاءَ فَرَأَى مَجْدِيَّ بْنِ عَمْرٍو الْجُهَنِيَّ قَالَ لَهٗ: هَلْ أَحْسَسْتَ أَحَدًا؟ قَالَ: مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَنْكَرَهٗ غَيْرَ إِنِّيْ قَدْ رَأَيْتُ رَاكِبَيْنِ۔

يَعْنِيْ بَسْبَسًا وَعَدِيًّا۔ قَدْ أَنَاخَا إِلَى هٰذَا التَّلِّ، ثُمَّ اسْتَقَيَا فِيْ شَنٍّ لَهُمَا، ثُمَّ انْطَلَقَا، فَأَتَى أَبُوْسُفْيَانَ مَنَاخَهُمَا فَأَخَذَ مِنْ أَبْعَارِ بَعِيْرَيْهِمَا، فَفَتَّهُ فَإِذَا فِيْهِ النَّوٰى، فَقَالَ هٰذِهٖ وَاللّٰهِ عَلَائِفُ يَثْرِبَ فَرَجَعَ إِلَى أَصْحَابِهٖ سَرِيْعًا فَضَرَبَ وَجْهَ عِيْرِهٖ عَنِ الطَّرِيْقِ، فَسَاحَلَ بِهَا، وَتَرَكَ بَدْرًا بِيَسَارٍ، وَانْطَلَقَ''۔

ترجمہ: ''بدر کے راستے سے ابوسفیان تجارتی قافلہ لے کر آرہا تھا، جب اس کو مسلمانوں کے حملے کا خطرہ محسوس ہوا تو وہ مسلمانوں کی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے بدر کی طرف آیا تا کہ وہ ان سے بچ کر نکل سکے۔ وہاں پر مَجْدِیْ بِنْ عَمرو اُلجُہَنی سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ ابوسفیان نے اجنبی لوگوں کے بارے میں اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا: میں نے کوئی اجنبی شخص نہیں دیکھا، صرف بسبس اور عدی دو اونٹ سوار دیکھے، انہوں نے اپنے اونٹ اس ٹیلے کے قریب بٹھائے اور پھر اپنے مشکیزوں میں پانی بھر کر چلے گئے۔ ابوسفیان نے اُن کے اونٹوں کے بٹھانے کی جگہ جا کر ان کے اونٹوں کی لید کو پکڑ کر توڑا، تو اُس میں سے کھجور کی گٹھلی نکلی، ابوسفیان نے کہا: یہ چارہ اور کھجور یثرب کے ہیں۔ وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کی طرف گیا اور بدر کو بائیں طرف چھوڑتے ہوئے راستہ بدل کر ساحل کے راستے مکہ روانہ ہوگیا۔ یعنی اُس نے کھجور کی گٹھلی کا جائزہ لے کر سمجھ لیا کہ مسلمان اس کے قافلے کے تعاقب میں قریب پہنچے ہوئے ہیں، سو اُس نے راستہ بدل کر اپنے قافلے کو بچالیا''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''أَهَمِّيَّةُ الْقَرَائِنِ اَلْقَضَاءُ بِالْقَرَائِنِ أَصْلٌ مِنْ أُصُوْلِ الشَّرْعِ، وَذٰلِكَ سَوَاءٌ فِيْ حَالِ وُجُوْدِ الْبَيِّنَةِ أَوِ الْإِقْرَارِ، أَمْ فِيْ حَالِ فَقْدِ أَيِّ دَلِيْلٍ مِنْ دَلَائِلِ الْإِثْبَاتِ فَقَدْ تَمْنَعُ الْقَرِيْنَةُ سَمَاعَ الدَّعْوٰى كَادِّعَاءِ فَقِيْرٍ مُعْسِرٍ إِقْرَاضَ غَنِيٍّ مُوْسِرٍ، وَقَدْ تَرُدُّ الْبَيِّنَةُ أَوِ الْإِقْرَارُ حَالَ وُجُوْدِ الشُّهْمَةِ، مِثْلُ قَرَابَةِ الشَّاهِدِ لِلْمَشْهُوْدِ لَهٗ، أَوْ كَوْنُ الْإِقْرَارِ فِيْ مَرَضِ الْمَوْتِ، وَقَدْ تُسْتَخْدَمُ الْقَرِيْنَةُ دَلِيْلًا مُرَجِّحًا أَثْنَاءَ تَعَارُضِ الْبَيِّنَاتِ مِثْلُ وَضْعِ الْيَدِ وَنَحْوِهٖ كَمَا عَرَفْنَا، وَقَدْ تُعْتَبَرُ الْقَرِيْنَةُ دَلِيْلًا وَحِيْدًا مُسْتَقِلًّا إِذَا لَمْ يُوْجَدْ دَلِيْلٌ

سِوَاهَا، مِثْلَ رَدِّ دَعْوَى الزَّوْجَةِ الْقَاطِنَةِ مَعَ زَوْجِهَا بِعَدَمِ الْاِنْفَاقِ عَلَيْهَا، فِي رَأْيِ الْمَالِكِيَّةِ وَالْحَنَابِلَةِ قَالَ ابْنُ الْقَيِّمِ وَمَنْ أَهْدَرَ الْاَمَارَاتِ وَالْعَلَامَاتِ فِي الشَّرْعِ بِالْكُلِّيَّةِ، فَقَدْ عَطَّلَ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْكَامِ، وَوَضَعَ كَثِيْرًا مِّنَ الْحُقُوْقِ۔

تَعْرِيْفُ الْقَرِيْنَةِ اَلْقَرِيْنَةُ لُغَةً هِيَ الْعَلَامَةُ الدَّالَّةُ عَلٰى شَيْءٍ مَطْلُوْبٍ وَاصْطِلَاحًا هِيَ كُلُّ أَمَارَةٍ ظَاهِرَةٍ تُقَارِنُ شَيْئًا خَفِيًّا فَتَدُلُّ عَلَيْهِ يُفْهَمُ مِنْ هٰذَا التَّعْرِيْفِ أَنَّهُ لَا بُدَّ فِي الْقَرِيْنَةِ مِنْ أَمْرَيْنِ (۱) أَنْ يُّوْجَدَ أَمْرٌ ظَاهِرٌ مَعْرُوْفٌ يَصْلُحُ أَسَاسًا لِلْاِعْتِمَادِ عَلَيْهِ (۲) اَنْ تُوْجَدَ صِلَةٌ مُؤَثِّرَةٌ بَيْنَ الْاَمْرِ الظَّاهِرِ وَالْاَمْرِ الْخَفِيِّ۔

وَبِمِقْدَارِ قُوَّةِ هٰذِهِ الصِّلَةِ تَنْقَسِمُ الْقَرَائِنُ قِسْمَيْنِ قَرَائِنَ قَوِيَّةٌ، وَقَرَائِنَ ضَعِيْفَةٌ وَلِلْفُقَهَاءِ وَالْقُضَاةِ دَوْرٌ مَّلْحُوْظٌ فِي اِسْتِنْبَاطِ نَتَائِجَ مُعَيَّنَةٍ مِنَ الْقَرَائِنِ وَمِنَ الْقَرَائِنِ الْفِقْهِيَّةِ اِعْتِبَارُ مَا يَصْلُحُ لِلرِّجَالِ مِنْ مَّتَاعِ الْبَيْتِ عِنْدَ اِخْتِلَافِ الزَّوْجَيْنِ فِيْ مِلْكِيَّتِهٖ هُوَ لِلرَّجُلِ، كَالْعِمَامَةِ وَالسَّيْفِ، وَمَا يَصْلُحُ لِلنِّسَاءِ فَقَطْ كَالْحُلِيِّ لِلْمَرْأَةِ بِشَهَادَةِ الظَّاهِرِ، وَمُلَاحَظَةِ الْعُرْفِ وَالْعَادَةِ۔

وَلَا يَحْكُمُ عِنْدَ جُمْهُوْرِ الْفُقَهَاءِ بِهٰذِهِ الْقَرَائِنِ فِي الْحُدُوْدِ، لِاَنَّهَا تُدْرَأُ بِالشُّبُهَاتِ وَلَا فِي الْقِصَاصِ اِلَّا فِي الْقَسَامَةِ۔ لِلْاِحْتِيَاطِ فِي مَوْضُوْعِ الدِّمَاءِ وَاِزْهَاقِ النُّفُوْسِ وَيَحْكُمُ بِهَا فِي نِطَاقِ الْمُعَامَلَاتِ الْمَالِيَّةِ وَالْاَحْوَالِ الشَّخْصِيَّةِ عِنْدَ عَدَمِ وُجُوْدِ بَيِّنَةٍ فِي اِثْبَاتِ الْحُقُوْقِ النَّاشِئَةِ عَنْهُ۔

ترجمہ: ’’قرائن کی اہمیت: قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کرنا شریعت کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے، خواہ مجرم نے اعترافِ جرم کرلیا ہو یا عینی گواہ موجود ہوں یا کوئی اور ثبوت موجود نہ ہو، تمام صورتوں میں قرائن کی شہادت کی اہمیت مسلّم ہے۔ بعض اوقات قرینہ باطل دعوے کو رد کرنے میں کام آتا ہے، جیسے تنگدست فقیر کا کسی مالدار کو قرض دینے کا دعویٰ کرنا۔ بعض صورتوں میں امکانِ تہمت کے سبب گواہی رد کردی جاتی ہے، جیسے گواہ کا اس شخص کا رشتے دار ہونا، جس کے حق میں وہ گواہی دے رہا ہے یا کوئی شخص مرضِ وفات میں کسی بات کا

اقرار کرے، کبھی گواہیوں میں تعارض کی صورت میں قرینہ راجح دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جیسے قبضہ وغیرہ۔ جب کوئی اور دلیل (اعتراف یا گواہ) دستیاب نہ ہو تو قرینہ ہی واحد دلیل رہ جاتا ہے، جیسے بیوی شوہر کے ہاں رہ رہی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ وہ نفقہ نہیں دے رہا۔ امام ابن قیم نے کہا: مالکیہ اور حنابلہ کا قول ہے: جس نے قرائن اور ظاہری علامات کو سرے سے رد کر دیا، اس نے بہت سے (شرعی) احکام کو بے اثر کر دیا اور حقوق کو ساقط کر دیا۔

قرینہ کی تعریف: لغت میں قرینہ مطلوبہ چیز پر دلالت کرنے والی علامت کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں یہ وہ ظاہری علامت ہے جو کسی خفیہ چیز کے ساتھ مل کر مطلوب پر دلالت کرے، اس تعریف کی رُو سے قرینے میں دو چیزیں ناگزیر ہیں: (۱) کوئی قابل اعتماد معروف چیز ظاہراً موجود ہو، جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو (۲) کوئی ایسی چیز موجود ہو جو امر ظاہر اور خفی کے درمیان تعلق اور ربط کو ظاہر کرے۔

اس تعلق اور ربط کے سبب قرائن کی دو قسمیں ہیں: (۱) قرائنِ قویہ: یعنی مضبوط قرائن، (۲) قرائنِ ضعیفہ: یعنی کمزور قرائن۔ فقہاء اور قُضاۃ کا قرائن سے مخصوص نتائج اخذ کرنے میں ایک قابلِ قدر کردار ہے۔ قرائنِ فقہیہ میں سے ایک یہ ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان گھر کے سامان کی ملکیت کے بارے میں اختلاف ہو جائے، تو اس صورت میں جو چیزیں مردوں کے لیے خاص ہیں، جیسے عمامہ، تلوار، تو یہ مرد کی قرار پائیں گی اور جو صرف عورتوں کے لیے خاص ہیں، جیسے زیورات، تو یہ ظاہر کی شہادت اور عرف اور عادت کو دیکھتے ہوئے عورت کی سمجھی جائیں گی۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جمہور فقہاء کے نزدیک ان قرائن کی بنیاد پر حدود جاری نہیں کی جائیں گی، کیونکہ حدود شبہات سے مرتفع ہو جاتی ہیں۔ اور محض اِن قرائن کی بنیاد پر قصاص کا فیصلہ بھی نہیں ہوگا، سوائے قسامت کے، تاکہ حتی الامکان خون رائیگاں نہ جائے۔ البتہ مالی معاملات کے انتظام اور احوالِ شخصیہ اور ان سے پیدا ہونے والے حقوق کے اثبات میں شہادت کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ان قرائن کی بنیاد پر فیصلہ دیا جا سکے گا۔ (الفقہ الاسلامی

وادلتہ، ج:8،ص:6127-6129)''۔

قرائن کی شہادت کو قبول کرنے میں احتیاط کی مثال یہ ہے: علی حیدر خواجہ امین آفندی لکھتے ہیں:

''إِذَا قَتَلَ أَحَدٌ شَخْصًا دَخَلَ إِلَى مَنْزِلِهِ فَقَالَ الْقَاتِلُ إِنَّ الْمَقْتُولَ رَجُلٌ فَاسِقٌ سَارِقٌ وَقَدْ دَخَلَ دَارِي بِقَصْدِ قَتْلِي، فَإِذَا كَانَ الْمَقْتُولُ مَعْرُوفًا بِالْجَرَائِمِ وَالْفِسْقِ وَالسَّرِقَةِ فَلَا يَلْزَمُ الْقَاتِلَ قِصَاصٌ وَلَكِنْ تَلْزَمُهُ الدِّيَةُ اسْتِحْسَانًا''۔

ترجمہ: ''جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہونے والے کو قتل کردے اور قاتل کہے کہ مقتول فاسق اور چور آدمی ہے اور میرے گھر میں مجھے قتل کرنے کے لیے داخل ہوا تھا، تو اگر مقتول فسق، چوری اور جرائم کے لیے مشہور ہے، تو قاتل پر قصاص لازم نہیں ہوگا۔ لیکن اس پر استحساناً دیت لازم ہوگی، (دُرَرُ الْحُكَّامِ فِي شَرْحِ مُجَلَّةِ الْأَحْكَامِ، مادہ: 1741)۔ کیونکہ مقتول کا مجرم کے طور پر مشہور ہونا قاتل کی بات کے سچ ہونے پر واضح قرینہ ہے۔ لیکن انسانی خون رائیگاں نہ جائے، اس لیے استحساناً دیت لازم کی گئی ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

قرائن کی شہادت:

واقعاتی شہادت یا قرائن کی شہادت کی اس زمانے میں بہت اہمیت ہے۔ اسلام میں بھی قرائن کی شہادت کو ایک گونہ اہمیت دی گئی ہے، اگر کوئی اور شہادت دستیاب نہ ہو تو قرائن کی شہادت پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور بعض دفعہ قرائن اور واقعاتی شہادات دیگر شہادات کے لیے تائید اور تقویت کا باعث بنتی ہیں، واقعات اور قرائن کی شہادت کی اصل قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ''اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾''۔

ترجمہ: ''اس عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے یہ گواہی دی کہ اگر ان کا کُرتا آگے

سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ (حضرت یوسف) غلط کہنے والوں میں سے ہیں اور اگر ان کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو اس عورت نے جھوٹ بولا ہے اور وہ سچوں میں سے ہیں، پھر جب ان کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہنے لگا: تو بے شک یہ تم عورتوں کی گہری چال ہے، یقیناً تم عورتوں کی فریب کاری بہت بڑی ہے، (یوسف: 26-28) اور چونکہ قرآن اور سنت میں اس واقعاتی شہادت کا رد نہیں کیا گیا، اس لیے ہماری شریعت میں بھی اس کا حجت ہونا برقرار ہے۔

قرائن اور واقعاتی شہادتوں سے شراب نوشی کا ثبوت:

اسلام میں قرائن اور واقعاتی شہادتوں کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اس پر احکام مرتب ہوتے ہیں، اگر کسی شخص کے منہ سے شراب کی بُو آرہی ہو تو خواہ اس کے خلاف دو مسلمان مرد گواہی نہ دیں تب بھی محض شراب کی بُو کی وجہ سے اس کا شراب پینا ثابت ہو جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی، اسی طرح اگر اس کو شراب کی قے کرتے ہوئے دیکھا گیا تب بھی اس کا شراب پینا ثابت ہو جائے گا اور اس کو شراب کی سزا دی جائے گی، صحابہ میں سے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے ان واقعاتی شہادات کی بنا پر شراب کی حد جاری کی ہے۔ فقہاء میں سے امام احمد کے نزدیک شراب کی بُو کے ثبوت پر حد لازم ہو گی (امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں) امام مالک کے نزدیک اگر دو گواہوں سے شراب کی بُو ثابت ہو گی تو اس پر شراب نوشی کی حد ہو گی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک شراب کی بُو کی بنا پر حد تو نہیں ہے لیکن وہ اس پر تعزیر لازم کرتے ہیں۔ پہلے ہم اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے آثار صحابہ پیش کریں گے اور پھر اقوال فقہاء بیان کریں گے۔

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

''عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّ عُمَرَ كَانَ يَضْرِبُ فِي الرِّيحِ''۔

ترجمہ: ''سائب بن یزید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شراب کی بُو پر مارتے تھے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 28628)''۔

''عَنْ مَالِكِ بْنِ عُمَيْرٍ الْحَنَفِي، قَالَ أُتِيَ عُمَرُ بِابْنِ مَظْعُونٍ قَدْ شَرِبَ خَمْرًا، فَقَالَ مَنْ شُهُودُكَ؟، قَالَ فُلَانٌ، وَفُلَانٌ، وَغِيَاثُ بْنُ سَلَمَةَ وَكَانَ يُسَمَّى غِيَاثٌ الشَّيْخَ الصَّدُوقَ، قَالَ رَأَيْتُهُ يَقِيئُهَا وَلَمْ أَرَهُ يَشْرَبُهَا، فَجَلَدَهُ عُمَرُ الْحَدَّ''۔

ترجمہ:''مالک بن عمیر حنفی بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ابن مظعون کو اس الزام میں لایا گیا کہ اس نے شراب پی ہے، حضرت عمر نے پوچھا: تمہارے گواہ کون ہیں، اس نے کہا: فلاں، فلاں اور غیاث بن سلمہ، غیاث کو سچا کہا جاتا تھا، اس نے کہا: میں نے اس کو شراب کی قے کرتے ہوئے دیکھا ہے، شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت عمر نے اس پر شراب کی حد جاری کردی، (مصنف ابن ابی شیبہ:28635)''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی قرائن کی شہادت کے قائل تھے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں:

''عَنْ عَلْقَمَةَ، قَالَ:أَتَى عَبْدُ اللهِ،الشَّامَ، فَقَالَ لَهُ نَاسٌ مِنْ أَهلِ حِمْص:اقْرَأْ عَلَيْنَا، فَقَرَأَ عَلَيْهِمْ سُورَةَ يُوسُفَ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ وَاللهِ مَا هٰذَا أُنْزِلَتْ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ وَيْحَكَ لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰكَذَا، فَقَالَ أَحْسَنْتَ فَبَيْنَا هُوَ يُرَاجِعُهُ، إِذْ وَجَدَ مِنْهُ رِيحَ الْخَمْرِ، فَقَالَ أَتَشْرَبُ الرِّجْسَ، وَتُكَذِّبُ بِالْقُرْآنِ؟ وَاللهِ لَا تُزَاوِلُنِي حَتّٰى أَجْلِدَكَ فَجَلَدَهُ الْحَدَّ''۔

ترجمہ:''علقمہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ علاقہ شام گئے، آپ سے حمص والوں نے کہا: ہمیں قرآن مجید سنائیں، آپ نے ان پر سورۂ یوسف تلاوت کی، ان لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: بخدا یہ سورت اس طرح نازل نہیں ہوئی ہے، حضرت ابن مسعود نے کہا: تجھ پر افسوس ہے، بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے اس سورت کو اسی طرح پڑھا تھا تو آپ نے فرمایا: تم نے اچھی قرأت کی، جس وقت یہ بحث ہورہی تھی اچانک اس کے منہ سے خمر (شراب) کی بُو آئی، حضرت ابن مسعود نے فرمایا: تم ناپاک

شراب پیتے ہو اور قرآن کی تکذیب کرتے ہو؟، بخدا! میں تم کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ تم پر حد نہ لگا دوں، پھر حضرت ابن مسعود نے اس پر حد لگا دی، (مسند احمد: 4033)"۔ اس حدیث کو امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی شراب کی بو کی بناء پر حد جاری کر دیتے تھے اور یہ واقعاتی شہادت کا اعتبار کرنے پر واضح دلیل ہے۔

آثارِ صحابہ پیش کرنے کے بعد اب ہم اس مسئلہ پر اقوالِ فقہاء کا ذکر کریں گے۔ امام احمد کے ایک قول کے مطابق شراب کی بُو کے ثبوت سے حد لازم ہو جاتی ہے، امام مالک کے نزدیک اگر دو گواہوں سے شراب کی بُو ثابت ہو جائے تو حد ہو گی اور امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک محض بُو کے ثبوت سے حد لازم نہیں ہو گی۔ اس حدیث میں یہ ثبوت ہے کہ واقعاتی شہادت کی بنا پر شراب کی حد لگائی جا سکتی ہے۔

ہر چند کہ فقہاء احناف کے نزدیک محض شراب کی بُو پائی جانے سے یا کسی کو شراب کی قے کرتے دیکھنے سے اس پر حد لازم نہیں ہوتی جب تک کہ وہ شراب پینے کا اقرار نہ کرے یا دو گواہ اس کے شراب پینے کی گواہی نہ دیں لیکن فقہائے احناف کے نزدیک بھی ایسے شخص کو تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"لِاحْتِمَالِ أَنَّهُ شَرِبَهَا مُكْرَهًا أَوْ مُضْطَرًّا فَلَا يَجِبُ الْحَدُّ بِالشَّكِّ، وَأَشَارَ إِلَى أَنَّهُ لَوْ وُجِدَ سَكْرَانُ لَا يُحَدُّ مِنْ غَيْرِ إِقْرَارٍ وَلَا بَيِّنَةٍ لِاحْتِمَالِ مَا ذَكَرْنَا أَوْ أَنَّهُ سَكِرَ مِنَ الْمُبَاحِ بَحْرٌ، لٰكِنَّهُ يُعَزَّرُ بِمُجَرَّدِ الرِّيحِ أَوِ السُّكْرِ كَمَا فِي الْقُهُسْتَانِيِّ"۔

ترجمہ: "کیونکہ یہ احتمال ہے کہ اس کو جبراً شراب پلائی گئی ہو یا اس نے مجبوراً شراب پی ہو، لہٰذا اس شک کی بنا پر حد واجب نہیں ہو گی، مصنف نے یہ اشارہ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص نشہ میں پایا گیا اور اس کے شراب پینے پر گواہی قائم ہوئی اور نہ اس نے اقرار کیا تو اس احتمال کی وجہ سے اس پر حد نہیں ہو گی اور "البحر الرائق" میں ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس کو کسی مباح

چیز کے پینے سے نشہ ہو گیا ہو، لیکن قہستانی میں ہے کہ شراب کی بُو پائی جانے سے یا نشہ میں پائے جانے سے اس کو تعزیر لگائی جائے گی۔

علامہ ابن رشد مالکی نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک صرف شراب کی بُو کے ثبوت سے حد لازم نہیں ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک اس پر حد ہے بشرطیکہ دو گواہ اس بات کی گواہی دیں کہ اس شخص کے منہ سے شراب کی بُو آرہی ہے۔ (بدایۃ المجتہد، ج:2،ص:333، دارالفکر بیروت)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: ایک قول امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرح ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر شراب کی بُو آرہی ہو یا اس کو شراب کی قے کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس پر حد ہے، کیونکہ شعبی سے روایت ہے کہ علقمہ النخعی نے قدامہ کے خلاف حضرت عمر کے سامنے شہادت دی کہ انہوں نے اس کو شراب کی قے کرتے دیکھا ہے، حضرت عمر نے فرمایا: جس شخص نے شراب کی قے کی اس نے شراب کو پیا اور اس پر شراب کی حد لگا دی، اسی طرح حضرت عثمان کے سامنے ولید بن عقبہ کے خلاف ایک شخص نے شراب پینے کی گواہی دی اور دوسرے نے شراب کی قے کرتے ہوئے دیکھنے کی گواہی دی، حضرت عثمان نے فرمایا: جب تک شراب پیے گا نہیں اس کی قے کیسے کرے گا اور حضرت علی سے کہا اس پر حد لگائیں، حضرت علی نے حضرت عبداللہ بن جعفر سے حد لگانے کے لیے کہا اور انہوں نے حد لگا دی، (المغنی لابن قدامہ، ج:9،ص:138۔139، دارالفکر بیروت)''۔

مذکور الصدر حوالہ جات سے واضح ہو گیا کہ صحابہ میں سے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود واقعاتی شہادت کی بنا پر حد لگا دیتے تھے۔ امام مالک کا یہی مسلک ہے اور امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر تعزیر ہے۔

واقعاتی شہادات اور قرائن خارجیہ سے زنا کا ثبوت:

زنا کا ثبوت جس طرح گواہی اور اقرار سے ہوتا ہے، اسی طرح قرائن سے بھی زنا کا ثبوت

ہوجاتا ہے، ان قرائن میں سب سے واضح قرینہ عورت کا بغیر نکاح کے حاملہ ہونا ہے۔
احادیث میں حمل کو بھی زنا کے ثبوت کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔
امام مالک روایت کرتے ہیں:

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُولُ: الرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ إِذَا أَحْصَنَ إِذَا قَامَتْ عَلَيْهِ الْبَيِّنَةُ أَوْ كَانَ الْحَبَلُ أَوِ الْاِعْتِرَافُ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مرد اور عورتوں میں سے جو شادی شدہ شخص بھی زنا کرے، اس کے لیے قرآن مجید میں رجم کا حکم ہے، بشرطیکہ گواہوں سے زنا ثابت ہو یا (بغیر نکاح کے) حمل ہو یا زانی اعتراف کرلیں، (موطا امام مالک:3042)''، اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر عورت کو بغیر نکاح کے حمل ہوجائے تو یہ اس کے زنا کی واقعاتی شہادت ہے، سو اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو رجم کردیا جائے گا اور اگر کنواری ہے تو اس کو سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

علامہ نووی شافعی اس مسئلہ میں بیان مذاہب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عمر، امام مالک اور ان کے تابعین کا مذہب یہ ہے کہ جب کوئی عورت حاملہ ہوجائے اور اس کا شوہر یا مالک نہ ہو اور نہ یہ ثابت ہو کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا تو اس پر حد لازم ہوجائے گی الّا یہ کہ وہ مسافرہ ہو یا وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کا کوئی شوہر یا مالک ہے، فقہاء مالکیہ نے کہا ہے: اگر اس نے زنا بالجبر کے خلاف استغاثہ نہیں کیا تھا تو ظہور حمل کے بعد جبر کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ فقط ظہور حمل سے حد لازم نہیں آتی خواہ اس کا شوہر یا مالک ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ مسافرہ ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ جبر کا دعویٰ کرے یا نہ کرے یا خاموش رہے، حد صرف اقرار یا

گواہوں سے لازم آتی ہے۔(شرح صحیح مسلم للنووی، ج:2،ص:66،نور محمد اصح المطابع کراچی)

میڈیکل رپورٹ کی بناء پرزنا کا ثبوت:

اگر ایک اجنبی مرد اور عورت ایک کمرے سے پکڑے جائیں اور ان کے کپڑے منی سے آلودہ ہوں اور پکڑے جاتے وقت ان کے چہروں پر گھبراہٹ اور خجالت کے آثار نمودار ہوں اور پھر میڈیکل ٹیسٹ کے ذریعے یہ ثابت ہوجائے کہ یہ منی انہی دونوں کی ہے، تو کیا اس واقعاتی شہادت سے ان پر حد لازم ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں ہر چند کہ ثبوت زنا پر قوی قرینہ موجود ہے لیکن ان پر حد جاری نہیں کی جائے گی، بلکہ ان کو تعزیری سزا دی جائے گی، (شرح صحیح مسلم، ج:5،ص:174۔178، فرید بک اسٹال لاہور)۔

قرائن عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کا غیر معتبر ہونا:

سائنسی علوم کے ذریعہ چاند کی رؤیت اور پہلی تاریخ کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے اور اس سے ہمیں شہادتوں کے پرکھنے کا بھی موقع ملتا ہے کہ یہ شہادت سچی ہے یا جھوٹی ہے، جب سائنسی آلات کے ذریعے یہ معلوم ہوجائے کہ آج چاند کی تولید نہیں ہوئی ہے اور اس کی رؤیت ممکن نہیں ہے اور مطلع بالکل صاف ہو اور پورے ملک میں کہیں چاند نظر نہ آیا ہو اور ایسے میں چند آدمی یہ گواہی دے دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی جھوٹی ہوگی اور سائنسی تحقیقات کے خلاف ان کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ قرائن اور شواہد کے خلاف جو گواہی دی جائے وہ شرعاً معتبر نہیں ہوتی۔ علامہ ابن قیم جوزیہ (متوفی 751ھ) نے اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عقلی شواہد اور دلائل کے خلاف گواہوں کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

قرائن عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کے غیر معتبر ہونے کے متعلق فقہائے اسلام کی تصریحات:

علامہ ابن قدامہ حنبلی (متوفی 620ھ) نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد

بن حنبل کا یہ موقف ہے کہ اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اسی طرح اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص نے زنا کیا ہے لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس کا آلہ کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (المغنی، ج:9،ص:71، دارالفکر بیروت، 1415ھ)

فقہائے شافعیہ کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی الشافعی المتوفی ٤٥٠ھ لکھتے ہیں:

المزنی نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر چار آدمیوں نے کسی عورت کے خلاف زنا کی شہادت دی اور چار نیک عورتوں نے یہ بتایا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (الحاوی الکبیر، ج:17،ص:81، دارالفکر بیروت، 1414ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی متوفی 676ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (روضۃ الطالبین، ج:7،ص:315، دارالکتب العلمیہ بیروت، 1412ھ)

فقہائے احناف نے اپنی متعدد کتب میں یہ لکھا ہے کہ کسی عورت کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے، پھر بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی مرد کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے، پھر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا آلہ کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، یہ تصریحات فقہائے احناف کی درج ذیل کتب میں مذکور ہیں:

(المبسوط، ج:10، ص:57، ہدایہ اولین، ص:522، الفتاوی الولواجیہ، ج:2، ص:239، المحیط البرہانی، ج:5،ص:146، فتح القدیر، ج:5،ص:273، البحر الرائق، ج:5،ص:22، تبیین الحقائق، ج:3،ص:598، فتاویٰ شامی، ج:4،ص:42، مجمع الانہر، ج:2،ص: 355، اعلاء السنن، ج:11،ص: 654، النہر الفائق، ج:3،ص:145، البنایہ، ج:6،ص:287، حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، ج:2،ص: 400، عالمگیری، ج:2،ص:153)

فقہائے اسلام کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ جب کوئی شہادت قرائن عقلیہ اور شواہد کے خلاف ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ماہرین فلکیات اور محکمہ موسمیات والے بتائیں کہ آج چاند کی تولید نہیں ہوئی ہے اور اس کی رؤیت ممکن نہیں ہے اور چند آدمی یہ گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی مردود ہوگی۔

اسی طرح اس مسئلہ پر عقلی دلیل یہ ہے:

اگر کسی مقتول کے پاس ایک شخص پستول بدست کھڑا ہو اور دو گواہ یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنے پستول سے فائر کر کے اس کو ہلاک کیا ہے اور بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ ہو کہ اس مقتول کے جسم سے جو گولی برآمد ہوئی ہے، وہ اس کے پستول سے نہیں چلائی گئی تو ان گواہوں کی گواہی جھوٹی قرار پائے گی اور اس شخص کو رہا کر دیا جائے گا، (تبیان القرآن، ج:10،ص:527۔528)

اب جا کر سائنس اور جدید علم نے اس کی توثیق کی ہے۔ چنانچہ اب فارنزک لیبارٹری کی مثبت رپورٹ اور وڈیو ریکارڈنگ یعنی مُتحرک تصاویر کو کسی جرم کے ثبوت کے لیے ایک حد تک قبول کیا جا رہا ہے۔ لیکن کسی سنگین نوعیت کے جرم، جس کی قانون اور شریعت میں سزا موت مقرر ہے، کے ثبوت کے لیے ڈی این اے کی مثبت لیبارٹری رپورٹ اور ویڈیو ریکارڈنگ کو، خواہ وہ کتنی ہی معیاری ہو، واحد حتمی اور قطعی ثبوت مان کر سزائے موت کا فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی محض اس مثبت فارنزک رپورٹ کی بنا پر شریعت کی مقرر کی ہوئی ''حَدِّ زنا'' جاری نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس میں ملاوٹ اور کسی چیز کی آمیزش کا امکان موجود ہے۔ اسی طرح وڈیو ریکارڈنگ اور متحرک تصاویر میں بھی ایڈیٹنگ کے امکان کو کلی طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ہمارے ہاں روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ٹیلیویژن کوریج کرنے والے اپنے کسی من پسند سیاسی رہنما یا پارٹی کے جلسے کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں اور ناپسندیدہ لیڈر یا پارٹی کے اُتنے ہی یا اُس سے بھی بڑے اجتماع کو چھوٹا کر کے دکھاتے ہیں، اِسے ہمارے محاورے میں کیمرے یا ہاتھ کا کمال کہتے ہیں۔ یعنی ذاتی پسند وناپسند، ترغیب

وتحریص، دباؤ اور تعصُّب کی بنا پر حقائق وواقعات میں تغیُّر وتبدُّل یا کمی بیشی یا موٴثر یا غیر موٴثر بنا کر پیش کرنا ممکن ہے۔ اسی طرح تمام تر دیانت اور نیک نیتی کے باوجود بشری خطا کے امکان کو بھی کلی طور پر رَد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کیس میں ایسا ہو، لیکن خطا کا امکان قطعیت کی نفی کے لیے کافی ہے۔ ہمارے ہاں میڈیکولیگل رپورٹ اور میت کے پوسٹ مارٹم میں ردّوبدل کے شواہد بہت ہیں۔

الغرض ان اسباب کی بنا پر ڈی این اے کی مثبت رپورٹ یا فارنزک شواہد ظنّی اور مشتبہ (Doubtful) قرار پاسکتے ہیں، قطعی ہرگز نہیں ہوسکتے، جبکہ حدِ زنا جاری کرنے یا قتل کی سزا نافذ کرنے کے لیے ثبوت کا قطعی اور لاریب ہونا ضروری ہے اور وہ مطلوبہ عینی شہادت ہی سے ممکن ہے۔ خون کے دھبے، بندوق کی گولیاں اور انسانی دانت سے کاٹنا اسی زمرے میں آتا ہے، تاہم ان شواہد کی بنا پر جج یا قاضی اگر مطمئن ہو تو تعزیر کے طور پر سزا دے سکتا ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ امریکہ کے حالیہ سفر میں ڈاکٹر خالد اعوان صاحب نے امریکہ اور جرمنی کی عدالتوں اور تفتیشی اداروں کے حوالے سے ڈی این اے رپورٹ کے غیر یقینی ہونے کے بارے میں وہاں کے اخبارات کے حوالوں سے ہمیں یہ شواہد فراہم کیے، جو ہمارے لبرل عناصر کے لیے یقیناً حجت ہوں گے:

امریکہ کے نہایت مشہور ایتھلیٹ او جے سمپسن پر اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے دُہرے قتل کا الزام تھا، وکیل صفائی نے موقف اختیار کیا کہ ڈی این اے کے حاصل کیے ہوئے نمونے میں لیبارٹری میں کسی آمیزش کے امکان کو رَد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح 2009ء میں ایک واضح ابہام رپورٹ کیا گیا۔ اس کی رُو سے محض ڈی این اے کی مثبت رپورٹ پر اس حد تک انحصار کو شک کی نظر سے دیکھا گیا کہ اسے قطعی شہادت مان کر مجرم پر سزائے موت نافذ کردی جائے۔

پندرہ سال تک جرمنی کی ایک اسٹیٹ کی پولیس ایک عادی قاتلہ خاتون کو شدت سے تلاش کرتی رہی، جس کی ڈی این اے کے مثبت شواہد چالیس جرائم کے وقوعوں میں پائے

گئے ،ان میں سے چھ قتل کے جرائم تھے۔2007ء میں انہوں نے متبادل امکانات پر غور شروع کیا، پھر مارچ2009ء میں اسٹیٹ منسٹر نے اعلان کیا کہ کیس کو حل کرلیا گیا ہے،وہ یہ کہ جس فیکٹری سے نمونہ لینے کے لیے روئی کا پھایا لیا جارہا تھا،وہاں ایک خاتون ورکر کی لاپرواہی سے آمیزش(Contamination)ہورہی تھی،(Kingport Times-News,Monday, May11, 2009)"۔

اسی طرح Amanda knox نامی ایک امریکی خاتون کو اٹلی میں اپنے ساتھ کمرے میں رہنے والی دوسری خاتون کو قتل کرنے کے الزام میں 25 سال کی سزا سنائی گئی۔اس پر الزام ثابت کرنے کے لیے ڈی این اے لیبارٹری رپورٹ کو بطور ثبوت پیش کیا گیا۔تقریباً ایک سال بعد اس فیصلے کو چیلنج کردیا گیا اور امریکہ کے ایک اخبار میں رپورٹ شائع ہوئی:"Rome-Amanda knox "کو ایک فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ایک غیر جانبدار فارنزک رپورٹ نے بتایا کہ اس امریکی طالب علم اور اس کی ساتھی کے مقدمے میں جو ڈی این اے رپورٹ بطور شہادت استعمال کی گئی،وہ قابل اعتماد نہیں تھی اور اس میں آمیزش تھی۔اس رپورٹ سے معلوم ہوا کہ پہلے ٹرائل میں جو ڈی این اے ٹیسٹ استعمال کیا گیا،وہ بین الاقوامی معیار سے کم تر درجے کا تھا اور اس کے سبب اَمنڈا ناکس کی سزا کو ختم کرنے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

(2011,Bristol Herald Courier,Thursday,June 30)

پس شرعی حد جاری کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کو حتمی اور قطعی ثبوت ماننے والوں کو اس رپورٹ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

اسی طرح امریکی ریاست ٹیکساس میں فوجداری عدالتِ مُرافعہ نے 16 جولائی کو Clifton Williams کی سزائے موت کو نفاذ سے محض چند گھنٹے قبل ملتوی کردیا،کیونکہ استغاثہ کے وکلاء نے یہ موقف اختیار کیا کہ Williams نامی ایک اور سیاہ فام شخص کے ڈی این اے پروفائل سے اس کے مشابہ ہونے کا امکان ہے اور اس امکان کا تناسب

ایک کے مقابلے میں Sextilion 43 ہے، یعنی 43 کے آگے اکیس صفر لگانے سے جو عدد بنتا ہے، اس کے برابر ہے یا اسے ایک بہ نسبت 43 بلین ٹریلین سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ٹیکساس کی انتظامیہ نے حال ہی میں ایف بی آئی کے تیار کردہ ڈیٹا بیس پر انحصار کرکے نتیجہ اخذ کیا کہ ایک اور سیاہ فام ولیم نامی شخص کے ڈی این اے پروفائل سے اس نمونے کے ملنے کے امکانات 40 in One Trillion Billions ہیں، (Kingsport 10 Times-News,Monday,August,2015)''۔

ہمارے ہاں بعض لوگ قتل یا آبروریزی کے مقدمات (یعنی ایسے جرائم جن کی سزا موت یا عمر قید ہے) میں صرف ڈی این اے کی مثبت لیبارٹری رپورٹ کو حتمی اور قطعی شہادت کے طور پر قبول کرنے پر مُصر ہیں اور اِسے حتمی اور قطعی ثبوت نہ ماننے والوں کو دقیانوسی فکر کا حامل قرار دیتے ہیں۔ایسے تمام لبرل حضرات سے گزارش ہے کہ وہ آبروریزی کے مقدمات میں ڈی این اے کی شہادت کو قطعی ثبوت نہ ماننے کی بابت Univercity of Michigans Innocene Clinic کے 56 سالہ کارل وِنسن کے مقدمے کا مطالعہ کریں، جسے جبری آبروریزی کے مقدمے میں 25 سال کی جیل گزارنے کے بعد اس بنا پر رہا کردیا گیا کہ جج ایزن براؤن نے کہا:''عدالت سائنسی شواہد کی بجائے عینی شہادت پر انحصار کرے گی۔
(2011,Kingport Times-News,Monday,July16)

الغرض ڈی این اے ٹیسٹ کی مثبت رپورٹ کے قطعی ثبوت نہ ہونے کے بارے میں امریکہ اور مغربی ممالک کی عدالتیں یک آواز نہیں ہیں، بعض اسے حتمی اور قطعی ثبوت مانتے ہیں اور بعض عدالتوں اور ایف بی آئی نے اسے تسلیم نہیں کیا۔اسی حقیقت کو علمِ نبوت نے چند الفاظ میں بیان فرمادیا:''جس قدر ہوسکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کردو، (سنن ترمذی:1424)''۔امام ابن ماجہ نے اپنی سُنَن میں باب باندھا:''مومن کی پردہ پوشی اور حدود کو شبہات کے سبب دور کرنے کا بیان''۔امید ہے میری یہ عاجزانہ کاوش ان شاءاللہ جج صاحبان،مفتیانِ کرام، وکلاء حضرات اور قانون کے طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

نوٹ: اہلِ علم کی آگہی کے لیے ڈی این اے کے بارے میں بعض سائنسی معلومات ہم ماہنامہ ''بیداری'' شمارہ اپریل 2017 میں شائع شدہ ایک مضمون ادارے کے شکریہ کے ساتھ شائع کررہے ہیں:

ڈی این اے حیرت اور سراپا حیرت

(یاسر غنی)

انسانی جسم ساٹھ کھرب سے زائد خلیوں (Cells) پر مشتمل ہے۔ ہر خلیے کے اندر اہم وراثتی مادہ ڈین این اے موجود ہوتا ہے جس میں مکمل انسان کی تمام تر معلومات (Blue Prints) موجود ہوتی ہیں۔ ڈی این اے ایک لمبا دھاگہ نما کیمیائی مادہ ہے، جو تقریباً تین ارب چھوٹے مالیکیولز پر مشتمل ہوتا ہے، جنہیں نیوکلیوٹائیڈ کہا جاتا ہے۔ ہر نیوکلیوٹائیڈ مزید تین چھوٹے مالیکیولز پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈی این اے میں پائے جانے والے نیوکلیوٹائیڈ چار قسم کے ہوتے ہیں جنہیں مختصراً T,G,A اور C سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

ڈی این اے کی لمبائی:

ڈی این اے کی لمبائی حیرت کا ایک سمندر ہے۔ ایک انسانی خلیے میں تقریباً چھ فٹ لمبا ڈی این اے کا دھاگہ پایا جاتا ہے۔ ایک مکمل انسان کے تمام خلیوں کے ڈی این اے کو لمبائی کے رخ پر جوڑا جائے تو اس کی لمبائی تقریباً گیارہ ارب کلومیٹر بنتی ہے جو زمین کے سورج سے فاصلے سے ستر گنا سے بھی زائد ہے، یعنی ایک جدید ترین الٹراسونک طیارہ جس کی رفتار آواز سے آٹھ گنا تیز ہے، وہ اس فاصلے کو سوا صدی میں طے کرے گا، اگر ایک ٹائپسٹ ۶۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ۸ گھنٹے روزانہ ڈی این اے کے نیوکلیوٹائیڈز کو ظاہر کرنے والے مخفف حروف تہجی ہی کو ٹائپ کرے تو بغیر کسی چھٹی اور آرام کے پندرہ سال میں صرف ایک خلیے کا ڈی این اے لکھا جاسکتا ہے۔ جب کہ اس سے جو کتاب تیار ہوگی، اگر اس کے ایک صفحے پر پانچ سو الفاظ ہوں اور کل ۱۰۰۰ صفحات ہوں تو ایسی ۲۸۰ کتابیں تیار ہوں گی جن پر صرف ایک خلیے کی معلومات ہوں گی۔ ایک انسان کے تمام

خلیوں کی معلومات لکھنے کے لیے روئے زمین کے تمام وسائل ناکافی ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے،ترجمہ:''زمین میں جتنے درخت ہیں اگروہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی، بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے،(سورۂ لقمان، آیت:27)''۔ اتنی لمبائی کے باوجود یہ انتہائی کم جگہ گھیرتا ہے۔ڈی این اے کے دس لاکھ نیوکلیوٹائیڈ اتنی جگہ گھیرتے ہیں جتنی جگہ پر کمپیوٹر ایک میگا بائٹ (MB) ڈیٹا اسٹور کرتا ہے اور ایک خلیے کا مکمل ڈی این اے ۳ گیگا بائٹ (GB) جگہ گھیرتا ہے۔

ڈی این اے کی ساخت وافعال:

ڈی این اے بل کھاتی ہوئی سیڑھی کی مانند ہوتا ہے، جس کو خاص قسم کی نیوکلیئر پروٹین (Histones) پر ایک خاص ترتیب سے لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔تین نیوکلیوٹائیڈ مل کر ایک کوڈ بناتے ہیں، جسے جین (Gene) کہا جاتا ہے۔عام طور پر ایک جین ایک خصوصیت کو کنٹرول کرتی ہے، مثلاً آنکھوں کے رنگ کو ایک جین کنٹرول کرتی ہے۔ایک خلیے میں تیس ہزار سے زائد فعال (Active) جینز پائی جاتی ہیں۔ہر خلیے کے اندر مکمل انسان کی معلومات ہوتی ہیں۔ایک ناخن کے ڈین این اے میں معدہ، دل، جگر، بال اور دیگر تمام اعضائے انسانی بنانے کی مکمل معلومات ہوتی ہیں۔اسی طرح تمام خلیوں میں مکمل معلومات موجود ہوتی ہیں۔یعنی ڈی این اے کی ایک ہی طرح کی کاپی ہر خلیے میں پائی جاتی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کی صناعی ایسی بے مثل ہے کہ ہر جین اپنی متعلقہ جگہ پر ہی ظاہر ہوتی ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سر پر ٹانگیں نکل آئیں یا ناخنوں کی جگہ دانت یا پھر دماغ کی جگہ پر گردے آجائیں۔ہر انسان کا ڈی این اے اپنی ترتیب میں دوسرے سے مختلف ہوتا ہے سوائے مماثل جڑواں بچوں (Identical Twins) کے، جو ایک ہی بیضے کی تقسیم سے پیدا ہوئے ہوں۔والدین، اولاد اور بہن بھائیوں کے ڈین این اے میں ایک خاص مشابہت ہوتی ہے جو کسی دوسرے کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔اس کو تکنیکی اصطلاح میں

ڈی این اے فنگر پرنٹنگ کہا جاتا ہے۔ڈی این اے کی اس خصوصیت کو بچوں کے والدین کی شناخت، حادثات اور مجرموں کی پہچان میں استعمال کیا جاتا ہے۔جس طرح پاکستان میں نادرا(N A D R A) کے پاس تمام رجسٹرڈ افراد کی انگلیوں کے نشانات (Fingerprints) کا ریکارڈ موجود ہے،صرف ایک انگلی کے نشانات سے اصل فرد کی پہچان ہوسکتی ہے، ایسے ہی ڈی این اے کا ریکارڈ بھی رکھا جاسکتا ہے۔حادثات ودیگر جرائم کی جگہوں سے صرف ایک بال، ناخن یا خون کا کوئی قطرہ وغیرہ مل جانے سے اصل فرد کی شناخت ہوسکتی ہے۔ امریکہ میں ایک ایسا ادارہ موجود ہے ، جہاں جیل جانے والے خطرناک مجرموں کا ڈی این اے ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ڈی این اے اپنے احکامات ایک خاص قسم کا مالیکیول بنا کر جاری کرتا ہے، جسے پیغام رساں آر این اے(Messenger RAN) کہا جاتا ہے۔اس چھوٹے سے مالیکیول مین نیوکلیوٹائیڈز کی ترتیب میں پیغام چھپا ہوتا ہے۔ یہ پیغام خلیے میں موجود رابوسومز(Ribosomes) پڑھتے ہیں اور دی گئی ہدایات کے مطابق پروٹین تیار کرتے ہیں۔ یہ پروٹین متعلقہ کام سرانجام دیتی ہے۔انسانی جسم کا آغاز صرف ایک خلیے زائیکوٹ سے ہوتا ہے جو ماں اور باپ کی طرف سے آنے والے تولیدی جرثوے اور بیضے(Egg Sperm) کے مدغم ہونے سے بنتا ہے۔ یہ زائیکوٹ(Zygote) تقسیم در تقسیم ہوکر کھربوں خلیوں پر مشتمل انسان بنتا ہے۔خلیے کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ڈی این اے بھی کاپی() ہوکر ہر نئے بننے والے خلیے میں چلا جاتا ہے۔ڈی این اے کی کاپی تیار کرنے کا نظام اتنا حیرت انگیز ہے کہ عام حالات میں کاپیاں تیار کرتے ہوئے اربوں مالیکیولز میں سے کسی ایک کی ترتیب بھی خراب نہیں ہوتی۔ کسی چھوٹی سی بھی غلطی کا نتیجہ خطرناک بیماری،معذوری یا جسمانی اعضاء کی تبدیلی کی صورت میں نکلتا ہے۔ڈی این اے یقیناً ایک حیرت ناک شے ہے اور اس کا مطالعہ بلا اختیار یہ اقرار کرنے پر مجبور کردیتا ہے کہ اس کائنات کا خالق ومالک انتہائی عظیم ہے اور صرف وہی اس لائق ہے کہ اس کے آگے جبینِ انسانی کو جھکایا جائے۔